قومی زبان

ائے اردو نمبر

انجمن ترقی اردو

انجمن ترقی اردو پاکستان کا پندرہ روزہ ترجمان

قومی زبان

جلد نمبر ۲۴ شمارہ ۳-۴

بابائے اردو نمبر

اگست سنہ ۱۹۶۳ء

اس شمارے کی قیمت

تین روپے

سالانہ قیمت
دس روپے

فی شمارہ
پچاس پیسے

انجمن ترقیٔ اردو پاکستان اردو روڈ کراچی

فہرست

ادار یہ	
عبدالحق کو میں نے کیسے اور کیسا جانا	مولوی محمد مقتدا خاں شیروانی
مولوی عبدالحق : چند یادیں	جلیل قدوائی
باتیں اُس کی یاد رہیں گی	رئیس احمد جعفری
مولوی عبدالحق اور ان کے چند خطوط	ڈاکٹر داؤد رہبر
مولوی عبدالحق کی وصیّت	ڈاکٹر رحیم الدین کمال
مولوی عبدالحق	پروفیسر ممتاز حسین
بابائے اردو کا تصوّرِ مذہب	ابو سلمان شاہجہان پوری
عکس تحریر	
بابائے اُردو : ایک تجریدی خاکہ	رفیق خاور
عملی آدمی	گنیش راؤ بھتے

احوال غالب اور مولوی عبدالحق	سید قدرت نقوی	۷۵
مولوی عبدالحق سے میرے مراسم	نصیرالدین ہاشمی	۸۲
مولوی عبدالحق کی شخصیت نگاری	ڈاکٹر سید شاہ علی	۸۶
افکار عبدالحق	ڈاکٹر احسن فاروقی	۹۵
چار ملاقاتیں	افسر امروہوی	۹۹
مسیحائے اردو	بیگم محمد شریف	۱۰۴
شمع انجمن	تحسین سروری	۱۰۷
ایک انٹرویو	بشیر نیاز	۱۲۲
بابائے اردو اور مولوی عمر یافعی کے مراسم	سخاوت مرزا	۱۲۵
بابائے اردو اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی کے مراسم	قاضی محمد اختر	۱۳۰
بابائے اردو اور حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس		۱۴۳
بابائے اردو اور رسالہ حسن	ادارہ	۱۵۳
بابائے اردو کی ایک غیر مطبوعہ تحریر		۱۶۱
بابائے اردو کے معالج	بشیر نیاز	۱۶۳
ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد	شمیم احمد	۱۸۴
فہرست مطبوعات انجمن		۲۳۴
اشاریہ عبدالحق		۲۴۱

نہ عشقِ بتاں ہے نہ فکرِ معیشت
مگر جاگتے رات کٹتی ہے ساری

بابائے اردو

۱۶ر اگست

بابائے اردو کو ہم سے جدا ہوئے پورے دو سال ہو گئے ہیں۔ آج ہم ان کی دوسری برسی منا رہے ہیں۔ ہمارے ملک کی یہ عام روایت ہے کہ ہم اپنے مشاہیر کو یا تو نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کی یاد میں ایک آدھ جلسہ کر کے اپنے "فرض" سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں۔ انجمن نے اپنی حد تک اس روایت سے بغاوت کرنے کی جسارت کی ہے اور بابائے اردو کی یاد منانے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے کام کو جاری رکھا جائے۔ انجمن دراصل بابائے اردو ہی کی ذات کا پرتو ہے اور انھیں کی زندگی بھر کی پرخلوص محنت اور لگن کا نتیجہ ہے اس لئے اگر انجمن زندہ و فعال ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ نہ سمجھیں کہ بابائے اردو آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور ان کا وہ کام جاری ہے کہ جس کے لئے وہ زندگی بھر کوشاں رہے۔

بابائے اردو کی برسی کے موقع پر یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ ان کی وفات کے بعد انجمن نے کس انداز سے کام شروع کیا اور کیا کیا کام انجام دئے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ انجمن بابائے اردو کے کام کو جاری رکھنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکی ہے۔

سب سے پہلا معاملہ 'مالیات' کا ہے۔ انجمن کا کاروبار اب تک حکومت کی امداد پر چلتا تھا۔ جو اس کی ضروریات کے لئے ناکافی تھی۔ نیز کسی ادارے کا صرف حکومت کی امداد کے سہارے زندہ رہنا بھی کوئی مستحسن بات نہیں ہے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت تھی کہ ایک طرف تو حکومت کی امداد میں اضافہ ہو اور دوسری طرف خود انجمن اپنے وسائل سے اتنا سرمایہ بہم پہنچائے کہ اس کے کاموں کا دائرہ وسیع ہو سکے۔ مقام شکر ہے کہ ان دونوں کاموں میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے۔ اس سال حکومت نے سالانہ امداد کے علاوہ ایک لاکھ روپے کی علاحدہ امداد بھی دی ہے۔ انجمن کی کتابوں کے فروخت کا انتظام بھی معقول ہو گیا ہے

انجمن پریس میں جدید ترین مشینیں نصب کی گئی ہیں جن کی وجہ سے انجمن کی آمدنی میں معقول اضافہ ہوگا نیز انجمن کی کتابوں کی طباعت کا معیار بھی بلند ہوگا۔

انجمن کے علمی و ادبی کام بھی تیز رفتاری سے انجام پا رہے ہیں۔ قاموس الکتب (جلد دوم) تکمیل کے قریب ہے۔ مختلف یونیورسٹیوں کے پی ایچ ڈی کے کئی مقالات بھی اشاعت کے لئے حاصل کئے جا رہے ہیں۔ متعدد ریسرچ اسکالروں کو مختلف علمی منصوبوں پر کام کرنے کے لئے متعین کر دیا گیا ہے۔ انجمن کی بعض اہم مطبوعات کے نئے ایڈیشن شائع کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے میں بابائے اردو کی اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس کی نظر ثانی ہو رہی ہے۔ طباعت کے لئے اعلیٰ درجہ کا کاغذ درآمد کر لیا گیا ہے۔ امید ہے اس سال کے آخر تک یہ ڈکشنری چھپ جائے گی۔

انجمن کا اردو کالج پاکستان کا واحد تعلیمی ادارہ ہے جہاں جملہ علوم و فنون کی تعلیم اردو کے ذریعے دی جاتی ہے۔ اب اس کالج کو اقامتی درس گاہ بنایا جا رہا ہے۔ اور اس مقصد کے لئے ۲۵ ایکڑ زمین بھی حاصل کر لی گئی ہے۔ اردو کالج کو اقامتی درس گاہ بنانے سے یہ فائدہ ہوگا کہ اس ادارے سے بیرون کراچی کے طالب علم بھی استفادہ حاصل کر سکیں گے

—— یہ تھا انجمن کے کاموں اور منصوبوں کا ایک سرسری سا خاکہ، جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اہل انجمن صرف ۱۶ اگست ہی کو بابائے اردو کی یاد نہیں مناتے بلکہ ان کے وقت کا ایک ایک لمحہ اسی یاد کی نذر ہوتا ہے۔

الحاج مولوی محمد مقتدا خاں شیروانی

مولوی عبدالحق کو میں نے کیسے (اور) کیسا جانا؟

میرے عزیز میاں مشفق خواجہ کی فرمائش ہے کہ انجمن کے رسالہ "قومی زبان" کے "بابائے اُردو نمبر" کے لئے ان کے بارہ میں مضمون لکھوں - میں تعمیل کرتا ہوں۔ مجھے بجائے "بابائے اُردو" کے ان کا اصل نام "عبدالحق" زیادہ عزیز ہے - لہذا برابر یہی لکھوں گا۔ یہی بولتا ہوں - کیونکہ "بابائے اردو" میں سراسر پیرانہ سالی کا مفہوم ہے اور وہ دم واپسیں تک یکسر جوان رہے۔

مولوی عبدالحق اور میں اگرچہ دونوں ایم اے او کالج کے اور سرسید کے زمانے کے طالب علم ہیں۔ مگر وہ مجھ سے بہت زیادہ سینیئر تھے میں ۱۸۹۳ء میں اسکول میں داخل ہوا - انھوں نے ۱۸۹۴ء میں بی اے کیا - لہٰذا انھوں نے بہ نسبت میرے سرسید کو بہت زیادہ اور بہت قریب سے دیکھا - میں نے اتنا زیادہ نہ دیکھا اور قریب سے تو صرف دو بار دیکھا سرسید کا انتقال مارچ ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ سرسید کے لٹریری اسسٹنٹ (اُردو کے مشہور ادیب و مصنف) مولوی سید وحیدالدین سلیم پانی پتی تھے - اور سرسید کے قدیم دوست اور رفیق کار حاجی اسمٰعیل خاں رئیس دتا ولی تھے - ان دونوں کے باہمی مشورہ اور اشتراکِ عمل سے سرسید کے انتقال سے دو تین ماہ بعد ہی "معارف" نام سے علی گڑھ سے ایک ماہوار رسالہ نکلا جو شروع ہی سے معیار کی معراج پر پہنچا - اس میں مولوی عبدالحق بی اے انسپکٹر مدارس گلبرگہ (بعدہٗ اورنگ آباد) کے بھی مضامین چھپنے لگے۔

میرے والد معارف کے مستقل خریدار تھے - اور میں مستقل مطالعہ شعاریوں میں اُن کے نام اور کام سے آشنا ہوا۔ اس کے بعد جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (حال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) علی گڑھ کے شعبے کے طور پر انجمن ترقی اُردو قائم ہوئی تو اس کی نظامت مولانا شبلی سے چل کر اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (بعدہٗ نواب صدر یار جنگ) سے گزر کر مولوی عبدالحق پر ایسی تھمی کہ جان کے ساتھ رہی ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم، تو جاں شدی　　　تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

میں ۱۹۰۲ء میں بسلسلۂ صحافت پنجاب (پیسہ اخبار، لاہور) چلا گیا اور آخر ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ آنے تک کئی سال انجمن ترقی اُردو شاخ پنجاب کا لاہور میں جوائنٹ سکرٹری رہا - اور اس حیثیت سے مولوی عبدالحق سے مسلسل کافی خط و کتابت رہی۔

آخر ۱۹۰۹ء میں جب میں مولوی سید وحید الدین سلیم پانی پتی کی جگہ کالج کے آرگن علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اڈیٹر ہو کر آیا اور کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں شریک ہونے لگا تو سب سے اول کانفرنس کے دسمبر ۱۹۱۱ء کے اجلاس ناگ پور (سی پی حال ایم پی) میں ان سے بالمشافہ ملاقات (اُنہی کی طرف سے) اس طرح ہوئی گویا لنگوٹیا یار ہیں۔ حالانکہ عمروں کا فرق آٹھ دس سال سے کم نہ تھا۔ اور معلوم ہوا کہ مولوی عبدالحق اول و آخر ادب ہی ادب ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں۔ سید افتخار عالم مارہروی بھی آیا کرتے تھے۔ اور اُن کے ساتھ ایک شاعر طپش مارہروی طپش صاحب کے اشعار ہزل سے گزر کر ایسے فحش و عریاں ہوتے تھے کہ سننے والوں کے کپڑے اُترتے تھے مثلاً او کھلی اور موسل کا استعمال طپش صاحب کے یہاں معمولی بات تھی۔ مگر مولوی عبدالحق اُنھیں بھی قہقہوں اور چہچہوں کے ساتھ کان کھول کر سنتے تھے۔ اُن کی ادبی خدمات اتنی اجلے اور اعلیٰ ہیں کہ اُن کے تفصیلی ذکر میں وقت صرف نہیں کروں گا۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے وہ پوری تحقیق و تدقیق اور نفس مضمون پر پوری طرح جامع و مانع طریقہ سے حاوی ہو کر لکھتے تھے طرز تحریر زیادہ تر سادہ اور عام فہم اور فارسی اضافتوں سے اکثر پاک ہوتا تھا۔ لغت، قواعد، تنقید، مقدمات، مختصر سوانح عمریاں، زبانوں کا باہمی مقابلہ غرض جس فن پر لکھا حق ادا کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے تصور سے لے کر اُس کے وجود اور پھر اُس کی ترقی تک اُن کا بڑا حصہ ہے۔ یونیورسٹی کے تمام ضروری علوم و فنون پر نصاب بہم پہونچانا انہی کا کارنامہ ہے۔

حیدرآباد میں دارالترجمہ پہلے سے قائم تھا اُن کے ذریعہ سے اُسے بہت ترقی ہوئی۔ انجمن کے لیے اُنھوں نے جو اُردو کتابوں کا کتب خانہ جمع کیا تھا وہ بایدو شاید تھا۔ مگر اوس پر جو افتاد پڑی اُس کا دہرانا لاحول فضول ہے۔ مگر ہمت نے ان سے بچپن ہارا تھا۔ اس سلسلہ میں جہاں تک مجھ سے ان کی مختصر خط و کتابت رہی اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہاں بھی انھوں نے از سر نو خاصہ (کم از کم کام چلاؤ) ذخیرہ فراہم کر لیا تھا۔ اصل حال مقامی شرکائے کار کو معلوم ہوگا۔

سر سید نے مسلمانوں میں اشاعت علوم کا ذریعہ ابتداء میں تراجم کو قرار دیا تھا۔ اور دنیا کے اکثر ملکوں خصوصاً عربوں اور آخر میں جاپانیوں کی نظیر ان کے سامنے تھی کہ اول اول عربوں نے یونانی اور سنسکرت اور یورپ نے عربی اور جاپان نے یورپ کی زبانوں سے اپنے اپنے علوم و فنون کو ترقی دی۔ اور پھر سب مستقل بالذات ہو گئے۔ جاپان کی تعلیمی تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے ایک ایک لفظ کے صحیح ترجمہ کی اُدھیڑ بُن میں سال سال بھر صرف کیا۔ سر سید نے بھی اسی طرح کام شروع کیا۔ اور اُسے کچھ روز چلایا۔ مگر اُن کو بھی یہی ناقابل عبور دقت پیش آئی کہ جب تک ایک علم کی کتاب کا ترجمہ ہو اور چھپے وہ علم کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے لہذا انھوں نے انگریزی تعلیم کو اردو کے

تراجم پر مقدم کی۔ تاکہ براہ راست تصنیف وتالیف کرنے والے کافی تعداد میں پیدا ہو جائیں۔ مولوی عبدالحق کو سرسید کی بنیاد پر عمارت اٹھانے کے لئے تقریباً آدھی صدی ملی۔ اس عرصہ میں ہر علم کے ماہر کافی تعداد میں پیدا ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے دل میں اپنی زبان کو ترقی دینے کی لگن ازبس ضروری تھی۔ اور یہ لگن مولوی عبدالحق نے لگائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں تقریباً تمام ضروری علوم وفنون پر اُردو میں درجنوں کتابیں تیار ہو گئیں اور وہ بھی اس طرح کہ ہر کتاب کا ہر مابعد اڈیشن اپنے زمانہ تک کی ترقیات کو لیے ہوئے نکلتا تھا۔ اور کثرت سے مصنف ومؤلف انجمن سے بے نیاز ہو کر بھی کتابیں شایع کرتے تھے۔ اور مولوی عبدالحق ان کے ساتھ بھی نہایت ہمت افزائی اور فراخ حوصلگی کا سلوک کرتے تھے۔ اس سب کا یہ نتیجہ ہوا کہ عثمانیہ یونیورسٹی محیر العقول تھوڑے عرصے میں ہندوستان اور برطانیہ کی قدیم تر یونیورسٹیوں کے دوش بدوش کھڑی ہو گئی۔ ۱۹۱۷ء کے مشہور تعلیمی سڈلر کمیشن کے ایک ممبر ڈاکٹر ضیاء الدین تھے۔ وہ کمیشن کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی کو دیکھتے ہوئے جب علی گڑھ آئے تو میں نے اُن سے عثمانیہ یونی ورسٹی کے متعلق اُن کی (گو یا پورے کمیشن کی) رائے پوچھی تو انھوں نے نہایت حقارت سے کہا: "کچھ نہیں سب ڈھونگ ہی ڈھونگ ہے۔ چار تنفس یہاں بیٹھے ہوئے ہیں چار تنفس وہاں بیٹھے ہوتے ہیں" (یہ مُتنفِس کی جگہ تنفس ڈاکٹر ضیاء الدین کی اردو تھی جیسے مُدغم کو انھوں نے ہمیشہ مُغدَم ہی بولا۔ حتیٰ کہ حضور نظام کے سامنے ایڈرس پڑھا تو اس میں بھی مُغدَم ہی پڑھا۔ حالانکہ یہ لفظ پہلے سے خاص طور پر انھیں کافی رٹا دیا گیا تھا)۔

آزاد طابعین وناشرین کی بھی ہمت افزائی کرتے تھے چنانچہ انجمن کا اپنا مطبع قائم ہونے تک دوسرے مطابع کو دل کھول کر کام دیتے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ (بعدہٗ مسلم یونی ورسٹی) پریس کی تعریف سے اُن کی زبان سوکھتی نہ تھی میں وعدہ کا نہایت سختی کے ساتھ پابند رہتا تھا اور اس لئے وہ جتنا کام انسٹی ٹیوٹ ومسلم یونیورسٹی پریس سے لینا چاہتے تھے میں نہیں دے سکتا تھا۔

دنیا کی دوسری زبانوں (خصوصاً انگریزی) کی ترقی اور اردو کی رقیب زبان ہندی کی چال پر بھی اُن کی کافی نظر رہتی تھی۔ اور اس سے وہ زبان اردو کی ترقی کی کوششوں میں قرار واقعی فائدہ اٹھاتے تھے۔

یہ جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا اگرچہ اس میں بھی ان کے عام اخلاق کا شائبہ تھا۔ لیکن اس میں زیادہ تر ان کے خالص اور اعلیٰ ذوق ادب کا جذبہ اور جلوہ کارفرما تھا۔

میرے دل میں اُن کی اصل اور حقیقی وقعت اُن کے قوی اعلیٰ اخلاق کے سبب سے تھی۔ سرسید اگرچہ نہایت شفیق اور نرم دل تھے۔ مگر اُن کے سامنے ہوتے ہوئے اچھے اچھوں کے پتے خواہ مخواہ پانی ہوتے تھے۔ لیکن اپنے زمانے میں عبدالحق سرسید کے حضور میں اپنے ساتھیوں کی زبان کے ترجمان رہتے تھے۔ اور اس میں بعض اوقات یورپین اسٹاف تک سے مقابلہ آپڑتا تھا۔

انھوں نے اپنی وضع ہمیشہ مشرقی رکھی۔ کوٹ پتلون نہ پہننا تو معمولی بات ہو سکتی ہے۔ مگر حیدر آباد میں کبھی انھوں نے مغلی کلاہ نہیں پہنی۔ ایک بار انھیں نظام (میر عثمان علی خاں بہادر) کی ناگواری کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے نہایت تلخی سے جواب دیا کہ "میں اپنی وضع نہیں بدلوں گا۔ کمال ہے۔

سرسیدؔ، نواب محسن الملک، نواب عماد الملک، سر سید راس مسعود کے متعلق انھوں نے جو تجربات لکھے وہ عام علم کے مطابق ہیں۔ مگر گدڑی کے لال نور خاں (وغیرہم ازیں قبیل لوگوں) کے اور اپنے مالی تک کا حال جس شرافت سے لکھا وہ انھی کا (یعنی انھی کے اخلاق کا) حصہ تھا۔

سید ہاشمی فرید آبادی کے لیے وہ ایم اے او کالج کے اس وقت کے ارباب حل و عقد سے بڑی بے جگری سے لڑے حیدری صاحب نے عثمانیہ یونی ورسٹی پر ہاتھ ڈالنا چاہا اور سید راس مسعود نے حیدری صاحب کی ہم نوائی کی تو وہ مسعود کو علی الاعلان "غلدری" (یعنی غلام حیدری) کہنے لگے تھے۔

سر مرزا اسمٰعیل نے اپنی وزارت عظمیٰ کے دور میں انجمن کی سرکاری امداد میں کمی کرنا چاہی تو انھوں نے اپنے اخبار میں اور بہت سے دوسرے اخبارات میں ان کی پالیسی کے خلاف بہت لمبا سلسلۂ مضامین لکھا۔ ایسی بے باک اور بے لاگ نگاری کی میرے علم و حافظہ میں دو اور صرف دو مثالیں ہیں۔ ایک سر انٹنی مکڈانل لفٹننٹ گورنر صوبہ مغربی و شمالی (بعد: صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ و حال اُتر پردیش) کی اُردو دشمنی کے خلاف مولوی بشیر الدین کے مضامین اپنے اخبار البشیر اٹاوہ میں ۹۷-۱۸۹۶ء میں اور دوسرے نواب وقار الملک کے مضامین ۱۹۱۱ء کے دربار تاج پوشی کے تقسیم بنگال کی منسوخی کے بارہ میں۔ لیکن مولوی بشیر الدین اور نواب وقار الملک کے مضامین اور مولوی عبدالحق کے مضامین کے اندر یہ نازک فرق تھا کہ ان دونوں کے مضامین زیادہ عام تحریکوں کی حمایت اور ایک منظم جمہوری حکومت کی مخالفت میں تھے۔ مولوی عبدالحق کا مسئلہ اتنا عام فہم نہ تھا اور ایک ایسی خود مختار سرکار میں تھا کہ ع ۔

نہ بر حرف او جائے انگشت کس

میری نیا زمندی کے بعد وہ جب کبھی علی گڑھ آئے اسٹیشن سے سیدھا پریس کا رُخ کرتے اور اس وقت چائے یا کھانے جس کا بھی وقت ہوتا اس سے فارغ ہو کر خود آزاد ہو جاتے اور مجھے بھی آزاد کر جاتے کہ زحمت انتظار نہ ہو۔ کیوں کہ وہ علی گڑھ میں اپنے وقت کے مالک نہیں رہتے تھے۔

البتہ جب اُن کی بہنگ مولانا سید سلیمان اشرف پروفیسر دینیات سے بڑھ گئی تو ان کے یہاں (آدم جی پیر بھائی منزل میں) ٹھہرنے لگے۔ اور چونکہ یہ یونیورسٹی کے عین مرکز میں تھی اس لیے ان سے ملنے والے بہت آسانی سے وہاں پہونچ جاتے تھے۔ میں بھی وہیں پہونچ جاتا تھا۔ کیوں کہ ۱۹۱۱ء سے (ہم دونوں کے ۱۹۰۹ء میں تقرر کے بعد سے) ان کے وصال ۱۹۳۹ء تک میری ان کے یہاں کی حاضری تیسوں دن اور بارہوں مہینے کی ہو گئی تھی۔

امیر عبدالرحمٰن خاں والی کابل کے زمانہ میں ایک شخص باغی ہوا تھا۔ امیر نے اُسے "کالا کافر" قرار دے کر اُس پر جہاد کیا تھا۔ مولوی عبدالحق کی آزادئ رائے اور اخلاقی جرأت کی بنا پر مولٰنا سلیمان اشرف صاحب نے ان کا لقب "کالا کافر" قرار دے دیا تھا۔ اور ان کے ورود کا نوٹس انھی الفاظ میں گھومتا تھا کہ "کالا کافر آگیا ہے"۔

مولانا اپنی مجلس کو فخر کے ساتھ "گپ کی مجلس" کہا کرتے تھے۔ کیوں کہ مجلس کے چند پتھر پر لکیر کے اصول تھے

- کسی کی بدگوئی نہ ہوتی تھی۔
- کوئی خود غرضی کا معاملہ نہ ہوتا تھا۔
- ہر قسم کے مضامین پر ایسے انداز میں بات ہوتی تھی کہ دماغ پر مطلق بار نہ ہو۔
- قابل ہمدردی لوگوں کی مدد پر غور ہوتا تھا۔
- دوسروں کی اخلاقی اقدار کو سراہا جاتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

مولوی عبدالحق صاحب کی شرکت سے "گپ" کا لطف دوبالا سے بالا ہو جاتا تھا۔ آخر نومبر یا شروع دسمبر ۱۹۶۰ء کے ایک نیاز نامہ میں میں نے اُنھیں "کالا کافر" کا خطاب یاد دلایا تو انھوں نے ۹ر دسمبر ۱۹۶۰ء کے والا نامہ میں مجھے لکھا:۔

"جو خطاب انھوں نے مجھے عطا فرمایا تھا مجھے اس پر فخر ہے۔ ظاہر پرست پابند اوہام و رسوم کفر و اسلام میں تمیز نہیں کر سکتے۔ رسمی مسلمان ہونا آسان ہے۔ کافر ہونا دشوار ہے۔ اس میں بہت سخت مقام طے کرنے پڑتے ہیں یہ سعادت کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے"۔

الحق۔ عبدالحق کے اس خیال کو ایک شاعر نے اس مصرعہ میں ادا کیا ہے ع

کافر تو انی شد ناچار مسلماں شو

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی نواب محسن الملک کی سکریٹری شپ اور صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کی جوائنٹ سکریٹری شپ کے زمانہ میں کانفرنس کے تین شعبے ۱۹۰۳ء میں قایم ہوئے:۔

(۱) ترقی اُردو۔
(۲) تعلیم نسواں۔
(۳) اقتصادیات

ترقی اردو کے سکریٹری مولوی شبلی اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں کے بعد مولوی عبدالحق ہوئے۔ تعلیم نسواں کے شیخ عبداللہ۔ اقتصادیات کے خواجہ غلام الثقلین۔ شیخ عبداللہ اور خواجہ صاحب کانفرنس سے لگے لپٹے رہے۔ مگر عبدالحق نے کانفرنس کی ذہنیت کو اپنے حوصلے سے ادنیٰ اور ادون سمجھ کر اس سے قطع تعلق کر لیا۔ شیخ عبداللہ کو بیگم صاحبہ بھوپال کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ خواجہ غلام الثقلین کی عمر نے وفا نہ کی۔ شعبہ کو قایم بالذات انجمن (ترقی اُردو)

عبدالحق نے اپنے زور بازو سے بنایا۔ واقعات اور اشخاص کے کردار میں بعض اوقات ناقابل فہم کرشمے بھی نظر آجاتے ہیں

مولانا سلیمان اشرف صاحب کے انتقال (آخر ۱۹۳۹ئ) کے بعد یہ ہونے لگا کہ وہ علی گڑھ آتے تھے۔ اور رہتے تھے۔ اور مجھے خبر تک نہ ہوتی تھی میں انھیں کسی جلسہ میں دیکھ لیتا تھا۔ مگر اپنے آپ کو نہ دکھاتا تھا۔ ایک بار ایک جلسہ میں میرے سامنے سے بے نیازانہ طور پر گزرے تو میں نے دامن پکڑ کر کہا۔ ع

من بتو مشغول و تو با عمرو زید

دامن آہستہ سے چھڑا کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے :- "بغیر زید و عمرو کے بھی کام نہیں چلتا۔" قیام ہندوستان کے زمانہ میں (بلکہ بقیہ عمر میں) میری ان کی ملاقات نواب صدر یار جنگ (مولوی حبیب الرحمٰن خاں) کی کوٹھی پر ہوئی جبکہ وہ دہلی کے واقعات سے پریشان حال تھے۔ ہم تینوں کافی وقت یک جا رہے۔ مگر عبدالحق مجھ سے بالکل ملتفت نہ ہوئے۔ اُن کے پہلے اُٹھ جانے کے بعد نواب صاحب نے مجھ سے پوچھا :- مقتدیٰ خاں! یہ کیا منظر تھا۔ میں نے عرض کیا ؎

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل

مولوی محمد امین زبیری نے بھی یہاں سے جا کر اُن کی کج ادائی کی انتہائی شکایت ان الفاظ میں لکھی کہ :- یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ عبدالحق ہیں اور میں محمد امین ہوں۔"

ان واقعات کے بعد ایک بار انھوں نے مجھے خط لکھا اور اس کے جواب کے ضمن میں اپنے ساتھ سلوک کی روییت اور محمد امین زبیری کی روایت لکھی تو انہوں نے ان دونوں کی ایسی تاویل کی جو برف سے بھی زیادہ بارد تھی۔ اور ساتھ ہی لکھا کہ "میں آپکا یہ خط محمد امین کو سنا رہا ہوں اور وہ میرے پاس بیٹھا ہنس رہا ہے" معلوم ہوتا ہے وہاں ان کے ساتھ سلوک ہو گیا۔ یہاں میرے ساتھ جو دائمی کی طرف سے ہوا وہ اُن خطوط سے ظاہر ہے جن میں سے بعض شایع ہو چکے ہیں۔ بعض اب بھی تشنۂ اشاعت ہیں میرے نام کے آخری خط کا اقتباس یہ ہے :- میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں کہ آپ گاہے گاہے اس دور افتادہ کو یاد فرماتے رہتے ہیں اور اپنے خیالات سے استفادہ کا موقع دیتے ہیں" (میرے بعض مضامین کا حوالہ دے کر) یہ باتیں آپ کے سوا کوئی دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ اسی لیے میں عرض کرتا ہوں کہ سرسید کی تحریک اور دیگر امور کے متعلق جو کچھ آپ نے دیکھا یا معتبر ذرایع سے سنا آپ سے بہتر اس زمانہ کے حالات کوئی دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ واقعات تو شاید کوئی دوسرا بھی لکھ لے۔ لیکن واقعات کی تہ میں جو باتیں نظر سے اوجھل ہوتی ہیں انھیں کرید کر نکالنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔ یہ صلاحیت بفضلہٖ آپ میں موجود ہے۔"

وہ بڑے مردم شناس تھے۔ مگر ایک تحریر میں انھوں نے مولوی سلیمان اشرف اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو "بے عمل" بتایا ہے۔ شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے شاعر نے کہا ہے ؎

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

مضمون شاید لمبا ہو گیا۔ مگر میں مقر ہوں کہ حق ادا نہیں کیا۔ کیوں کہ کر نہیں سکتا ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

جلیل قدوائی

بابائے اردو۔ چند یادیں

بڑے آدمی کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ اُس کی معیت میں چھوٹا آدمی اپنے کو بڑا محسوس کرنے لگتا ہے۔ مجھے اس تعریف سے ہمیشہ اختلاف رہا اس لئے کہ اس میں بڑے آدمی کی بڑائی کا پہلو شاید نکلتا ہو مگر اس سے چھوٹے آدمی کی چھٹائی یقیناً ثابت ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں بڑے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ اُس کے مرنے کے بعد ہر چھوٹا بڑا شخص اُسے براہ راست یا بالواسطہ جاننے والا نیز اُس کا مخالف اور دشمن بھی اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ محسوس کرنے لگے کہ اُس کی موت اُس کا اپنا ذاتی سانحہ ہے۔

اور یہ میں نے بابائے اُردو کے جنازے کے جلوس کے موقع پر دیکھا کہ شہر کراچی کے در و دیوار سوگوار تھے اور سہ منزلہ چہار منزلہ عمارتوں کی بالکنیوں میں اور سب سے اوپر کی چھتوں پر عورتیں، پڑھی لکھی یا باہر نکلنے والی نہیں، پرانی اور پردے میں بیٹھنے والی دنیا و مافیہا سے بے خبر، بھولے بھالے بچے اور وہ مرد بھی جو شاید صرف اتنا جانتے تھے کہ یہ صدر ایوب کی ایک محبوب شخصیت کی میت کا جلوس ہے۔ کثیر تعداد میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ان میں سے کسی سے بابائے اُردو کے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ قرار واقعی کچھ نہ بتا سکتے مگر پھر بھی وہ آنسو بہا رہے تھے اور مرحوم کے مخالفین تو اپنی گردنیں جھکائے، منہ لٹکائے، بال بکھرائے وحشت و عبرت کی تصویر بنے میت کے ساتھ ساتھ تھے ہی!!

میرے لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ بابائے اردو کس لحاظ سے ایک بڑے انسان تھے اور اس سے بھی زیادہ مشکل یہ کہ وہ کتنے بڑے ادیب، محقق، زباں داں، نقاد وغیرہ تھے۔ مجھ میں اُن کے اوصاف کا جائزہ لینے کی صلاحیت نہیں۔ میں نے ان کی تحریروں سے صرف اتنا فائدہ اٹھایا ہے کہ اپنے ذوق ادب کو کچھ جلا دے لی ہے۔ وہ جلا جو خود ان کی شخصیت میں تھی اس کی پرکھ میری آنکھوں کو نہ آئی کیونکہ میں اس حد تک بدتوفیق ہوں کہ موصوف سے کم و بیش چالیس سال کے ربط ضبط کے باوجود اُن کی صحبتوں میں ہمہ وقت شریک نہ رہ سکا۔ اُن سے تیر و شکر نہ ہو سکا۔ درحقیقت اس تمام طولانی عرصہ میں زیادہ تر بقول اکبر

ع "میرا حصہ دور کا جلوا"

ہم دونوں علی گڑھ، دہلی، اور کراچی ان تین شہروں ہی میں ایک وقت میں رہ سکے اور ایک دوسرے سے ملتے بھی رہے مگر وقفوں کے ساتھ اور بہ شرط ضرورت یا بہ قدر مناسب۔ ظاہر ہے کہ زیادہ تر بلکہ بہت زیادہ میں ہی ان کی خدمت میں حاضری دیتا تھا لیکن مجھے یہ شرف بھی حاصل ہے کہ میری دعوت پر اور بعض خاص حالات میں موصوف میرے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرماتے تھے۔ دہلی میں تو وہ ایک بار صبح کی ہوا خوری کے بعد از خود بھی تشریف لے آئے اور دہلی کی تباہی کے بعد شیر شاہ مس میں کئی بار شام کو ہمارے کمروں میں آکر بیٹھے اور بیوی بچوں کے ساتھ خوش گپیاں بھی کیں۔ کراچی میں بھی بعض تقریبات میں غریب خانہ پر آئے مگر فی الجملہ یہ تمام ملاقاتیں ایک خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہوتیں۔ دربار داری کی قسم کی کوئی صلاحیت مجھے فطرت نے ودیعت نہیں کی اور دربارداری کی اپنی سالہا سال کی ریاستی زندگی کے باوجود وہ اپنے لیے غرض نیاز مندوں سے توقع بھی نہیں رکھتے تھے۔ نہ میں ان کی زندگی میں انجمن ترقی اردو سے یا ان کے ساتھ مسلسل کسی حیثیت سے بھی وابستہ رہا۔ نتیجہ یہ ہے کہ میں ان کی روزمرہ کی زندگی کے واقعات یا اُن کی ڈائری کے قبیل کی کوئی چیز لکھ کر ان کی شخصیت اور سیرت کا جائزہ نہیں لے سکتا۔ ہاں ان سے اپنی متفرق اور مختصر ملاقاتوں یا کبھی کبھی کی نسبتاً طویل نشستوں اور ان کے کسی حکم کی تعمیل یا عدم تعمیل کی یاد تازہ کر سکتا ہوں اور اس سے زیادہ اس تحریر کی کوئی حیثیت نہیں۔

ٹھیک ٹھیک یاد نہیں آتا کہ بابائے اردو سے میری پہلی ملاقات کب اور کس طرح ہوئی تھی۔ یہ بخوبی یاد ہے کہ ان کا جو مضمون میں نے پہلے پہل پڑھا وہ "انسانیت اور درندگی" تھا جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے "آہا! خالہ بی آج کیا جاتی دنیا دیکھی" اور جس میں انھوں نے بلی اور لومڑی کے درمیان مکالمہ کی شکل میں انسان کی شیطنت، حیوانیت اور اپنے منہ میاں مٹھو یعنی اشرف المخلوقات بننے پر کتنی چابکدستی کے ساتھ طنز کی ہے۔ میں اس وقت اناؤ ہائی اسکول کی کسی چھوٹی جماعت کا طالب تھا غالباً چھٹی یا ساتویں کا۔ بارہ تیرہ برس کی عمر تھی۔ سال غالباً ۱۹۱۷ء، ۱۹۱۸ء تھا۔ کیا صاف، شستہ رفتہ، بامحاورہ اور سلجھی ہوئی زبان تھی، روزمرہ کا چٹخارہ مستزاد تھا۔ میں سادہ دل اسی دن سے ان پر غائبانہ فریفتہ ہو گیا۔ میرا خیال ہے جو زبان انھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی بنیادی طور پر آخر وقت تک وہ اسی پر قائم رہے اگرچہ سادگی، شیرینی اور دل کشی میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ مضمون تحقیقی ہو یا تنقیدی، ادبی ہو یا علمی، صرف و نحو سے متعلق ہو یا فلسفہ و معیشت سے، مراسلت ہو یا مکالمت زبان وہی ہوتی تھی جو انھوں نے "خالہ بی" والے مضمون میں اختیار کی تھی اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسا ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا تھا۔ یہ حالی کا انداز تھا۔ وہ اس کے سب سے بڑے مقلد تھے اور تقلید کرتے کرتے آخر ان سے بازی لے گئے۔

بابائے اردو کا یہ مضمون میں نے مولوی عبدالوالی مرحوم کے رسالہ "معلومات" لکھنؤ میں پڑھا تھا۔ اس کا تازہ شمارہ تھا یا کوئی پرانی اشاعت تھی یہ یاد نہیں۔ ان دنوں گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے نانا

میر سجاد علی کے باغوں کے آم کھانے اپنی نانہال ملیح آباد آتے جاتے اپنے بعض اعزا سے ملنے کی غرض سے لکھنو بھی ٹھہرتا تھا۔ مولوی اسحاق علی (ظفر الملک ایڈیٹر الناظر) کو میرے ایک نانا نے بھوپال میں پڑھایا تھا۔ وہ مجھے اپنے بچوں کی برابر سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں بھی جاتا تھا۔ رسالۂ معلوماتؔ بھی شاید انھیں کے پاس دیکھا تھا۔ شاید انھیں کے ہاں بابائے اُردو سے میری پہلی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت صرف "مولوی عبدالحق بی اے" تھے۔ لانبی ترکی ٹوپی، چاٹنا سلک کی بادامی رنگ کی شیروانی۔ علی گڑھ کٹ کا پتلون نما پتلی مہری کا پاجامہ، چہرہ پر داڑھی۔ ہاتھ میں چھڑی۔ اُف! کس قدر خوش پوشاک اور خوش وضع تھے وہ اور خوش گفتار بھی جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں اور ان کی پاٹ دار آواز اور گلے میں ایک خاص کھٹکا یا ٹھسکا اور ان کے قہقہے اور ع

چال جیسے کڑی کمان کا تیر!

کیسا رکھ رکھاؤ اور کیا نستعلیق انداز تھا۔ سبحان اللہ۔

یہ میرا اس وقت کا تاثر تھا۔ پھر عرصہ کے بعد غالباً ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ میں محترمی سید سجاد حیدر یلدرم کی کوٹھی پر تجدید ملاقات ہوئی، یا شاید خواجہ منظور حسین صاحب (حال سکریٹری انٹر یونی ورسٹی بورڈ، کراچی) کے ذریعہ ملا جو ان دنوں یونیورسٹی میں طالب علم اور طلبا کے رسالہ "علی گڑھ میگزین" کے قابل رشک ایڈیٹر تھے اور دہلوی ہونے کے سبب بابائے اُردو کو خوب جانتے تھے۔ ممکن ہے یہ دوسری ملاقات خواجہ غلام السیدین صاحب (سابق معتمد تعلیم حکومت ہند) کے توسل سے ہوئی ہو۔ وہ بھی علی گڑھ کے چوٹی کے طالب علموں میں سے تھے اور ان کے والد خواجہ غلام الثقلین مرحوم بابائے اُردو کے اچھے دوستوں میں تھے اور نانا مولانا حالی بابائے اردو کے استاد معنوی تھے۔ بہرحال اتنا یاد ہے کہ اگرچہ یہ ملاقات سات آٹھ سال بعد ہوئی تھی ان کے مندرجہ بالا اداؤں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

اُن دنوں وہ حیدرآباد دکن میں تھے اور مسلم یونیورسٹی کورٹ ایجوکیشنل کانفرنس اور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے نصابی یا دوسرے جلسوں میں شرکت کی غرض سے علی گڑھ آتے رہتے تھے۔ وہ انجمن ترقی اُردو کے تاریخی حیثیت رکھنے والے سہ ماہی ادبی رسالہ "اُردو" میں عظمت اللہ خاں، ڈاکٹر بجنوری اور اختر شیرانی کی جدید وضع کی نظمیں اور اُن کی حمایت میں مضامین نیز راس مسعود، شررؔ، مرزا فرحت اللہ بیگ، پروفیسر شیرانی، ڈاکٹر اقبال کی شاندار علمی ادبی اور تحقیقی تخلیقات شایع کر رہے تھے۔ خود اُن کے فاضلانہ مضامین اور تبصرے بھی شائع ہوتے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ رسالۂ "اردو" کے شباب کا دور تھا بلکہ اس کے شباب کا سورج اس وقت نصف النہار پر تھا۔ ٹائپ میں چھپتا تھا اور مجلد ہوتا تھا۔ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے اسے دیکھنے سے نظر لگتی تھی آنکھوں میں نور دل میں سرور پیدا ہوتا تھا اور بابائے اُردو سے میرا تعلق خاطر بڑھتا جاتا تھا۔

پھر اُنہوں نے انگریزی اُردو لغات کا ڈول ڈالا اور ہندوستان کے مختلف فضلا پر آکسفورڈ کنسائس ڈکشنری کے حروف ترجمہ کے لئے تقسیم کر دئے۔ علی گڑھ میں اگر میں غلطی نہیں کرتا تو سجاد حیدر یلدرم اور رشید صدیقی صاحب کے پاس بھی کچھ حروف تھے۔ الفاظ کے ترجموں پر نظرِ ثانی کا کام کچھ عرصہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے علی گڑھ میں رہ کر کیا۔ بابائے اُردو ڈکشنری کے کام سے علی گڑھ آتے رہتے۔ راس مسعود صاحب کے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ آجانے کے بعد علی گڑھ آنا اور بڑھ گیا۔ ان دنوں مسعود صاحب انجمن ترقی اردو کے صدر اور بابائے اُردو معتمد تھے کچھ دن بعد انجمن دہلی منتقل ہو کر آگئی اور بابائے اردو کے دوست مولوی محمد امین زبیری بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر مستقل طور پر علی گڑھ میں اقامت پذیر ہو گئے۔ چنانچہ وہ زبیری صاحب سے ملاقات کرنے بھی علی گڑھ آتے رہتے تھے۔

اس وقت تک میں نے لکھنے پڑھنے میں تھوڑا بہت نام پیدا کر لیا تھا۔ اور میرا ذوق ادب ترقی پر تھا۔ اگرچہ بابائے اردو کی علمیت کی ہیبت دل پر طاری تھی تاہم کچھ نہ کچھ براہ راست حاصل کرنے کے شوق میں اُن کے قیام علی گڑھ کے دوران میں کبھی کبھی اُن کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان سے تکلف دور ہونے لگا۔ وہ مجھ پر مہربان ہو گئے اور میری حوصلہ افزائی کرنے لگے خصوصاً روسی کہانیوں کے ترجموں کے سلسلے میں میری کئی بار تعریف کی۔ "اُردو" میں میرے پہلے مجموعہ "سیرِ گل" پر بڑا اچھا تبصرہ کیا۔ خط و کتابت کا سلسلہ چل پڑا۔ جب میں علی گڑھ کی ملازمت ترک کر کے حکومتِ ہند میں آیا اور دہلی شملہ میرا قیام رہنے لگا تو محکمۂ اطلاعات میں خصوصاً دیسی زبانوں کا انچارج ہونے کے سبب مجھ سے اُردو کے بارے میں اخبارات کے تراشے منگواتے رہے۔ عرصہ تک تعمیل حکم کی گئی یہ اُردو کے لئے بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔ بابائے اُردو گاندھی جی' راجندر پرشاد' کھیر' ٹنڈن وغیرہ سے اُردو ہندی کے مسئلہ پر ٹکر لے رہے تھے۔ چنانچہ اُردو کے ہر نمبر میں مرسلہ اخباری تراشوں کی بنا پر لکھے ہوئے بابائے اُردو کے بیانات پڑھنے کے قابل ہوتے تھے۔

دہلی ہی رسالہ "اُردو" میں مجھ سے بعض کتابوں پر تبصرے لکھوائے۔ انھیں دنوں آل انڈیا ریڈیو کے رسالہ "آواز" میں وہاں کے عملہ کی جہالت نہیں تو بے پروائی اور غفلت کی وجہ سے بعض اُردو شعرا کے ساتھ بڑی زیادتی ہو رہی تھی۔ یعنی غزلوں کے پر دیگر امور میں بعض مشہور مطلعوں تک کے پہلے مصرعے غلط درج کر دئے جاتے تھے۔ مزید ستم یہ ہوتا تھا کہ غزل ہو کسی شاعر کی اور منسوب کر دی جاتی تھی کسی اور سے۔ بابائے اردو اس پر بہت بھناتے تھے مجھے لکھنے کے لئے آمادہ کیا اور انجمن کے پندرہ روزہ رسالہ "ہماری زبان" میں کئی قسطوں میں "ریڈیائی اساتذہ کی اصلاحیں" کے عنوان سے میرا مضمون "ریڈیو کا ایک نیاز مند" کے نام سے چھاپا۔ نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ اس مضمون میں طنز اور ہجو ملیح بھی ہوتی تھی۔ پطرس بخاری اس وقت ریڈیو کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل تھے۔ بابائے اُردو سے ملے اور بہتیرا کہا کہ لکھنے والے کا نام بتا دیں تاکہ راقم اور ریڈیو دونوں ایک دوسرے سے "استفادہ" کر سکیں مگر انہوں نے نام نہ بتایا صرف

اتنا کہا "ہمارا ایک یار لکھتا ہے، نام میں کیا دھرا ہے کام دیکھو"

عام خیال ہے کہ بابائے اُردو اپنے کام کے خلاف نکتہ چینی خصوصًا اپنے سے چھوٹوں کی طرف سے برداشت نہیں کرتے تھے۔ مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ یہ بھی میرے حکومت ہند میں آنے کے بعد کا قصہ ہے۔ محترم ڈاکٹر عبدالستار صدلقی جن کا بابائے اردو لوہا مانتے تھے دہلی آئے ہوئے تھے اور میرے ہاں ان کی آمد کی تقریب میں ایک صحبت تھی۔ عابد رضا بھی موجود تھے، انجمن کی انگریزی اردو لغت کا تذکرہ چھڑ گیا۔ ہم یعنی میں بمعہ دیگر مترجمین محکمۂ اطلاعات اس لغت سے کام لیتے رہے تھے۔ میرا اس وقت خیال تھا اور آج بھی ہے کہ اس لغت کو جس التزام اور اہتمام سے ترجموں کے سلسلے میں ہم نے استعمال کیا کسی فرد، ادارہ یا جماعت نے نہیں کیا نہ کسی کو موقع تھا یوں کہ اُردو اخبارات میں اشاعت کے لئے میری نگرانی میں ہر روز پابندی کے ساتھ ہمارا شعبہ مرکزی حکومت کے تمام ہی مختلف النوع محکموں کی کارروائیوں کے پریس نوٹ، کمیونک، تقریریں، رپورٹیں، پیغامات، اخباری خلاصے اُردو میں تیار اور جاری کرتا جن میں سے اہم ترین ترجمے پندرہ روزہ مصور رسالہ "مرکزی اطلاعات" میں شایع ہوتے تھے۔ پمفلٹ، رسالے اور کتابیں بھی ترجمہ ہو کر شایع ہوتی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں تو نئے سے نئے موضوعات پر معلومات واطلاعات کے ترجموں کی انتہا نہ تھی۔ میں موضوع سے ہٹا جا رہا ہوں مگر اتنا کہے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا کہ اردو اخبارات کو بہ شمول بعض بڑے اور کثیر الاشاعت اخباروں کے معنوی اعتبار سے آج کل کے اعلیٰ معیار پر بڑی حد تک ہمارے محکمہ کی مسلسل قلمی امداد نے پہونچایا ہے۔

بہرحال جس صحبت کا ذکر ہے اس میں انجمن کی انگریزی اردو ڈکشنری زیر بحث تھی اور میں نے اس کی چند خامیاں بتائیں۔ جہاں تک بہت سے انگریزی الفاظ کے لغت میں نہ ملنے کا سوال ہے اس میں انجمن کا قصور نہ تھا اس لئے کہ وہ الفاظ بعد میں ایجاد ہوئے اور دراصل ایڈیشن میں بھی شامل نہ تھے مگر بے شمار موجودہ الفاظ کے ترجمے جن معنوں میں ہم چاہتے تھے نہیں ملتے تھے اور آج بھی نہیں ملتے اس لئے کہ پہلے ایڈیشن کے بعد سے یہ لغت نہیں چھپی اور پاکستان میں انجمن اسے اب چھپوا رہی ہے اس اثنا میں ہندوستان کے ایک پبلشر نے انجمن کی چوری چوری اسی پہلے ایڈیشن کے فوٹو لے کر جو لغت چھاپی ہے ظاہر ہے کہ وہ خامیاں اس میں بھی علیٰ حالہٖ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی لفظ بینڈ (BAND) کا ترجمہ آپ کو ریڈیائی لہروں کی لمبائی کے معنوں میں نہیں ملے گا۔ آپ فلاں اسٹیشن لتنے میٹر بینڈ پر سن سکتے ہیں، یہ مفہوم آپ کیسے ادا کریں گے۔ یا امبریلا (UMBRELLA) کے معنی ہوائی دستہ جو سمندری جہازوں یا زمینی سامان کی حفاظت کرتا ہے کہیں نظر نہ آئے گا۔ اسی طرح کور اور کوریج (COVER, COVERAGE) خبروں کی اشاعت کے سلسلے میں اور مارکٹ (MARKET) بازار میں مال کی نکاسی، درجہ بندی وغیرہ کے معنوں میں نہ ملیں گے۔ فوئیل (FUEL) کے معنی صاف صاف پٹرول کے نہیں دئے گئے ہیں حالانکہ آج کل اس لفظ کے یہ معنی عام

ہیں یا لیپس (LAPSE) کا ترجمہ سرکاری امداد یا بیمہ پالیسی کے ختم یا سوخت ہو جانے کے معنوں میں نہیں ملتا، وغیرہ وغیرہ۔ ناظرین اسے تعلّی نہ سمجھیں۔ میرا بیان سن کر بابائے اُردو سناٹے میں آگئے اور مجھ سے اصرار کیا جسے بعد میں چند بار دہرایا بھی کہ میں انجمن کی لغت پر نہ صرف ایک تفصیلی ریویو لکھ دوں بلکہ ایسے الفاظ کی فہرست مع ترجمہ بھی مرتب کر دوں۔ افسوس یہ کوتاہی بلکہ محرومی سراسر میری ہے کہ اپنی مصروفیات کے سبب ان کی آرزو پوری نہ کر سکا اور اس جرم کا بار اپنے قلب پر ہر وقت محسوس کرتا ہوں۔

اُردو کے خلاف بابائے اُردو کوئی بات نہیں سن سکتے تھے۔ ایسے موقع پر وہ کھرے اور بے باک ہی نہیں اکھڑ اور بد اخلاق ہو جانے کی بھی پروا نہ کرتے تھے اور بڑے سے بڑے آدمی کی رعایت نہ کرتے تھے نہ موقع کو دیکھتے تھے۔ ایک بار کراچی میں زاہد حسین صاحب مرحوم (گورنر دولت پاکستان بنک) کی صدارت میں وائی ایم سی اے میں قومی زبان کے مسئلہ پر ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اتفاق سے ڈائس پر میں بابائے اُردو کے پاس بیٹھا۔ زاہد صاحب نے اپنے خطبہ میں عربی کو قومی زبان بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ بابائے اُردو آلۂ سماعت لگائے ہوئے تھے مگر تقریر کے اس حصہ پر متوجہ نہ تھے۔ میں نے اپنا منہ اُن کے قریب لے جا کر کہا "سنا آپ نے کیا فرماتے ہیں؟" بولے "نہیں"۔ میں نے صورت حال سے آگاہ کیا تو فوراً تیوریاں چڑھ گئیں اور اپنا داہنا ہاتھ زاہد صاحب کی طرف بڑھا کر زور سے چلائے "جاہل کہیں کا۔ نہ اردو جانے نہ عربی۔ کہتا ہے قومی زبان عربی ہو۔" شاید اس کے بعد تقریر میں بھی اِس تجویز کی دھجیاں بکھیری تھیں۔

زاہد صاحب سے وہ یوں بھی خار کھاتے تھے تقسیم کے بعد نئی دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے۔ انجمن کی دہلی میں تباہی کے بعد بابائے اردو نے ان سے جو توقعات وابستہ کی تھیں پوری نہ ہوئیں۔ اُن پر وہ بڑی بےکسی کا وقت تھا کم و بیش ویسا ہی جیسا بعد میں کراچی میں اپنے بھائی بندوں کے ہاتھوں پڑا تھا۔ ہاں پہلے کی تہ میں اپنوں کی بدنیتی اور کوئی سوچی سمجھی سکیم نہ تھی۔ وہ زاہد صاحب کے اصرار پر اور بعض دوستوں کے کہنے سے "گل رعنا" (دہلی میں مرحوم لیاقت علی خاں کی کوٹھی جو پاکستانی ہائی کمشنر کی اقامت گاہ تھی اور مسلم مہاجرین کی کم و بیش جائے پناہ ہو گئی تھی) میں ٹھہر گئے تھے۔ میں نے انھیں اس زمانے میں دیکھا ہے۔ سب سے اوپر کے ایک کمرے میں تن تنہا پڑے رہتے تھے۔ انھیں چپ لگ گئی تھی۔ رات کے وقت اس خاموشی میں دھیمی روشنی کے ایک بلب سے اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ بہ حیثیت مجموعی ہر طرف مایوسی کی فضا ہوتی۔ زاہد صاحب کا مذاق جدا تھا۔ فرائض کی کثرت سے بھی فرصت نہ ملتی کہ بابائے اُردو سے بات کریں۔ ڈرتے بھی تھے۔ کھانے پر دونوں کا ساتھ ہو جاتا تو بابائے اردو میز کے ایک کونے پر چپکے بیٹھ جاتے۔ بات چیت اس وقت بھی نہ ہوتی جو لوگ ڈاکٹر انصاری کی شاندار کوٹھی واقع دریا گنج میں جو انجمن کا سابق دفتر اور بابائے اردو کی قیام گاہ تھی موصوف کی بے پناہ دنیا فنون کے ٹھاٹھ اور وہاں کی گہما گہمی دیکھ چکے ہیں انھیں

اس ماحول کی بے لطفی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ کچھ دن بعد گھبرا کر رفیق الدین احمد کے ساتھ شیر شاہ مس میں چلے آئے جو پاکستانی ہائی کمیشن کے اسٹاف کی قیام گاہ تھی۔ میں بھی ترا با بیرام خاں پر تباہ ہو کر اور تھوڑے عرصہ پرانے قلعہ کی ہوا کھا کر یہیں میں پہونچ گیا تھا اور جیسا کہ ابتدائے مضمون میں ذکر کیا گیا ہے وہ ان دنوں شام کو میرے ہاں آجاتے تھے۔ اور دیر دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔ بعد میں مستقل طور پر کراچی چلے آئے۔

جیسا کہ معلوم ہے بابائے اُردو دہلی میں رہ کر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے لئے کام کرنا چاہتے تھے مگر یہ ان کی سادہ دلی تھی اور بدلے ہوئے حالات میں ایسا سوچنا بھی نہ چاہئے تھا۔ کراچی آکر انھوں نے اپنے ٹوٹے ہوئے حوصلے کو جمع کر کے اور پرانی انجمن کے منتشر اجزا کو سمیٹ کر از سر نو اپنا کام شروع کیا۔ کن بے حوصلہ حالات اور مالی وسائل کی عدم موجودگی میں انجمن قائم کی۔ اس کے لئے عمارت حاصل کی۔ اردو کالج کی بنا ڈالی رسائل و مطبوعات جاری کئے۔ الحاق کے مسئلہ پر سندھ یونیورسٹی سے ٹکر لی۔ فیڈرل یونیورسٹی کی تجویز میں حصہ لیا۔ اردو یونیورسٹی کی مہم چلائی مگر اپنی بہترین کوششوں کے باوجود جیسا چاہتے تھے ویسا کام نہ چلا اور حالات دن بدن غیر مساعد اور ان کے مخالف ہوتے گئے جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہم سب ان سے واقف ہیں۔ یہ ان کی زندگی کا بڑا المیہ تھا۔ بڑے کاموں کے لئے قوم کے پاس جانا بابائے اُردو نے سرسید سے سیکھا تھا اور جب تک وہ حیدرآباد دکن میں رہے ان کا ہوٹی لوٹا رہا۔ اُردو کے لئے بڑے بڑوں سے کھرے کھرے کام اور دیکھتے دیکھتے جیب خالی کرالیتے مگر افسوس اپنے وطن میں وہ اپنا پرسان حال تلاش کرتے تھے اور انہیں نہیں ملتا تھا۔

اس سلسلے میں مجھے ان کا ایک واقعہ کسی طرح نہیں بھولتا۔ ایک بار ہفتوں کی کوششوں کے بعد مرکزی حکومت کے ایک اعلیٰ افسر سے جنہیں خدا نے علم و ادب کی دولت سے بھی نوازا ہے اور جو انجمن کی بعض کمیٹیوں کے رکن بھی تھے بابائے اُردو نے ملاقات کا وقت مقرر کرایا۔ ملنے پہونچے تو صاحب موصوف میٹنگ میں مصروف تھے اور دیر تک مصروف رہے۔ چپراسی نے اُن کی آمد کی اطلاع کرنے سے انکار کر دیا۔ میں پاس ہی کے ایک کمرے میں بیٹھتا تھا اور چک کے پیچھے سے بابائے اردو کو برآمدے میں اپنی چھڑی لئے کبھی ایک جگہ کھڑے کبھی ادھر اُدھر ٹہلتے دیکھ رہا تھا۔ باہر نکل آیا اور اپنے ہمراہ اپنے کمرہ میں لے کر انھیں آرام کرسی پیش کی۔ اُن کی حالت دیدنی تھی۔ منہ لٹکا ہوا چہرہ ستا ہوا غم و غصہ اور مایوسی کی ملی جلی کیفیت۔ ایک تو انتظار کا تکان دوسرے یہ احساس کہ میں نے بھی ان کی یہ درگت بنتے دیکھ لی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا میری زبان سے کچھ نکلا اور آبگینوں کو ٹھیس لگی۔ چنانچہ میں نے کوئی دوسرا موضوع چھیڑ دیا اور ذرا دیر بعد تھوڑی سی کوشش سے انھیں افسر متعلقہ تک پہونچایا۔

آخر آخر انھیں اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ کراچی کے غدار شہر اور اپنے وطن کے آباد ویرانے میں وہ ایک مجنوں کی طرح در و دیوار سے اپنا سر پھوڑ رہے ہیں۔ انجمن کی تحقیقاتی کمیٹی کے تقرر سے کچھ دن پہلے کا ذکر ہے کتب خانہ

خاص کے برآمدہ میں چند بزرگوں کے ساتھ کھڑے صورتِ حالات پر بڑی مایوسی کے ساتھ تبصرہ کر رہے تھے۔ میں بھی حاضر تھا۔ بعض عمال حکومت کی شکایت کرنے لگے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے عرض کیا" بابا! آپ کو اپنی سطح کے آدمی سے بات کرنی چاہیئے۔ آپ براہ راست صدر پاکستان کے پاس کیوں نہیں پہونچتے"۔ مجھے یہ کہتے سنا تو عجیب بے بسی بلکہ بے کسی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ فضا میں پورے پورے پھیلادئے اور دوبار جیسے مجھ سے زیادہ آپ سے فرمایا " ہم کیا ہیں کچھ نہیں۔ ہم کیا ہیں، کچھ نہیں "۔

اس میں شک نہیں کہ اس واقعہ کے چند ہی دن بعد اُن کی فرمائش پر صدر ایوب کی توجہ انجمن کی طرف منعطف ہوئی اور وہ کچھ ہوا جس کی ان سے توقع تھی اور جو ہم سب کے سامنے ہے۔ آج بابائے اُردو ہم میں موجود نہیں ہیں اور مجھے نہیں معلوم اگر ہوتے تو انجمن کی نشاۃ الثانیہ کے بارے میں ان کا کیا تاثر ہوتا۔ فی الحال تو ان کی روح انجمن کے چپہ چپہ پر پکارتی معلوم ہوتی ہے ؎

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد!

شوق و سعی

حصول علم کے شوق میں ایک اور بات بھی مضمر ہے جو سب سے زیادہ قابل قدر ہے۔ انسان کو انسان بنانے والی یعنی اسکا کیریکٹر سنوارنے والی جو شے ہے وہ شوق و سعی اور ریاضت و محنت ہے۔ خصوصاً جب کہ مدعا حصول اغراض نفسانی نہ ہو۔ ان لوگوں کے کیریکٹر میں ایک خاص بات پیدا ہو جاتی ہے اور یہ صرف انہی لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کے دلوں میں کسی اعلا مقصد کے حاصل کرنے کی لو لگی ہوتی ہے اور جو اس دھن میں دن کو دن سمجھتے ہیں اور نہ رات کو رات، مصیبت کو مصیبت خیال کرتے ہیں نہ راحت کو راحت، مگر راہ طلب میں برابر قدم بڑھائے چلے جاتے ہیں اور آخر میں گوہر مقصد ہاتھ آئے یا نہ آئے مگر ایک ایسی چیز ہاتھ لگ جاتی ہے جو اس سے زیادہ نایاب اور اس سے کہیں بیش بہا ہے یعنی انسانیت یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ صفائی باطن۔ (مقدمات حصہ اول ص ۲۵۴-۲۵۵)

رئیس احمد جعفری

باتیں اُس کی یاد رہیں گی

کسی شاعر کا قول ہے۔

گر پیر نود سالہ بمیرد عجبے نیست۔

مولوی صاحب کی عمر تو ۹۰ سے بھی متجاوز تھی۔ لہذا ان کی موت غیر طبعی نہ تھی۔ پھر بھی ان کی موت اردو زبان کے لئے، ملک کے لئے۔ قوم کے لئے، ایک سانحہ ہے، ایک جگر فگار حادثہ ہے، اب ایسے لوگ کاہے کو پیدا ہوں گے۔

میں نے سب سے پہلے مولوی صاحب کو بمبئی میں دیکھا یہ غالباً ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے۔

نواب سر مسعود جنگ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے دفعتاً اندرونی سازشوں اور دراندازیوں سے تنگ آکر استعفیٰ دیدیا۔ اس واقعہ نے سارے ملک کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ میں روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر تھا، کئی پُر زور مقالات افتتاحیہ میں نے مسعود جنگ کی تائید اور ان کے مخالفین کی مخالفت میں لکھے۔ موصوف کو یہ مضامین پسند آئے انہوں نے اس زمانے میں کئی خطوط لکھ کر سپاس و ممنونیت کا اظہار کیا، کوشش کی گئی کہ استعفا واپس لے لیں، لیکن وہ اپنے فیصلے پر اٹل تھے، ایک روز ان کا نامہ کرم میرے نام آیا۔

میں بمبئی آرہا ہوں۔ ایک روز مسٹر اسٹون برج کے ہاں قیام کرکے دوسرے روز پی، اینڈ او کمپنی کے جہاز سے لندن روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ اگر وہاں تشریف لے آئیں تو بہت ممنون ہوں گا! ملنے کو جی چاہتا ہے۔!

یہ خط پاکر میں بہت خوش ہوا۔ سر مسعود جنگ، جسٹس محمود کے بیٹے، سر سید کے پوتے سے ملنے کی تمنا کسے نہ ہوگی جامعہ ملیہ کے زمانے طالب علمی میں ایک مرتبہ زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اب ملاقات ہوگی۔ باتیں ہوں گی ہندوستان کی ایک بہت بڑی شخصیت سے شرف نیاز حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوگا۔

آخر وہ دن آیا اور میں سہ پہر کو مسٹر اسٹون برج (یہ ایک انگریز انجینئر تھے) کے دولت کدے پر جو بیلرڈ پیر

کے قریب تھا پہنچا۔ نواب مسعود جنگ برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ تپاک اور گرم جوشی سے ملے۔ میں نے سوال کیا۔ لندن آپ کیوں جا رہے ہیں۔ آپ کی زیادہ ضرورت تو ہندوستان کو ہے!

فرمایا "میرا دل بجھ گیا ہے۔ اب میں وہیں جاؤں گا، کئی انگریز دوستوں کا اصرار ہے کہ ہم اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ لیکن کوئی کتاب نہیں ملتی تو ہماری طرح انگریزی لکھتا ہے۔ تیری کتاب سے ہم پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔"

سر مسعود جنگ پر ایک سیمابی کیفیت طاری تھی۔ یہ ساری باتیں ٹہل ٹہل کر ہو رہی تھیں۔

میں نے پوچھا "مسلم یونیورسٹی کا کیا حشر ہو گا؟"

فرمایا اگر یونیورسٹی والوں میں ذرا بھی عقل ہے تو وہ اسماعیل خاں (نواب اسماعیل خاں) کو پکڑیں گے۔ وہی ایک ایسا ایماندار اور سچا آدمی ہے۔ جو قوم کی اس امانت کی حفاظت کرے۔

بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک صاحب، میانہ قد، سفید شیروانی، ترکی ٹوپی، بارلش سفید تشریف لاتے نظر آئے۔ سر مسعود جنگ دیکھتے ہی ان کی طرف لپکے اور گویا ہوئے۔

"عبدالحق تم آ گئے؟"

اور ابھی عبدالحق نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ سر مسعود جنگ نے معانقہ شروع کر دیا۔ وہ بھی پوری گرمجوشی سے عبدالحق دُبلے پتلے سر مسعود جنگ بھاری بھرکم، عبدالحق میانہ قد اور سر مسعود جنگ ضرورت سے کچھ زیادہ کشیدہ قامت پوزیشن تقریباً یہ تھی کہ عبدالحق کا سر نواب مسعود جنگ کے سینہ پر ٹکا ہوا تھا فعتاً وہ جھکے اور انہوں نے عبدالحق کے دونوں گالوں پر باری باری سے بآواز بلند بوسہ دیا۔ عبدالحق نے نہایت سعادت مندی سے ایک کے بعد دوسرا گال پیش کر دیا۔ میں اس منظر کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ حیرت اس بات پر زیادہ تھی کہ دونوں کی عمر میں تفاوت تھا۔ لیکن بڑے ہونے کے باوجود عبدالحق کچھ مودب سے اور چھوٹے ہونے کے باوجود مسعود جنگ بالکل بے تکلف۔ پھر دونوں میں حیدرآباد کی سیاست پر گفتگو شروع ہو گئی۔ اس گفتگو کے دوران میں مسعود جنگ نے عبدالحق سے میرا تعارف کرایا۔ بات ختم ہو گئی، ملاقات ختم ہو گئی۔

دوسرے روز مولوی صاحب دبے پاؤں میرے دفتر میں تشریف لائے۔ دبے پاؤں اس لئے کہ وہ مولانا شوکت علی سے گھبراتے اور ان سے ملتے ہوئے کتراتے تھے۔ نہ جانے ڈنکے کی چوٹ وہ کیا کہہ بیٹھیں اور انہیں خاموش رہتے بھی نہ بن پڑے۔ میرے لئے اُس سے بڑھ کر فخر کی کیا بات ہو سکتی تھی کہ وہ مجھ سے ملنے میرے دفتر تشریف لائے تھے۔ میں نے دیدہ دل فرش راہ کر دیے۔ چند رسمی باتوں کے بعد فرمایا میں جائزہ زبان اردو کا کام کر رہا ہوں۔ بمبئی میں بڑی دشواری پیش آ رہی ہے۔ کیا آپ میری مدد کریں گے، بمبئی کا ایک بااثر بزرگ اور اردو زبان کے شیدائی مسٹر عبدالرحیم

ڈشمکر کے خلوص کی بہت تعریف کی۔ اور فرمایا آپ کو انہی کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔ کیوں کہ نیک نیت اور مخلص ہونے کے باوجود وہ عدیم الفرصت رہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا میں ہر طرح حاضر ہوں۔

اب مولوی صاحب سے وقفہ وقفہ سے خط وکتابت کا اور جب کبھی وہ بمبئی تشریف لاتے۔ ملاقات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ قاضی عبدالغفار مرحوم جو کسی زمانے میں ہمدرد کے اسسٹنٹ ایڈیٹر، اور مولانا محمد علی شوکت علی کے نیاز مند خصوص سے تھے۔ حیدرآباد سے اپنا روزنامہ پیام نکال رہے تھے۔ جب سے یہ اخبار نکلا تھا۔ بعض مایوسیوں کے باعث وہ مولانا شوکت علی کے خلاف مسلسل لکھتے رہتے تھے۔ کبھی مزاحیہ کالم میں۔ کبھی ادارتی نوٹ میں۔ ان تحریروں میں نہ صرف وہ حفظ مراتب کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اپنی مسلمہ ادبی سطح سے بھی نیچے اتر آتے تھے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اختلاف اصولی نہیں۔ ذاتی تھا۔ میں بھی خلافت میں خوب خوب لکھتا تھا اور ترکی بہ ترکی جواب دیتا تھا۔ قاضی صاحب کی ایک کتاب کا نام ہے "اس نے کہا" میں نے ایک طنزیاتی مقالہ لکھا۔ اور اس کا یہی عنوان رکھا اور دکن سے لے کر حیدرآباد تک کی کتاب زندگی کے بہت سے دلچسپ اور سبق آموز ورق الٹ دیئے۔ اس زمانے میں مشہور دواساز کمپنی "سیلانی" کے منیجنگ ڈائریکٹر اور مشہور دوا "اکاسا" کے سول ایجنٹ مسٹر عبدالحمید خواجہ نئے نئے کانگریسی بن کر میدان میں آئے تھے۔ وہ بھی شوکت صاحب کے خلاف زہر چکانیاں کیا کرتے تھے۔ کافی عرصہ تک طرح دینے کے بعد ان کے مکاشفات سیاسی کے جواب میں ایک مضمون میں نے لکھا۔ جس کا عنوان تھا "اکاسا کا زور"! اتفاق کی بات چند روز کے بعد مولوی صاحب بمبئی آئے۔ اور ملاقات کے موقع پر ایک زوردار قہقہہ لگا کر فرمایا۔ "تم نے قاضی اور خواجہ کے متعلق جو کچھ لکھا وہ نہایت دلچسپ ہے۔ لیکن میں نے کہا "اکاسا کا زور" کا جواب نہیں۔

جب مولوی صاحب حیدرآباد سے منتقل ہو کر تشریف لائے اور انجمن کو بھی اپنے ساتھ لائے تو مجھ پر اتنے مہربان ہوچکے تھے کہ میری دو کتابیں "رند پارسا" اور "حکایات آغا" شائع فرمائیں۔

تقسیم ہند کے بعد میں بھی کراچی آگیا۔ اور مولوی صاحب بھی۔ لیکن وہ اپنی الجھنوں میں مبتلا تھے۔ میں اپنی مصیبتوں میں گرفتار، عرصہ تک ملاقات نہ ہو سکی۔

اسی اثناء میں مسٹر شعیب قریشی ماسکو میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے۔ مولوی صاحب سے اور شعیب صاحب سے بڑے دیرینہ اور گہرے روابط تھے۔ چنانچہ ان کی الوداعی دعوت کا اہتمام مولوی صاحب نے کیا۔ سید آتی الدین مرحوم اس زمانے میں مولوی صاحب کی ناک کے بال تھے۔ اور یہ ناک کے بال اکثر بدلتے رہتے تھے۔ غرض سید صاحب اپنے ساتھ مجھے بھی زبردستی لے گئے۔ مولوی صاحب اس طرح ملے جیسے ایک بزرگ خورد سے ملتا ہے۔ دعوت کے اختتام پر مولوی صاحب نے اپنے ایک دیرینہ خدمت گزار کی طرف اشارہ کرکے شعیب صاحب سے فرمایا:۔

"کچھ اس کی بھی خواہش ہے"!

پھر اپنے ملازم کی طرف دیکھا۔ اس نے جھٹ سے ایک ہار شعیب صاحب کے گلے میں پہنا دیا۔ مولوی صاحب رسمیات کے پابند نہ تھے۔ لیکن جذبات سے بھی ماورا نہ تھے۔

اس دعوت کے بعد کئی بار مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی وہ میرے حالات کے جویا تھے۔ اور میں زبان خاموشی میں گفتگو کا عادی تھا۔ آخر قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم سے مشورہ کے بعد انہوں نے انجمن کی سول ایجنسی مجھے دے دی۔ سول ایجنسی کے متمنی اور بھی کئی لوگ تھے۔ ان کے پاس روپیہ بھی تھا۔ اور وہ قیمت دے کر مال لینے اور مطلوبہ رقم ڈیپازٹ کرنے کو بھی تیار تھے۔ میری شرط یہ تھی کہ ڈیپازٹ کچھ نہیں کرسکتا۔ مال ادھار لوں گا۔ اور قیمت ایک مہینے کے اندر ادا کروں گا۔ مولوی صاحب نے زرداروں کو ٹھکرا دیا۔ اور ایک بے بضاعت شخص کو قبول فرمالیا۔ اور اصول کا اتنا لحاظ رکھا کہ جو کتابیں براہ راست فروخت ہوتی تھیں، ان کا کمیشن بھی میرے حساب میں درج ہو جاتا تھا۔

پھر میں روزنامہ زمیندار کا چیف ایڈیٹر ہو کر لاہور چلا گیا۔ یہاں متعدد مواقع پر میں نے انجمن اور مولوی صاحب سے متعلق کئی مضامین لکھے۔ ایک خط میں مولوی صاحب نے مجھے لکھا:۔

"سنا ہے سعید سہگل بھی قومی اور ملی کاموں میں روپیہ دے ڈالتا ہے۔

آپ مجھے لاہور بلا رہے ہیں۔ میں آنے کو تیار ہوں۔ لیکن انجمن کے لئے اس کی مالی حالت بہت سقیم ہے۔!

میں نے ایک اردو کانفرنس منعقد کرنے کا ارادہ کیا۔ مجلس استقبالیہ کے کئی ممبر بھی منتخب کرلئے۔ لیکن بعض وجوہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، یہ ارادہ کامیاب نہ ہوسکا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ مولوی صاحب مسلسل ابتلاء کے دور سے گزرتے رہے۔ حد یہ ہے کہ ان کا ذاتی کتب خانہ تک مقفل کردیا گیا۔ مجھ پر اس زمانے میں قلبی حملہ بہت شدید ہوا تھا۔ میں نے انہیں لکھا، گو ڈاکٹر اب تک مجھے بستر سے نہیں اٹھنے دیتے لیکن میں کراچی آنے اور کتب خانے کے لئے ستیہ گرہ کرنے کو تیار ہوں۔!

فوراً مولوی صاحب کا جواب آیا۔

"آج میں نے جانا کہ دنیا میں میرا بھی کوئی ہے۔ میں آپ کو خودکشی کی اجازت نہیں دے سکتا، آپ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کیجئے، یہ میرا حکم ہے"!

پھر کچھ عرصہ بعد جب میری صحت کسی حد تک بحال ہوئی تو میں کراچی آیا۔ مولوی صاحب سے ملنے کی تمنا بیتاب کئے ہوئے تھی، لیکن وہ بالائے بام رہتے تھے۔ اور مجھے ڈاکٹروں نے دس سے زیادہ سیڑھیاں چڑھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ میں اس مشکل کا میں نے مولوی صاحب کے ایک عزیز اور معتمد رفیق کار سے ذکر کیا، انہوں نے اپنے دولت کدہ پر ناظم آباد میں رات کے کھانے پر مجھے اور مولوی صاحب کو مدعو کرلیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ رات کو مولوی صاحب آسکیں گے۔ لیکن وہ مجھ سے پہلے پہنچ گئے۔ کھانے کے دوران میں اور کھانے کے بعد تقریباً گیارہ بجے رات تک جی کھول کر مختلف

معاملات و مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مولوی صاحب کی موٹر بک چکی تھی۔ ایک رکشا میں اپنے پٹھان ملازم کے ساتھ وہ واپس تشریف لے گئے!

اس کے بعد پھر کئی مرتبہ کراچی جانا ہوا۔ لیکن کچھ ایسی الجھنوں میں مبتلا رہا کہ مولوی صاحب کی خدمت میں نہ حاضر ہو سکا۔ اور اب ریڈیو کی زبان نے یہ خبر سنائی کہ وہ اس خاکدانِ عالم سے عالم بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ رہے نام اللہ کا!

مولوی صاحب مر گئے، لیکن اپنے ملنے والوں اور جاننے والوں کے حلقے میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس وقت وہ گویا میری نظر کے سامنے ہیں، تنا ہوا سینہ چاہے کھڑے ہوں یا بیٹھے ہوں۔ تحریر اس بڑھاپے میں بھی صاف اور دل کش حروف ایسے مضبوط جیسے لوہے کے قلم سے گڑ کر لکھے گئے ہوں وہ مر گئے لیکن کیا اُن کا یہ بانکپن بھی مر سکتا ہے۔ ہائے کس سے پوچھوں۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

کاہلی

انسان فطرتاً کاہل معلوم ہوتا ہے۔ محنت کرنا نہیں چاہتا۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ سب انسان نیک ہیں۔ سوائے کاہل کے۔ کاہلی جرم ہے، گناہ ہے، عطیہ الٰہی سے انحراف اور کفران نعمت ہے۔ یاد رکھیئے کہ جو اقوام یا افراد کام کرنے سے ہچکچاتے اور محنت سے جی چراتے ہیں۔ انہیں کبھی آزادی نصیب نہ ہوگی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ غلام رہیں گے، اگرچہ ان کے ہاتھوں میں آزادی کے منشور کیوں نہ ہوں، کام سے انسانیت آتی ہے۔ سیرت اور اخلاق بنتے ہیں۔ ظاہر و باطن کی اصلاح ہوتی ہے۔ ہم جان دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اس میں پتا مارنا پڑتا ہے، عزیز اشغال اور محبوب عادتوں کو ترک کرنا پڑتا ہے۔

(خطبات ص ۴۳۶ ۴۳۷)

ڈاکٹر داؤد رہبر

مولوی عبدالحق اور انکے چند خطوط

ڈاکٹر داؤد رہبر، پروفیسر محمد اقبال مرحوم کے صاحبزادے ہیں اور ایک عرصے سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ پروفیسر اقبال، اور بابائے اُردو مرحوم میں نہایت ہی گہرے مراسم تھے اور اسی وجہ سے بابائے اُردو ڈاکٹر رہبر کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے نام مولوی صاحب نے بہت سے خطوط لکھے، ان خطوط کا بڑا حصہ "اردوئے معلّےٰ" (شائع کردہ ابوتمیم فریدآبادی) اور "مکاتیب عبدالحق" (مرتبہ جلیل قدوائی) میں شامل ہے۔ اس مضمون کے ساتھ نو ایسے خطوط شائع کئے جارہے ہیں، جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ (مدیر)

مولوی صاحب مرحوم نے آخری خط اس غریب الوطن کو اپنی رحلت سے چند ہی روز قبل لکھا اس کے بعد ایک عزیز نے لکھا کہ مولوی صاحب انتقال فرما گئے۔ غریب الوطن کے تجربات میں ایک انوکھا پن ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک لطیف صورت اس کی یہ ہے کہ جب وطن سے کسی محبوب کے جاں بحق ہونے کی خبر آتی ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس محبوب کا پتہ بدل گیا ہے۔ یعنی پہلے شارد امنزل کے پتے پر ان کو خط لکھتے تھے۔ اب کنارہ کوثر کا جھونپڑا ان کا پتہ ہے۔ جہاں ان کو خط لکھیں تو ضرور مولوی صاحب کا بانکا خط جواب میں آئے گا۔

مولوی صاحب جب اورنگ آباد میں تھے تو اجنٹا اور ایلورا اور مقبرۂ رابعہ دورانی کے جوار میں ان کی اقامت گاہ تھی۔ اور وہ رہائش اب داستان بن گئی ہے۔ جب دلّی میں آئے تو دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری کی حویلی میں بادشاہ بن کر رہے۔ اور فقیری بھی قائم رکھی۔ کراچی آئے تو شارد امنزل ڈھونڈ لیا جو ڈاکٹر انصاری کی حویلی کی طرح اکابر کانگرس کی بزم گاہ تھی اب وہ جنّت میں ہیں تو ضرور سقراط منزل کرائے پر لے کر رہیں گے اور زندہ دل مفکر اُن کو گھیرے رہیں گے اور وہ مشاہیر ازمنہ سے دبنے والے نہیں۔ سب سے کہیں گے کہ اگر اُردو نہیں بولتے تو نکل جاؤ اس گھر سے،

مولوی صاحب کے نقادانہ سوانح نگاروں نے اُن کی ذات کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ بعض نے کہا وہ غصّے والے

آدمی تھے غصّے سے مغلوب ہو جاتے تھے۔ پطرس بخاری مرحوم کا قول تھا کہ مولوی عبدالحق صاحب قوّتِ تخیّل سے عاری ہیں۔ ہم اُن کی غصّے والی بات کو زیرِ بحث نہیں لاتے۔ اگر غصّے ہوئے تو کیا مضائقہ، کیا میر تقی غصیلے نہ تھے؟ مگر ان کا غصہ سجیلا تھا۔ اُن کے غصّے پر ہزار ریاکارانہ تبسّم قربان۔ ہاں تخیل سے عاری ہونے والی بات قابلِ بحث ہے، حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب نے تخیّل کو سرعتِ انتقالِ ذہن کے سوفسطائی فن میں نہ ڈھالا تھا۔ وہ ایسی باتوں کو قابلِ بیان سمجھتے تھے جن کو اہلِ تخیل پیش پا افتادہ کہہ کر ٹھکرانا چاہتے ہیں۔ وہ ٹھوس، کھری اور سادہ سچائی کو اپنے معصوم قہقہے کے زعفران سے رنگین کرتے تھے۔ اُن میں غریب پروری اور ایفائے وعدہ کے ایسے گُن تھے کہ اُن کے پروردگان کے دلوں پر اُن کی سیدھی سادی گفتار اثر کرتی تھی۔ علم البیان اور علم خطابت کے ماہرین یہ ذکر نہیں کرتے کہ کلام کی تاثیر میں شخصیت کا کھراپن سب سے بڑا گہر ہے،

مولوی صاحب کے ایثار کا ایک واقعہ مجھے ایسا یاد ہے کہ اس کو سُن کر دل موم ہو گا۔ ۱۹۵۲ء کی گرمیوں میں راقم بعض حالات سے مجبور ہو کر عازم کنیڈا ہوا۔ وہاں سے تدریسِ تاریخِ اسلامیانِ ہند کے سلسلے میں ایک دعوت آئی تھی۔ دعوت دینے والوں نے مجھے کرایہ جہاز کا دیا لیکن کہا کہ بیوی بچّوں کو لانا ہے تو ان کا کرایہ خود فراہم کرو، چنانچہ اِدھر اُدھر سے جمع کرنا شروع کیا۔ مولوی صاحب مرحوم اُن دنوں کوئٹے میں تھے۔ میرا خط کراچی سے ہو کر اُن کو وہاں پہنچا۔ فوراً انہوں نے مدد کو پانچ سو روپے کا چیک بھیج دیا۔ چیک ملنے کے فوراً بعد میں کراچی پہنچا۔ وہاں ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب بالکل بلا توقع کوئٹے کی تفریحی اقامت فسخ کر کے کراچی آگئے ہیں اور اس کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ میرا اپنا گمان یہ ہے کہ اُن دنوں مولوی صاحب کے مالی حالات مساعد نہ تھے پانچ سو روپے مجھے بھیج کر وہ واپس کراچی چلے آئے اور اپنی تعطیل فسخ کر دی۔

اخلاقی حسن ہی برترین حسن ہے۔ مولوی صاحب مزاج کے بادشاہ بھی تھے فقیر بھی تھے۔ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے تھے لیکن راہ میں کسی سٹیشن پر سموسے کی چھابڑی نظر پڑ جاتی تو بلا تکلف نکل کر پتے پر سموسہ رکھ کر چٹنی لگا کر کھاتے جاتے۔ ایسے عالم میں آغا خاں بھی آجائیں تو مولوی صاحب نہ جھینپیں۔

دسمبر ۱۹۵۷ء اور جنوری ۱۹۵۸ء میں عالمی مؤتمرِ اسلامی لاہور میں منعقد ہوا۔ غریب الوطن بھی دسترخوان پر بلایا گیا۔ چار سال بعد خاکِ پاک لاہور پر قدم رکھا۔ انقرہ یونیورسٹی سے چھٹی لے کر گیا۔ کل پندرہ روز پاکستان میں نصیب ہوئے۔ ان میں سے آخری دو روز مولوی صاحب مرحوم کے لئے بچا کر رکھے۔ مؤتمر کی کارروائی نے طول کھینچا۔ وہاں مندوبین کے اکھاڑے ل نے روک لیا۔ گیارہ جنوری کی رات دو بجے ہوائی جہاز کراچی سے انقرہ روانہ ہوتا تھا۔ گیارہ کی شام آٹھ بجے سے پہلے لاہور سے چھٹی نہ ملی۔ کراچی کے ہوائی اڈّے پر پہنچا تو کچھ دوست وہاں موجود تھے۔ اُن سے کہا کہ مولوی صاحب سے نہ ملے تو وطن آنا بیکار۔ ہوائی اڈّے پر ساڑھے دس بج گئے۔ گیارہ بجے رات انجمن کے دفتر میں پہنچے۔ آٹھ دس دوست ساتھ تھے مولوی صاحب سب سے اوپر کی منزل پر سو رہے تھے۔ ان کے وفا شعار ملازم بدر عالم نے دیکھا تو کہا کہ مولوی صاحب کو جگاتا ہوں۔ اس وقت ادب کو طاق میں رکھ کر کہا کہ گستاخی جائز ہے، مولوی صاحب جاگے تو بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بدر عالم

سے کہا جائے بناؤ۔ کوئی گھنٹہ بھر باتیں ہوئیں۔ مؤتمر کا حال پوچھا۔ انقرہ کے احوال سُنے۔ پھر کہا خدا حافظ۔ انقرہ پہنچا تو مجھے خط لکھا کہ تمہارا رات کو جگانا خواب کا اثر رکھتا تھا مگر اچھا ہوا کہ تم بے ملے نہیں گئے۔

راقم کو انقرہ یونیورسٹی بھجوانے میں کئی منزلیں تھیں۔ ایک منزل پر مولوی صاحب کی مشفقانہ تحریک بھی شامل انتظام تھی۔ جب میں انقرہ پہنچا تو خوشی کا خط مولوی صاحب نے لکھا۔ اس سے قبل مدتوں وہ خط میں مجھے "تم" کہہ کر خطاب فرمایا کئے۔

اس خط میں پہلی بار "آپ" کا استعمال ہوا۔ اس کا مجھے رنج ہوا اور فوراً میں نے شکایت کا خط لکھا کہ "تم" کی لذت سے مجھے محروم نہ کیجئے، اس کا جلد ہی جواب آیا۔ اس میں آپ اور تم کی بحث بالکل نہ تھی لیکن "تم" الحمدللہ کہ پھر لوٹ سے نکل آیا۔

ہم نے مولوی صاحب کی جوانی اُن کے بڑھاپے میں دیکھی، خدا نے ہمیں اُن خوش نصیبوں میں نہ رکھا جس نے مولوی صاحب کی جوانی میں اُن کی بزرگی دیکھی۔ مولوی صاحب کی رحلت کے بعد بہتوں نے ان کی زندگی لکھی، ان میں سب سے اچھی تحریر منشی بنسی دھر کی دیکھی جو حیدرآباد (دکن) کے رسالہ مجلس کے عبدالحق نمبر میں چھپی، وہ تحریر بڑی محبت سے لکھی گئی ہے، مولوی صاحب جس شان کے آدمی تھے اس کے دکھانے کو ایک سوانح عمری کی جلد کافی نہیں، اُن کے مناقب اور آثار عالیہ کا ذکر آئندہ نسلوں میں جاری رہے گا۔

اس عصر کو مسلمانانِ ہند کے انحطاط کا زمانہ نہ کہو۔ کیا اقبال، ظفر علی خاں اور ابوالکلام آزاد اس صدی نے پیدا نہ کئے؟ کیا عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت نے خُلیں آباد نہ کیں؟ کیا جگر مُراد آبادی اور حفیظ جالندھری نے شعر کی آگ ٹھنڈی ہونے دی؟ کیا بیخود دہلوی اور حسرت موہانی کی درویشی تاریخِ عالم میں درج نہ ہوگی؟ کیا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور چودھری محمد ظفراللہ خاں کی خدمات پر آئندہ نسلیں فخر نہ کریں گی؟ ان سب کی روشنی مستعار نہیں۔ یہ اپنے جوہر کی چمک سے چمکے ہیں۔ اور مولوی عبدالحق اور سر عبدالقادر ایسے بزرگ اس عصر کی محفل کے صدر نشین تھے۔ وہ جنّت میں اُن منتخب مشاہیر کی محفل میں جا ملے جہاں اُن کی سچائی اور معصومیت کے قدر دانوں کی کمی نہیں، جہاں افلاطون، جاحظ، حافظ، معرّی، ابو نواس، رومی، عطّار، کالیداس، شیکسپیئر، غالب، شبلی، محمد حسین آزاد، تان سین، میرابائی، کبیر، نانک، فلاسفہ اور اولیاء سب اُن کو خوش آمدید کہتے ہیں اور اُن کے احترام میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کو ممتاز کرسیوں پر بٹھا کر خود بیٹھے۔

غیر مطبوعہ خطوط بنام ڈاکٹر داؤد رہبر

کراچی

۲۲ جون ۱۹۵۴ء

عزیز من سلمہ، کئی روز سے ارادہ کر رہا تھا کہ تمہیں خط لکھوں کہ کل تمہارا ہی خط آگیا۔ اسے پڑھ کر مجھے افسوس بھی ہوا

اور کسی قدر مسرت بھی - لاہور والوں کی ذہنیت کو میں خوب سمجھتا ہوں - اس زمانے میں مجھے ان سے بہت کچھ سابقہ پڑا ہے - بیشک تمہارا سب سے بڑا "قصور" یہ ہے کہ تم ...... نہیں مجھے ...... سے ایک صاحب نے لکھا کہ یہاں کے اخبار اور نام ونمود کے لوگ اور اہلِ ادب اگرچہ اردو اور انجمن ترقی اردو کو اچھا سمجھتے ہیں لیکن آپ سے للّٰہی بغض ہے اور آپ کے اور انجمن کے کارناموں کا ذکر اچھائی سے نہیں کرتے اور نہ اخباروں میں آنے دیتے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ .... نہیں ہیں - پاکستان کی سب سے پہلی برکت یہ ہے - میں تم سے کیا کہوں کہ اس زمانے میں کیا کیا تماشے دیکھنے میں آئے ہیں - تم کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ..... زبان کا رزولیوشن کسی .... نے پیش نہیں کیا تھا - یہ سعادت ایک .... بزرگ کے حصے میں آئی - ملک فیروز خاں نے پیش کیا اور بیگم شاہنواز، شیخ صادق حسین، خلیل الرحمٰن، افتخار الدین، دولتانہ وغیرہ نے تائید کی ان .... کو کچھ بھی خیال نہ آیا کہ یہ کیا کر رہے ہیں یہ بڑی لمبی داستان ہے - خط میں اس کی گنجائش نہیں - کبھی ملاقات ہوئی تو سناؤں گا - امید ہے کہ تم اور بیوی بچے سب خیر وعافیت ہونگے - پہلے تم لے ان کو انگلستان کی سیر کرائی - اب کنیڈا لے جا رہے ہو - کیا ان کی قسمت میں جلاوطنی لکھی ہے -

خیر طلب

عبدالحق

(۲)

کراچی

(غیر مورخہ لیکن ۵۵ء میں انقرہ میں موصول ہوا)

عزیز من سلمہ، تمہارا خط پہنچا - اردو کے لئے جو کام تم وہاں کر رہے ہو وہ قومی خدمت ہے، اس کے جو اچھے نتائج بھی تم کروگے وہ داخلِ ثواب ہوگا - تم نے کمال کیا کہ اتنی جلدی تم نے ترکی زبان میں اس قدر مہارت حاصل کر لی کہ اردو کا درس بغیر امداد ترجمان دینے لگے -

اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ترکوں کو اردو زبان سے بہت الفت ہے - اب چند ترک ایسے تیار کرو کہ وہ اردو میں بخوبی لکھنے پڑھنے لگیں اور ہم کسی روز ان کی تحریر قومی زبان میں شائع کریں -

تعجب ہے کہ تم کو میرا خط اور قومی زبان کا وہ پرچہ نہیں پہنچا، یکم نومبر کے پرچے میں وہ تصویر تمہارے نوٹ کے ساتھ چھپی تھی اور اس پرچے میں تمہارا پورا خط شائع کر دیا تھا جو تم نے مجھے لکھا تھا - اب دوبارہ قومی زبان کے دو پرچے بھیج رہا ہوں - وصول سے مطلع کرنا - بچوں اور بیوی کو دعا و سلام،

خیر طلب

عبدالحق

(۳)

انقرہ یونیورسٹی کے اُردو طلبہ کے نام ایک پیغام

مورخہ ۲۷ جون ۱۹۵۷ء

میں ترک طالب علموں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اُردو زبان سیکھنے کا عزم کیا ہے۔ پاکستانیوں اور ترکوں میں قدیم سے مذہبی اور تہذیبی رشتہ موجود ہے۔ زبان کو انسانی تہذیب میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اردو زبان سیکھنے سے یہ رشتہ اور زیادہ مضبوط اور قوی ہو جائے گا۔ کسی زبان کے سیکھنے سے اُس زبان والوں سے خود بخود اُنس ہونے لگتا ہے۔ ہم زبانی سے ہم خیالی پیدا ہوتی ہے اور ہم خیالی اتحاد کی بنیاد اُستوار کرتی ہے۔ یہ زبان جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ترکی سے اجنبی نہیں ترکی زبان کے بہت سے لفظ ہماری زبان میں مروج ہیں۔ ہمارا فن حرب خاص کر اس کا رہین منت ہے۔ قدیم شاہی دربار اور عہدوں کے الفاظ اکثر تُرکی تھے اور بہت سے کھانوں کے نام اب بھی تُرکی ہیں۔ ہماری زبان میں "رومی" کے کئی معنے ہیں اور یہ قدیم رشتے کو یاد دلاتا ہے۔ پاکستانیوں کو ترکوں سے جو محبت ہے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ اس کی شاہد ہے۔ اردو زبان کے سیکھنے سے اس محبت میں ایک نئی تازگی اور شگفتگی پیدا ہو جائے گی۔ اگرچہ اُردو نوعمر زبان ہے لیکن اس نے قلیل عرصے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور اب دنیا کی زبانوں میں اس کا تیسرا درجہ ہے۔ آپ اسے حاصل کر کے اس کی تعداد میں خوشگوار اضافہ کریں گے۔

میری ساری عمر اردو زبان کی خدمت گزاری میں گزری ہے۔ جب میرے عزیز ڈاکٹر محمد داؤد رہبر نے مجھے یہ خوشخبری پہنچائی کہ آپ نے بڑے شوق سے اُردو پڑھنی شروع کر دی ہے تو مجھے اس سے جو مسرت ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ اگر مجھ میں پہلی سی توانائی ہوتی تو میں بذاتِ خود انقرہ پہنچ کر اپنی زبان سے آپ کو یہ پیغام پڑھ کر سناتا۔

میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو علم و ادب سے مالا مال کرے اور دین و دنیا میں سرخروئی عطا فرمائے۔

آپ کا خیر طلب

عبدالحق

(۴)

کراچی

۱۱ اکتوبر ۱۹۵۷ء

عزیز من سلمہ، تمہارا خط پہنچا، اسے پڑھ کر بہت افسوس اور رنج ہوا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ ہمارے سفارت خانے بیکار سے ہیں اور اپنی قومی زبان اور تہذیب کا انہیں کوئی درد نہیں۔ تمہارے خط سے اس بدگمانی کو اور تقویت ہوئی۔ اسلامی

ممالک خاص کر ترکی میں پاکستان کو ایسے اشخاص بھیجنے چاہئیں جو پاکستان کے وقار کو بڑھائیں باہمی تعلقات میں خوش گواری پیدا کریں اور عوام سے اپنا رشتہ قائم کرنے کی صورتیں نکالیں، ان حالات میں جو کام تم کر رہے ہو وہ بہت ہی قابل قدر اور لائقِ تعریف ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جسے اپنی زبان و تہذیب سے محبت ہے۔ اس کے انجام دینے میں تم جو ایثار اور غیر معمولی محنت کر رہے ہو اس کی کوئی قدر کرے یا نہ کرے وہ بجائے خود بڑی نعمت ہے جو تمہاری اور تمہارے بچوں کی سیرت کے بنانے اور اخلاق کے سنوارنے میں مدد دے رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری ہمت میں برکت دے اور تمہیں کامیاب کرے۔ دسمبر میں تمہارے آنے کا انتظار ہے، اس وقت جی بھر کے باتیں کریں گے۔

خیر طلب

عبدالحق

(۵)

کراچی

۵ نومبر ۱۹۵۸ء

عزیزی محمد داؤد سلمہ، ایک مدت کے بعد تمہارا خط کل آیا۔ خواجہ مشفق میرے خط جمع کر رہے ہیں نئے خبطوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کوئی ٹکٹ جمع کرتا ہے کوئی دیا سلائی کی ڈبیاں اور کوئی تیتریاں۔ جن کو بیکاری کا کوئی اور شغل نہیں ہوتا وہ لوگوں کے دستخط ہی لئے پھرتے ہیں، میں نے یہ خط کیا اشاعت کے لئے لکھے تھے؟ یہ بات تو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی کہ کوئی میرے خط حفاظت سے رکھے گا۔

اس سے تو اطمینان ہوا کہ تم خیر و عافیت سے ہو۔ لیکن خط کے آخری جملوں سے مجھے کسی قدر تشویش ہوئی۔ میں اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ تم وہاں پورے اطمینان اور آزادی سے کام کر رہے ہو اور خوش ہو۔ اب معلوم ہوا کہ تمہیں وہ اطمینان نصیب نہیں جس کے تم جویا تھے۔

یہاں کے حالات تم اخباروں میں پڑھتے ہو گے، ایک اعتبار سے اچھا ہی ہوا۔ گزشتہ حکومت کے وزراء و عمال اور سیاست کاروں نے ادھم مچار کھا تھا اور حالت انتہائی خراب ہو گئی تھی، اب بہت کچھ رو بہ اصلاح ہے۔ گرانی کم ہو گئی ہے اشیاء کی قیمتیں گھٹ رہی ہیں۔ جرائم میں بھی تخفیف ہے۔ انصاف کی بھی توقع ہے، ابھی انتظار کرنا چاہیئے کہ اس ابتدائی مستعدی اور سرگرمی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

بچوں اور دلہن کو دعا پہنچے،

خیر طلب

عبدالحق

(۶)

کراچی

۲۴ دسمبر ۱۹۵۸ء

میرے عزیز داؤد، اللہ تعالیٰ تمہیں صحت و عافیت سے رکھے اور کامیابی اور خوشحالی عطا فرمائے۔

تمہارے دو خط پہنچے، پہلا خط پڑھ کر جس قدر افسوس اور رنج ہوا اُسی قدر خوشی دوسرے خط کو پڑھ کر ہوئی۔ ہمارے اہل وطن کی بے مہری اور ناقدردانی قابلِ افسوس بلکہ قابل شرم ہے، تم پہلے شخص نہیں جس سے انہوں نے یہ برتاؤ کیا ہے۔ ایسے کئی جوہر قابل ہیں جو ان کے ہاتھوں مجروح ہو چکے ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام کو دیکھو۔ یہاں اسے کسی نے نہ پوچھا۔ ناچار واپس انگلستان چلے گئے وہاں ان کا ایسا اعزاز ہوا کہ ہم اب اُس پر فخر کرتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے کرتے ہمارا مُنہ خشک ہوا جاتا ہے۔ قدردانی مغربی ممالک پر ختم ہے۔ آخر وہیں تمہارے مقالے کی قدر ہوئی اور وہیں کے ایک ملک نے اسے شائع کرنے کی ہمت کی اور وہیں ایک ادارے نے اس کی طباعت کے مصارف ادا کرنے کی ذمہ داری لی۔ انشاء اللہ اب تمہیں کسی مغربی ملک میں ضرور کوئی ایسی مستقل جگہ مل جائے گی کہ تم آسائش اور عزت کے ساتھ بسر کر سکو۔ لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تم تعلیم پانے کے بعد غیر ممالک میں مارے مارے پھرے اور وطن میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ تمہاری اولاد بھی غیر ملکی ہے اور ان کی زبان بھی غیر ملکی ہوگی۔ یہ بھانت بھانت کی بولیاں بولیں گے۔ کیسے غضب کی بات ہے۔

مجھے اب لکھنے پڑھنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ موتیا بند میری آنکھوں میں نزولِ اجلال فرمانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ کم بخت بھی ایسے وقت آیا جب انجمن کی الجھنوں کے رفع ہونے کی توقع ہے اور کام کرنے کا موقع آیا ہے۔ آدمی کی کیا بساط ہے، اتفاقات کا شکار ہے۔ غالباً اب قدح کروانا پڑے گا۔ ڈاکٹر سے مشورہ کروں گا۔ اگر اس کے بعد بینائی عود کر آئی تو سمجھو دنیا بھر کی نعمت پائی ورنہ دنیا میرے حسابوں اندھیر ہو جائے گی اور اسی کے ساتھ میری زندگی کا خاتمہ بھی ہے، یہ میرا سب سے اندوہناک المیہ ہوگا۔ اب تک میں دوں فطرت حریفوں کا رہین ستم رہا اب خود فطرت برسرِ انتقام ہے،

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

یہ خط میں نے ٹھیر ٹھیر کے اٹکل سے لکھا ہے، کوئی غلطی یا سہو قلم نظر آئے تو اس کا خیال نہ کرنا۔ جس نے ہزارہا صفحے لکھ ڈالے آج وہ ایک صفحہ خط کا ٹٹول ٹٹول کر لکھ رہا ہے۔ بچوں اور بیگم کو بہت بہت دعا،

عبدالحق

(۷)

کراچی

۱۴ مارچ ۱۹۶۰ء

عزیز القدر داؤد رہبر سلمہ اللہ تعالیٰ تمہارا خط عین انتظار میں پہنچا، اتنے دنوں سے جو تمہارا خط نہیں آیا تھا تو بڑی تشویش

۱؎ اس خط کے نیچے صرف دستخط مولوی صاحب کے اپنے دستِ مبارک سے ہیں۔

تھی، خط پڑھ کر بہت اطمینان ہوا۔ تم نے اردو کے متعلق جو تحریک وہاں شروع کی ہے اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تم اردو کے سفیر ہو اور امریکہ میں تمہاری یہ سفارت بہت کارگر ہوگی۔

امریکہ میں اردو کے ساتھ تمہارا گانا بھی کام آیا، اُردو سے زیادہ وہ تمہارے گانے کو پسند کریں گے۔ یعقوب کا کوئی خط کیمبرج سے نہیں آیا۔ معلوم نہیں کیا حال ہے، تمہارے پاس اگر خط آتے ہوں تو مجھے اس کے حالات سے اطلاع دو، باقی باتوں کا جواب خواجہ مشفق دیں گے،

بیوی بچوں کو بہت بہت دُعا

خیر طلب
عبدالحق

(۸)

کراچی [۱]
۲ جولائی ۱۹۶۰ء

عزیزم سلمہ، بہت دنوں کے بعد تمہارا خط آیا۔ تمہاری اور بیوی بچوں کی خیریت معلوم کرکے اطمینان ہوا۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تم وہاں [۲] خوش ہو اور حسب منشا وہاں اُردو کی لائبریری قائم کرنے والے ہو۔ میں بھی تمہیں یہاں سے کتابیں بھیجونگا تمہیں اُردو سے جو محبت ہے اس کی وجہ سے میں تمہیں بہت عزیز رکھتا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ اُردو انٹرنیشنل زبان بن جائے اور وہ تم ہی جیسے اُردو کے شیدائی کی بدولت بن سکتی ہے،

میری آنکھ کا اپریشن بیشک کامیاب ہوا لیکن ابھی تک بینائی نے عود نہیں کیا۔ اس وجہ سے لکھنے پڑھنے سے معذور ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ بینائی کے آنے میں ابھی کچھ دن لگیں گے۔ میں اس دن کے انتظار میں ہوں۔ اب تو دوسرں کا محتاج ہوں۔ خود پڑھنے لکھنے کے قابل نہیں رہا،

بیوی بچوں کو میری طرف سے بہت بہت دعا اور سلام

خیر طلب
عبدالحق

---

[۱] ۔ یہ خط بھی املا ہے اور مولوی صاحب کے ہاتھ سے صرف دستخط ثبت ہیں

[۲] ۔ یعنی امریکہ

کراچی
۶ جنوری ۱۹۶۱ء

عزیز من سلمہ، تمہارا خط عین انتظار پر پہنچا، اتنے دنوں سے جو تمہارا خط نہیں آیا تھا تو مجھے بہت تشویش تھی اللہ تعالیٰ تمہیں خوش حال اور کامیاب رکھے۔ یہ زمانہ بکواس یعنے پروپیگنڈے کا ہے۔ اس میں بغیر بولے چارہ نہیں، مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تم نے بحیثیت پروفیسر اردو و تاریخ پاکستان اپنا افتتاحی لیکچر دیا، پاکستان کس نے بنایا لوگ اس سے اب تک بے خبر ہیں، یہ نہ اقبال نے بنایا اور نہ جناح نے۔ پاکستان اردو نے بنایا۔ میں اس پر ایک مقالہ لکھنے والا ہوں۔

مکاتیب عبدالحق اب تک نہیں چھپے۔ مجھے اس سے زیادہ علم نہیں اور نہ مجھے اس سے دلچسپی ہے۔ میری سالگرہ ماسکو اور حیدرآباد میں ہوئی۔ یہاں ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی گئی تھی۔ آپس میں پھوٹ پڑ گئی اور معاملہ ختم ہو گیا۔ اچھا ہوا تم نے مسلم ورلڈ میں اچھا نوٹ لکھا ہے، یہ بھی یار فروشی ہے،

انجمن کی مطبوعات کی فہرست بھیج رہا ہوں۔ پہلے کی کتابیں کہاں سے ملیں گے دریافت کر کے اطلاع دوں گا۔

میں ابھی تک لکھنے پڑھنے سے معذور ہوں۔ تمہاری فرمائش پر یہ خط اپنے ہاتھ سے لکھ رہا ہوں لیکن جو کچھ لکھ رہا ہوں اسے خود نہیں پڑھ سکتا اس لئے مجھے معلوم نہیں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ٹھیک لکھا گیا ہے یا نہیں تمہارا خط بہت جلی حروف میں کھلا کھلا، لکھا تھا اُسے میں نے ذرا سی کوشش سے پڑھ لیا۔ میری دوسری آنکھ بھی متاثر ہو گئی ہے۔ ایک آدھ مہینے میں اس کا بھی اوپریشن کرنا پڑے گا۔

بیوی، بچوں کو میرا سلام اور دعا پہنچے۔ تمہارے یہ بچے تو یورپین ہو گئے خدا انہیں خوش و خرم زندہ سلامت رکھے۔

عبدالحق

محبت اور جبر

دو شخصوں کو مجبور کرنا کہ آپس میں محبت کرو ایک متضاد بات ہے۔ جہاں جبر ہے وہاں محبت کہاں اور جہاں محبت ہے وہاں جبر کی حاجت نہیں۔ ممکن ہے کہ بعضے یہ کہیں کہ اکثر بعد میں محبت پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ اتفاقی باتیں ہیں اور اتفاق پر بھروسہ کرنا دانشمندی کے خلاف ہے۔

(بابائے اردو)

ڈاکٹر رحیم الدین کمال

مولوی عبدالحق کی وصیت

مولوی عبدالحق ایک با اثر اور با وقار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا کردار دلکش تھا۔ ان کے کاموں کو جانچنے اور خیالات کے ارتقاء کو پانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے کردار کا مطالعہ کیا جائے۔ وہ بڑے بلند ہمت اور پختہ عقیدہ رکھنے والے انسان تھے۔ صاف اور واضح انداز میں سوچتے تھے۔ خلوص اور بے باکی میں یکتا تھے۔ غریبوں اور کمزوروں کی اعانت اور حوصلہ افزائی کے موقعہ ڈھونڈتے رہتے تھے۔ جابروں سے نبرد آزما ہوتے اور خود پرستوں سے بے تعلق رہتے تھے۔ جب کوئی خیال ان کے ذہن میں بیٹھ جاتا اور اس کی معقولیت کے وہ قائل ہو جاتے تو پھر کسی طرح اسے ترک نہ کرتے۔ جب کسی کام کی دھن سماتی تو اس کام کے سرانجام کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دیتے اور جب تک اسُے پورا نہ کر لیتے۔ نچنت نہ بیٹھتے ان کی ساری زندگی ایک مہم سے عبارت تھی۔ اور یہ مہم اردو زبان کی ترقی و ترویج پر مرکوز تھی۔ اس مقصد کو آگے بڑھانے کے لئے نئی نئی تجویزیں پیش کیں۔ اور بڑے بڑے معرکے جیتے۔ ان کی مہم آرائی کے آگے بڑے سے بڑا سورما بھی ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جاتا۔ جب ان کے سامنے کوئی کام ہوتا تو پھر وہ ان کی زندگی کا وظیفہ بن جاتا۔ اور جو کوئی ان کے اس کام کے ساتھ لگ جاتا۔ اس کے بارے میں بھولے سے بھی نہیں سوچتے تھے کہ وہ کون ہے۔ اور کس قماش اور فطرت کا آدمی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ۔ شاطروں نے کام کے بہانے ان سے تعلقات پیدا کئے۔ ذاتی فائدے اٹھائے اور دھوکہ بھی دیا۔ لیکن ان باتوں سے نہ تو وہ پریشان ہوتے تھے۔ اور نہ ہی ہمت ہارتے۔ وہ کام کی خاطر ہر خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے مصلحت آمیزی ان کے مزاج کے مطابق نہ تھی۔ جب کسی سے اختلاف رائے ہوتا تو وہ اس شدومد سے اس کا اظہار کرتے کہ کسی کمزور انسان کے لئے اس کی تاب لانا ناممکن ہو جاتا۔

مولوی عبدالحق کو آخری زندگی میں دو بڑی معرکے کی مہمیں سر کرنی پڑیں۔ جب انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ

اور ادارہ پران کے مخالفین کی عملداری قائم ہوگئی تو ان کے جذبات واحساسات بُری طرح مجروح ہوئے۔ لیکن وہ خاموش بیٹھنے والے انسان نہ تھے۔ امیدوں کا چراغ ہاتھ میں لئے ہمت واستقلال سے اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ اور بالآخر وہ کامیاب ہوئے۔ ان کی آخری زندگی کی اس سے بھی زیادہ اہم مہم اردو جامعہ ہے۔

اردو یونیورسٹی کی تحریک سے ان کو بڑا تعلق خاطر تھا۔ وہ برسوں سے ایسی جامعہ کی داغ بیل ڈالنے کی فکر کر رہے تھے۔ جو انھیں کے الفاظ میں اس درماندہ قوم میں صحیح اور حقیقی ذوق پیدا کر سکے۔ اور اس قوم کے لئے ایک عظیم الشان علمی مرکز فراہم ہو جائے۔ وہ یہ تحریک اس وقت چلا رہے تھے جب کہ وہ اپنی زندگی کی "نوّے منزلیں طے کر چکے تھے۔ لیکن کام کی رفتار جستجو سرگرمی اور سعی سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا تھا کہ واقعی ان کے ارادے نوّے سال کی عمر میں بھی جوان تھے۔ اور ان کا "عزم و حوصلہ زندگی کی حرارت سے سرشار" تھا۔ ان کے سامنے ایک مقصد تھا۔ اور وہ "مقصد کی تکمیل" کو اپنی "زندگی کا حاصل" سمجھتے تھے۔ وہ اس مہم میں اپنے ساتھ سب کو شریک کر لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو یونیورسٹی کی یہ مہم وہ اپنی زندگی کی آخری منزل میں کیوں چلا رہے تھے۔ اور اس سے ان کی زندگی کا مقصد کیوں وابستہ ہو گیا تھا۔ اس کا جواب پانے کے لئے خود ان کی تحریروں کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ خود مولوی صاحب کے قول کے مطابق اردو کو اعلیٰ درجوں میں ذریعہ تعلیم بنانے یعنی اردو یونیورسٹی کا خیال سب سے پہلے ہمارے قوم کے اعلیٰ دماغ "مصلح سرسید کو ہوا۔ جب کہ انہوں نے ۱۸۶۷ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن (British Indian Association) کی طرف سے جس کے علاوہ بانی اور آنریری لائف سیکریٹری تھے۔ اس بارے میں ایک عرضداشت گورنمنٹ آف انڈیا میں پیش کی ـــــ اس عرضداشت میں سرسید نے اس تجویز کی ضرورت اور اہمیت کو صاف اور سادہ زبان میں نہایت مدلل طور پر بیان کیا ہے۔ اور اس امر پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ کہ جب تک جدید علوم ہمیں ہماری زبان میں نہ پڑھائے جائیں گے۔ ہماری تعلیم ناقص، ناکافی اور غیر مؤثر رہے گی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سرسید کی تمام کوشش کہ اردو یونیورسٹی علیگڈھ میں قائم کی جائے کامیاب نہ ہو سکیں۔ کیونکہ حکومت وقت نے نہ صرف یہ کہ ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ دشواریاں بھی پیدا کیں۔"

جب علیگڈھ کالج کو یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کا بل پیش ہوا تو مولوی عبدالحق صاحب نے پھر ایک مرتبہ قلم اٹھایا اور کتابچہ مسئلہ مسلم یونیورسٹی کے عنوان سے لکھا۔ اور اس بات کی سعی کی کہ سارے ہندوستان میں یونیورسٹی کے مسئلہ پر صحیح نقطۂ نظر پیدا ہو۔ وہ اس جامعہ کو قومی کردار کی تعمیر اور علم وفن کی ترقی کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ وہ اس کتابچہ میں لکھتے ہیں۔ اس یونیورسٹی سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمارا تمدن خصائص اور آداب واخلاق میں جو خوبیاں ہیں۔ انہیں قائم رکھا جائے اور ترقی دی جائے۔ جو نقائص ہیں۔ انہیں

رفع کیا جائے۔ اور اصلاح کیجائے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں۔ اگر ہم اس درماندہ قوم میں علم و فضل کا صحیح اور حقیقی ذوق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اپنی قوم کے لئے ایک عظیم الشان علمی مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ اگر گذشتہ کی تنقیح موجودہ کی اصلاح اور آئندہ کی فکر منظور ہے۔ تو ہمیں صحیح اور حقیقی معنوں میں یونیورسٹی حاصل کرنی چاہیئے۔ اور نام ونمود اور نقالی، ظاہر پرستی اور خوش فعلیوں سے باز رہنا چاہیئے۔ یہ زمانہ ان حرکتوں کا نہیں۔ ہم بھولے ہوئے ہیں۔ وہ کبھی کا گذر گیا۔ یہ وقت راست گوئی بے ریائی۔ اخلاقی جرأت اور محنت و مشقت کا ہے۔ اگر ہم نے کبھی مروت سے کام لیا تو یاد رکھو ہم دین و دنیا کہیں کے نہ رہیں گے۔ مروت اور اخلاقی سہل انگاری (جس کا نام ہم نے خوش اخلاقی رکھا ہے) اُسی وقت زیبا تھی۔ ہم اس کے بار کو برداشت کرتے تھے۔ اس وقت تو گلے گھاؤ تک بس ہے۔ اس وقت ہمیں ذاتی اغراض سے گذر کر قوم وملک کے سود و بہبود کا خیال کرنا چاہیئے:۔

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب اپنے زندگی کے ابتدائی دور میں بھی اس قومی فرض سے ناآشنا نہ تھے۔ ان کی حیثیت ایسے تعمیر کار کی سی تھی جو اپنی قومی تہذیب کے مال مصالحے سے خوب واقف ہو۔ اور اپنی ذہنی اپج سے تعمیر کے نئے نئے منصوبے بناتا ہو۔ اور اس کو قوت ایجاد پر قدرت حاصل ہے۔ علیگڑھ یونیورسٹی کے ذریعہ تو یہ مقصد پورا نہ ہوسکا کہ اردو زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنایا جاتا نہ تو سرسید اس مقصد میں کامیاب ہوئے اور نہ ہی ان کے جانشین دوست و ہم کار لیکن ان سبھوں نے اردو کی ترقی کا ایک نیا ڈھنگ نکال لیا۔ اور اردو کو اعلیٰ خیالات اور علمی مضامین کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا۔ چنانچہ جب اردو جامعہ کی تحریک پس پشت پڑگئی تو سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اردو زبان کی ترقی و تحفظ کے وسائل پیدا کئے اور یہ ہی تحریک رفتہ رفتہ انجمن ترقی اردو کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ مولوی عبدالحق اس کے معتمد بنائے گئے تو انہوں نے جب کبھی موقعہ ملا اردو جامعہ کے مقصد کو آگے بڑھانے کی برابر کوشش کی چنانچہ جب جامعہ ملیہ کے قیام کی صورتیں پیدا ہوئیں تو مولوی عبدالحق نے اس کے مباحثہ میں حصہ لیا۔ اور کوشش کی کہ وہ اردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے میں کامیاب ہوجائیں۔

جب حیدرآباد میں اردو جامعہ کی تحریک نے زور پکڑا تو پھر ایک مرتبہ مولوی عبدالحق کو ایک موقعہ ہاتھ آیا۔ انہوں نے ان تمام اصحاب کو جو اردو جامعہ کی شدت سے مخالفت کرتے تھے رفتہ رفتہ اپنا ہمنوا بنالیا۔ سر راس مسعود اور سر اکبر حیدری ان کے خیال کی تائید کرنے لگے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں ان واقعات کا ذکر کیا ہے۔ جو سر اکبر حیدری کے خیال کی تبدیلی کا باعث ہوئے۔ مولوی صاحب ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے لاہور گئے ہوئے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ حیدری صاحب اورنگ آباد آرہے ہیں۔ تو وہ فوراً اورنگ آباد پہنچ گئے۔ ایک جلسہ کیا۔ اور تقریر کی۔ اس تقریر کے علاوہ حیدری صاحب سے اور ملاقاتیں ہوئیں۔ اور ان نجی ملاقاتوں میں وہ

اردو جامعہ کے مسئلہ پر گفتگو کرتے رہے۔ اور جب حیدری صاحب اورنگ آباد سے واپس ہوئے تو اپنے ساتھ یہ ایقان بھی لیتے آئے کہ حیدرآباد میں جو جامعہ قائم ہوگی۔ اس کا ذریعہ تعلیم صرف اردو ہی ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب مجھے اپنے ایک تاریخی خط میں لکھتے ہیں۔ "یہ بہت اچھا ہوا کہ روسی زبان میں عثمانیہ یونیورسٹی پر آپ سے مضمون لکھوایا جا رہا ہے۔ المالطیفی نے اس یونیورسٹی کے بنانے میں کوئی کام نہیں کیا۔ وہ اس تحریک کے مخالف تھے۔ وہ انگریزی کے بجائے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے خیال کو ناقابل عمل سمجھتے تھے۔ سر راس مسعود جب آئے تو یہ تحریک چل چکی تھی۔ یعنی دفتر کی مثل میں آچکی تھی۔ یعنی ابتدائی کام ہو رہا تھا۔ راس مسعود کو ابتدا میں اس کے بارے میں بہت کچھ شبہ تھا۔ وہ قطعی طور پر کوئی رائے قائم نہ کر سکے، سر اکبر حیدری اور مجھ سے اس کے متعلق گفتگو اور بحث ہوتی رہی۔ اور آخر میں وہ قائل ہو گئے۔ قائل ہونے کے بعد انہوں نے پوری مستعدی سے کام لیا۔ اصل کام سر اکبر حیدری نے کیا۔ وہ اگر اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تو یہ تحریک چل ہی نہیں سکتی تھی۔ آپ پوچھیں گے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی۔ ہوا یہ کہ ایک بار سر اکبر اورنگ آباد آئے اور میں نے ان کی صدارت میں ایک تقریر مروجہ تعلیم اور طریقہ تعلیم پر کی۔ اس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ اس کا اعتراف خود انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کیا ہے۔ جو انہوں نے اورنگ آباد کے ایک سالانہ جلسہ میں کی تھی۔ ...... وہ نورس (کالج کا رسالہ) میں چھپی تھی ...... خیر حیدری صاحب تو آمادہ ہو گئے۔ وہ خود اس کی تحریک نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ ان کے سامنے یہ تحریک آتے تو وہ کارروائی کرنے کو تیار تھے۔ المالطیفی کے ذریعہ اس تحریک کو پیش کرنا خلاف مصلحت تھا۔ وہ اس کے مخالف تھے۔ اس زمانے میں دارالعلوم کے پرنسپل مولوی حمید الدین مرحوم تھے۔ انہوں نے میرے متواتر اصرار پر یہ عہدہ قبول کیا تھا۔ میں نے انہیں اپنا ہم خیال بنا لیا۔ اور ان سے کہا کہ آپ بحیثیت پرنسپل دارالعلوم یہ تحریک کیجئے۔ انہوں نے کہا تم لکھ دو میں دستخط کر دوں گا۔ میں نے ہوم سیکرٹری کے نام چند سطریں لکھ کر درخواست پیش کر دی۔ ہوم سیکرٹری اس وقت سر اکبر حیدری تھے۔ اب بموجب انگریزی محاورے کے گیند لڑھکنا شروع ہوئی۔ مجھے اورنگ آباد سے اسپیشل ڈیوٹی پر بلایا گیا۔ کام دھیرے دھیرے شروع ہوا۔ عرضداشت اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں پیش کی گئی۔ وہ میری ہی لکھی ہوئی تھی۔"

اس تفصیل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نہ صرف انجمن ترقی اردو کے ذریعہ اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے تا دم زیست کوشاں رہے۔ بلکہ وہ تمام تحریکوں کے جو عہد جدید میں جامعہ کے قیام سے تعلق رکھتی ہیں۔ روح رواں بھی تھے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ہر ایسی تحریک کے خالق خود مولوی عبدالحق ہوتے تھے۔ خواہ اس میں انکا نام ظاہر ہو یا نہ ہو۔

مولوی عبدالحق کے خیالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات کما حقہ واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ہماری قوم

کی اصل کمزوری سے واقف ہوگئے تھے۔ اور ان کا یہ عقیدہ راسخ تھا۔ کہ خیالات اور جذبات کے اداکرنے کے لئے زبان ایسی ضروری ہے۔ جیسے انسانی زندگی کے لئے آکسیجن..... زبان کے ہر ہر لفظ اور جملے میں قومی روایات تہذیب وتمدن کے شعار اور ذہنی و روحانی تجربے پیوست ہوتے ہیں۔ قوم کی ذہنیت میں اور اس کی زبان میں ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق غیر زبان سے پیدا نہیں ہوتا۔ مولوی عبدالحق کا کہنا تھا کہ دوسری زبانوں کے مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعہ پڑھنے سے طالب علموں کے طرز فکر کے سانچے بدل جاتے ہیں۔ ان پر بھی رنگ غالب آجاتا ہے۔ نقالی اور تقلید کے عادی بن جاتے ہیں۔" اس ذہنی نکبت کی وجہ سے وہ بے لاگ غور و فکر سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ ان میں اور ان کے ماحول میں مغائرت پیدا ہوجاتی ہے۔ جو قومی ترقی و نشو نما کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اس باطنی ہیئت کا اثر ظاہر پر بھی پڑتا ہے۔

یہی وہ اسباب تھے۔ جس کے پیش نظر علیگڈھ تحریک کے سربراہوں نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہی وہ وجوہ تھے۔ جن کی بناپر دہلی کالج میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تھا۔ اور انہیں مقاصد کے پیش نظر جامعہ عثمانیہ میں ایک مشترکہ تہذیبی ورثہ کا مرکز قائم ہوا۔ تاکہ وہ اردو زبان کے ذریعہ جو اس مشترکہ ورثہ کی انمول یادگار ہے۔ ترویج و اشاعت ہو سکے۔ یہ سچ ہے کہ مولوی عبدالحق کو حالات کی تبدیلی کی وجہ سے مسلسل نبرد آزما ہونا پڑا۔ لیکن وہ اس سے تھکے ہارے نہیں۔ چنانچہ جب انہوں نے انجمن ترقی اردو کی شاخوں کے قیام کے ذریعہ سارے ملک میں اردو کے کام کو منظم کر لیا تو اس کے ساتھ ہی ساتھ ابتدائی مرحلے کے طور پر ایک ایسا کالج بھی قائم کر دیا۔ جو آئندہ چل کر اردو جامعہ کی صورت میں وسعت پا سکے۔ جب مولوی عبدالحق کو یہ محسوس ہوا کہ کچھ حالات سازگار ہوگئے ہیں۔ تو انہوں نے اردو یونیورسٹی کی مہم کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ اور مختلف تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ اردو ذریعہ تعلیم کے نظریہ کو اب شک و شبہ کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا اور وقت کا تقاضہ ہے کہ اردو یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اور یہ عہد کیا: جب تک قلم میں طاقت اور زبان میں سکت ہے۔ اردو یونیورسٹی کی اس پاک مہم کو جاری رکھونگا۔ ملک کے چپہ چپہ کا دورہ کروں گا۔ اور سب سے اپنا درد دل بیان کرونگا۔ کیونکہ یہ میرا ایمان ہے کہ نونہالان قوم کی دماغی اور ذہنی نشو و نما اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک کہ تعلیم کا ذریعہ ان کی اپنی قومی زبان نہ ہوگی۔"

جب مولوی عبدالحق کسی مہم پر لگ جاتے۔ تو ان کی تحریروں اور تقریروں کا محور بھی وہی مہم بن جاتی تھی اس دوران میں مجھ سے مسلسل خط و کتابت ہوتی رہی۔ انہوں نے اس زمانے میں جو خطوط مجھے لکھے ہیں۔ ان میں اس تحریک سے متعلق اکثر ذکر آیا ہے۔ مجوزہ یونیورسٹی کے بارے میں بھی خط و کتابت ہوتی رہی میں نے اپنے ایک خط میں مولوی صاحب کو لکھا تھا" مولوی صاحب آپ اردو یونیورسٹی کو قائم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ یونیورسٹی تو کبھی کے قائم ہو چکی۔ اب دراصل ایسی اردو جامعہ کو قائم کرنا ہے جو بین قومی حیثیت رکھتی ہے۔ تاکہ وہ ہماری ثقافت و تہذیب کا مرکز بن جائے۔ اور اردو زبان کے بولنے والے خواہ وہ کسی ملک و نسل سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں۔ اپنے بچوں کو اس مرکز پر اس خیال سے بھیج سکیں کہ ان کی تربیت اردو تہذیب کی روایات میں ہو سکے گی۔ اردو زبان کو جو بین قومی زبان بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اس مرکز کے ذریعہ تقویت حاصل کرے۔ اور نوجوان نسل کی تعمیر نو کی بنیاد ڈال سکے۔" اس کے جواب میں مولوی صاحب لکھتے ہیں۔ "آپ کو معلوم ہے کہ آج کل میں موتیا بند کے عارضہ کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے معذور ہوں کوئی خط آتا ہے تو اُسے پڑھوا کر سن لیتا ہوں۔ اور جواب لکھ دیتا ہوں۔ آپ کا خط جب آیا تو میں نے اپنے ایک دوست کو جو میرے پاس بیٹھے تھے پڑھنے کو دیا وہ مجھے پڑھ کر سنانے لگے۔ اور جب وہ اس مقام پر پہنچے۔ جہاں آپ نے میری اردو یونیورسٹی کو بین قومی اردو یونیورسٹی بنانے کی تجویز ہے۔ تو میں سن کر اچھل پڑا۔ اور میرا دوران خون جو کچھ سُست پڑ گیا تھا۔ تیز ہو گیا اس خیال سے مجھ میں ایک نئی قوت پیدا ہو گئی۔ اب آپ آج سے میرے شریک کار ہیں۔ اور انشاء اللہ یہ یونیورسٹی بین قومی یونیورسٹی ہی بن کر رہیگی۔ میں نے اپنی یونیورسٹی کے مصارف کے لئے پچیس ۲۵ لاکھ تجویز کئے تھے۔ یہ کافی نہیں ہو سکتے۔ مجھے اب ایک بلکہ دو کروڑ تجویز کرنے ہونگے۔ میں اس یونیورسٹی میں ایسے باکمال حضرات کو جمع کرنے کی کوشش کروں گا۔ جو ہماری زبان و تہذیب اور علم و حکمت سے سچی محبت رکھتے ہیں۔ خدا کرے میری یہ تمنا پوری ہو۔ اور اگر میرے جیتے جی یہ آرزو پوری نہ ہو تو میرے بعد آپ جیسے صاحب کمال اُسے پروان چڑھائیں۔" ایک اور خط میں فرماتے ہیں "آپ نے اپنے خط میں اردو زبان کی عظمت اور وسعت اور نظام تعلیم اور بین قومی اہمیت پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہیں پڑھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ مجھے یقین ہو چلا ہے کہ جب آپ جیسے اردو کے شیدائی اور اس کے قدرداں میری امداد اور دستگیری کے لئے موجود ہیں۔ تو مجھے ضرور اس مہم میں کامیابی ہو گی۔ اردو زبان السنہ جدیدہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا ہے۔ اور وہ بین قومی زبان ہونے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اس موضوع پر ایک اور تحریر شائع کرنے کی ضرورت ہو گی اس سے قبل جو کہ مختصر پمفلٹ اردو یونیورسٹی کے متعلق میں نے شائع کیا تھا۔ وہ غالباً آپ کو پہنچ گیا ہو گا۔" جب میں آج ان خطوط کو پڑھتا ہوں تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب سے میری خط و کتابت طویل عرصہ سے جاری تھی۔ لیکن یہ رفتہ رفتہ ایک ایسی منزل میں داخل ہو گئی تھی جب کہ کام کی شراکت کا نیا افق اُبھر رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے سات سال صرف اس بات کو سمجھنے میں لگائے تھے کہ ہندوستان کی قومی تعمیر و ترقی کے لئے کون سے عناصر و عوامل ضروری ہیں۔ اور کن بنیادوں پر اس کی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ تاکہ وہ نہ صرف ملک و قوم کی ضامن بن سکیں۔ بلکہ ان سے انسانیت کی ترقی کی راہ بھی ہموار ہو سکے۔ اسی غور و فکر کے نتیجہ میں ہی میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اردو

زبان دراصل اشباتی نقطۂ نظر اور تعمیری جذبات واحساسات کا نتیجہ ہے۔ اوران میں ہندو و مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ اس زبان کے ساتھ ایک تاریخی مشن بھی وابستہ ہے جو سارے ہندوستان کو محبت واتحاد اور ترقی کے رشتہ میں باندھ سکتاہے۔ اس میں ہر رنگ و نسل اور ہر حوصلہ وعزم کے انسان کو مستقبل کی روشنی مل سکتی ہے۔ اور اس کی منزلِ آخر پر انسانی قدریں جگمگاتی ہیں۔ جب میں نے اپنے اس خیال کو مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں پیش کیاتو مولوی صاحب نے بزرگانہ عنایت سے اس کی تائید اور حوصلہ افزائی کی اور ہم دونوں نے یوں محسوس کیاکہ یہ رشتہ بہت مضبوط اور مقصد بہت پاک ہے فاصلہ کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے سے اس مقصد میں بہت قریب تھے جب مولوی عبدالحق کی موت کی خبر پہنچی تو مجھ پر ایک سکتہ طاری ہوگیا۔ اور آج بھی میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا سارے ملک میں کوئی ایسا نہیں جو اس مقصد کو آگے بڑھائے۔ راہ کی صعوبتوں اور دشواریوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوا مستقبل کے چراغ روشن کرے۔ میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے میرے توسط سے دراصل یہ پیام اردو زبان اور تہذیب کے شیدائیوں کو دیا تھا۔ ان سب کو یک دلی کے ساتھ اس کام کو آگے بڑھانے کیلئے قدم اٹھانا چاہئے۔ تاکہ مولوی عبدالحق کی یہ وصیت کہ ان کے بعد اسس تحریک کو اردو کے شیدائی پروان چڑھائیں پوری ہو سکے۔ اور ہم ان کے ورثہ کے جائز حقدار بن سکیں۔ اس میں نہ صرف مولوی عبدالحق کی وصیت کی تکمیل مضمر ہے۔ بلکہ ملک کے درخشاں مستقبل کی رمز بھی اسی سعی وجستجو میں پنہاں ہے تاکہ نئی نسل آزادیٔ فکر وخیال کے ساتھ جدت عمل اور جدت خیال کی دولت سے مالا مال ہو اور قوم کی تعمیر برق رفتاری کے ساتھ نئی بنیادوں پر کرسکیں۔ اور ترقی یافتہ قوموں کی نہ صرف ہمدوش آجا سکیں بلکہ ان کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکیں۔ یہ منصب اسی وقت حاصل ہو سکتاہے۔ جب کہ ہم کو فکر و نظر کی آزادی حاصل ہو۔ ہمارے اعمال میں جدّت وندرت ہو ہمارا مقصد بلند وپاک ہو، ہم نیک نیتی اور بے نفسی میں بے مثال ہوں محنت ومشقت کے عادی بنیں۔ لایعنی اصراف کو ترک کریں۔ وقت کی دولت کو پہچانیں۔ زندگی کو نئے منصوبوں اور بنیادوں پر آراستہ کرسکیں۔ ہمارے دلوں میں نئی امنگیں اٹھیں۔ ہمارے جذبات میں صداقت اور ہمارے دلوں میں محبت کے دریا امڈیں۔ ہم انسانیت کی تعمیر وترقی کو اپنا نصب العین بنائیں۔ تاکہ ہم ان تمام قوموں میں جو قومی تعصب میں مبتلا ہیں۔ ممتاز ہو سکیں۔

پروفیسر ممتاز حسین

مولوی عبدالحق

ایسے لوگ ہماری ادبی تاریخ میں کم گزرے ہیں جنھوں نے اتنی یکسوئی، دھن اور لگن سے اُردو زبان اور ادب کی خدمت کی ہو اور اپنی عمر کی آخری منزل میں پہنچ کر بھی اتنے ہی مستعد، جوشیلے اور انقلابی رہے ہوں، جتنے کہ مولوی صاحب رہے ہیں۔

ایک ایسے شخص کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ پھر یہ کہ مولوی صاحب صرف ایک شخصیت یا کوئی ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ اپنی ذات سے پوری ایک تحریک ہیں، وہ تحریک اُردو زبان کو ہندوپاک کے دور دراز حصّوں میں مقبول بنانے، اُردو زبان کی صلاحیت کو بروئے کار لانے، اور اُس کے قدیم اور جدید سرمایۂ سے لوگوں کو آشنا کرانے اور ہندوپاک کی تاریخ میں اس کی تہذیبی اور اتحادی قوتوں کو اُجاگر کرنے کی تھی۔ مولوی صاحب کی حیثیت اس تحریک میں انجمن کے ایک عہدے دار کی نہیں رہی ہے، بلکہ وہ اس تحریک کے رہنما اور ہادی رہے ہیں۔ اس تحریک کی تاریخ اور اس کا سیاسی پسِ منظر کیا تھا، میں اس سے یہاں بحث کرنا نہیں چاہتا، میرے سامنے تو اس وقت الماری بھر انجمن کی وہ مطبوعات اور مولوی صاحب کی خود اپنی تالیفات ہیں جو اس تحریک کا عطیہ ہیں۔ اور اگر کسی کو اُن کی جوت نظر نہ آتی ہو، تو پھر یہ اُس کی اپنی فطرت کا قصور ہے۔ ان دنوں جب کہ تحقیقات کا میدان بہت کچھ مولوی عبدالحق ہی کی کوششوں سے وسیع تر ہو گیا ہے اور اس کے زیادہ سے زیادہ وسائل اور ماخذ مہیا ہو گئے ہیں، کسی بھی شخص کا اُٹھ کر یہ کہہ دینا کہ مولوی عبدالحق کوئی بڑے محقق نہیں ہیں۔ ایک بہت ہی آسان بات ہے، لیکن اس سے اُن کے کارناموں کی اہمیت گھٹتی ہوئی نظر نہیں آتی ہے۔ کیونکہ اُن کی حیثیت ایک محقق سے زیادہ ایک مبلّغ، ایک ریفارمر، ایک مجاہد کی رہی ہے، لیکن وہ لوگ جو کہ دقیانوسی خیالات کے ہیں، اور تاریخ میں سنین ٹٹولتے رہتے ہیں وہ مولوی صاحب کے کارناموں کو بھلا اس نظر سے کیوں دیکھیں، وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے تحقیق کے میدان میں کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اور یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ماضی کی دریافت بھی، ہر دریافت کی طرح اضافی ہوا کرتی ہے۔ یہ حضرات جو ان دنوں تاریخی کتب اور تذکروں کی چھان بین میں اپنا سر کھپا رہے ہیں، میں ان کی اس کوشش کی تحقیر نہیں چاہتا کہ یہ ایک نہایت

---

[1] یہ مضمون میں نے مولوی صاحب کی زندگی میں لکھا تھا جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوا! (ممتاز حسین)

بڑا ضروری اور اہم کام ہے، لیکن میں اُن کے اس ادّعا کو تسلیم نہیں کرتا ہوں کہ اُن کی یہ عرق ریزی کسی ایسے شخص کی ذہنی کاوش کے ہم پلّہ ہے جس کا مقصد ماضی کے بارے میں صرف خام مال اکٹھا کرنے کا نہیں، بلکہ ادبی ورثے کو سمجھنے اور سمجھانے کا بھی ہے، میر سیّد تھے یا کہ شیخ؟ اس سے زیادہ اہم اس بات کی دریافت ہے کہ میر کا ورثہ ہمارے لئے کیا معنی رکھتا ہے، اور یہ کام وہی کرسکتا ہے جو کچھ ناقدانہ بصیرت اور مستقبل کا تصوّر بھی رکھتا ہو۔

مولوی عبدالحق کی ادبی تحقیقات میں جہاں خبر ہے، وہاں نظر بھی ہے، انھوں نے ادب کو ہمیشہ زندگی کے پس منظر میں دیکھا ہے، اور زندگی کی ارتقائی قوّت ہی کا اسے مظہر بتلایا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی ادبی تنقیدات میں قدامت پرستی کے خلاف ایک مسلسل جدوجہد اور فرانسیسی انسائیکلوپیڈسٹوں کی طرح عقلیت پسندی اور روشن خیالی کو عام کرنے کی ایک پیہم کوشش ملتی ہے۔ خواہ وہ کسی کتاب کا مقدمہ ہو یا تبصرہ، اُن کی ہر تنقیدی نگارش میں اُن کے اس نقطۂ نظر کی جھلک موجود ہے

جو موڑ کہ سرسیّد اور حالی کے زمانے سے ہماری زندگی اور ادب میں آیا، معجزات کی دنیا سے نکل کر عالمِ اسباب میں آنے اور قوانینِ فطرت کے سمجھنے کا، اس کی اسپرٹ کو جیسا مولوی صاحب نے سمجھا ہے، ویسا اُن کے کسی دوسرے ہم عصر نے نہیں سمجھا، مولوی صاحب اس اسپرٹ کے صرف ایک ترجمان اور شارح ہی نہیں رہے ہیں، بلکہ اسے ایک قدم آگے بڑھانے اور اس کی مدافعت میں مخالف قوتوں کے خلاف جدوجہد کرنے میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ انھوں نے ہر انقلابی تحریک کا ساتھ دیا ہے۔

لیکن چونکہ مولوی صاحب کو اُردو تحریک بہت عزیز رہی ہے، اس لئے انھوں نے وقتاً فوقتاً اس کی خاطر ایسے لوگوں سے بھی سمجھوتہ کیا جو سرسیّد اسپرٹ کے مخالف اور قدامت پسندی کے مارے ہوئے تھے۔ گزشتہ دنوں میں مولوی صاحب جس کرب و بلا کے عالم سے گزرے ہیں، اُس کی تہ میں یہی حقیقت کارفرما رہی ہے۔ مولوی صاحب ان سے کام لینا چاہتے تھے، وہ یہ سمجھے ہم مولوی صاحب پر حاوی ہوگئے، اور ہم جس طرح چاہیں انھیں استعمال کرسکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو اُن کا یہ غلبہ اس طرح ظاہر ہوا کہ انھوں نے مولوی صاحب کو بنگالی زبان کے خلاف جارحانہ پالیسی اختیار کرنے کے لئے اکسایا، اور اُن سے یہ کہلوایا کہ بنگالی ہندو کی تہذیب کی ترجمان ہے، اور اُردو اسلامی تہذیب کی ترجمان ہے۔ بنگالیوں نے اُس کے جواب میں اپنی مسلم بنگلہ نکالی۔ اس طرح یہ لڑائی کچھ دنوں تک اسلام اور کفر کی چلتی رہی، یہ ساری باتیں مولوی صاحب کے دیرینہ موقف کے خلاف تھیں، وہ جب تک ہندوستان میں رہے اُردو کو ہندوی کہتے، اسے ہندی الاصل بتاتے اور حالی کی طرح اس خیال کے مؤید تھے کہ اردو جاننے کے لئے جہاں عربی فارسی کا جاننا ضروری ہے، وہاں سنسکرت اور ہندی کا بھی جاننا ضروری ہے، اب جو مولوی صاحب نے یہ باتیں کہنی شروع کیں تو لوگوں کو ایک عجیب تضاد نظر آیا، لیکن مولوی صاحب نے اپنے اس انحراف پر بہت جلد قابو پالیا، اور اب وہ زبان کے معاملے میں بھی "لا اکراہ" کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ:۔

مولوی صاحب کو افسوس اس بات کا نہیں ہے کہ کیوں نہیں پاکستان کے سارے لوگ اُردو کو اپنی مادری زبان بنا لیتے

ہیں بلکہ اس بات کا ہے کہ انگریزی زبان کو جسے غلامی کے زمانے میں ہم پر مسلط کیا گیا۔ اُسے آج آزادی کے زمانے میں کیوں پیچھے ہٹنے پر مجبور نہیں کیا جاتا ہے۔

اس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ایسا ہماری غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں ہماری غلامانہ ذہنیت کو بھی دخل ہے۔ لیکن صرف ایک یہی سبب نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہماری حیثیت آزاد نہیں ہے، اس سے بیرونی اثرات کا دباؤ اتنا پڑتا ہے کہ ہماری زبان انگریزی کی حاکمیت سے آزاد نہیں ہو پاتی ہے، چنانچہ وہ سارے حیلے بہانے انگریزی کی حاکمیت کے قائم رکھنے کے اور اپنی قومی زبانوں کو اس درجے پر نہ پہنچانے کے اسی لئے کئے جاتے ہیں۔ اب مولوی صاحب کی یہ عمر تو رہی نہیں کہ وہ اپنی حیثیت کو آزاد بنانے کی دھن میں ہل بیل لے کر کھیت میں اتر آئیں، یا بڑی بڑی مشینوں کے ڈھالنے میں لگ جائیں اور یہ نعرہ لگانا شروع کر دیں کہ "چلی مشین چلی"۔ اس لئے بعض لوگوں کے اس اعتراض کے جواب میں کہ اُردو زبان اس کی اہل نہیں ہے کہ اسے کسی یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے۔ انھوں نے اب ایک اُردو یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ بنایا ہے۔ مولوی صاحب اپنی دھن کے پکے ہیں اور کیا عجب وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں، لیکن اس راہ میں جو مزاحمتیں ہیں وہ ان سے بے خبر بھی نہیں ہیں۔

ہمارا تعلیمی نظام اب آہستہ آہستہ امریکی طرزِ تعلیم پر ڈھلنے لگا ہے۔ اور جہاں تک کہ امریکی ماہرینِ تعلیم کا اثر و رسوخ تعلیمی پالیسی میں کارگر ہونے لگا ہے، اور ہمارے اپنے لوگوں کا رجحان اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کا پیدا ہو گیا ہے، اس کے امکانات گھٹتے جا رہے ہیں کہ مولوی صاحب اپنے اس منصوبے میں کسی مستقبل قریب میں کامیاب ہو سکیں۔ کیونکہ مولوی صاحب کے اس منصوبے سے امریکیوں کا منصوبہ دوچار ہوتا ہے۔ لیکن اس سے مایوس بھی نہ ہونا چاہیے۔ آج جب کہ گھانا کی جمہوریہ جو کل تک حجری دور میں تھی، اپنی ہی قومی زبان کو تمام ریاستی کاموں اور تعلیم کا ذریعہ بنانے کا منصوبہ رکھتی ہے، تو پھر ہم کچھ اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ ہمیں اس جائز حق سے بہت دنوں تک محروم رکھا جا سکے۔

یہ بات میں نے اس لئے اٹھائی کہ ادھر حال ہی میں مولوی صاحب کی تقریر کا ایک اقتباس میری نظر سے گزرا، جس کا ایک جملہ مجھے بہت ہی پر درد معلوم ہوا۔ وہ جملہ یہ ہے: "جو شخص اردو سے نفرت کرتا ہے، وہ اپنی ماں سے نفرت کرتا ہے" اس میں شبہ نہیں کہ اگر کوئی شخص ایسا ہے جس کی مادری زبان اُردو ہے اور وہ اُردو سے نفرت کرتا ہے، تو اس پر اس جملے کا اطلاق ہونا چاہیے۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں اردو سب کی مادری زبان نہیں ہے، مولوی صاحب کا یہ جملہ کسی اور حقیقت کا غماز ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُردو یونیورسٹی کے قیام میں جو مزاحمتیں کہ بعض جگہوں سے پیدا کی جا رہی ہیں، ان کا جھٹکا مولوی صاحب کے جذبات پر ابھی سے پڑنے لگا ہے کوشش یہ کی جائے کہ مولوی صاحب اس جھٹکے سے محفوظ رہ سکیں، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہم سب اس جدوجہد میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔

مولوی صاحب کی جو اس قدر عزت اور تعظیم و تکریم کی جاتی ہے۔ اس کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ اُردو زبان کی تاریخ، اس کی لغت اور قواعد کی تدوین میں اُن کی ٹھوس خدمات ہیں جو انھیں بڑے سے بڑے عالم کے پہلو میں بٹھاتی ہیں۔ اور یہ اسی قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ سنہ ۶۰ء میں روس میں بھی اُن کی سالگرہ منائی گئی، اور وہاں کے مستشرقین نے اُن کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

مولوی صاحب کی کتاب "چند ہم عصر" ہمارے ادب میں کلاسیکی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ وہ چند ایک واقعات کی مصوری

سے آدمی کے صحیح کردار، اور اُس کی شخصیت کے بنیادی پہلو کو نمایاں کر دیتے ہیں، اس کتاب میں مولوی صاحب کی انسان دوستی بھی پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

"چونکہ مولوی صاحب انسان ہیں اس لئے تقاضائے فطرت یہی ہے کہ اُن میں بھی کچھ کمزوریاں ہوں گی، لیکن مجھے تو اُن کی زندگی تمام تر ایک شہیدِ راہِ وفا ہی کی نظر آتی ہے۔ کیا عجب جو اسی لئے رقیبوں نے اُن کی تشہیر کا سامان بھی کیا ہو۔؟ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا۔"

زبانوں کا اختلاف

ہر قوم خواہ وہ کیسی ہی حقیر کیوں نہ ہو دنیا میں ایک حیثیت رکھتی ہے۔ یہی حال زبان کا ہے۔ زبانیں بھی قوموں کی طرح بڑھتی، گھٹتی اور بدلتی ہیں۔ پھر وہ افراد اور اقوام کی طرح گردوپیش کے حالات و اثرات اور دوسری زبانوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ جس طرح قومیں مختلف تعلقات کی وجہ سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اسی طرح زبانوں میں بھی ایک دوسرے سے رشتے ناتے ہیں، ایک زمانہ آئے گا جبکہ دنیا کی تمام قوموں کو نوعِ انسانی کے حلقے میں آکر ایک ہونا پڑیگا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ وقت کب آئے گا، یہ تخیل کی جولانیاں ہیں جو آئندہ کی تاریکی میں پنہاں ہیں۔ اور ان کے ظہور کی پیشین گوئی کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ زمانہ ایک روز آئے گا جب بنی نوعِ انسان ایک قوم اور ایک ذات ہوں گے۔ اور تمام سفیہانہ اور شرمناک اختلافات جو اس وقت ادنیٰ خود غرضیوں کی بدولت بہت اہم نظر آتے ہیں۔ مٹ جائیں گے۔ لیکن زبانوں کا اختلاف پھر بھی باقی رہے گا۔ لیکن یہ اختلاف معاندانہ یا منافقانہ نہ ہوگا، بلکہ تمدن اور علم و تہذیب کو فروغ دے گا — اور ایک زبان دوسری سے تقویت اور روشنی حاصل کرے گی۔

بابائے اردو

(مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر)

ابو سلمان شاہجہانپوری

بابائے اردو کا تصور مذہب

ہر شخص کی زندگی کے مختلف پہلو اور متعدد حیثیتیں ہوتی ہیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ایک حیثیت سب حیثیتوں پر چھائی ہوئی اور کوئی ایک پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اس شخصیت کی دوسری حیثیتیں کم اہم ہوتی ہیں۔ یہ محض حالات کا تقاضہ ہوتا ہے انسانی فطرت کا لازمہ کہ وہ بیک وقت کئی چیزوں پر یکساں توجہ نہیں کرسکتا مجبوراً اسے کوئی ایک راستہ اختیار کرلینا پڑتا ہے اس لئے وہی ایک حیثیت زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ شخصیت کا صرف ایک علمی اور نمایاں پہلو ہوتا ہے۔ حالانکہ بعض اوقات وہ شخصیت ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے کاملین کا درجہ رکھتی ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم و مغفور کا بھی بالکل یہی معاملہ تھا۔ وہ مذہب و سیاست، تمدن و معیشت، اخلاق و فلسفہ، تہذیب و معاشرت تعلیم و صحافت اور دیگر علوم و فنون پر یکساں عبور رکھتے تھے اور ان کے مختلف گوشوں میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ لیکن اردو زبان سے ان کا تعلق اور عشق ان کی شخصیت پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ ان کی دوسری حیثیتوں تک عام نگاہیں مشکل سے پہنچ سکتی تھیں۔

مولوی صاحب نے جس ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی وہاں مذہب کو ایک خاص مقام و اہمیت حاصل تھی شعائر اسلامی کی پابندی پر زور دیا جاتا تھا۔ ان کے گھر کا ماحول مذہبی تھا، جس زمانے میں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی، اس وقت تک مدارس میں پرانے خیال کے استاد موجود تھے۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ تشریف لائے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے کارپرداز سب مذہبی لوگ تھے، ان کے بعض افکار و عقائد اور سیاسی معاملات میں ان کے نقطۂ نظر و مسلک سے لاکھ اختلاف کیا جائے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تمام مذہبی لوگ تھے۔ مذہب سے ان کو دلی لگاؤ تھا اور اصلاح کا داعیہ رکھتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اسی ماحول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسلامی اخلاق و تہذیب اور انہیں بنیادوں پر معاشرہ کی تعمیر کے زبردست حامی رہے ممکن ہے ان کے بعض دینی افکار سے اختلاف کی گنجائش نکل آئے

اور علمی اعتبار سے بھی وہ تقویٰ کے معیار پر پورے نہ اتریں لیکن قلبی طور پر وہ ایک پختہ ایمان مسلمان تھے اور اسلام سے اُن کا تعلق محض رسمی نہ تھا بلکہ قریبی تعلق رکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ اسلام سے جذباتی تعلق رکھتے تھے۔ وہ سرسید، محسن الملک وقارالملک اور حالی و شبلی کے سلسلے کی ایک کڑی تھے اور انہوں نے بالواسطہ اور بلاواسطہ ان بزرگوں سے اکتساب فیض کیا تھا، اور قومی زندگی کی یہی وہ عظیم شخصیتیں تھیں جو بطور نمونہ ان کے پیش نظر تھیں۔ مولوی صاحب کو دیکھ کر اور مل کر ان بزرگوں کی یاد آتی تھی۔ جن کی ادبی زندگی کی ابتدا زمانۂ قیام علی گڑھ میں ہو چکی تھی۔ اور مذہب و تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔ حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں انہوں نے ابتداً جو علمی و ادبی کام کیا اس کا موضوع بھی مذہب اور اسلام تھا۔ "العالم الاسلامی" کے نام سے ان کی ایک کتاب دکن ریویو میں بالاقساط شائع ہوئی۔ جو ان کی اسلام سے وابستگی اور شیفتگی کا نتیجہ تھا۔ مولوی چراغ علی کی کتاب کا ترجمہ "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" کے نام سے کیا۔ معرکۂ مذہب و سائنس کا گرانقدر مقدمہ اسلام سے اسی وابستگی و تعلق کا نتیجہ تھا، اگرچہ بہت جلد ان کا موضوع مذہب و تاریخ کے بجائے اردو اور لسانیات بن گیا، لیکن انہوں نے مذہب کے بارے میں جو تحریرات اپنی یادگار چھوڑی ہیں وہ اس قدر گراں قدر ہیں کہ ان کا شمار مولوی صاحب کے کارناموں میں ہوگا۔ اگرچہ دنیا آج تک اس اعتبار سے ان کی عظمت کا اندازہ نہ لگا سکی لیکن بہت جلد اس پر واضح ہو جائے گا کہ وہ جو ایک دیوانہ تھا جسے بابائے اردو کے معزز خطاب سے یاد کیا جاتا ہے، وہ اسلام کا والہ و شیدا مبلّغ، مذہب کا ترجمان اور اس اعتبار سے بھی مسلمانوں کا بہت بڑا محسن تھا۔

اردو زبان کی حیات کے لئے ان کی بہت بڑی خدمات ہیں۔ اردو زبان کو ان کی وجہ سے حیات تازہ نصیب ہوئی۔ اردو کے لئے انہوں نے کیا کیا کام کئے اور کس طرح قربانیاں دیں، ان کی جمع و ترتیب ہی کے لئے وقت چاہیئے۔ پھر کہیں ان کی خدمات کا اندازہ لگایا جا سکے گا اور اس کے بعد ہی ان کے حقیقی مقام کا تعین ہو سکے گا۔ اور اس وقت سوچنا پڑیگا کہ آخر وہ کون سے الفاظ اور کیا خطاب ہو سکتا ہے جس سے اس کے مقام رفیع اور اپنی عقیدت کا اظہار کیا جا سکے کچھ لوگ اپنے خطاب سے بڑے بنتے ہیں اور کچھ لوگ خطاب سے بڑے ہوتے ہیں۔ بابائے اردو کا تعلق ان سے تھا۔ جو خطاب سے بڑے ہوتے ہیں، ان کی عظمت نہ خطاب کی محتاج تھی، نہ حکومت کی نظر عنایت اور نہ عوام کی التفات کی۔ البتہ ان کی عظمت نے ان کے سامنے حکومت کو بھی جھکا دیا تھا اور عوام کے دلوں کو بھی ان کی جانب پھیر دیا تھا۔ لیکن ان کی زندگی کا یہ صرف ایک پہلو تھا، ان کی زندگی کا دوسرا پہلو وہ تھا جس کی جانب ابھی اشارہ کیا تھا یعنی مذہب کے بارے میں ان کا تصور اور ان کے دینی افکار و خدمات — اردو زبان میں مذہبی اور دینی لٹریچر کی کمی نہیں۔ اور ایسے علماء و فضلاء کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جن کا مستقل موضوع مذہب رہا ہے اور انہوں نے لاتعداد و بیش قیمت تصانیف کا اضافہ اردو زبان میں کیا ہے۔ اور بلاشبہ مسلمانوں پر ان کے احسانات ہیں، ان کی خدمات بہت زیادہ ہیں اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ان کے شکر گزار ہوں۔ اگرچہ بعض لوگوں نے مولوی صاحب کو ان محسنین اور خدمت گزاران اسلام میں شمار نہیں کیا لیکن

واقعہ یہ ہے کہ ان کا ایک خاص مذہبی مقام ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ ہماری کوتاہ بینی ہے کہ ہم نے ان کی خدمات کے اس خاص پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔

اگر اردو میں کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے اسلامی خدمات کا فیصلہ کیا جائے تو مولوی صاحب کی جگہ شاید سب سے آخر میں ہوگی۔ لیکن اصل چیز تصانیف کی تعداد اور کسی تحریر کی ضخامت نہیں بلکہ اس کی علمی حیثیت اور معنوی قدر و قیمت ہے، پس اگر اس اعتبار سے ہم مولوی صاحب کی صرف ایک مختصر مذہبی تحریر "معرکۂ مذہب و سائنس کا مقدمہ" پیش نظر رکھیں تو اس کی بنا پر وہ علماء اسلام کی پہلی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

انہوں نے جس طرح اس "مقدمہ" میں سائنس کے مقابلے میں مذہب کے مقدمہ کی پیروی کی ہے اور مقدمہ کو جیتا ہے، وہ وقت کے کسی دوسرے عالم کا کام نہ تھا۔ اس مقدمہ سے مولوی صاحب مرحوم کے علم و فضل اور ان کے وسیع مطالعہ ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ یہ مذہب سے ان کے تعلق کی ناقابل انکار دستاویز ہے۔ صرف اس مختصر تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی صاحب نے اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب اور فلسفہ، طبعیات، نفسیات، تاریخ، سائنس اور دیگر علوم و فنون کا کتنا گہرا اور کس قدر وسیع مطالعہ کیا ہے۔

مولوی صاحب نے اس "مقدمہ" میں اپنی بحث کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، پہلے انہوں نے سائنس پر مذہب کی برتری کو مختلف طریقوں اور دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے اس کے بعد مذاہب عالم پر اسلام کی برتری کو ثابت کر دکھایا ہے۔ اور ان دونوں مرحلوں سے ایسی کامیابی کے ساتھ گزرے ہیں، کہ تعجب ہوتا ہے۔ عام طور پر اس قسم کی تحریرات اصول منطقیہ اور قواعد و مباحث کلامیہ سے مربوط کی جاتی ہیں یا پھر طنز و تعریض، طعن و تشنیع سے کام لیا جاتا ہے کہیں عام لوگوں کی خوش عقیدگی سے کام نکالا جاتا ہے تو کہیں شاعرانہ خیال آرائیوں سے اور دلائل و براہین سے کام لیا جاتا ہے اس قسم کی تحریرات بعض اوقات بڑی رنگین ہو سکتی ہیں لیکن اس سے اہل علم کا اطمینان نہیں ہوتا۔ محض خوش عقیدہ لوگ ان کو پڑھ سکتے ہیں لیکن اہل نظر کے لئے ان میں کوئی بات قابل اعتنا نہیں ہوتی اور طالب حق و صداقت کو ان سے سخت وحشت ہوتی ہے۔

مولوی صاحب مرحوم نے اس طرح اس مقدمہ کو پیش کیا ہے، کہ ایک ایک لفظ دل میں اترتا چلا جاتا ہے، انداز بیان اتنا شگفتہ اور موثر کہ اس سے بہتر کا تصور نہیں جا سکتا، اس مقدمہ میں انہوں نے عبارت آرائی کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی لیکن علم و خلوص کی ایسی گھلاوٹ ہے کہ قاری کا قلب و ذہن متاثر ہوتا چلا جاتا ہے۔ غیر مذہبی اور محض عقلی و سائنسی نظریات کی ایسے انداز میں تردید کی ہے کہ مخالف کے لئے اس سے انکار مشکل اور ناممکن ہو جاتا ہے دلائل و براہین اس طرح صفیں باندھے کھڑے نظر آتے ہیں کہ ان سے غنیم کا بچ کر نکل جانا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ جہاں دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کے مقدمہ کو پیش کیا ہے اور جس طرح اسلام کی برتری کو ثابت کیا ہے وہ بیان میں لانے کی چیز نہیں صرف

مطالعہ واحساس کی چیز ہے۔

اگرچہ مولوی صاحب کی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی تھی لیکن اس کے بعد ان کا ماحول مذہبی نہ رہا بلکہ ایک آزادانہ ماحول تھا جہاں ہر مذہب و ملت اور مختلف فکر و خیال کے لوگ تھے۔ اس کے علاوہ ان کی عملی زندگی بھی اس قسم کی نہ تھی جیسی کہ عام مولوی کی ہوتی ہے اور اس کے باوجود کہ وہ علوم و فنون کے مختلف گوشوں میں بہت وسیع نظر رکھتے تھے لیکن وہ مذہبی افکار و نظریات اور عقائد کے اعتبار سے عام تجدد پسندوں کی طرح آزاد خیال بھی نہ تھے۔ خدا اور رسول، حشر و نشر، حساب و کتاب، جنت و دوزخ، نیکی و بدی، رسولوں اور ملائکہ وغیرہ پر اسی طرح پختہ ایمان رکھتے تھے جس طرح ایک خوش عقیدہ مولوی رکھ سکتا ہے۔ البتہ ان کا تصور مذہب اس قسم کا محدود نہ تھا جیسا کہ عام طور پر کسی مولوی کے بارے میں خیال کیا جا سکتا ہے ـــ وہ اگرچہ مذہبی تقشف سے بہت دور تھے لیکن ان کی آزاد خیالی مذہبی حدود سے متجاوز نہ تھی ـــ وہ اگرچہ عقل و فکر اور تحقیق و جستجو کی راہوں پر ایک صاحب عقل و فکر اور محقق متجسّس کی طرح چلتے تھے، لیکن، فکری و اصلاحی اور اخلاقی اور اسلامی و دینی نتائج اخذ کرنے میں وہ ایک عالم دین اور مصلح قوم کی سطح پر ہوتے تھے۔

مذہب کے بارے میں ان کا تصور کسی خانقاہ کے سجادہ نشین، صوفی اور ملائے مسجدی کی طرح نہیں بلکہ ایک مسلمان فلسفی اور مفکرؔ کی طرح ہے۔ اور یہی چیز سب سے زیادہ متاثر کرنے والی ہے۔ مذہب کے بارے میں فرماتے ہیں۔

> ”مذہب کو منطق و استدلال سے اتنا تعلق نہیں جتنا کہ انسان کے جذبات لطیفہ، وجدانِ قلب سے ہے اور اسی لئے مذہب پر بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان رسمی قیود سے باہر نکل کر نظر ڈالے اور اس میں وہ جوش اور حرارت ہو جو ایک سرد مہر منطقی یا ایک نابیاں دنیا دار میں نہیں ہو سکتی۔“
>
> (افکار عبدالحق ص۲۲۵ مرتبہ آمنہ صدیقی)

مولوی عبدالحق صاحب کے یہاں ایک بڑی چیز جامعیت ہے انہوں نے ہر علم و فن کی حقیقت کو پالیا اور اس کی حدود کو جان لیا ہے مذکورہ مقدمہ میں یہ بات بہت نمایاں ہے۔ ایک جگہ پر عقل و جذبات کے حدود اور ان کے کام کی تفصیل بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ صرف عقل یا محض جذبات انسانی زندگی کے مسائل کو حل نہیں کر سکتے بلکہ ان سے بالاتر ایک قوت حاکمہ ہونی چاہیئے جو ان دونوں سے کام لے اور وہ قوت ”مذہب“ ہے فرماتے ہیں۔

> ”عقل اور جذبات میں اتحاد پیدا کرنا، ظاہر اور باطن میں موافقت قائم رکھنا، ایک دوسرے کو حدِ اعتدال سے نہ بڑھنے دینا، جسم کے افعال کو عقل و جذبات کے زیر حکومت رکھنا، مذہب کا کام ہے۔“

مزید فرماتے ہیں کہ

ہ فلسفہ ومنطق اور علوم نظری عقل کو بڑھاتے اور ترقی دیتے ہیں۔ تمدن، پالٹیکس اور اتحاد مقاصد انسانی و قومی جذبات کو فروغ دیتے ہیں، لیکن مذہب کا حق یہ ہے کہ وہ عقل وجذبات کو ساتھ ساتھ اور برابر بڑھائے، باہم اعتدال قائم رکھے اور قوت حیوانی کو دماغی اور احساسی حصہ جسم کی پرورش اور نشوونما میں یکساں صرف کرے۔" (افکار عبدالحق صفحہ ۷۵)

اس فلسفۂ عقل وجذبات پر ایک اور انداز سے روشنی ڈالتے ہیں اور عقل وجذبات پر مذہب کی برتری ثابت کرتے ہیں۔

"انسان کو فطرتاً دو ضرورتیں ہوتی ہیں - ایک علم کی دوسری محبت کی۔ علم کا تعلق عقل سے ہے اور محبت کا جذبات سے۔ عقل چاہتی ہے کہ سب میرے تابع ہوں اور میرے اشارے پر چلیں۔ جذبات کہتے ہیں کہ ہم سب کو دبا کر رکھیں اور من مانی حکومت کریں۔ مذہب کا تعلق ان دونوں سے ہے، وہ عقل سے جذبات کی روک تھام کا کام لیتا ہے، اور جذبات سے عقل کے ہوش درست کرتا ہے۔ .... جہاں عقل اور جذبات میں اتحاد و اعتدال نہیں رکھا گیا وہ مذہب نہیں بلکہ ایک قسم کا فلسفہ یا کچھ اور ہے ...... جو مذہب محض استدلال اور قیاس ہے وہ کوئی مذہب نہیں، وہ فلسفہ ہے اور جس میں صرف جذبات ہی جذبات ہیں، وہ اکثر توہمات میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔"

مولوی صاحب کے نزدیک خرابیوں کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ عقل وجذبات میں اتحاد و اعتدال سے کام نہیں لیا جاتا، ان کو اپنی حدود سے متجاوز ہونے سے نہیں روکا جاتا۔ ظاہر ہے کہ عقل وجذبات خود اس مقدمہ کا فیصلہ نہیں کر سکتے ایک تیسرے کی ضرورت ہے جو فیصلہ کر سکے لیکن ضروری ہے کہ نہ صرف عقل ہو نہ محض جذبہ ـــ بلکہ ایک ایسی قوت حاکمہ ہو جو ان دونوں سے بلند ہو لیکن بے تعلق نہیں بلکہ ایسی قوت جو عقل وجذبہ دونوں کی ترجمانی اور نمائندگی بھی کر سکے اور فیصلہ بھی کر سکے، مولوی صاحب موصوف کے نزدیک یہ قوتِ حاکمہ "مذہب" کے سوا کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر مذہب میں صرف عقل ہی کو نمائندگی دی گئی ہو اور استدلال وقیاس کو بنیادی حیثیت دے دی گئی ہو یا محض جذبات کی کارفرمائی ہو اور جہاں علم و استدلال کی آواز نہ سنی جاتی ہو وہ مذہب نہیں مجموعہ توہمات بن جاتا ہے۔ کسی کو گھٹانے اور کسی کو بڑھانے کا عمل یہاں سخت مضر ہوتا ہے۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں۔

"مذہبی جذبات کو جب حد سے بڑھا دیا جاتا ہے تو یا تو وہ پیچیدہ اسرار ہوتے ہیں یا ایک ناواجب خوف کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دونوں مضر ہیں۔ ایک کو بڑھا کر دوسرے کو گھٹانا ٹھیک نہیں ـ دلی جذبات کی عقل سے روک تھام کی جانی چاہیئے اور عقل بے پروا نہ کی اصلاح جذبات سے۔"

صرف عقل کو مولوی صاحب کوئی اہمیت نہیں دیتے ان کے نزدیک محض عقلی ترقی کی بنیاد پر کوئی قوم زندہ نہیں رہ

سکتی - زندگی کے لئے عقل کی نہیں مذہب و اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے - اگر کوئی قوم محکوم و غلام ہو تو وہ دنیا میں زندہ و قائم رہ سکتی ہے لیکن اگر کوئی قوم عقلی ترقی کے منتہائے کمال کو پہنچ جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کا اگلا قدم تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں - پھر انہوں نے یہ دعویٰ بغیر دلیل نہیں کر دیا بلکہ اس پر ایک ایسا تاریخی استدلال پیش کرتے ہیں - جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا - فرماتے ہیں -

"یونان کی عقلی ترقی دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے اور بڑے بڑے اہل آرار کی رائے ہے کہ باوجود زمانۂ موجودہ کی حیرت انگیز ترقی کے ہم ابھی تک اس درجہ کو نہیں پہنچے اور ہم اب بھی سقراط، افلاطون و ارسطو و قیٹڈی اس جیسے لوگ پیدا نہیں کر سکے - لیکن باوجود اس زبردست عقلی ترقی کے وہ ایسا نیست و نابود ہوا کہ گویا کبھی پیدا ہی نہ تھا - یہ اس لئے کہ اس ترقی میں عقل غالب آگئی تھی اور اخلاقی و مذہبی اصول تابع عقل کر دیئے گئے تھے - اسی بد اخلاقی و بد مذہبی نے روما کو تباہ برباد کیا - لیکن یہودی اور ہندو باوجودیکہ صدیوں سے محکوم اور غلام ہیں اب تک باقی ہیں اور ان میں ترقی کی صلاحیت موجود ہے - روما و یونان کے زوال کی تاریخیں پڑھنے سے حیرت و عبرت ہوتی ہے - اور یہ بہت بڑا سبق ہے ان اقوام کے لئے جو دنیا میں بڑھنا اور ترقی کرنا چاہتی ہیں"

مولوی صاحب مرحوم نے عقل و جذبات اور فلسفہ و سائنس اور مذہب پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور اس پر مذہب کی فوقیت ثابت کی ہے اور بتایا ہے کہ صرف عقل و جذبات یا سائنس کی ترقی شیرازۂ عالم کو متحد نہیں رکھ سکتی اس لئے کہ عقل ہمیں اپنا ہی فائدہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے، جذبات صرف اپنی ہی حیوانی خواہشات پوری کرنے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن اگر عقل و جذبات کو اس بات کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو اس عالم میں فساد برپا ہو جائے - انسانی تمدن کی ترقی کے لئے ایثار اور سوسائٹی کے فائدے کو اپنے فوائد پر مقدم سمجھنا اور اپنی اغراض کو دوسرے کے لئے قربان کر دینا ضروری ہوتا ہے' یہ ایثار و قربانی کا سبق عقل و سائنس یا فلسفہ نہیں سکھاتا بلکہ یہ سبق مذہب سکھاتا ہے - حضرت بابائے اردو فرماتے ہیں -

"مذہب ہمیں ذاتی اور شخصی قربانی اور ایثار سکھاتا ہے، نہ صرف ان لوگوں کی خاطر جو ہمارے آس پاس زندہ موجود ہیں - بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی جو آئندہ زمانے میں آئیں گے اور ابھی وجود میں نہیں آئے، حالانکہ یہ امر ذاتی فوائد کے خلاف ہے"

دنیا کی سیر ترقی اس ایثار و قربانی کا نتیجہ ہے اور ایثار و قربانی کے محرک و داعی مذہبی و اخلاقی اصول ہیں یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو لوگ مذہب کی ضرورت سے انکار کرتے ہیں اور کسی مذہب و اخلاق کے ضابطہ اور اصول کو نہیں مانتے وہ بھی غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی مذہبی اور اخلاقی اصول کے تابع ہوتے ہیں - مولوی صاحب مرحوم و مغفور فرماتے ہیں -

"دنیا میں جہاں کہیں اصلی ترقی ہوئی وہاں اخلاقی اور مذہبی رجحان غالب رہا اور عقل اس کی تابع رہی۔ عقل بے شک ہماری رہبر و رہنما ہے لیکن اس کا احاطہ محدود اور اس کی نظر تنگ ہے، اور اس لئے ضرورت ہے۔ ایک ایسی ہدایت کی جو اس سے آگے نہیں لے جائے اور یہ کمی مذہب سے پوری ہوتی ہے۔"

"اکثر کہا جاتا ہے کہ جو لوگ مذہبی اور اخلاقی نظام کے بالکل قائل نہیں وہ باوجود اس کے نیک نیت اور معتبر اور نیک چلن ہوتے ہیں۔ لیکن یہ امر ماننے یا نہ ماننے پر منحصر نہیں ہے۔ انسانی تمدن یا انسانی ترقی چند اشخاص یا ایک آدھ نسل کا کام نہیں ہے قرنوں اور نسلوں کی جدوجہد کے بعد حالت درست ہوتی ہے۔ جو شخص کسی اصول اخلاق و مذہب کا قائل نہیں ہے وہ بھی اس سلسلۂ تمدن کی پیداوار ہے۔ اس کی نشست و برخاست، بات چیت، طرز خیال، غرض کل حرکات و افعال اسی سانچے میں ڈھلے ہیں اور اسی سوسائٹی سے ارثاً، تعلیماً، صحبتاً ملے ہیں وہ ہزار زبان سے انکار کیا کرے لیکن جو روش و رجحان طبیعت اس میں پیدا ہو گیا ہے وہ اسے زائل نہیں کر سکتا یعنی وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ مجبور ہے ہے اور بات بات میں اسی نظام اخلاق و مذہب کا تابع ہے جس سے وہ انکار کرتا ہے اور جس کی تضحیک کرتا ہے۔"

(افکار عبدالحق ص ۳۱۰، ۳۱۱)

مولوی صاحب مذہب کو انسان کی فطری ضرورتوں میں سے شمار کرتے ہیں، مذہب کے بغیر ان کے نزدیک انسانیت کی تعمیر ممکن نہیں اور جب تک انسانوں کو حقیقی انسان نہ بنایا جائے اور ان کی تعمیر صحیح بنیادوں پر نہ ہو یہ دنیا امن و سکون اور اطمینان و عافیت کا گہوارہ نہیں بن سکتی۔

عام معنوں میں بابائے اردو مذہبی آدمی چاہے نہ ہوں لیکن انہوں نے اپنی تحریرات میں مذہب کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے پیش نظر وہ بڑے پکے مذہبی شخص تھے انکے قلم سے کوئی ایسا لفظ نہیں نکلا نہ ان کی زبان پر کوئی ایسا کلمہ جاری ہوا جس کا سراغ ان کی زندگی، عمل اور کردار میں نہ لگایا جا سکے۔ انہوں نے ایثار قربانی، اپنے مفاد پر دوسروں کے مفاد کو مقدم رکھنا، دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دینا، فراغ دلی، وسعت نظر، ضبط و نظم، تحمل و بردباری کو مذہب کا لازمہ بتایا ہے اور ان میں سے کوئی ایسی چیز نہیں جو ان کی زندگی کا عملی حصہ نہ رہ چکی ہو۔ اس اعتبار سے وہ خالص مذہبی شخص تھے۔

لیکن خود مذہب کی حقیقت کیا ہے؟ اور مذاہبِ عالم میں اسلام کا کیا درجۂ مقام ہے؟ مذہب و اخلاق کا کیا تعلق ہے؟ اخلاق کے بارے میں مولوی صاحب مرحوم کا نقطۂ نظر کیا تھا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس بحث کو "بابائے اردو کا تصورِ مذہب" پر ختم کرتے ہیں اور آئندہ صحبتوں میں انشاءاللہ دوسرے سوالات پر بحث کریں گے۔

عکس تحریر

انجمن ترقی اردو کالج کراچی

تمام برعظیم ہند و پاکستان میں اگر کوئی کالج یہ دعوا کرسکتا ہے کہ وہ صحیح قومی بنیاد پر قائم ہوا ہے تو وہ انجمن ترقی اردو کالج کراچی ہے۔ اس نے اپنے عمل اور نتائج سے یہ ثابت کردیا ہے کہ ہماری قومی زبان اردو میں یہ قوت اور صلاحیت ہے کہ وہ اعلا سے اعلا تعلیم کا ذریعہ ہوسکتی ہے۔ اس نے ذلت و محکومی کے طوق کو اتار کر پھینک دیا ہے جس کے بغیر قومی آزادی نا مکمل اور ناقص محسوس ہوتی تھی۔ یہ محض ایک درسگاہ نہیں بلکہ یہ ایک حیات افزا تحریک ہے جس کے ذریعے سے قومی تہذیب و روایات کو زندہ رکھنا، پاکستانی نوجوانوں کے دلوں میں قومی غیرت و حمیت کے جذبات کو اُبھارنا اور علم کو جو ایک مخصوص حلقے میں محدود ہوکر رہ گیا ہے، عام کرنا ہے۔

اِس کالج کو قائم ہوئے چھٹا برس ہے۔ نہایت نامساعد حالات میں قائم ہوا۔ لیکن باوجود سرمایہ کی ناداری کے ہر سال برابر ترقی کرتا رہا۔ اِس وقت طلبہ کی تعداد سولہ سو ہے، اور اس میں اردو عربی فارسی انگریزی السنہ اور اسلامیات، تاریخ، معاشیات، فلسفہ، ریاضی، سائنس، تجارت اور قانون کی تعلیم ہوتی ہے۔ اور پورے پاکستان میں یہ واحد کالج ہے جس میں یہ چاروں شعبے ایک ساتھ قائم ہیں اور یہ تمام علوم اردو زبان کے ذریعہ پڑھائے جاتے ہیں۔ درسگاہوں کے افادے کی جانچ اُن کے امتحانی نتائج سے بھی کی جاتی ہے۔ اس میں بھی ہمارے کالج کے طلبہ نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

ہمارے پیش نظر اِس کالج کی ترقی اور طلبہ کی تربیت کے لیے ایسے مفید اور جامع منصوبے ہیں کہ اگر سرمایہ نے مساعدت کی اور عمل میں آگئے تو یہ کالج قومی تعلیم و تربیت کی بے نظیر درسگاہ ہوجائے گا۔ ہم سائنس کے بعد

قانون کے شعبوں کو زیادہ وسیع کیا جاتے ہیں اور اگر کافی سرمایہ بہم پہنچ سکی تو ان شعبوں کو اعلا مدارج تک پہنچا دیں گے ۔ تعلیم قومی تعمیر کا سب سے اہم جزو ہے اور یہ تعمیر اسی وقت مستحکم وسیع جامع اور کارآمد ہو سکتی ہے جب اس کی اساس قومیت پر ہو ۔ قومیت پر اساس ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی اشاعت قومی زبان کے ذریعہ کی جائے ورنہ علم ایک نہایت تنگ دائرے میں محدود ہو کے رہ جائے گا ۔ اور اہل پاکستان کی ایک بڑی اکثریت علم و تہذیب کی دولت سے محروم ہو جائے گی ۔

لہذا

ہم اُن تمام اصحاب سے جو اپنی تہذیب و روایات اور اپنی قومی زبان سے محبت رکھتے ہیں اور علم کی عام اشاعت کے خواہاں ہیں ۔ یہ التماس کرتے ہیں کہ وہ اس اہم اور مبارک کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں ۔

ہم اس وقت زیادہ نہیں صرف ایک لاکھ کی امداد چاہتے ہیں تاکہ جو کام اس وقت نامکمل ہے اُن کی تکمیل کر دی جائے ۔ اس میں ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق کچھ نہ کچھ دے سکتا ہے ۔ ایک ایک اینٹ سے محل تیار ہو جاتا ہے ، قطرہ قطرہ دریا اور دانہ دانہ خرمن بن جاتا ہے اور ایک ایک روپے سے کروں روپے جمع ہو جاتے ہیں ۔

آئیے اور اس ایوان علم کی تعمیر میں جتنا کچھ بھی آپ دے سکتے ہیں عنایت فرمائیے ۔

نہ عیش تخت رہے گا نہ مولت بہمنی رہے گی
رہے گی ای منعمو تو باقی دیے کی کچھ روشنی رہے گی

غزل اور متغزلین

حالی کے بعد کچھ دنوں غزل پر لیت لے دے ہی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بعض فرسودہ رسم و رواج کی طرح یہ صنف کلام متروک

ہو جائے گی۔ لیکن یہ ہماری تہذیب، ہماری روایات، ہمارے
خیالات و تصورات میں ایسی رچی ہوئی تھی کہ اس کا ترک چاہے
اختیار سے باہر تھا۔ حالی اصلاح چاہتے تھے۔ انھوں نے اس میں
وسعت پیدا کی۔ پھر اس کی وسعت کا دائرہ روز بروز بڑھتا
چلا گیا۔ اس نے وقت کے تقاضوں اور ماحول کے اثرات کو اپنے
میں ایسا جذب کیا کہ اس کے حسن و جمال میں ایسی دلکشی اور
رعنائی پیدا ہو گئی کہ وہ تمام اصناف سخن پر چھا گئی اور اس کی
مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ عالم و عامی، پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب اس
کے شیدائی ہیں۔ یہ بہت نازک صنف ہے۔ اس کی اپنی زبان ہے اور حسنِ
بیان اس کی جان ہے۔

اس کتاب کا موضوع غزل ہے۔ ڈاکٹر عبادت نے غزل کے
ارتقا، اس کی اہمیت، اس کے جمالیاتی پہلو، جدید رجحانات
اور اس کے مستقبل غرض اس کے ہر پہلو پر بہت تفصیلی اور
بصیرت افروز بحث کی ہے اور غزل سے متعلق تمام مسائل کا
تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ چند مضامین غزل کے اصول کی تنقید میں
ہیں اور چند غزل کے ارتقا پر۔ غزل پر ایسی جامع
کتاب جس میں غزل پر اس تفصیل سے بحث کی گئی ہو اب تک
نہیں لکھی گئی۔ ڈاکٹر عبادت صاحب اردو کے ممتاز نقادوں
میں ہیں اور ان کا انداز تنقید امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

[illegible]

انسان بنو

ایک فلمی گیت کی ٹیپ ہے "انسان بنو"۔ آدمی نے ارتقا کی بے شمار منزلیں
طے کر لی ہیں اور اتنا آگے بڑھ گیا ہے کہ قیاس اس کا جائزہ لیتے ہوئے
لڑکھڑاتا ہے۔ اس پر بھی وہ حقیقی انسانیت سے دور ہے۔ وہاں تک
پہنچنے کے لیے اُسے ابھی بہت سی بے شمار منزلیں طے کرنی ہیں۔ اپنے قدیم ترین
مورثوں سے ورثے میں جو کچھ ملا تھا اس میں کا ابھی اتنا کچھ باقی ہے کہ
انسانیت اس کے نیچے دب کے رہ گئی ہے۔ کیڑے مکوڑوں، مویشی، بہائم اور
درندوں کے عادات و خصائل دلوں کی تہ میں ایسے چھپے بیٹھے ہیں کہ
وقت پر یکبارگی چشمے کی طرح پھوٹ نکلتے ہیں۔ چونکہ اس کلمے کو
عقل بھی معاون ہوتی ہے اس لیے وہ انتقام، خونخواری اور غارتگری وغیرہ

ہے اپنے قدیم بھائی بندوں سے بازی لے جاتا ہے۔
دنیا میں کیسے کیسے عالم، فاضل، عالی ہمت ادیب، شاعر، حکیم و فلسفی، بہادر سپہ سالار، نامور فاتح اور جلیل القدر سلاطین گزرے ہیں کہ ان کے کارناموں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن ان میں کتنے ہیں جو حسنِ انسانیت سے آراستہ ہیں؟

آج کل دنیا کی حالت پر نظر ڈالیے۔ دنیا کو چھوڑیے اپنے ہی ملک کو دیکھیے۔ خودغرضی، بے حیائی، حب جاہ و منصب، انتقام، لوٹ کھسوٹ، خیانت، بد دیانتی، حیلہ سازی، کمینہ پن، غداری کیا ہے جو یہاں نہیں۔ ذاتی مفاد ملک و قوم کے مفاد پر مقدم ہے۔ اپنی ذات سب کچھ باقی سب ہیچ۔ یہ انتہائی پستی ہے۔ اکثر قومیں اور سلطنتیں اسی پستی کے نذر ہو گئیں۔

ٹلی گیٹ کہتا ہے "انسان بنو"
مرزا غالب فرماتے ہیں "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"۔
حالی کہتے ہیں "فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ"

کیا یہ فی الحقیقت ایسی نایاب شے ہے؟ کیا ہمارے درسوں کا لجوں یونیورسٹیوں میں کہیں انسان گری نہیں سکھائی جاتی؟ کیا دستور ساز اسمبلی، کابینہ، پارلیمان میں اس کے حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہے؟ اگر انسانوں کے یہ ادارے انسانیت سکھانے سے قاصر ہیں تو اس کے حصول کی کیا صورت ہے؟ یہ غور کرنے کی بات ہے۔

[signature]

اُردو اور صرف اردو

جو نامعقول اور ناقابل قبول لسانی ضابطہ (فارمولا) لیگ کی پارلیمنٹری پارٹی اور مجلس دستور ساز نے منظور کیا ہے، اس میں زبان کے متعلق تین نام استعمال کیے گئے ہیں۔ ۱۔ اوفیشیل لنگوایج۔ ۲۔ اسٹیٹ لنگوایج۔ ۳۔ نیشنل لنگوایج۔ یعنی دفتری زبان، سرکاری زبان اور قومی زبان۔ یہ الفاظ بے سوچے سمجھے استعمال کیے گئے ہیں اور مجوزین فارمولا نے ان کو مترادف سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات حقیقت سے کس قدر دور اور زبان کے مسئلہ سے کس قدر ناواقف ہیں۔

مملکت پاکستان ایک فیڈرل یعنی وفاقی حکومت ہے، لہذا اس کی زبان بھی فیڈرل یعنی وفاقی ہونی چاہیے۔ وفاقی زبان سے مراد وہ زبان ہے جو پاکستان کے ہر حصے (یونٹ) میں زیادہ سے زیادہ

بولی اور سمجھی جاتی ۔ اس بنا پر علاقائی اور صوبائی زبانیں خود بخود خارج ہو جاتی ہیں خواہ وہ چار کروڑ کی ہوں یا چار لاکھ کی۔ کیونکہ وہ ایک محدود رقبے میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور اس سے باہر انھیں کوئی نہیں سمجھتا ۔ اس لیے ان میں سے کوئی زبان بھی وفاقی حکومت کی زبان نہیں ہو سکتی ۔ پاکستان کی وفاقی زبان صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اردو ہے جو نہ صرف پاکستان بلکہ برعظیم پاک و ہند اور اس سے باہر بھی دور دور پھیلی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم علیہ الرحمہ نے اسے پاکستان کی واحد زبان قرار دیا تھا۔

مجلس دستور ساز کی یہ نامبارک مہم جو ہماری وفاقی اور قومی زبان کو پامال و برباد کرنے کے لیے کی گئی ہے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ انجام کار اسے ناکامی اور ذلت نصیب ہوگی۔

نیا دور

یہ لازم نہیں کہ ہر انقلاب اچھا ہی ہو اور ہر تغیر بلندی اور اصلاح کا پیش خیمہ ہو ۔ درخت اپنے پھل سے اور انسان اور اوقات اپنے عمل سے پہچانے جاتے ہیں

نئی کابینہ کے نئے ارکان ہمارے لیے کچھ نئے نہیں ہیں یہ جانے پہچانے اور دیکھے بھالے ہیں ان میں کتنے ایسے ہیں جنھوں نے پاکستان کے لیے قربانیاں کیں، مصیبتیں اور سختیاں جھیلیں اور جان جوکھوں میں ڈال کر کسی مشتعل ہو کر جہاد کیا ہو اور ان میں کتنے ایسے ہیں جنھوں نے علی الاعلان پاکستان کی مخالفت اور قائد اعظم کی تضحیک کی ۔ ان سے قطع نظر کرکے دیکھنا یہ ہے کہ یہ کرتے کیا ہیں ۔ اور اسی سے ہم انھیں جانچیں گے۔

خود غرضی ، ہوسناکی ، حب جاہ و منصب ، خیانت ، بددیانتی ، رشوت ، جعلسازی ، غداری کیا ہے جو یہاں نہیں ہے ۔ ذاتی منفعت ملک و قوم کے مفاد پر مقدم ہے ۔ اپنی ذات سب کچھ باقی سب ہیچ ۔ یہ اخلاق کی انتہائی پستی ہے ۔ اکثر وزیر اور سلطنتیں اسی پستی کی نذر ہو گئیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ نئے وزرا جو برسراقتدار آئے ہیں ان ناپاک خواہشوں کے دور کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں

ملک میں ہر طرف انتشار نظر آتا ہے ۔ گروہ بندی اور صوبہ پرستی نے نفاق و تفرقہ پیدا کر رکھا ہے ۔ عمل اقتدار کے ہاتھ توڑ جوڑ اکھاڑ پچھاڑ اور واسطہ

اور سازشوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ انتشار کی یہ صورت صوبوں صوبوں کے درمیان اور صوبوں اور مرکز کی جو کشمکش پاکستان کی حقیقت سے غافل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مرض کا جو مزمن ہوتا نظر آتا ہے کیا علاج کیا جائے گا۔

مہاجرین نے پاکستان کی بنیاد میں شامل قربانیاں کیں اور جان و مال کی، مصیبتیں گوارا کیں، گھر بار لٹا کر صرف اس لئے پاکستان حاصل کیا۔ وہ آج بے گھر اور بے اختیار ہیں۔ اُن کی طرف سے جو ناقابل معافی غفلت اور بے اعتنائی کی جا رہی ہے۔ [illegible] اور اُن کے حقوق کو پامال اور اُن کی قربانیوں کو خاک میں ملایا جا رہا ہے وہ جرم ہی نہیں معصیت ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اُن کے زخموں پر مرہم رکھنے اور اُن کی خوش حالی اور بہبود کے لئے حکومت وقت کیا تدبیریں اختیار کرتی ہے۔

حال ہی میں وزیر اعظم نے پاکستان کے استحکام و سالمیت کا پہلو لے کر

مجلس دستور ساز میں جو ناقابل عمل اور ناقابل قبول فارمولا پیش کیا وہ پاکستان کی وحدت و سالمیت کی تخریب و تذلیل ہے۔ اردو کے ساتھ کسی علاقائی زبان کو شریک کرنا ناجائز ہی نہیں شرک ہے۔ صرف اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو پاکستان و بھارت میں سب سے زیادہ مقبول اور اُن کے مختلف صوبوں میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جس کی جڑیں اس برصغیر کے [illegible] تک جا پہنچی ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ صرف زبان نہیں بلکہ ہماری تحریک آزادی اور ننگ و ناموس کا تحفظ بھی اور ہماری روایات، اخلاق، عادات، تعلیمات، تہذیب و تمدن کی حامل ہے۔ ہماری تمام مذہبی، تبلیغی، ثقافتی اور سیاسی تحریکوں کو اسی کی بدولت فروغ ہوا۔ دو قومی نظریہ اسی کی بدولت وجود میں آیا اور اسی نے قصر پاکستان کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھی۔ اسی کی خاطر قائد اعظم نے جان جوکھوں میں ڈال کر ڈھاکہ کا پُرخطر سفر اختیار کیا اور یہ اعلان فرمایا کہ پاکستان کی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی اور جو اس کے خلاف غلط فہمی پیدا کرتا ہے وہ پاکستان کے دشمن ہیں۔"

ہماری مملکت وفاقی ہے۔ اس کی زبان بھی وفاقی ہونی چاہیے اور وہ صرف اردو ہی ہے کسی علاقائی زبان کو جو خاص علاقہ میں محدود و مخصوص ہے یہ حق نہیں پہنچتا خواہ وہ اکثریت کی بولی ہو یا اقلیت کی۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ نئی کابینہ کے وزراء حال ہی میں ایجنسیوں کے لسانی مسائل کے متعلق کیا فتویٰ صادر فرماتے ہیں۔ سب کی آنکھیں انہیں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ — مولوی

رفیق خاور

بابائے اردو — ایک تجریدی خاکہ

شاعری اور اس کے ساتھ ادب بھی کیا ہیں؛ گنجینۂ معنی کا طلسم۔ غالب نے اپنی شاعری کے متعلق بھی یہ ہی کہا تھا اور صرف غالب ہی نہیں۔ اکثر لوگ صدہا سال سے یہی کہتے چلے آرہے ہیں۔ اِنّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمَۃ ۔ لیکن کیا شاعری یا ادب صرف یہی کچھ ہیں؛ معنی و حکمت۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں! کیا یہ دونوں طلسمِ الفاظ نہیں ہیں؟ اور الفاظ میں کیا کچھ نہیں۔ ان کی اپنی ہی ایک دنیا ہے۔ نہایت وسیع، رنگارنگ، متنوع، پیچیدہ۔ اور جب یہ آپس میں مل جاتے ہیں! تو کیا کیا روپ نہیں دھارتے، کیا کیا تیور نہیں پیدا کرتے۔ کبھی ظاہر کبھی پنہاں۔ ان کی تہہ میں اشارات و کنایات کی ایک دنیا جھلکتی نظر آتی ہے۔ اگر ہم کسی تحریر پر غور کرنے لگیں۔ تو الفاظ سے کتنی ہی باتیں پتہ دیتی ہیں۔ بڑے پتے کی باتیں۔ ہر ہر لفظ لکھنے والے کی شبیہ ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کا آئینہ دار، اس کے دل و دماغ کا عکس۔ مگر شخصیت کے معنی صرف افکار و خیالات یا جذبات و احساسات ہی نہیں اسمیں قوائے فکر بھی تو شامل ہیں اور وہ پراسرار ہستی جسے فن کار کہتے ہیں۔ ایک کاری گر۔ وہ ذوق رکھتا ہے، مزاج رکھتا ہے اسکی تخئیل بھی ہوتی ہے اس کے شعور و لاشعور میں آمیزشیں بھی ہوتی ہیں۔ اس کی ذات میں فکر و احساس کے ساتھ ساتھ جنھیں ہم اس کی ساری شخصیت کا مترادف سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ذوق، یہ مزاج، یہ صلاحیتیں برابر موجود رہتی ہیں۔ ان کا عمل تخلیق میں ایک بنیادی حصہ ہے۔ کیوں کہ ان کے بغیر کوئی چیز بروئے کار آہی نہیں سکتی اور معنی و حکمت کا گنجینہ نظروں سے پنہاں ہی رہتا ہے۔ ان سے بھی صاحب فن کے متعلق اتنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جتنا براہ راست اس کے افکار و احساسات سے دونوں ایک ہی منزل کے رہنما ہیں۔ ایک بلاواسطہ اور دوسرا بالواسطہ ایک میں ہم اپنے موضوع کو سامنے کے رخ سے دیکھتے ہیں۔ اور دوسرے میں گھوم پھر کر کنکھیوں سے۔ جیسے ہم اسے دیکھ ہی نہ رہے ہوں۔ اور قیاس یا قیافہ شناسی سے کام لے کر اس کو پہچاننے کی کوشش کریں۔

پہلی قسم کی شناسائی نسبتہً آسان ہے۔ کیونکہ ہم اپنے موضوع کو بالمشافہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے افکار و احساسات ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔ اور ہم ان کے متعلق رائے قائم کر سکتے ہیں دوسری طرح کا جائزہ ایک بڑا ہی دلچسپ کھیل ہے

ایک رومانوی تلاش جس میں ہم دھندلکوں میں ہاتھ پاؤں مارتے، اَن جانے، اَن بوجھے رشتوں کا سہارا لیتے منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ صاحبِ فن کے جوہر، اس کے تیور، اس کا لب و لہجہ، اس کا مشاہدہ۔ اس کے داؤ پیچ۔ یہ سبھی تو اس شخصیت کا جزو ہیں۔ اور بہت اہم جزو کچھ عجب نہیں ہماری حقیقی دلچسپی انہی میں ہو۔ ہم اس صناع سے دوچار ہونا چاہتے ہیں۔ جو پس پردہ بیٹھا ہوا یہ سارا طلسم پیدا کرتا ہے۔ کہیں یہ وہ چیز تو نہیں جسے "فن برائے فن" کہتے ہیں وہ جمالیاتی قدریں جن کو ہم ٹھیک طرح پہچان نہیں سکتے اور ہمیشہ نظر انداز کرتے رہے ہیں یا محض ثانوی اہمیت دیتے رہے ہیں۔

کوئی آرنلڈ، کوئی اقبال یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ یہ ہے ایک دانائے راز کا پیغام، یہ ہے اس کا تصور، اس کا نظریہ وہ تفسیرِ حیات کرتا ہے۔ زندگی پر تنقید کرتا ہے۔ کائنات کا انکشاف کرتا ہے۔ مشاہدۂ حق، معنی ہی معنی، مواد ہی مواد، یہی اس کا مقصود ہے۔ اور اس پر اس کی اہمیت کا موقوف ہے۔ مگر تصویر کا ایک اور پہلو بھی تو ہے۔ ان تمام امور کو اجاگر کرنے کے لئے کوئی آلۂ کار بھی تو لازم ہے۔ اور کوئی مصنف اس کی کوشش کرے یا نہ کرے۔ اس کی صلاحیتیں اس کی تمام شخصیت ان لفظوں، پیرایوں طریقوں، تشبیہوں، استعاروں میں ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی جنھیں وہ ان مقاصد کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اس کا حقیقی منشاء کچھ بھی ہو، اس کی تخلیقی قوتیں اس سے عنانِ اختیار چھین لیتی ہیں۔ اور اس کی ذات کے ساتھ گنجینۂ معنی کے حریف بھی بن جاتی ہیں۔ ہماری توجہ نادانستہ اس کے افکار و احساسات کی بجائے کسی اور بات کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ اس اداکار کی طرف جو اپنی ترجمانی کے لئے طرح طرح کے ڈھنگ اختیار کرتا ہے، اور ہم اس کی ڈرامائی حرکات و سکنات میں خود بخود دلچسپی لینے لگتے ہیں حرکات و سکنات اپنے اندر ایک ابدی دلچسپی کا سامان لئے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے اعصاب ہماری جبلت ان سے تسکین پاتی ہے۔ اور ذوق و فن اور تخیل کی حد تک تو یہ بلا شرکتِ غیرے ہماری توجہ کے طالب ہیں۔ شعور کی کسمساہٹیں ـــ ذہنی جھمیلے، دل کے ہنگامے، لاشعور کی کروٹیں، تیزیاں اور نرمیاں، پریشانیاں اور شادکامیاں سکون و اضطراب، خلوتیں جلوتیں، مشاہدہ سب لکھنے والے کی پوری پوری داستان سناتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں آلۂ کار کو نظر انداز کرنے میں فاش غلطی کی گئی ہے۔

آئیے ہم کچھ دیر کے لئے یہ بھول جائیں کہ کوئی فن کار اپنے خیالات و محسوسات کی شکل میں خود کیا کہتا ہے، اور محض اس کی تحریر پر غور کریں۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ الفاظ کس طرح اپنے خالق کی غمازی کرتے ہیں۔ بدیہی طور پر نہیں بلکہ تجریدی طور پر۔ وہ نمونے جنھیں تجریدی کہتے ہیں۔ بعینہ اسی طرح اہلِ ہنر کی مصوری کا انکشاف کرتے ہیں۔ اور کسی معنی یا مقصد کی ترجمانی کئے بغیر محض خطوط کی طرح ہیئت، ترتیب اور توازن سے اپنا جواز پیش کرتے ہیں۔ جن کی حیثیت خالص فنی و جمالیاتی ہے۔ جو لوگ فن اور معنی کو لازم و ملزوم خیال کرتے ہیں، اس اہم حقیقت کو ملحوظ نہیں رکھتے ارباب فن نے کئی فنون ـــ مصوری، سنگ تراشی، عمارت سازی ـــ میں ان کے معنی و مقصد سے بے نیاز نمونے پیش کر کے اس نظریہ کی بنیادی غلطی واضح کر دی ہے۔ اور ہماری کلاسیکی موسیقی تو پہلے ہی بڑی حد تک اس التزام سے آزاد تھی۔ عام دستکاریاں مثلاً ظروف، پارچہ جات، زیورات وغیرہ اس سے ہمیشہ ہی آزاد رہے ہیں، ہمارے ذوقِ آرائش نے کبھی کسی معنی کا تحمل نہیں کیا۔ خود دیباچے

آب و گل میں لالہ و گل یا قوس و قزح خالص حسن ہی کے مظہر ہیں۔ جن کی تہہ میں کوئی معنی یا مقصد تلاش کرنا بے سود ہے۔ ہم ان سے اسی لئے محظوظ ہوتے ہیں کہ وہ خوب صورت ہیں۔

اب دیکھیں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تحریر سے ان کے متعلق کیا عیاں ہوتا ہے۔۔ ان کا رنگ طبیعت چند ہی پاروں سے واضح ہو جائے گا۔ لکھتے ہیں۔

سادگی و پُرکاری کمال صناعی ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے یہ معنی نہیں کہ آسان لفظ جمع کر دیئے جائیں۔ ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہونا چاہیئے۔ یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اس کے ساتھ موضوع تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ اسے لوگ سمجھیں، اس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر ہو یا تقریر محض بے کار اور تضیع اوقات ہے۔

یہ پارہ شاید مولوی صاحب نے اپنے ہی بارے میں لکھا ہے، اور اپنے مسلک کو پیش نظر رکھتے ہوئے صاف صاف جچے تلے ہلکے پھلکے الفاظ۔ کوئی لفظ بھاری بھرکم مشکل یا غریب نہیں۔ عربی فارسی الفاظ کی کوئی بھرمار نہیں اور جو ہیں۔ وہ بھی بالکل ضرورت کے مطابق اور برمحل۔ سرسید اور حالی کے برعکس جن کے وہ ہم وضع اور ہم مشرب ہیں۔ وہ مولویانہ اور عالمانہ الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں۔ نہ انگریزی الفاظ کا چاؤ ہے۔ جس سے پڑھنے والوں پر رعب طاری کرنے کی کوشش ہو نہ عام بول چال کا اس درجہ شوق کہ وہ معمولی روکھے پھیکے یا بے کیف قسم کے الفاظ برتیں۔ وہ نہ نمود کے قائل ہیں نہ خاکساری کی دھن میں اپنے آپ کو گرانے پر آمادہ اسی لئے نہ ان کے یہاں ٹیپ ٹاپ ہے۔ نہ معیوب حد تک سادگی نہ عالمانہ و فاضلانہ دھوم دھام ہے نہ چھچھورا پن۔ ہر انتہا سے دور۔ حشو و زوائد سے گریزاں، میانہ رو۔ دھیمی دھیمی رفتار۔ دھیمی دھیمی لے۔ نہ زیادہ اونچی نہ نیچی زبان صاف ستھری، سلجھی ہوئی۔ مگر ایسی نہیں کہ وہ خشک یا پھیکی پھیکی ہو جائے۔

حالی کی تحریر زیادہ متین، منضبط، گھٹی ہوئی اور بالعموم باوقار ہے۔ مولوی صاحب نے اس انداز کو چمکا کر زیادہ نفیس بنا دیا ہے۔ جس سے توانائی کم ہو گئی ہے۔ اور یہ ایک بڑی وقیع قدر ہے۔ جو حالی کو جوہر قابل اور انشاء پرداز دونوں کی حیثیت سے زیادہ ممتاز کرتی ہے، لیکن سلاست و صفائی کافی بڑھ گئی ہے۔ اسی لئے جب ان کی طبیعت چمک اٹھتی ہے تو وہ ہمیں ایسے پارے بھی دے جاتے ہیں، جن میں کہیں زیادہ نکھار پایا جاتا ہے۔

"مولوی سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتا ہے۔ لیکن صوفی ہر ایک کے رنگ طبیعت کو دیکھتا ہے۔ اور جیسی جس کی رفتار ہوتی ہے۔ اُسی ڈھنگ سے اس کی تربیت کرتا ہے۔ وہ علماء کی نسبت کہیں زیادہ زمانے کی نبض کو پہچانتا ہے۔ وہ دلوں کو ٹٹولتا ہے۔ اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ دلوں کی تہہ تک پہنچتا ہے۔ جہاں انسان کے اصل بھید چھپے اور دبے رہتے

ہیں جن سے ہم خود بھی اکثر واقف نہیں ہوتے مولوی کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی اس میں صوفی کی جیت ہے۔"
یہ تو ظاہر ہے کہ مولوی صاحب آج کے نہیں کل کے ادیب ہیں۔
(وہ ایک پرانی محفل کی یادگار ہیں۔ اس لئے ان کی تحریر میں بھی اسی کا رنگ روپ ہے۔ اور اس کی وضع بھی اس کی اپنی وضع کی طرح ہے۔ لیکن زمانے کے نئے نئے تیور نئے نئے رنگ دیکھ کر وسیع تجربہ اور طبیعت میں لوچ لچک نکھار نے تحریر میں بھی ایک صفائی ایک جوت پیدا کردی ہے۔ اور قدیم وسیع کے ساتھ اس سے جدید تیور بھی جھلکتے ہیں۔)
دیکھئے اوپر جو پارہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں الفاظ کس قدر بے ساختہ ہیں۔ اور اس کے باوجود ان کو بڑی احتیاط سے چُن چُن کر رکھا گیا ہے۔ وہ بالکل بے تکلف معلوم ہوتے ہیں۔ زبان اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ ہر فقرہ پچھلے فقرہ کے ساتھ توازن پیدا کرتے ہوئے روانی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ پے در پے چھوٹے چھوٹے برجستہ ایک جیسے فقرے رفتار کو تیز تر کرتے ہیں۔ جس سے خود لکھنے والے کے مزاج میں حرکت معلوم ہوتی ہے
آخری جملہ پر غور کیجئے۔ آج کل کا لکھنے والا اسے کیسے ادا کرتا وہ اس میں جدید نفسیات کی بڑی بڑی مرعوب کن بعید از فہم اصطلاحیں استعمال کرتا لاشعور تحت الشعور زیر نفسی اور خبر نہیں اور کیسا کیسا کچھ۔ مگر بابائے اردو نے کس طرح کوئی پیچیدگی پیدا کئے بغیر بات ادا کر دی ہے۔
بابائے اردو کے یہاں ایسے مواقع نسبتاً کم ہی آئے ہیں۔ جب وہ پابندی وضع کو چھوڑ کر جولانی طبع پر آجائیں اور چمک دمک پیدا کریں چکا چوند پیدا کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ اور وہ طبعاً اس کی طرف مائل ہی نہیں وہ اس کی کو نباہتے ہیں۔ جو ان میں اور ان کے یاران سفر کردہ سرسید اور حالی میں مشترک ہے۔ ان بزرگوں کی طرح ان کی تحریر وضع بھی یادگاری حیثیت رکھتی ہے۔ یہ لوگ اصلیت پرست تھے۔ ان کو تمام تر نفس الامر سے سروکار تھا۔ تیزی طراری۔ چلبلا پن، تیکھا پن، شوخی، طرح طرح کے داؤ گھات، کیف و رنگ، شاعری، زبان آوری، زیب داستان، اشارات و کنایات، کروفر، طمطراق، گھن گرج، سنسنی خیز، جوش و خروش، یہ سب ان کے مزاج سے بہت دور تھے۔ وہ بلند قسم کی سنجیدگی جو ٹھوس صداقت اور امر واقعہ میں رچ بس جاتی ہے۔ ان کی طبیعت پر پوری شدت سے غالب تھی۔ اس لئے حالی تو اس سنجیدگی کے خول سے شاذو نادر باہر نکلتے ہیں تا وقتیکہ وہ وقتی طور پر اپنے استاد غالب کی زندہ دلی سے متاثر ہو کر ان کی رو میں نہ بڑھ نکلیں اور ان کے لطائف و ظرائف کا ذکر کرتے ہوئے تھوڑی دیر ان کے لبوں پر ہنسی نہ آجائے لیکن سرسید فطرتاً خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ جو ایک کامیاب قائد کے لئے جس کو ہر طرح کے انسانوں سے میل جول رکھنا پڑتا ہے۔ بہت ہی ضروری چیز ہے۔ بابائے اردو بھی حق پرست۔ یعنی سنجیدہ مزاج ہونے کے باوجود بذلہ سنجی کے لطیف جوہر سے بہرہ ور ہیں اور جب ان کی طبیعت کسی دلچسپ واقعہ یا خوش کن بات سے چمک اٹھتی ہے۔ تو وہ ہمیں ایک اور رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔ ایک بار خاطر کی حیثیت سے جو ہمیشہ بزرگانہ وعظ و نصیحت کرتے

"صاحبو! جنگ آزادی کے بعد ہمارے ملک پر ایک سخت آزمائش کا وقت آیا ہے —"

"نوجوانو! مجھے معاف کر دینا اگر کام کا لفظ زیادہ برا لگا ہو۔ (" اگرچہ یہ طرزِ خطاب بھی ان کی ملنسار طبیعت، رکھ رکھاؤ، تپاک اور انسان دوستی کو ظاہر کرتا ہے۔ جو ان کی پسندیدہ و محبوب شخصیت، سرسید کا طرہ امتیاز تھی :) بار خاطر ثابت نہیں ہوتا۔ دیکھئے وہ ان باروں میں پابندی و منع ادراک دینے والی سنجیدگی کے دائرے سے کس طرح باہر نکل گئے ہیں۔

"لیکن تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ انگریز قوم ووٹ دیتی ہوئی پیدا نہیں ہوئی تھی"۔

"ایک بڑی خصوصیت ان میں یہ تھی کہ بغیر گالی کے بات نہ کرتے گالی ان کا تکیہ کلام تھا۔ بے چارے مزدوروں پر اس کی خوب مشق ہوتی تھی۔ گالی میں نئی نئی ایجادیں پیدا کرتے تھے"۔

یہ بالکل ویسے ہی ہے۔ جیسے گھٹا ٹوپ بادلوں میں اچانک بجلی کی لہر —

بابائے اردو کی طبیعت میں ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ ہے۔ ایک ضبط، ایک ومنع احتیاط۔ وہ اصلیت اور سلامت روی کے راستے سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ نہ ان میں کانیاں پن ہے۔ نہ ٹیڑھی چال چلنے کی طرف میلان۔

وہ جو بات کہتے ہیں۔ برملا کہتے ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ۔ کیوں کی وہ عیاری مکاری جانتے ہی نہیں۔ اسی لئے ان کی عبارت میں کبھی کوئی الجھاؤ کرتب، کوئی ٹیڑھی چال، کوئی باریکی کوئی الجھن نہیں۔ اور وہ سپاٹ ہونے کی حد تک صاف گو اور صاف بیان ہیں۔ شاید وہ کسر داستان کے لئے کچھ گھٹا دیں۔ لیکن زیب داستان کے لئے بڑھا دینا کفر سمجھتے ہیں۔

کیونکہ یہ حق کو چمکا کر ٹیپ ٹاپ کرنے کے مترادف ہے۔ الفاظ ان کے لئے محض الفاظ ہیں۔ وہ ان کے لغوی مفہوم سے سروکار رکھتے ہیں۔ ان الٹی سیدھی دلالتوں سے نہیں جو مجاز سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے ان کی تحریر کہاں اور شاعری کہاں شاعری تو محض رنگ آمیزی ہے، تصرف ہے۔ شعری فکر کے معنی ہیں۔ بات کو کسی اور ڈھب سے ادا کرنا، سوچ میں ایک ٹیڑھ، ایک مصنوعی ذہنی کاوش، ایک عارضہ۔ کوئی اصلیت پرست ایسا روگ نہیں پالنا چاہتا، وہ ذہن کو ایسے لاابالیانہ پن سے روکتا ہے۔ اس کی طبیعت روشنی کو روشنی ہی دیکھنا پسند کر لی ہے۔ توڑ پھوڑ کو رنگوں کی شکل میں نہیں دیکھنا چاہتی کیوں کہ یہ حقیقت سے گریز ہے۔ لہٰذا وہ تصویر سے بھی کوئی مس نہیں رکھتا۔ کیوں کہ اس میں حواس اور تخیل جیسے غیر عنصر داخل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا مطمح نظر صرف ایک ہے۔ تجرید ایسے لوگ پیدا ہی نثر کے لئے ہوتے ہیں۔ بابائے اردو کہیں اتفاق ہی سے تصویروں میں بات کرتے ہیں۔ جیسے وہ بھول کر اس طرف نکل آئے ہوں۔

"اگر اس وقت سرسید نے انگریز کے ہتھیار اسی کی ڈھالوں پر نہ روکے ہوتے تو آج مسلمان قوم کا نشان تک نہ ہوتا۔ اس وقت انگریز اور ہندی چکی کے دو پاٹ بنے ہوئے تھے۔ مگر سرسید قوم کو ان دو پاٹوں کے بیچ سے صاف بچا کر لے گئے"۔

"لیکن یہ چند روزہ بہار تھی۔ آفتاب اقبال گو غروب ہو گیا تھا۔ لیکن ڈوبتے سورج کی ہلکی شعاعیں ابھی کچھ کچھ پڑ

رہی تھیں۔ ان کے جاتے ہی اندھیرا ہو گیا۔"

بابائے اردو کے یہاں بھی ایسے تصویر پارے چند لمحوں کی ہی بہار ہوتے ہیں۔ یہ آتے ہی گزر جاتے ہیں۔ اور پھر وہی صاف چٹیل میدان۔

بابائے اردو کی طبیعت جس طرح ایک سیدھی لکیر ہے، اسی طرح ان کی تحریر بھی ہے۔ اس میں دائیں بائیں، اوپر نیچے کوئی سمتیں نہیں۔ ایک مسلسل ہمواری ہی ہمواری ہے نہ زیر ہے۔ نہ بم۔ نہ اتار نہ چڑھاؤ۔ نہ پیچ نہ خم، نہ ہچکولے نہ جھکولے۔ نہ ترت پھرت نہ ٹھاٹ باٹ۔ نہ کوئی دھیمی سی نوا ہے نہ گونج۔ نہ لاابالیانہ پن نہ رومانویت وہ الفاظ کے طوطے مینا نہیں بناتے۔ نہ ان میں ڈرامائیت ہے نہ میکانیت۔ نہ لمبے چوڑے الجھے، پیچ در پیچ جملے اور نہ پُرکار استعارے اور ترکیبیں۔ ان کی تحریر کیا ہے۔ بالکل اکہرا تار، نہ اس میں کئی کئی تاروں کی مرکب یا فنت ہے نہ گنجلک کیفیت۔ جیسے موضوعات کا ایک خاص دائرہ ہے۔ ویسے ہی انشاد کے طور طریق بھی ہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ وہ ذرا بھی حقیقت سے ابھر کر حسن و جمال کی رنگین رومانوی دنیا میں داخل ہو جائیں تو یہ ناممکن ہے۔ اسی لئے نہ وہ شبلی بن سکتے ہیں۔ نہ مہدی الافادی، نہ ابوالکلام آزاد، نہ بجنوری ان کے قلم سے کبھی "غیر فانیوں" "لوح سے تحت" "افتاں وخیزاں بحریں" جیسے طمطراق آمیز الفاظ نہیں نکل سکتے۔ یہ معمولی الفاظ لیجئے، رقم طراز۔ جلوہ گر۔ شاہد رعنا۔ بابائے اردو کے یہاں ایسے الفاظ بھی شاذ ہی دکھائی دیں۔ اس لئے کہ یہ بھی من و عن اصلیت پر اضافہ ہیں۔ ان کی سنجیدہ طبیعت کدال کو کدال ہی کہنا پسند کرتی ہے۔ اسی طرح وہ گراں بار الفاظ و تراکیب سے بھی گریز کرتے ہیں۔ اضافتیں، عطف، مغلق الفاظ، مکررات اور پیچ دار فقرے ان کی میانہ رو طبیعت سے کوسوں دور ہیں۔

ہاں کبھی کبھی اتفاق سے ایک آدھ فقرہ ایسا دکھائی دے جاتا ہے جس میں علمیت اپنا رنگ دکھا جاتی ہے۔

"طرح طرح کے توہمات، تعصبات اور اختلافات میں مبتلا تھے" "اور بلا خوف لائم بڑی اخلاقی جرأت، دلیری اور بے باکی سے وہ بات کہہ دی۔"

یہاں بھی الفاظ کی کثرت اور تکرار کا جواز موجود ہے۔ جس چیز کی طرف ہم خاص طور پر اشارہ کرنا چاہتے تھے وہ ایک ہی قسم کے الفاظ سے پیدا ہونے والی قافیہ کی آواز ہے۔ توہمات۔ تعصبات۔ اختلافات کیونکہ بابائے اردو اس قسم کی معمولی زبان آوری اور گل نگار سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ہر ادیب کو خواہ وہ کتنا ہی اعتدال پسند کیوں نہ ہو۔ کبھی نہ کبھی نمود کا شوق ہو جاتا ہے اور وہ کوئی بلند بانگ لفظ کوئی انوکھی ترکیب کوئی چست فقرہ برتے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کوئی ایسی بات جس سے چٹخارہ پیدا ہو، جو ذوق کو گدگدائے، وجد و مستی پیدا کرے۔ تاکہ ان باتوں سے اسکی بڑائی ظاہر ہو۔ اس کے انا کی تسکین ہو، دل کی گرہیں وا ہو جائیں، نفسی الجھنیں دور ہوں یا دوسروں پر رعب طاری ہو۔ اور اس کا سر بلند ہو۔ کہیں دور وادی خیال میں لے جائے یا فن کی نزاکت پیدا کرے۔ مگر بابائے اردو کو یہ خواہش

نہیں تڑپاتی۔ وہ نہ اس سے بہکتے ہیں۔ نہ بہک سکتے ہیں۔ نہ سلگتے ہیں نہ بھڑکتے ہیں۔ ان کو خدا نے کفایت کا مجسمہ پیدا کیا ہے۔ اس لئے ان کی تحریر بھی اسی کا نمونہ ہے۔ نہ ان کا تخیل بے قابو، نہ مزاج لاابالی۔ ممکن ہے یہ ایک لحاظ سے محرومی بھی ہو اور معذوری بھی۔ ہم منتظر ہی رہتے ہیں کہ کب بیان غیر متوقع حدود کو چھولے۔ ایک ادیب کے اس جملے میں،

"مگر ابھی چرخ نیلی فام سے پرے اس کی شاعرانہ اختراعات فائقہ کے ایسے دیوار از چشم جزیرے بھی موجود ہیں۔ جو بدستور دیدۂ انتظار وا کئے۔ تازہ دم قافلوں کی راہ دیکھ رہے ہیں؛

مگر یہ توقع پوری نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ جس سانچے میں بابائے اردو کی طبیعت ڈھلی ہے ——————

—— وہ کچھ اور ہی ہے وہ شروع سے ہی ایسی رفتار اختیار کرتے ہیں۔ جس میں کمی و بیشی کی ضرورت پیش نہ آئے بے شک ایسی تحریریں، جن میں بے حد طمطراق ہو۔ تھوڑی دیر کے لئے ہمیں مبہوت کر دیتی ہیں۔ اور ان میں بعض فرقانی قسم کے اثرات ہوتے ہیں۔ جو عام تحریر سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ ان میں ایک بے پناہ شان جلالی پائی جاتی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد یہ تیز رفتاری طبیعت پر گراں گزرنے لگتی ہے۔ جیسے کسی تیز رفتار طیارہ میں پرواز کرنے سے سر چکرانے لگے تب ہم محسوس کرتے ہیں کہ اونچی فضاؤں میں پرواز کرنے کے بجائے ٹھوس زمین پر میانہ روی زیادہ پُر لطف اور تسکین بخش ثابت ہوتی ہے۔ اس سے طبیعت ایک آسودگی، ایک فرحت محسوس کرتی ہے۔ لکھنے والے کا معتدل مزاج اور تحریر کی متانت ایک خوش گوار اثر چھوڑتی ہے۔ اس طرح ادیب کی طبیعت کا نظم و ضبط بن جاتا ہے۔ جو شعر و ادب کے اثر کا ایک اور پہلو ہے۔ کارلائل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ بد ہضمی کا شکار ہو۔ یہ پھٹ اڑا اڑا دھواں۔ تمام گولے بارود کی فضا۔ بابائے اردو کی تحریر اس کے برعکس ایک صحت مند جسم کی خبر دیتی ہے۔ اور یہی تندرستی صرف اس کی نوّے سال سے اوپر زندگی بلکہ سرگرم و مصروف زندگی اور غیر معمولی علمی، ادبی اور قومی سرگرمیوں کی رازدار ہے۔ نہ ان کی قویٰ مضمحل ہیں نہ عناصر میں بے اعتدالی ہے۔ اور نہ دل ہی الجھنوں کا شکار۔

اگر کوئی ایسا شخص ہو جو نباضِ نفس (PSYCHIATRIST) کی طرح نباضِ اسلوب (STYLIATRIST) ہو۔ (اور یہ تجزیہ کچھ نبض ہی سے اندازہ لگانے کی بات ہے) تو وہ محسوس کرے گا۔ کہ جس طرح انسانی نفس میں کوئی الجھن، کوئی پیچ یا رکاوٹ عمل میں مانع ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ شخصیت کو دولخت بھی کر دیتی ہے، اسی طرح ذہن میں بھی کوئی رکاوٹ، ہو سکتی ہے۔ یا اعصابی نظام ہی میں کوئی ایسی گڑبڑ یا گرہ پڑ سکتی ہے۔ جو سوچ اور بیان کی بے ساختہ روانی میں مانع ہو۔ مثال کے طور پر محمد حسین آزاد کے بے تحاشہ بولے جانے اور الفاظ کے طوطے مینا بنانے سے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ شخص آگے چل کر بہک نہ جائے۔ سو وہی ہوا۔ بہرحال اس ذہنی اور نفسی رکاوٹ کا نتیجہ

ایک ہی ہوتا ہے تناؤ۔ اس رکاوٹ پر غالب آنے کی کوشش لازماً دباؤ پیدا کرے گی۔ جو جسم کی اضطراری حرکات کے ساتھ ساتھ تحریر میں بھی طرح طرح کی کسمساہٹیں پیدا کرے گی۔ یہ باتیں تصنع کا پیش خیمہ ہیں۔ کارلائل کا جو فقرہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ اس سے کس طرح واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حروف، الفاظ اور آوازیں آپس میں لڑ رہی ہیں، رگ رگ اور ریشے ریشے میں رگڑ۔ تناؤ ہی تناؤ۔ جبھی وہ کہا کرتا تھا کہ میرے پیٹ میں ایک دوزخ ہے دوزخ! اس کی تحریر کے دھماکے اس کی بین شہادت ہیں۔ جبھی اسے لکھنے میں بے حد زحمت کرنی پڑتی تھی۔ لکھنا اس کے لئے مستقل عذاب تھا۔ الفاظ میں ہر بے احتیاطی، ہر زیادتی، ہر خرابی، بے تکاپن، بے ڈھنگاپن، اور جملوں میں ہر جھول، ہر الجھاؤ، ان کی ٹوٹی، وضع، بوجھل پن، بے تحاشہ لمبائی، بے ہنگم پیراگراف، دل و دماغ اور حواس اعصاب میں کوئی ایسا ہی بے کینڈاپن ظاہر کرتے ہیں۔ افراط ہو یا تفریط، بہرحال اعتدال سے دور ہیں۔ زیادہ اور مشکل الفاظ کی بھرمار درحقیقت قدرت کا فقدان ظاہر کرتی ہے۔ جتنا لکھنے والے کو اپنے آپ اور الفاظ پر کم اعتماد ہوگا۔ اتنا ہی وہ اثر پیدا کرنے کے لئے زیادہ الفاظ برتے گا عجیب اور بلند بانگ۔ تحریر میں تشنگی کا احساس اسے مبالغہ پر اکسائے گا۔ جو ظاہر ہے توانائی نہیں، ناتوانی کی علامت ہے۔

یک گیر و محکم گیر۔ باکمال ادیب جسے اپنے آپ اور اپنی تحریر پر اعتماد ہو، کم سے کم الفاظ برت کر ان سے بھرپور اثر پیدا کرے گا۔ ہمارے یہاں ابوالکلام آزاد کی زبان آوری اور ڈاکٹر تاثیر کا دھمکی آمیز لہجہ بھی کچھ ایسی ہی ذہنی یا باطنی بندش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کے برعکس عبدالمجید سالک۔ چراغ حسن حسرت۔ اور بابائے اردو ایسے لکھنے والے ہیں جن کے ذہن کی صفائی اور روانی میں کوئی چیز حائل نہیں معلوم ہوتی۔ جیسے پانی کی لہر بے ساختہ بہتی چلی آ رہی ہو۔ اسی لئے وہ کاوش یا آورد سے کام نہیں لیتے۔ اور بہ ظاہر انہیں عبارت میں کاٹ چھانٹ کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ قلم اٹھاتے ہی الفاظ اُمڈتے چلے آتے ہیں۔ اور بعینہ وہ بات ٹھیک پڑتی ہے۔ جو وہ چاہتے ہیں۔ نظر ثانی سے بے نیاز۔ ان کے یہاں مبالغہ، تکلف یا کوئی غیر عادی بات نہ ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔ جب سوچنے یا لکھنے میں کوئی بات آڑے ہی نہ آئے۔ تو عبارت قدرتی طور پر بے تکان ہوگی۔ سرسری صحافتی بیان سے گزر کر ادبی ہوتے ہوتے ہوئے بھی ان کا طرز بیان سائنٹفک ہوتا ہے۔ صاف اور تیز بہدف۔ اس میں ایک کمی بھی ہوتی ہے۔ یہ کہ بیان زیادہ چست اور مضبوط نہیں ہوتا۔ اور نہ وہ زائد خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جو کاوش ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ تاوان ہے جو انہیں اپنی حاضر طبعی کے لئے ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور بہت کاوش سے لکھنے والوں کو ان پر فوقیت حاصل کرنے کا موقع دیتا ہے۔ کیوں کہ طبیعت میں جس قدر ہیجان ہوگا۔ اتنے ہی لکھنے والے کے جوہر اور طبعی کیفیتیں زیادہ نمود پائیں گی۔ اس کا اسلوب زیادہ پُرکار ہوگا۔ یہاں ایک اور لطیف فرق بھی پیدا ہوتا ہے۔ سادہ اور پُرکار اسلوب ذہنوں کے مفرد و مرکب ہونے کی علامت ہے۔ یہ درحقیقت صناعانہ قدرت کا فرق ہے۔ سادہ ذہن میں اختراعی قوت لازماً کم ہوگی، اس کی نئی نئی رشتوں، ترکیبوں اور طرحوں تک پہنچ نہیں ہوتی۔ مرکب ذہن زیادہ خلاق بھی ہے اور صناع بھی۔ وہ اپنے سازوسامان میں نئے نئے رشتے اور رابطے

پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جو زیادہ قدرت اور متنوع کمالات کی متقاضی ہے۔ فن جبھی پیدا ہوگا کہ ہم کوئی بات ادا کرنے کے لئے برجستہ الفاظ یا اسلوب تلاش کریں۔ اگر بات سیدھے سبھاؤ کہہ دی جائے تو اس میں فن کیا ہوگا؟ کیونکہ ذہن کوئی حسن کارانہ اثر پیدا کرنے کے لئے کام ہی نہیں آتا۔ کیا ہم ایسی پُرکاری کے مقابلے میں سیدھی سادھی وضع کو "اسلوب" قرار دے سکتے ہیں! اسلوب کے لئے ایک شرط ضروری ہے۔ پیش کش میں حکمتِ عملی یا چابک دستی۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہو کہ لکھنے والے نے اثر پیدا کرنے کے لئے کوئی "اچھوتا" طریقہ برتا ہے۔ وہ لفظوں کے انتخاب، ان کے استعمال در و بست، نشست و ترتیب اور تحریر کی وضع و ہیئت میں کوئی خاص بات پیدا کرتا ہے۔ جیسی تحریروں کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ وہ عموماً سیدھے سبھاؤ ہی لکھی جاتی ہیں۔ اس لئے وہ بمشکل اسلوب کے تحت آسکتی ہیں۔ اور نہ وہ کچھ ایسی ممیز ہی ہوتی ہیں۔ اسلوب کے لئے یہ شرط تو لازم نہیں گردانی جاسکتی ہے اس میں ضرور کوئی سبھاؤ ہو یعنی جو بات کہی جائے بڑے ہی نفیس انداز سے کہی جائے جس سے لکھنے والے کا سلیقہ اور استادی ظاہر ہو۔ اسلوب کی نوعیت صاحب تحریر پر موقوف ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی افتادِ طبع اور صلاحیتوں کے مطابق ہی اپنی نگارش میں کوئی خاص انداز پیدا کرسکتا ہے۔ اس کا سبھاؤ اسی مخصوص نفاست یا خوش اسلوبی پر موقوف نہیں بلکہ اس کی انفرادیت کے تحت ایک نرالی طرح اور امتیاز پر موقوف ہے اور یہ پرتکلف سے پرتکلف تحریر میں بھی موجود ہو سکتا ہے۔ جس میں سبھاؤ کی کوئی علامت نہ ہو۔ اسلوب کی برجستگی کا دار و مدار انشا پرداز کے مزاج اور طبعی جوہروں کے مطابق مطلوبہ مضمون کی ادائیگی پر ہے۔ جس سے کوئی امتیازی خصوصیت نمایاں ہو۔ بابائے اردو کی تحریر اس کی نوع سے الگ ایک معروضی حیثیت رکھتی ہے۔ والٹر بیگ ہاٹ نے سادہ و جلیل اسالیب کا موازنہ کرتے ہوئے بالآخر سادہ انداز بیان ہی کو ترجیح دی ہے۔ کیوں کہ اس کی عنصری وضع میں ایک قدرتی ادا ہے۔ جس سے پرجلال انداز محروم ہے۔ پھر بھی مرکب موسیقی کی طرح مرکب اسلوب سے بھی زیادہ مخترع شعور ظاہر ہوتا ہے۔ جو متعدد اجزا کو ترتیب دینے اور آپس میں مربوط کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ موسیقی ہی کی اصطلاح میں آرکسٹرا کا سا تنظیمی اثر پیدا کرتا ہے۔ جو ترقی یافتہ تعمیری شعور کے بغیر ممکن نہیں۔ سادہ شعور رکھنے والا صرف استغنائی سے مس رکھتا ہے۔ اثر وہ نہیں اٹھا سکتا۔

اگر اس سلسلہ میں ہم نے ایک بات بیان نہیں کی تو کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ کہ بابائے اردو سنجیدگی ہی نہیں بذلہ سنجی میں بھی سرسید کے جانشین ہیں۔ اور بالطبع لطائف کی طرف مائل ان کا ذہن خود بخود حرف و حکایات کی طرف نکل جاتا ہے۔ اور ہم ان کی باتوں میں بڑے بوڑھوں کی داستانوں کا سا لطف پاتے ہیں۔ اور پند پیر دانا کا وعظ و نصیحت بھی سعدی کا سا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک جہاں دیدہ پیر کہن سالی کی زندگی اس کے ماضی ہی کے پرتو پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ نئی نسلوں کو اپنے قصے کہانیوں اور جادو بیانی سے مسحور کرتا ہے۔

(شاید اسے کمزوری پر بھی محمول کیا جائے۔ کیوں کہ اس سے ذہن کاوش فکر سے ہٹ کر سہاروں پر آرہتا ہے۔) جو اس کی سو سال کے لگ بھگ زندگی کا حاصل ہیں۔ بابائے اردو باتیں کرتے کرتے کس طرح آپ ہی آپ چٹکلوں اور لطیفوں پر آجاتے ہیں۔ جن سے ان کی بات چیت میں بڑی پر لطف چہک پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ سر سیّد کی روحِ جواں، ان کی بذلہ سنجی بدستور زندہ ہے۔ اور بابائے اردو کی باغ و بہار طبیعت ان کی نمائندگی کرتی ہے۔

مگر کبھی کبھی اس پیر نود سالہ میں جوانی بھی عود کر آتی ہے۔ اس کی خاکستر سے چنگاریاں چھوٹنے لگتی ہیں اس کی ذکاوت پوری طرح لو دے اٹھتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ کسی شدید جذبہ یا تحریک کے تحت وہ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے دل و دماغ کی رگیں تن جاتی ہیں۔ اس کے جذبات کو یک بیک اشتعال لگ ہوتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کوئی بات اس کو برہم کر دے۔ اور یہ اردو کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ اس زبان ــــ بابائے اردو کی واحد محبوب ــــ پر کوئی آنچ آئے۔ اور وہ خاموش رہیں؟ وہ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ چپ چاپ، صلح پسند، نرم خو ہستی جس کی بردباری اور تحمل پر ہم پھولے ہوئے تھے۔ یک دم تلملا اٹھتی ہے۔ اس کا سارا وجود آگ بگولہ ہو جاتا ہے چہرے پر خشونت کے آثار شدید تر ہو جاتے ہیں۔ سر سے پاؤں تک صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم! اس کے منھ سے شعلے لپکتے ہیں۔ اس کی طنزیہ حس جو عموماً اس کی بردبار طبیعت کے ضبط میں رہتی ہے۔ تیز ہو جاتی ہے۔ ایسے عالم اس کی تحریر میں بے پناہ تیکھا پن پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسی نشتریت جو کند رگوں کو بری طرح کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس کی طعن و تشنیع کبھی کبھی جھنجھلاہٹ یا بوچھاڑ کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

اس سے ایک نیا عبدالحق پیدا ہوتا ہے۔ مولوی اور ڈاکٹر نہیں بلکہ ایک محبوب کی آن پر مر مٹنے والا عاشق عام عبدالحق سے کہیں زیادہ توانا اور پرجلال۔ ایک نئی توجہ کا مستحق۔ وہ نرم دمِ گفتگو، یہ گرم دمِ کارزار۔ اردو کے سلسلہ میں اسے ذرا چھیڑ دیجئے۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اس کی آزادی و بے باکی جو معتدل لمحات میں صرف صداقت والنصاف کی خاطر سنجیدہ تحریر کے لئے وقف رہتی ہے۔ اس شدت سے مظاہرہ کرتی ہے۔ جیسے ایک طوفان برپا ہو۔ یہ وہ آزادروی اور خشونت ہے۔ جو زندگی میں کسی انتہا تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ اگر جلوت میں نہیں تو خلوت ہی میں سہی۔ تجرد کی حد تک! ایسے موقعوں پر بابائے ملت کی تحریر ان کے اندرونی ہیجان کا پورا پورا نقشہ پیش کرتی ہے۔ دل کے شعلے زبان کے شعلوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔

یہ شعلے، یہ شبنم ایک ہی ذات میں! جوئے شیر بھی اور جوئے آتشیں بھی۔ مگر ہماری زبان، ہمارے ادب ہماری قوم کو ان دونوں کی ضرورت ہے۔ اور رہے گی۔

گنیش راؤ تھتھے
مترجم: مبارز الدین رفعت

عملی آدمی

[جناب گنیش راؤ تھتھے اورنگ آباد کے رہنے والے مراٹھا برہمن ہیں اور بڑی خوبیوں کے انسان ہیں۔ ذاتی کوشش اور محنت سے انہوں نے اپنی زندگی بنائی ہے۔ مڈل کامیاب کر کے انہوں نے سابق ریاست حیدرآباد کے ضلع ناندیڑ کے ایک مڈل اسکول میں مدرس کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اتنی کم عمری میں کہ ان کے بعض طالب علم بھی عمر میں ان سے بڑے تھے۔ مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے بابائے اردو ان کی ان تھک محنت اور فرض شناسی سے بہت خوش ہوئے اور ان کو اورنگ آباد کے ہائی اسکول پر لے لیا جس کے بعد میں وہ کئی برس تک پرنسپل رہے۔ تھتھے صاحب نے اسی مدرسے میں پڑھاتے ہوئے میٹرک کا پھر انٹرمیڈیٹ کا پھر بی۔ اے اور ایم۔ اے کا امتحان خانگی طور پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے دیا اور ہر امتحان میں کامیابی پر انہیں ترقی ملتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں معاشیات کے سینیئر لکچرار مقرر ہوئے۔ اس عہدہ سے بھی ترقی پاکر اسی کالج کے پرنسپل بنے۔ ابھی دو تین سال ہوئے وظیفہ حسن خدمت پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں۔

اورنگ آباد کا عثمانیہ کالج اب گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس کہلاتا ہے۔ اس کالج سے طالب علموں کا ایک میگزین

اردو، ہندی، مراٹھی اور انگریزی میں "نوریش" کے نام سے نکلتا ہے۔ میگزین کا یہ نام 'بابائے اردو' ہی کا تجویز کردہ ہے۔ سنہ ۱۹۶۲ء اس کے ایک شمارے میں تھتھے صاحب کے قلم سے ایک مضمون انگریزی میں بابائے اردو پر نکلا ہے۔ ذیل میں اسی مضمون کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ مضمون ایک مراٹھی بولنے والے کا خراج عقیدت ہے جو بابائے اردو کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔ کئی حیثیتوں سے یہ مضمون دلچسپ ہی نہیں بلکہ ایک اہم مضمون ہے ——— رفعت۔]

انگریزی راج نے جتنے نقصان ہمارے ملک کو پہنچائے ہیں ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے ہماری قوم سے قومی خود اعتمادی چھین لی۔ ہماری سب سے بڑی قومی تباہی کے اس حزنیہ ڈرامے کی انتہا یہ ہے کہ اس ملک کا روشن خیال تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی زبان کی چمک دمک اور اس کے جادو سے متاثر ہو کر اپنے "تابناک ماضی" سے بالکل ہی بے نیازی برتنے لگا۔ انگریزی زبان کے ہپناٹیسی Hypnotising اثر کے تحت ہمارے برادران وطن خود اپنی زبانوں کی طرف کم راغب رہے۔

لیکن ان میں ایک آدمی ایسا بھی تھا جو اس کو کسی طرح تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسے اس بات پر شرم آتی تھی کہ اس کی زبان کی موزونیت پر کوئی حرف رکھے۔ اس نے جرأت کے ساتھ دعویٰ کیا کہ اس کی زبان تمام انسانی ضرورتوں کا ساتھ دے سکتی ہے۔ یہ مولانا عبدالحق کی ذات تھی!

میری ان سے پہلی مڈبھیڑ ۱۹۱۵ء میں امتحان گاہ میں ہوئی جہاں میں مڈل کا امتحان دے رہا تھا۔ ان کی گھنی داڑھی مجھے کچھ ڈراؤنی سی لگی۔ امتحان دینے والوں میں میں سب سے کم سن تھا۔ میری کم سنی نے ان کی توجہ میری طرف منعطف کرلی۔ میں انھیں دیکھ کر سہم گیا تھا۔ لیکن جب وہ خاص طور پر میرے پاس آئے اور انہوں نے میرے متعلق مختلف سوالات کئے تو میرا سارا ڈر دور ہو گیا۔ اس واقعہ کے چار سال بعد میں ان سے دوسری بار اس وقت ملا جب وہ نانہ تیر کے مڈل اسکول کا معائنہ کرنے کے لئے آئے تھے۔ میں اس اسکول میں مدرس کی حیثیت سے ملازم تھا۔ کم سن اتنا تھا کہ بس لڑکا ہی تھا اور اپنے بعض شاگردوں سے بھی چھوٹا تھا۔ مولانا نے اپنے معائنہ کی رپورٹ میں خاص طور پر میرا ذکر کیا تھا۔ میرے اس خصوصی ذکر کو دیکھ کر میرے بعض ساتھی کیسے جلے تھے اس کے خیال سے آج بھی مجھے بڑا لطف آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی اس اچھی رائے ہی کی وجہ سے میرا تبادلہ اورنگ آباد کے اردو ذریعۂ تعلیم کے ہائی اسکول

پر کر دیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں یہ ہائی اسکول انگریزی ذریعۂ تعلیم کے ہائی اسکول سے مربوط کر دیا گیا اور اس کا درجہ بڑھا کر اسے انٹرمیڈیٹ کالج بنا دیا گیا۔ اور مولانا اس کے پہلے پرنسپل مقرر کئے گئے۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے چھ سال تک ایک ایسے ادارے میں کام کیا ہے جس کے صدر مولانا جیسے عظیم المرتبت عالم تھے۔ مولانا ۱۹۲۹ء میں وظیفۂ حسن خدمت پر اس عہدے سے الگ ہوئے اور جامعۂ عثمانیہ میں اردو کی پروفیسری کا نیا عہدہ سنبھالنے کے لئے حیدرآباد چلے گئے۔ وہ اس عہدہ پر قریب قریب دس سال تک فائز رہے۔

مولانا کی ابتدائی زندگی کے حالات کم ہی معلوم ہیں۔ لوگوں کو بس اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ علی گڑھ کے ایم اے او کالج کے پہلے طالب علموں میں گنے جاتے تھے اور اس کالج کے بانی سرسید احمد خان کے منظور نظر تھے۔ سرسید کے پوتے سر راس مسعود ریاست حیدرآباد میں ناظم تعلیمات رہے اور یہاں سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو کر علی گڑھ چلے گئے۔ وہ مولانا کو اپنا چچا مانتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کے خاندان سے ان کے کتنے گہرے مراسم تھے۔ مولانا عبدالحق اس ٹیم کے ایک رکن کی حیثیت سے حیدرآباد آئے تھے جو جسٹس محمود کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اس ٹیم کے ذمہ قانونی اور دفتری اصطلاحات وضع کرنے اور انگریزی میں مدون قوانین کے ترجمہ کا کام تھا۔ کیونکہ ۱۸۸۴ء میں ریاست حیدرآباد نے فارسی کی جگہ اردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیدیا تھا۔ اس ٹیم کے بہت سے اراکین بعد میں بڑے اونچے عہدوں پر فائز ہوئے۔ لیکن مولانا عبدالحق اورنگ آباد پر مہتمم تعلیمات کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۱۴ء میں مولانا اورنگ آباد آئے اور رابعۂ دورانی کے مقبرہ کے قریب ایک بنگلہ میں قیام پذیر ہوئے۔ اس وقت وہ انجمن ترقی اردو کے معتمد بھی تھے۔ انہوں نے انجمن کا دفتر بھی اورنگ آباد منتقل کر لیا۔ پھر تو آنے والے پندرہ برس تک اورنگ آباد اس زبان کی تمام سرگرمیوں اور ترقیوں کا مرکز اور اس زبان کے شیدائیوں کے لئے ایک زیارت گاہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اسی وجہ سے مجھے اردو دنیا کی بیشتر عظیم المرتبت شخصیتوں کی تقریریں سننے کا افتخار حاصل رہا ہے۔

انجمن ترقی اردو نے انگریزی زبان کی امہات کتب کے ترجمہ کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اسی انجمن سے ایک سہ ماہی رسالہ "اردو" بھی شائع ہونے لگا اور پھر رفتہ رفتہ اور دو سہ ماہی رسالے "معاشیات" اور "سائنس" بھی اسی نے جاری کئے۔ ان سب کے چھاپنے کے لئے اورنگ آباد میں ایک اردو پریس قائم کیا گیا۔ مولانا نے لیتھو کی چھپائی کے قدیم طریقے کو ترک کر کے اردو ٹائپ کی چھپائی کو اختیار کیا۔ ڈاکٹر عابد حسین (جو بعد میں جامعۂ ملیہ دہلی سے وابستہ ہوگئے) اور ڈاکٹر سید حسین (جو بعد میں جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر مقرر ہو گئے) ان رسالوں میں مددگار مدیروں کی حیثیت سے مولانا کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ آگے چل کر انجمن نے ایک ہفتہ وار اخبار بھی "ہماری زبان" کے نام سے جاری کیا۔ اس میں اردو سے متعلق خبریں ہوتی تھیں اور ملک بھر کی مختلف اردو تنظیمیں جو جو کام کر رہی تھیں ان کی

رپورٹیں اس میں درج کی جاتی تھیں۔ انجمن نے اُردو جاننے والوں کی مردم شماری کا بھی اہتمام کیا تھا۔ جب مولانا دہلی منتقل ہوئے تو انجمن کا کتب خانہ اور اس کا دفتر بھی ۱۹۳۸ء میں دہلی منتقل ہو گیا۔ مولانا نے آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کا ترجمہ بھی شائع کیا۔ طالب علموں کے لئے اس ڈکشنری کا اڈیشن بہت مقبول ہوا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حکومت حیدرآباد نے انجمن کی فراخ دلی اور سیرچشمی کے ساتھ سرپرستی کی۔

مولانا خاندان کے بکھیڑوں سے آزاد تھے۔ ان کے بس ایک ہی بھتیجے تھے جو بعد میں اردو پریس کے منیجر کی حیثیت سے اورنگ آباد آئے۔ اورنگ آباد میں مولانا عبدالحق "مولانا صاحب" کے لقب سے مشہور تھے اور قریب قریب سنیاسیوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی غذا سیدھی سادی تھی اور لباس کے بارے میں بھی کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ گھر کے حدود میں حقہ ان کا نہ جدا ہونے والا رفیق تھا۔ لیکن گھر کے باہر اسے کبھی نہ نکالا۔ وہ سویرے سویرے اپنے بنگلے کے پیچھے کی پہاڑیوں میں دکھائی دیتے تھے۔ اس طرح انہوں نے بڑی عمر کے باوجود اپنی صحت اور طاقت کو سلامت رکھا تھا۔ ذہنی حیثیت سے ان کی اس طاقت کا مظہر یہ تھا کہ وہ ہر قسم کی تنگ دلی سے متنفر تھے۔ قدامت پرستی چاہے وہ ہندوؤں کی ہو کہ مسلمانوں کی انہیں پسند نہ تھی۔ انہیں کسی نے مسجد کی سیڑھیاں چڑھتے نہیں دیکھا بلکہ لوگوں کو گمان تھا کہ وہ دہریے ہیں۔ علی گڑھ کے ان کے پس منظر نے انہیں کسی نہ کسی کام میں لگے رہنے کی صفت کا ثناخواں بنا دیا تھا۔ میں نے انہیں یہاں تک کہتے سنا ہے کہ "ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والے احمقوں سے تو بُرے کام کرنے والے اچھے ہوتے ہیں۔" وہ بڑا پاکیزہ حسن مزاح بھی رکھتے تھے اور لوگوں سے مذاق بھی کیا کرتے تھے۔ ایک بار وہ ہولی کے تہوار کے دنوں میں شہر کے بیچ سے گزر رہے تھے۔ ہولی کھیلنے والے ہندوؤں کے ایک مجمع نے انہیں گھیر لیا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے اس مجمع کو اجازت دے دی کہ وہ انہیں رنگ میں بھگو دیں۔

میزبان کی حیثیت سے مولانا کی فراخ دلی اور سیرچشمی نوابوں سے بڑھ کر تھی۔ شاید ہی کوئی ایسا ہفتہ جاتا ہو گا جب کہ ان کے یہاں کوئی مہمان نہ آتا ہو۔

معاملات میں ان کا نقطۂ نظر لادینی تھا۔ اور انہوں نے کبھی بھی حکمراں قوم کے تعصبات کا ساتھ نہ دیا۔ وہ ایک پکے قوم پرست تھے اور ۱۹۲۰ء سے کھدر پہننے لگے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس ملک کے دو عظیم مذہبی گروہوں میں اتحاد و اتفاق کے قائل تھے۔

مولانا ایک ممتاز ادبی نقاد کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔ اگرچہ اس موضوع پر ان کی کوئی مستقل تصنیف میری نظر سے نہیں گزری۔ انہوں نے اردو کی ابتداء کے مسئلہ کی تحقیق کے لئے اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر رکھا تھا۔ جہاں تک اس مسئلہ کا شمال سے تعلق ہے وہ اس کے ہر پہلو سے واقف تھے۔ اورنگ آباد میں قیام کے زمانے میں انہوں نے پورے جنوبی ہند کے اس مسئلہ کے تعلق کا جائزہ لے ڈالا۔ اور دکنی میں لکھی ہوئی بہت سی نادر تصانیف کو

منظر عام پر لے آئے۔ بیجاپور نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے اس سے وہ بہت متاثر تھے۔ انہوں نے اپنے کالج کے اردو میگزین کے لئے "نورس" کا نام بھی بیجاپور کے عادل شاہی فرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی کے بیجاپور میں بسائے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے ایک محلہ "نورس پور" سے مستعار لیا۔ آگے چل کر وہ اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ دکن ہی اردو ادب کی ولادت گاہ ہے۔ ان کے تمام تحقیقی کارناموں اور اردو دنیا میں ان کے ممتاز مقام کو پیش نظر رکھ کر ان کی مادر علمی جامعۂ الہ آباد نے انہیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی اور انجمن ترقی اردو نے پیار اور محبت کا لقب "بابائے اردو" پیش کیا۔

۱۹۲۷ء میں اورنگ آباد میں جو کالج ڈے منایا گیا وہ "یوم کالج" سے کہیں زیادہ "یوم اردو" تھا۔ اردو کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب اس تقریب میں شریک تھے۔ اس موقع پر بہادر شاہ ظفر کے دربار کا "آخری یادگار مشاعرہ" اس خوبی سے اسٹیج کیا گیا تھا کہ اس پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ پورے تین دن تک ادبی جشن ہوتا رہا۔ مولانا محض نظریات پیش کرنے والے انسان نہ تھے۔ اپنے نظریات کو عملی صورت دینا بھی انہیں خوب آتا تھا۔ اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود جامعۂ عثمانیہ نے اس حقیقت کو پوری طرح ثابت کر دکھایا کہ ایک ہندوستانی زبان تعلیم کے انتہائی مدارج میں بھی ذریعہ تعلیم بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اس طرح جامعۂ عثمانیہ نے آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا اور اس راستے پر ایک تابناک مشعل اس نے روشن کر دی۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس کامیاب تجربے پر نصف صدی گزر جانے کے باوجود دوسرے اس کی پیروی سے آج بھی ہچکچاتے ہیں ہر پھر کر عبدالحق کی جرأت اور ان کے ایقان پر ہی ایمان لانا پڑتا ہے جس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

دنیا کے آگے اردو کی صلاحیتوں کے عملی مظاہرے پیش کرنے کے بعد مولانا نے اردو کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے کی مہم کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ انہوں نے "بابائے قوم" کو اپنے اس مطالبے کا قریب قریب ہم نوا بنا لیا تھا۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان کا اس بات پر اصرار کہ دیوناگری رسم خط کو خارج از بحث رکھا جائے ان کے بہت سے ہمدردوں کو ان سے جدا کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسی ایک اختلاف خیال نے مولانا جیسے نیشنلسٹ اور غیر فرقہ پرست کو پاکستان پہنچا دیا۔ انہوں نے کراچی پہنچ کر ایک اردو کالج کی بنیاد رکھی۔ اُردو پاکستان کی قومی زبان قرار پائی اور مولانا کا مشن پورا ہو گیا۔

اورنگ آباد شمال اور جنوب کا نقطۂ اتصال ہے۔ اس شہر نے اپنی ایک مخصوص تہذیب پیدا کی ہے۔ اس تہذیب نے ملک کے دونوں حصوں کی خوبیوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ اورنگ آبادیوں کے لئے مولانا صاحب اس تہذیب کے سب سے بڑے مظہر تھے۔

مراٹھی بولنے والے طبعاً وسیع القلب اور مہربان واقع ہوئے ہیں اور اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے

دوسری زبانوں کے الفاظ اور محاوروں کو اختیار کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ اس کے باوجود وہ اپنی زبان کے سوا دوسری زبانوں پر مہربان نہیں ہوتے۔ اٹھارویں صدی عیسوی کی مراٹھی زبان پر فارسی زبان کی بڑی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ مولانا نے اس توقع کے ساتھ اس اعجوبہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا کہ ان کے ہم عصر مراٹھی بولنے والے پھر ایک بار اسی اسپرٹ سے کام لیں گے۔ بدقسمتی سے مراٹھی بولنے والوں کا یہ جذبہ کہ وہ اپنی زبان کے سوا کسی اور زبان پر مہربان نہیں ہوتے، پھر بیدار ہوگیا اور وہ ریاست حیدرآباد کے لوگوں پر اردو کو مسلط کرنے کی مخالفت کرنے والوں کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔

اردو بڑی خوبصورت زبان ہے۔ اس زبان میں ہر قسم کے خیالات کے اظہار کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ زبان بڑی آسانی کے ساتھ لوگوں کے دل موہ لیتی اگر اس کے چاہنے والے اس کے ادب کی توسیع کی طرف توجہ دیتے۔ اس کو فرقہ واریت کے بھنور سے نکالنے کی سعی کرتے اور اس میں شیکسپیئر، ڈکنس، ٹالسٹائی جیسے دل نشین نابغۂ ادب پیدا کرتے۔ افسوس ہے کہ اردو والوں نے ان بنیادی اور اہم باتوں کی طرف سے بڑی غفلت برتی۔

یہاں ایک اہم واقعہ کا مجھے انکشاف کرنا ہے جس کا مجھے شخصی طور پر علم ہے۔ سر اکبر حیدری اورنگ آباد میں مراٹھی کی ایک ذیلی جامعہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ مولانا نے ابتداء میں مشورہ دیا تھا کہ جامعہ عثمانیہ دولت آباد اورنگ آباد سے گیارہ میل دور واقع علاؤالدین خلجی کے عہد کی مشہور رہ گزر ہے، میں قائم کی جائے۔ اگر مراٹھی ذریعۂ تعلیم کی جامعہ اورنگ آباد میں قائم ہو جاتی تو یہ اس شہر سے مولانا کی وابستگی کی ایک دائمی یادگار بن جاتی۔ ان دونوں زبانوں کے قریبی ربط سے انہیں عظیم الشان فائدے پہنچتے اس کا آسانی کے ساتھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ آخر انسان ہی انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

مولانا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ لیکن اورنگ آباد کے لوگ انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ مولانا کے ایک مراٹھی بولنے والے مداح کی حیثیت سے میری تجویز ہے کہ اورنگ آباد میں "ایسی تبادلے کا ایک مرکز" قائم کیا جائے۔ اس مرکز میں مراٹھی اور اردو دونوں زبانوں کا ساتھ ساتھ مطالعہ کیا جائے اور یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی بہترین چیزوں کو اپنے اندر جذب کریں۔ کسی زمانے میں مراٹھے اور مغل ایک دوسرے کو "لٹیرے" کہا کرتے تھے۔ آئیے، اپنی کوشش سے ہم حقارت کے اس لفظ کو ایک باعزت لقب میں تبدیل کر دیں اور ایک دوسرے کی زبان اور ادب سے بہترین چیزیں بے تکلف لینے اور دینے کی ابتدا کریں۔

مجھے یقین ہے ہماری ایسی کوشش مولانا کی روح کو شاد کرے گی۔

سید قدرت نقوی

احوالِ غالب اور مولوی عبدالحق

غالب سرزمین پاک و ہند کا ایک عظیم و محبوب شاعر ہے۔ غالب کے متعلق آئے دن کوئی نہ کوئی نئی بات منظرِ عام پر آتی ہی رہتی ہے۔ پورے اردو ادب پر غالب کی شخصیت چھائی ہوئی ہے۔ اردو کے متعلق کام کرنے والے، کسی نہ کسی پہلو سے غالب کو اپنے کام میں شریک کر ہی لیتے ہیں۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے ایک طویل عمر پائی اور قریب قریب ان کی ساری عمر اردو کی خدمت میں بسر ہوگئی۔ ان کا ایک نصب العین تھا اور اس کے حصول کے لئے وہ عزمِ راسخ کے مالک تھے۔ اتنی طویل عمر میں غالب پر انہوں نے متعدد بار لکھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ علی گڑھ والوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیرِ اہتمام علمی و تعلیمی مسائل پر تقاریر و مقالات خوانی کا اہتمام کیا۔ رشید احمد صاحب صدیقی اردو لیکچرر مسلم یونیورسٹی نے بھی ایک مقالہ پڑھا، جو ترمیم و اضافہ کے بعد کتابی صورت میں "زبان اردو پر سرسری نظر" کے نام سے طبع ہوا۔ رشید صاحب نے اس مقالہ میں غالب کے متعلق اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے پاس کتاب پہنچی تو آپ نے تبصرہ فرماتے ہوئے غالب کے متعلق لکھا: "صدیقی صاحب نے اردو کے جدید دور کو غالب سے شروع کیا ہے اور اس نامور شاعر کو جو اپنا مثل اردو ہی میں نہیں بلکہ بہت سی زبانوں میں نہیں رکھتا۔ چند ہی سطروں میں ختم کر دیا ہے اور مرزا صاحب کی شاعری پر جو تنقیدانہ رائے انہوں نے فرمادی ہے، وہ قابل سننے کے ہے۔ وہ فرماتے ہیں "غالب کی شاعری ایک حد تک صرف ہائے و ہو اور ناؤ نوش کی ترجمان ہے"۔

یہ رائے ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی ہے، جس نے اردو ادب کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ خود بھی ادیب ہے، اور یونیورسٹی میں اردو لکچرار ہے اور اس لئے نہایت حیرت انگیز ہے۔ ناپسندیدگی کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مرزا کی شاعری میں کوئی "پیغام" (MESSAGE) نہیں ملتا۔ کیا شکسپیئر کی شاعری میں جو سرتاج شعرائے عالم ہے، کوئی پیغام ملتا ہے؟ ایک نہیں کئی کئی۔ یہی حال مرزا کی شاعری کا ہے۔ کیا یہ کچھ کم ہے کہ مرزا غالب نے اردو شاعری کو پستی سے نکال کر کہیں کا کہیں پہنچا دیا؟ غزل میں عام روش اور تقلید سے آزاد ہو کر نیا رنگ پیدا کیا۔ (لیکن شاید صدیقی صاحب غزل میں کسی اصلاح کے قائل نہیں) خیالات کی جدت،

تخیل کی بلندی اور بیان کا لطف، جو مرزا غالبؔ کے یہاں پایا جاتا ہے، وہ اردو کے کسی شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتا۔ میں ایسے کئی صاحبوں کو جانتا ہوں جنہیں مرزا کے مختصر دیوان میں وہ پیغام ملے ہیں، جو کسی دوسرے کے کلام میں کیا؟ مذہب و اخلاق کی کتابوں میں بھی نہیں ملے اور ان پر مرزا کے کلام کا خاص اثر ہوا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر مرزا غالبؔ نہ ہوتے تو حالیؔ اور اقبالؔ بھی نہ ہوتے[۵۵]۔ مرزا غالبؔ کا اثر اردو شاعری پر عجیب و غریب ہوا ہے، اور رہے گا۔ کیا کسی پیغام کے بغیر یہ ممکن ہے؟۔ صدیقی صاحب اس بات سے بھی ناراض ہیں کہ مرزا صاحب کا قدیم کلام کیوں چھاپا گیا؟ (شاید وہ اسے مہمل سمجھتے ہیں) ۔ فرماتے ہیں کہ "میرا خیال ہے کہ اردو نوازی کے اس سے بہتر طریقے بھی ممکنات سے تھے" یہ خیال اردو کے ایک پروفیسر کا ہو، حیرت سے خالی نہیں! غالباً انہوں نے اس کلام کا مطالعہ نہیں فرمایا، ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ جن ظالموں کے ہاتھ میں مرزا کے کلام کا انتخاب تھا، انہوں نے بیدردی سے ایسے ایسے اشعار مجروح کر دیئے جن کی نظیر سوائے مرزا کے کلام کے اور کہیں نہیں ملتی۔ علاوہ اس کے اس کلام سے اس زبردست اور بلند خیال شاعر کی طبیعت اور اس کے کلام کے ارتقا کی صحیح حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس کا جاننا ایک پروفیسر اور محقق کے لئے نہایت ضروری ہے[۵۶]"

میں نے مولوی عبدالحق صاحب کا یہ بیان اس لئے نقل کیا کہ غالبؔ کے متعلق ان کے خیالات کا علم ہو جائے۔ رسالہ "اردو" سہ ماہی کو یہ شرف حاصل رہا ہے، کہ اس نے غالبؔ کے بہت سے غیر مطبوعہ آثار کو شائع کیا ہے۔ نظم و نثر کے یہ نوادر نہایت قابل قدر ہیں، جن میں کچھ خطوط، کچھ غزلیں اور ایک "غالبؔ کے خود نوشت حالات" شامل ہیں۔ مؤخر الذکر بہت اہم چیز ہے۔ یہ حالات، رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۲۸ء جلد ۸ نمبر ۳۱ صفحہ ۳۲۸ پر شائع ہوئے۔ سب سے پہلے یہ حالات ملاحظہ فرمائیے۔

"اسد اللہ خاں، غالبؔ تخلص، عرف مرزا نوشہ، قوم کا سلجوقی، سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے اس کا دادا قوقان بیگ خاں، شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلّی میں آیا۔ پچاس گھوڑے نقارہ و نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا۔ پہاسو کا پرگنہ، جو اب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا، وہ اس کی جائداد میں مقرر تھا۔ باپ اسد اللہ خاں مذکور کا عبد اللہ بیگ خاں دلّی کی ریاست چھوڑ کر اکبرآباد میں جا رہا۔ اسد اللہ خاں اکبرآباد میں پیدا ہوا۔ سال ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ یکشنبہ

عبد اللہ بیگ خاں الور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا جس حال میں کہ اسد اللہ خاں مذکور پانچ چھ برس کا تھا۔ اس کا حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جنرل لیک صاحب اکبرآباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کیا، اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سواروں کا برگڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو کی تنخواہ مقرر کی۔ پھر جب اس نے اپنے بازو سے سونک، سونسا، دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لئے، جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بطریق استمرار عطا فرمائے، مگر خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے

۵۵۔ میرے نزدیک یہ بات اس طرح ہے کہ اگر غالبؔ نہ ہوتے تو سر سیدؔ، حالیؔ اور اقبالؔ بھی نہ ہوتے۔ دلائل کے لئے دیکھئے میرا مضمون "غالب اور سرسید" مطبوعہ ماہ نو فروری سنہ ء

۵۶۔ تنقیدات

کے بعد، بمرگ ناگاہ ہاتھی سے گر کر مرگیا۔ جاگیر سرکار میں بازیافت ہوئی، اور اس کے عوض نقدی مقرر ہوگئی، اور سرکار کو دے دلاکر ساڑھے سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذات کو اس زرِ معافی میں سے ملتے ہیں۔ اس نے شاعری میں بڑا کمال پیدا کیا۔ نہ فقط شعر بلکہ نثر میں بھی دستگاہ رکھتا ہے۔ نثر کی تین کتابیں ہیں۔ پنج آہنگ، مہرِ نیمروز، دستنبو۔ فارسی نظم کا کلیات دس ہزار بیت کا بالفعل اودھ اخبار لکھنؤ میں چھاپا ہوا ہے۔ گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے، اشرفیوں کے عوض قصیدۂ مدح نذر دیتا ہے، اور سات پارچے، جیغہ، سرپیچ، موتیوں کی مالا، خلعت پاتا ہے۔ اب کے بار جو لاہور میں لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے درباروں کی فہرست کے، صاحب کمشنر بہادر حصار نے کہ ریولا قائم مقام صاحب کمشنر بہادر دہلی بھی ہیں۔ مثل اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے، اس کو بھی خط لکھا بیچارہ بسبب تہیدستی اور بے مقدوری کے راہورنہ جا سکا۔ مجھ سے کہتا تھا کہ ستر برس کا آدمی، کانوں سے بہرہ ہوں، اور اکثر بیمار رہتا ہوں، لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا، تو میں ان عوارض کو نہ مانتا، اور بے شک لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا۔ خیر آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا، خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے۔ اس شخص نے ۱۸۵۵ء کے آخر میں قصیدۂ مدح ملکہ معظمہ ولایت کو بسبیل ڈاک لارڈ النبرا گورنر سابق کی معرفت بھیجا ہے، اور اوائل ۱۸۵۶ء میں تین خط انگریزی کے بے واسطہ انڈیا گورنمنٹ ولایت سے اس کو ڈاک میں آئے ہیں۔ اب ہم ان تینوں خطوں کے خلاصے لکھ کر اس کے ذکر کو ختم کرتے ہیں۔ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ"

مولوی عبدالحق صاحب نے ان حالات کا تعارف لکھا تھا، جس میں لکھتے ہیں:

"جب بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں مرزا غالب کے قدیم کلام کا نسخہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کیا گیا تھا تو اس کی ترتیب وغیرہ کا کام ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کے لئے بہت سی نئی نئی چیزیں جمع کی گئی تھیں، منجملہ ان کے ایک عجیب چیز خود مرزا کے ہاتھ سے لکھے ہوئے اپنے حالات تھے جو انہوں نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے۔ یہ ورق کہیں سے سید افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا تھا اور انہوں نے اپنی عنایت سے مرحوم کو بھیج دیا تھا.... ...سید افتخار عالم مرحوم نے ان حالات کے ساتھ نیر راجستھان جلد ۲ نمبر ۱۵ کا بھی ایک مطبوعہ ورق بھیجا تھا جس میں تذکرہ مظہر العجائب کا اشتہار شائع ہوا تھا، اغلب ہے کہ یہ حالات مرزا صاحب نے اسی تذکرہ کے لئے تحریر کئے ہوں"

احوالِ غالب، مرتبہ مختار الدین صاحب آرزو، میں یہ حالات مع عکس شائع ہوئے ہیں۔ اظہار الحق صاحب ملک نے ان حالات کے متعلق ایک مضمون لکھا، جس میں کئی باتیں محلِ نظر ہیں۔ تحریر کی تاریخ متعین کرنے میں انہوں نے بہت سے امور کی طرف توجہ نہ فرمائی اور حالات کو نستعلیق کرتے وقت یہ جملہ" اور ایک مثنوی غزوات رسالت پناہی میں بہت عمدہ، بہت طویل لکھی جس کے اشعار حد سے زیادہ ہونگے" چھوڑ گئے ہیں، جو غالب نے حاشیہ پر اضافہ کیا تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے تعارف سے صرف نظر کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں لکھ دیا۔

"تذکرہ مظہر العجائب موجود نہ سہی، لیکن اس میں مرزا کا جو ترجمہ درج کیا گیا تھا وہ، اتفاق سے ہمارے سامنے موجود ہے اور

یقین ہے کہ یہ ترجمہ خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔

ظہار الحق ملک کے مضمون اور ان کی اس رائے پر محترمہ سعیدہ ادیبی نے[1] آج کل دہلی فروری ۵۵ء میں ایک مضمون لکھا جس میں ملک صاحب کی تحریر کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ان کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہے، اس پر بھی کبھی لکھا جائے گا۔ سردست میں ایک اہم بات کو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ محترمہ نے ان حالات میں، دربار لاہور کے ذکر اور ستر سالہ عمر کی تحریر سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ تحریر دربار کے بعد کی ہے اور غالب کی عمر بلحاظ سنین قمری ۱۸۶۵ء میں ستر سال کی ہوتی ہے اس لئے لکھا ہے:

"اس حقیقت کے پیش نظر میں اس "خود نوشت حالات" کو تذکرہ مظہر العجائب کے لئے تسلیم نہیں کرتی۔ دوسرے یہ سامنے ڈاکٹر عبد الحق صاحب کی تحریر کا وہ حصہ بھی ہے کہ "یہ ورق کہیں سے سید افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا تھا اور انہوں نے اپنی عنایت سے بجنوری مرحوم کو بھیج دیا تھا" اس کی روشنی میں بھی میرا خیال یہی ہے کہ یہ تحریر "تذکرہ مظہر العجائب" کے علاوہ کوئی دوسری تحریر ہے"

محترمہ نے اپنے اس خیال کے ثبوت میں مولانا احتشام الدین دہلوی کی یہ تحریر پیش کی ہے جو موصوف نے نسخہ حمیدیہ مملوکہ سید احتشام الدین صاحب رضوی (لکھنؤ یونیورسٹی) کے صفحہ ۱۶۲ پر اپنے قلم سے لکھی ہے:

"یہ غلط ہے کہ بجنوری نے یہ دیباچہ غالب کے نسخے دیوان مرحوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا، نہیں، بلکہ دستیاب ہونے پر ان کو مکمل کلام غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور یہ مقدمہ اس ارادہ کی پیروی میں لکھا گیا۔ اس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علی گڑھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا کٹا پھٹا، ان کے پاس موجود تھا، اور انہوں نے خود اپنی زبان سے اس کو مجھے پڑھ کر سنایا، اور طباعت کے متعلق مشورے کئے۔ اور یہ ظاہر کیا کہ اس کے ساتھ غالب کا ایک فوٹو اور ان کے خط خاص کا نمونہ بھی دینا چاہیئے، مگر اس کی بہم رسی کے لئے متردد تھے۔ میرے پاس وہ مختصر تذکرہ خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا موجود تھا، جو ان سے مسٹر ہملٹن ڈپٹی کمشنر دہلی کے تذکرہ شعرائے فارسی کے لئے میرے والد ماجد مرحوم نے لکھوایا تھا۔ وہ میں نے بجنوری مرحوم کو دیا، مگر ان کے انتقال کے بعد جب یہ نسخہ بالآخر شائع ہوا تو نہ اس کے ساتھ مرزا کی تصویر تھی اور نہ ان کے خط کا وہ نمونہ۔ مسٹر شعیب قریشی کی وساطت سے اس کو بہت تلاش کیا، کہ وہ مرحوم کے ورثا کے واقف اور بروقت وفات بھوپال میں موجود تھے، مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر حیدرآباد آکر معلوم ہوا کہ مولوی عبد الحق صاحب (انجمن ترقی اردو) کے پاس وہ "احوال غالب" خود ان کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ الحمد للہ کہ ابھی تک ضائع نہیں ہوا، مگر انتظار ہے کہ کب شائع ہوتا ہے۔ "محمد احتشام الدین دہلوی"

محترمہ نے اس تحریر کو حرف آخر قرار دے کر ان حالات کو تذکرہ مظہر العجائب سے نسبت دینے کو نادرست قرار دیا —— حالانکہ احتشام الدین صاحب کی یہ تحریر خود محل نظر ہے، اور ان کی اس تحریر میں دو باتیں کلیتہً غلط ہیں۔ ایک تو مسٹر ہملٹن ڈپٹی کمشنر دہلی کا تذکرہ شعرائے فارسی لکھنا۔ دوسرے ان کے والد (مولوی انوار الحق) کا تذکرہ کے لئے حالات لکھوانا، کیونکہ غالب نے خود لکھا ہے:

[1] آج کل دہلی فروری ۵۵ء

"ڈکرو درصاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے، انکی جگہ ری ٹیگن صاحب مقرر ہوئے، ان کے ناچار منہ پڑا، دہ تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔ مجھ سے بھی انہوں نے مدد چاہی۔ میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعراء کو تو اچھی طرح جانتا ہے، ان کا حال لکھ بھیج۔ میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے"[1]

اس خلاصے صاف ظاہر ہے کہ ری ٹیگن صاحب نے غالب سے خود حالات بھیجنے کو کہا تھا۔ غالب نے اپنے اور دیگر شعراء کے حالات لکھ کر بھیجے۔ اس زمانہ میں مولوی انوار الحق کی کیا حیثیت تھی وہ بھی غالب ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے:

"یکشنبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے، ان سے سب حال معلوم ہوا۔ پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم ری ٹیگن صاحب کے لکھا تھا"[2]

"انوار الحق گھاٹ پر نوکر ہیں۔ پندرہ روپے مشاہرہ پاتے ہیں"[3]

اس حیثیت کے آدمی سے غالب کے تعلقات جیسے ہوں گے وہ سب کو معلوم ہے، پھر ری ٹیگن صاحب کی استدعا پر غالب دوسرے ... حالات لکھ کر بھیجتے ہیں تو کیا ان سے اپنے حالات قلمبند کرنے کی استدعا نہیں کی ہوگی؟ یہ بداہتہً ناممکن ہے۔ پس احتشام الدین صاحب کا یہ لکھنا کہ ان کے والد مرحوم (مولوی انوار الحق) نے غالب سے حالات لکھوائے تھے قطعاً غلط ہے، اور مسٹر مٹلف ڈپٹی کمشنر دہلی لکھنا تو انتہائی ناواقفیت کی دلیل ہے، کیونکہ غالب کے خطوط، اور اشتہار مطبوعہ نیر رخشاں میں ری ٹیگن صاحب ہی کا نام ہے۔ جو شخص اہل تذکرہ کے خاندان سے متعلق ہو اور وہ بانی تذکرہ کے نام وعہدہ میں اتنی فاحش غلطی کا مرتکب ہو تو اس کے بیان کردہ دیگر امور پر کس طرح اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

سعیدہ ادہمی صاحبہ نے درپردہ اور مولوی احتشام الدین صاحب نے کھلم کھلا مولوی عبدالحق صاحب پر یہ الزام لگایا کہ وہ "احوال غالب" ان کے پاس موجود ہیں جو انہوں نے بجنوری مرحوم کو دیئے تھے اور جو مطبوعہ خود نوشت حالات کے علاوہ ہیں اب تک مولوی صاحب نے ان کو شائع نہیں کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی عبدالحق مرحوم کی ذات پر اس قسم کے رکیک حملے ہوتے رہے ہیں۔ میں نے اکثر حضرات سے سنا ہے کہ مولوی صاحب نے بہت سی نادر تصنیفات دبا رکھی ہیں، اور ان کو وہ مصنفین کی حیات کے بعد اپنے نام سے طبع کرا دیں گے۔ اس سلسلہ میں یہ حضرات غلط فہمی کا شکار تھے، کیونکہ مولوی صاحب کے ہاتھ میں ایک ادارہ تھا، جو اہم کتابیں طبع کرنے میں کوشاں رہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مولوی صاحب کے پاس دو قسم کے مسودات آتے رہتے ہونگے۔ ایک تو اصلاح، تقریظ، مقدمہ اور دیباچہ وغیرہ کی غرض سے۔ دوسرے طباعت کے لئے۔ مولوی صاحب بیحد مصروف انسان تھے اور انجمن کے مالی وسائل محدود۔ اس لئے دونوں قسم کے مسودے پڑے رہتے ہونگے، اور کئی کئی برس تک اصلاح وغیرہ اور طباعت کی نوبت نہ آتی

[1] خط بنام تفتہ خطوط غالب ص ۱۹۹
[2] " " " ص ۲۰۰
[3] " " " ص ۲۰۱

ہوگی۔ اس تعویق وتاخیر کی وجہ سے صاحبانِ تصنیف جب اپنے اپنے احباب سے ذکر کرتے ہوں گے کہ ان کی تصنیف مولوی صاحب کے پاس اتنے دن سے ہے۔ تاحال کوئی خاطر خواہ جواب نہیں آیا، تو یارانِ طریقت، اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوں گے، اور یہ باتیں خوب فروغ پاتی ہونگی۔ حالانکہ یہ بالکل بے بنیاد باتیں ہیں۔ مولوی احتشام الدین صاحب نے بھی ایسی ہی سنی سنائی بات کو یقین کا درجہ دے دیا، حالانکہ "احوال غالب" کی یہ نوعیت بھی نہ تھی۔ مولوی صاحب کو غالب سے جو لگاؤ تھا اس کا ابتدا میں ذکر کر چکا ہوں۔ جو شخص غالب کے متعلق ایک غلط بات کو گوارہ نہ کر سکے وہ اس کی تحریر کو کیوں کر چھپا سکتا ہے، اور جب اس سے پہلے وہ ایک اور اسی قسم کی غیر مطبوعہ تحریر کو تعارف کے ساتھ شائع کر چکا ہے تو دوسری تحریر کو شائع نہ کرنے کے کیا معنی؟ احتشام الدین کا بیان خود قابل قبول نہیں، کیونکہ، انہوں نے اپنی معلومات کا ذریعہ نہیں لکھا کہ حیدر آباد میں کس سے معلوم ہوا کہ وہ تحریر مولوی عبدالحق صاحب کے پاس موجود ہے؟ علم ہونے کے بعد انہوں نے خود مولوی صاحب کی طرف رجوع نہیں کیا؟ سید احتشام حسین صاحب رضوی کے مملوکہ نسخہ پر تو انہوں نے یہ باتیں لکھ دیں، مگر اصل تحریر کی اشاعت میں کوئی کوشش کیوں نہیں کی؟ یہ تمام باتیں احتشام الدین صاحب کی تحریر پر وارد ہوتی ہیں۔ جن کا جواب ہمیں نہیں ملتا اور اس بے اعتنائی کے لئے کوئی وجہ جواز بھی نظر نہیں آتی اس لئے درایتہً احتشام الدین صاحب کا بیان پایۂ اعتبار سے ساقط نظر آتا ہے۔

میں نے ۱۹۵۷ء میں غالب کے خطوط وغیرہ پر کام کرنا شروع کر دیا تھا غالب کے اکثر خطوط کی تاریخیں غلط ہیں اور متن کی غلطیاں اس کے علاوہ ہیں۔ منشی مہیش پرشاد آنجہانی نے غالب کے خطوط کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دینے کا کام شروع کیا اور ایک جلد شائع کر دی۔ مولانا غلام رسول صاحب مہر نے تمام خطوط تاریخی حیثیت سے ترتیب دیکر "خطوط غالب" کے نام سے دو جلدوں میں شائع کر دیئے ان کوششوں کے باوجود غالب کے بعض نثری آثار مجموعوں میں شامل نہ ہو سکے اور تاریخیں درست نہ ہو سکیں۔ میں نے "غالب کے خطوط کی تاریخیں اور ترتیب" کے عنوان سے ایک مضمون ماہ نو فروری ۵۹ء میں شائع کرایا۔ جس میں خطوط بنام منشی میاں داد خاں سیاح کی تاریخیں درست کی تھیں۔ اسی زمانہ میں آج کل فروری ۵۵ء میں یہ مطبوعہ مضمون نظر پڑا، کیونکہ مجھے غالب کے غیر مطبوعہ نثری آثار کی جستجو تھی، لہٰذا میں نے مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں ۱۱ مارچ ۵۹ء کو یہ خط لکھا:

مکرمی زید مجدکم!

آداب ونیاز!

میں خطوط غالب کی تاریخی ترتیب از سرنو کر رہا ہوں۔ خطوط کے علاوہ غالب کے دیگر نثری آثار بھی شامل کرنا چاہتا ہوں میری کاوش کا اندازہ، جناب ماہ نو فروری ۵۹ء میں "غالب کے خطوط کی تاریخیں اور ترتیب" ملاحظہ فرما کر لگا سکتے ہیں۔ اکثر بزرگوں سے اس سلسلہ میں خط وکتابت ہے، اور وہ حضرات مجھ پر عنایت فرماتے رہتے ہیں۔

مدعائے اصلی اس عریضہ سے یہ ہے کہ آپ کی تحویل میں غالب کی ایک نادر تحریر ہے جو آج تک کہیں شائع نہیں ہوئی۔ یہ تحریر مولوی احتشام الدین صاحب دہلوی نے ڈاکٹر بجنوری مرحوم کو دی تھی۔ ڈاکٹر بجنوری کے انتقال کے بعد جب مولانا حیدر آباد گئے

توان کو معلوم ہوا کہ وہ تحریر آپ کی تحویل میں ہے ۔ اس کا اظہار مولوی احتشام الدین صاحب نے اپنی ۱۱ ۵ء کی ایک تحریر میں کیا ہے ۔ یہ تحریر" غالبؔ کے خود نوشت حالات " ہے ۔ جو اس تحریر سے جداگانہ ہے، جو اردو (دکن) جولائی ۲۸ء میں شائع ہوئی تھی وہ تحریر سید افتخار عالم صاحب کے ذریعہ سے ملی تھی ۔

براہ کرم اس تحریر کے متعلق تحریر فرمائیے کہ آپ کے پاس ہے یا نہیں؟ اگر آپ نے شائع فرمائی تھی تو کب اور کس رسالہ میں ؟ اگر اصل تحریر آپ کے پاس نہیں تو کس کے پاس ہے ؟ اس کی کوئی نقل ہے یا نہیں ؟

اگر اصل آپ کے پاس ہے تو براہ کرم عنائت فرمایئے، میں اس کا بلاک بنوا کر واپس کر دوں گا یا کم از کم اس کی نقل عطا فرما دیجئے تا کہ میں اس کو مجموعہ میں داخل کر دوں ۔ میں غالبؔ کا تمام نثری سرمایہ یکجا جمع کر کے شائع کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں، لیکن یہ ارادہ آپ جیسے بزرگوں کی امداد ہی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے گا ۔ مذکورہ تحریر کے علاوہ اگر اور کوئی غالبؔ کی نثر آپ کے پاس ہو یا کہیں اور موجودگی کا علم ہو تو آگاہ فرمایئے ۔ شکرگزار ہوں گا ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا والسلام

نیاز کیش

سید قدرت نقوی

۱۱ مارچ کے اس عریضہ کا جواب مولوی صاحب نے ۴ اپریل ۵۹ء کو یہ عنایت فرمایا ۔

مکرمی نقوی صاحب، تسلیم

میرے پاس مرزا غالبؔ کی کوئی ایسی تحریر نہیں جس کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے ۔ ان کی خود نوشت سرگزشت جو مجھے ملی وہ رسالہ اردو میں شائع ہو چکی ہے، اس کے علاوہ کوئی اور ایسی تحریر میرے پاس نہیں تھی ۔ اگر مولوی احتشام الدین صاحب نے ایسا بیان کیا ہے تو وہ صحیح نہیں ان کو کچھ غلط فہمی یا غلط اطلاع ملی ۔

خادم

عبدالحق

مولوی صاحب کی اس تحریر کی موجودگی میں احتشام الدین صاحب کا بیان غلط اور سعیدہ اوہمی صاحبہ کے ثبوت کی بنیاد بے بنیاد ثابت ہو جاتی ہے ۔ حقیقت امر یہ ہے کہ " غالبؔ کے خود نوشت حالات " اشتہار مطبوعہ نیر راجستان اور خطوط غالبؔ بنام تفتہ و علائی کی روشنی میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے ۔ کہ ان حالات کا تذکرہ منظہر العجائب کے لئے لکھا جانا عین ممکن ہے ۔

نصیرالدین ہاشمی

مولانا ڈاکٹر عبدالحق سے میرے مراسم

مولانا ڈاکٹر عبدالحق مجھ سے (۲۵) سال بڑے تھے ۱۸۹۵ء میں جب آپ علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری لیکر حیدرآباد آ کر مدرسۂ آصفیہ کی ہیڈ ماسٹری پر مامور ہوئے تھے تو اسی سنہ کی دس مارچ کو میری پیدائش ہوئی ۔ اس کے بارہ تیرہ سال کے بعد مجھے مولانا کے نام سے آگاہی ہوئی جب کہ میں نے اردو رسالوں اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تھا "گلشن ہند" پہلی کتاب تھی جس کا مقدمہ مولانا نے قلمبند کیا ہے۔ یہ کتاب طغیانی رود موسی ۱۹۰۸ء کے بعد شائع ہوئی تھی اس کے چند سال بعد جب حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۹۱۴ء میں ہوا تو مولانا عبدالحق کو دیکھنے کا موقع ملا ۔ اسی زمانہ میں مولانا حمیدالدین صدر دارالعلوم مقرر ہوئے تھے اور میں مدرسہ دارالعلوم کی یونین انجمن ثمرۃ الادب کا اعزازی معتمد تھا ۔ مولانا عبدالحق کی مولانا حمیدالدین صاحب سے بڑی دوستی تھی ۔ مولوی حمیدالدین کے پاس مولانا عبدالحق آیا کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ انجمن ثمرۃ الادب کے علمی جلسہ کی صدارت بھی مولوی عبدالحق نے فرمائی تھی اور رسالہ ثمرۃ الادب کے لئے اپنا مضمون مقدمہ انتخاب کلام میر بھی عنایت فرمایا تھا۔ اس طرح مولانا سے میری ملاقات ہوئی تھی ۔ ملاقات رسمی تھی ۔ اس زمانے میں مولانا جوانی کی سرحد سے گزر چکے تھے ۔ داڑھی میں سفیدی آگئی تھی مگر جوان ہمت تھے ۔ لیلئ اردو کے والہ اور شیدا تھے ۔ کانفرنس کے سوشل گدرنگ میں ایک انگریز کی اردو دانی کا دلچسپ مزاحیہ انداز میں اظہار فرمایا تھا ۔

۱۹۲۲ء میں میں نے پہلی مرتبہ مولانا کو خط لکھا اور حضرت سید محمد گیسو دراز کی اردو شاعری کے متعلق مولانا کے خیالات دریافت کئے تھے مولانا نے جواب دیا ہنوز حضرت گیسو دراز کی شاعری کے متعلق تحقیقات جاری ہے ۔ اگر دکن میں اردو کا مضمون مکمل ہو جائے تو اس کو رسالہ اردو میں خوشی سے شائع کیا جائے گا ۔

۱۹۲۲ء میں دکن میں اردو کا مسودہ مکمل ہو گیا ۔ جو ایک مضمون سے بڑھ کر ایک ضخیم مقالہ کی صورت میں آگیا ۔ اس مقالہ کو شائع کرنے کے لئے میں نے سررشتہ تعلیمات سے امداد کی استدعا کی ۔ میرا مسودہ مولانا عبدالحق صاحب کے پاس رہنے کے

لئے روانہ کیا گیا۔ مولانا نے مسودہ کی خامیوں اور نقائص پر روشنی ڈال کر اس کو ناقابل اشاعت قرار دیا۔ میں نے مسودہ واپس لے کر شائع کر دیا چھ ماہ کے اندر پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا اور ...... ہندوستان کے مشاہیر اور اردو کے معیاری رسالوں نے بڑی اچھی تنقید کی تھی اور ایک نئے موضوع کے لحاظ سے اس کتاب کی بڑی تعریف اور تحسین کی۔ مگر رسالہ اردو نے جو تنقید کی وہ بڑی حد تک ناانصافی پر مبنی تھی اور ہمت شکن بھی۔ اس عرصہ میں ایک اور واقعہ ہو گیا۔ دکن میں اردو کی دوسری طباعت کے بعد مولانا نے سررشتہ تعلیمات سے درخواست کی تھی کہ انجمن ترقی اردو کو تاریخ زبان اردو مرتب کرنے کے لئے دس ہزار روپے دیئے جائیں تاکہ اردو زبان کی تاریخ کو قلمبند کیا جائے۔ سررشتہ تعلیمات نے اس تحریک کو منظور کر کے باب حکومت کو روانہ کیا۔ یہ تحریک باب حکومت کے ارکان میں گشت کرنے لگی جب نواب تلاوت جنگ (جو صدر المہام تعمیرات تھے) کے پاس مسل پیش ہوئی تو موصوف نے یہ لکھا کہ نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو شائع کر دی ہے اس لئے انجمن ترقی اردو کو دس ہزار روپے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کارروائی جب حیدری صاحب کے پاس ہو (جو اس وقت صدر المہام فینانس تھے) پیش ہوئی تو موصوف نے اپنی رائے قلمبند کرنے کے بجائے رسالہ اردو نے جو تنقید دکن میں اردو پر کی تھی وہ نقل کر دی۔ غرض یہ تحریک ارکان باب حکومت میں گشت کے بعد باب حکومت میں پیش ہوئی اور بہ غلبہ آرا دس ہزار روپیہ انجمن کو دینا منظور ہو گیا۔ مگر جب عرضداشت اعلیٰ حضرت کی منظوری کے لئے روانہ کی گئی تو اعلیٰ حضرت نے باب حکومت کے غلبہ آرا سے اتفاق نہیں کیا بلکہ تلاوت جنگ کی رائے سے اتفاق کر کے رقم نامنظور کر دی۔

مجھے اس کارروائی کا علم ۱۹۵۵ء میں اس وقت ہوا جب کہ جنگ آزادی کے مواد کے سلسلہ میں باب حکومت کے مسلے میں نے دیکھے تھے۔ اس عرصہ میں کچھ اور باتیں ایسی ہو گئیں جو میرے لئے رنج کا موجب بن گئیں۔ میں نے دکن میں اردو کی امداد کے سلسلہ میں حکومت سے استدعا کی کہ مجھے نقد رقم دینے کے بجائے یورپ کو روانہ کیا جائے تاکہ دکن میں اردو کا مزید مواد فراہم کیا جائے۔ میری استدعا نواب سر امین جنگ مرحوم کی تحریک اور سید راس مسعود صاحب کی تائید سے منظور ہو گئی اور مجھے یورپ کو روانہ کر دیا گیا۔ جب میں انگلستان میں تھا تو رسالہ اردو میں ڈاکٹر بلوم ہارٹ کی مرتبہ انڈیا آفس کے اردو مخطوطات کی فہرست پر تنقید شائع ہوئی۔ یہ تنقید حکیم شمس اللہ قادری صاحب کی تھی اس میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ انگلستان میں اردو کا کوئی ایسا مواد نہیں ہے جس کے لئے انگلستان کا سفر کیا جائے۔ جو اصحاب اس کا ارادہ کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو اور حکومت کو دھوکہ دیتے ہیں۔ یہ مضمون میرے انگلستان جانے کے بعد شائع ہوا۔ اگر پہلے شائع ہوتا تو ممکن تھا مجھے یورپ جانے کا موقع نہ ملتا۔

جب میں یورپ سے واپس آیا تو اس وقت مولانا عبدالحق صاحب جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر ...... تھے اور نواب میر احمد علی خانصاحب (حال منسٹر تعمیرات) یونین کے صدر تھے۔ یونین کی جانب سے میری تقریر کا انتظام کیا گیا۔ میرے مضمون کا عنوان یورپ کے کتب خانے اور ان کا اردو ذخیرہ تھا جلسہ کے صدر مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں واضح کیا تھا کہ یورپ میں تین قسم کا مواد ملتا ہے۔ اول تو یہ کہ ایسی کتابیں ہیں جن کا کوئی نسخہ ہندوستان یا حیدرآباد میں نہیں

ہے اور دوسرے یہ کہ بعض کتابوں کے ایک سے زیادہ نسخے موجود ہیں ۔ تیسرے یہ کہ جو دکنی کتابیں فارسی کا ترجمہ ہیں ان کی اصل فارسی کتابیں بھی وہاں ہیں جس کی وجہ سے مقابلہ کرنے میں سہولت ہوتی ہے مولانا نے اپنی صدارتی تقریر میں بیان کیا کہ جو کتابیں انگلستان میں ہیں وہ یہیں سے گئی ہیں، اور ایک آدھ کتاب کے سوا کوئی ایسی کتاب وہاں نہیں ہے جس کو نایاب کہا جائے ۔

میں نے اپنے انگلستان کی واپسی کے بعد وہاں کے حاصل کردہ مواد کو "یورپ میں دکھنی مخطوطات" کے نام سے شائع کیا کتاب کے شائع ہونے پر رسالہ اردو میں شیخ چاند صاحب کا مضمون اس کی خامیوں کے متعلق شائع ہوا اور ازابتدا تا انتہا اس کتاب کو ناقص نامکمل اور ناقابل التفات ظاہر کیا گیا تھا۔ جب میں نے اپنی اس کتاب کے نسخے سررشتہ تعلیمات میں خرید کئے جانے کی تحریک کی اور سررشتہ تعلیمات نے مولانا کی رائے دریافت کی تو مولانا نے اپنی رائے میں ان ہی امور کا ذکر کیا جن کو شیخ چاند صاحب نے اپنے مضمون میں واضح کئے تھے ۔ اس اختلاف کے باعث سررشتہ تعلیمات نے میری کتاب کے صرف (۷۵) نسخے خریدے ۔

یہ وہ وجوہات تھے جن کی وجہ سے اب میں نے بھی مولانا کے خلاف قلم استعمال کرنے کا ارادہ کرلیا اور دو تین مضمون مولانا کے خلاف لکھے ۔ ایک مضمون کا عنوان تھا "رسالہ اردو کی خصوصیات" اور دوسرا مضمون ڈاکٹر بیلی کا اردو لٹریچر اور رسالہ اردو کے عنوان سے لکھا گیا ۔ یہ مضامین دہلی کے ایک معیاری رسالہ میں شائع ہوئے ۔ اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ رسالہ اردو کی تنقید عموماً جانب داری کی ہوتی ہے صرف ان ہی کتابوں کو اچھا کہا جاتا ہے جو اصحاب مولانا کی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں دوسری اچھی کتابوں کو بھی زیادہ تر صرف اس کے نقائص اجاگر کئے جاتے ہیں ان کی خوبیوں کا تذکرہ نہیں ہوتا۔

میرا تیسرا مضمون "سب رس" پر تھا ۔ مولانا نے اولاً رسالہ اردو میں وجہی کی سب رس پر ایک مضمون لکھا تھا اور اس کے دو تین سال کے بعد داستان سب رس شائع کی گئی اس کا مقدمہ مولانا عبدالحق نے تحریر فرمایا ہے ۔

میں نے اپنی تنقید میں یہ واضح کیا ہے کہ مولانا دوسروں کو مشورہ دیتے ہیں کہ کسی کی تحقیق سے فائدہ اٹھایا جائے تو اس کا اعتراف کرنا چاہیئے اور دیانت داری سے اپنے ماخذ کو ظاہر کرنا ضروری ہے ۔ مگر مولانا خود اس پر عمل نہیں کرتے ۔ اس کی مثالیں بھی دی گئی تھیں ۔ اگرچہ یہ تنقید سخت سے سخت تر ہے مگر اسلوب مہذب اور شائستہ رکھا گیا ہے ۔ متانت اور سنجیدگی سے مقدمہ سب رس کی خامیاں اجاگر کی گئی ہیں ۔

غرض جب تک مولانا حیدرآباد یا اورنگ آباد میں رہے مجھے بالمشافہ مولانا سے گفتگو کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا اور نہ میں نے کوئی مضمون رسالہ اردو کو اشاعت کے لئے روانہ کیا ۔

پھر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے دہلی منتقل ہوگئی اور اس کے بعد تقسیم ہند کے بعد مولانا کراچی چلے گئے ۔

یہ سب ماضی کی داستان تھی جو بھول جانے کے لئے ہے صرف تسلسل بیان کے لئے اس کا اعادہ ناگزیر تھا در اصل مولانا سے حقیقی مراسم کا آغاز ۱۹۵۳ء کے بعد سے ہوتا ہے ۔

۱۹۵۷ء میں میں نے مولانا کے اس خط کی نقل کو دیکھا جو موصوف نے گاندھی جی کو تقسیم کے ہنگاموں کے موقع پر ..... ۱۹۴۷ء میں لکھا تھا۔ یہ خط جس دل سوز اور المناک حالت میں لکھا گیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اس خط کو دیکھ کر مولانا کی عظمت اور جرأت کا اقرار کرنا ضروری ہے ان کے اردو سے والہانہ شغف اور پہاڑ جیسے استقلال نے میرے دل پر بہت اچھا اثر کیا۔ ان کی عالی ہمتی۔ جرأت اور صداقت شعاری کا نقش ثبت ہوگیا اور مولانا کے خلاف جو مضامین لکھے تھے ان پر افسوس ..... ہونے لگا نادم ہو کر مولانا کے ایثار۔ خلوص کا اعتراف کرنا پڑا۔ اس کے بعد ہی مولانا سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں نے رسالہ اردو کے لئے مضامین روانہ کئے۔ دو تین سال کے عرصہ میں میرے کئی مضامین وار رسالہ اردو میں شائع ہوئے۔ اس زمانہ میں ایک خاتون نے مولانا پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ان کو مواد کی فراہمی میں مدد دی گئی۔

مولانا نے رسالہ اردو کے علاوہ انجمن ترقی اردو کا پندرہ روزہ اخبار قومی زبان میرے نام جاری فرمایا۔ اس میں بھی میرے مضامین شائع ہونے لگے۔ پاکستان میں اردو کے متعلق مولانا نے چند پمفلٹ شائع فرمائے تھے وہ بھی مجھے ارسال کئے گئے اپنی بعض تصانیف سے بھی مستفید فرمایا گیا۔ خطوط کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان سے واضح ہو سکتا ہے کہ کس طرح مولانا نے میری گستاخیوں اور بے ادبیوں کو فراموش کر کے معاف کر دیا۔ محبت اور اخلاص کا ہاتھ دراز کر دیا۔ خطوط سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مولانا کام کرنے والوں کی دل سے قدر کرتے تھے اور کاموں کی ستائیش بھی فرماتے تھے۔ خطوط کے چند اقتباس اس موقع پر قابل ملاحظہ ہیں۔ ایک خط میں تحریر فرمایا ہے۔

آپ نے عماد الملک والا مضمون پسند فرمایا مجھے اس سے خوشی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ اہل حیدرآباد اسے پسند نہیں کریں گے۔

میں انجمن میں قاموس اردو کتب تیار کرا رہا ہوں یعنی ابتدا سے اب تک جس قدر کتابیں اردو میں ہیں ان سب کی فہرست۔ یہ قاموس پانچ چھ جلدوں میں ہوگی ...... اگر سالار جنگ کے کتب خانہ میں اس موضوع (اسلامیات) سے متعلق کتابیں ہوں تو انکا نام لکھ بھیجئے ممنون ہونگا۔

دوسرا خط لکھا ہے۔

"اس وقت اس موضوع پر دس ہزار سے زیادہ کتابیں درج ہو چکی ہیں۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر ان عنوات کی کتابیں جن کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے فہرست ٹائپ کر کے روانہ کر دیں۔"

ایک اور خط میں تحریر فرمایا ہے۔

"آپ کا خط نثر میں داستانوں والا مضمون اور فہرست مخطوطات نواب سالار جنگ وصول ہوئے۔ جس کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ آپ کا یہ کام بہت قابل قدر ہے اس نوع کے آپ نے متعدد لائق تعریف کام کئے ہیں جن سے اہل تحقیق کو بہت مدد ملے گی۔"

ان اقتباسات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مولانا میرے کام کو اب کس نظر سے دیکھنے لگے تھے۔

بہر حال اب میں مولانا کا بیحد احترام کرتا ہوں اور دلی عقیدت کے نذرانے میں تین مضمون قلمبند تھے دو مضمون پاکستان میں شائع ہوئے۔

ڈاکٹر سید شاہ علی

مولوی عبدالحق کی شخصیت نگاری

اگر مولانا حالی نے باقاعدہ اردو سوانح نگاری کی بنیاد رکھی تو ان کے انتہائی عقیدت مند اور عزیز شاگرد مولوی عبدالحق نے اردو شخصی مرقعہ نگاری کی ابتدا کی ۔ لیکن فرق یہ ہے کہ مولانا حالی نے شعوری طور پر اردو میں اس فن کی داغ بیل ڈالی اور مولوی عبدالحق کے بارے میں یہ وثوق سے کہنا مشکل ہے۔

اردو سوانح نگاری کی کائنات میں حالی سے پہلے سرسید کی آثار الصنادید کا چوتھا باب مشاہیر دہلی کے حال میں، ماسٹر رام چندر کے سوانحی مضامین کے تراجم، اور آزاد کی آب حیات اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں کہ یہ قدیم تذکرہ نگاری اور سیر رجال و شمائل کے مقابلے میں جدید سوانح نگاری سے قریب تر ہیں ۔ لیکن حالی کی سوانحی تصانیف کی بات ہی اور ہے اور حیات سعدی کا دیباچہ بقول آل احمد سرور اردو سوانح نگاری کا مینی فسٹو ہے یہ صحیح ہے کہ مولوی عبدالحق سے پہلے حالی اور شبلی کی بدولت اردو سوانح نگاری کو باقاعدہ رواج اور استحکام نصیب ہو چکا تھا اور اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہو چکی تھی کہ عبدالحلیم شرر، عبدالرزاق البرامکہ وغیرہ نے ان کی تقلید میں متعدد تصانیف سپرد قلم کیں ۔ لیکن ان تصانیف اور مولوی عبدالحق کی سوا تحریروں کا فرق ظاہر ہے کہ مستقل سوانح عمریوں MONOGRAPHS اور سوانحی مضامین کا فرق ہے ۔ جن میں سے بعض شخصی مرقع کے قریب پہنچ جاتے ہیں ۔

شخصی مرقع دیگر سوانحی اصناف کے برعکس نہ صرف اردو ادب بلکہ دنیائے ادب میں ایک نئی چیز ہے شخصی مرقعے اور مستقل سوانح عمری کا فرق ناول اور افسانے کا سا فرق ہے ۔ مستقل سوانح عمری میں انسان کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سلسلے میں خارجی اثرات اور افتاد طبع اور ان کے ایک دوسرے پر عمل اور ردّ عمل کے بیان کے علاوہ بہت سے متنازع فیہ مسائل بھی زیر بحث آجاتے ہیں ۔ لیکن شخصی مرقع اس کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ اس میں انسان کی زندگی کا ایک ایسا عکس نظر آتا ہے جس میں ایک یا چند پہلو نمایاں ہوں۔ گویا

سیرت ایک قدآدم تصویر ہے اور شخصی مرقع صرف چہرے کی کسی ایک رخ سے ایک ہلکی اور مختصر سی جھلک جو زیادہ تر مرقع نگار کے اپنے تصور کی ترجمانی کرتی ہے لیکن یہ تصور اس کی سوجھ بوجھ اور قوت متخیلہ وغیرہ کا نتیجہ ہوتا ہے اور ایسے پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہے جس سے شخصیت کا ایک عمدہ تصور خود پڑھنے والے کے ذہن میں قائم ہو سکے۔ اس مقصد سے اسے سنہ ولادت سے وفات تک کے حالات زندگی کا سلسلہ وار اور تاریخی بیان قلمبند کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ اس کے حالات کی تلاش و تحقیق یا اس کی حیات اور خیالات کے مشاہدے اور مطالعے کے لئے اس کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہنے کی ضرورت ہے اور نہ اہم واقعات کو پیش کرنا ہی لازم ہے بلکہ اس کا طریقہ کار یہی ہونا چاہیئے کہ حیات پر ایک چھلتی ہوئی سی نظر ڈالے اور غیر اہم واقعات سے اہم کی طرف رجوع کرے۔ وہ ایک واقعہ سے بھی اپنے موضوع کی زندگی اور شخصیت کا پورا تصور پیش کر سکتا ہے۔

شخصی مرقع تذکرے یا مختصر حالات سے مختلف ہوتا ہے۔ موخرالذکر گویا سوانح عمری کا خلاصہ ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد آرٹ نہیں معلومات پیش کرنا ہے۔ بصیرت نہیں بیان واقعات ہے۔ یہ سچ ہے کہ شخصیت اور کردار کے خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں پر ان کی نظر ہوتی ہے لیکن یہ ایک ناول کی تلخیص کی طرح اکثر سوانح عمری کے ڈھانچے کو برقرار رکھتے ہیں۔ شخصی مرقع کی تکنیک ان سے اتنی ہی مختلف ہے جتنی افسانے کی ناول سے اور یہی چیز مختصر حالات یا تذکرے سے اس کے فرق کو بھی واضح کرتی ہے۔ ان کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ معلومات پیش کریں۔ لہٰذا ان میں ادبیت اور فارم کی طرف توجہ دینا مشکل ہوتا ہے۔ دراں حالیکہ شخصی مرقع ایک فنّی چیز ہے۔ یہ گویا ایک ایسی تصویر ہے جس میں مصور آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ انگریزی لغات قومی سوانح نگاری میں اس ایجاز و اطناب کی کوشش کی گئی ہے لیکن ایک قاموس میں اس طرح دریا کو کوزے میں بند کرنے کی سعی میں سنہ و تاریخ کی بھرمار ناگزیر ہو جاتی ہے جو آرٹ سے ذرا بھی مس نہیں رکھتی۔

شخصی مرقعے دلچسپی اور مقبولیت میں غزل اور مختصر افسانہ کے حریف ہیں۔ بلکہ امریکہ کے تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق یہ مختصر افسانوں سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ افسانے کیا ہیں؟ خیالی افراد کے شخصی مرقعے ہی تو ہیں اگر حقیقی افراد کے مرقعوں میں فنی انداز کو کام میں لایا جائے تو یہ افسانوی کرداروں سے زیادہ دلچسپ ہو سکتے ہیں۔ افسانوں میں افسانہ نگار اپنے مختلف تجربات و مشاہدات کے پیوند لگا کر ایک رنگا رنگ مرقع پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن شخصی مرقعوں میں اس کی ضرورت اور اجازت نہیں۔ حقیقی مرقعوں میں صرف جلا پیدا کرنے کی ... ضرورت ہوتی ہے جس سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ اس صنف کو مقبول بنانے اور ترقی دینے میں لٹن اسٹراچی کو بڑا دخل ہے .... اس کا قائل ہے کہ سوانح عمری باسول کی حیات جانسن کی طرح طویل ہو یا آبرے کی سوانح عمریوں کی طرح مختصر۔ ایک لحاظ سے جانسن کی حیات الشعراء بھی اسی مختصر صنف کے تحت آسکتی ہے۔ اسٹراچی نے بہت حد تک جانسن اور آبرے کے طریقوں کے امتزاج سے کام لیا ہے۔ علاوہ بریں اس نے فرانسیسی اساتذہ کی تصانیف سے بھی خوشہ چینی کی ہے جن کے فن نے اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی تھی ———

EMINENT VICTORIANS. کے پیش لفظ میں جو جدید مرقع نگاری کا دستور العمل تسلیم کیا گیا ہے وہ لکھتا ہے "شخصی مرقعوں کو صحیح طور پر پیش کرنے کے لئے ہر غیر ضروری جزو کو خارج اور ہر قابل ذکر چیز کو شامل کرنے اور انسان کے گوناگوں وجود کو چند تابناک صفحوں میں منتقل کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ مواد کو اکٹھا کر چکنے کے بعد مرقع نگار ان حقائق کا انتخاب کرتا ہے جو اس کردار سے متعلق اس کے اپنے تصور کو نمایاں کرتے ہیں اور اس کی بصیرت سے مناسبت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، مختصر افسانے کی طرح مرقع نگاری بھی ایک مختصر ہلکی پھلکی اور تفریحی چیز ہوتی ہے اور اپنے اندر ایک عمدہ فنی تصنیف کی اپیل رکھتی ہے۔ سٹراچی نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ علمیت کا غیر لطیف اور غیر جمالیاتی ہونا ضروری نہیں ہے۔ طویل اور مختصر افسانوں کی طرح مرقع نگاری کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ سٹراچی کی EMINENT VICTORIANS طویل کی اور "PORTRAITS INMINIATURE." مختصر کی مثال ہے۔ سٹراچی کا اپنا رجحان زیادہ تر مختصر سوانح نگاری ہی کی طرف تھا۔ چنانچہ اس کی ثانی الذکر تصنیف (P. M) کو نوبل پرائز کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ اردو میں فرحت اللہ بیگ کی نذیر احمد کی کہانی طویل کی اور گنج ہائے گراں مایہ مختصر کی مثال پیش کرتی ہیں اور خود چند ہم عصر کے اندر دونوں قسم کے نمونے شامل ہیں۔

نیم شخصی مرقع یا جزوی سوانحی خاکے کا ذکر بھی شخصی مرقعوں کے ضمن میں ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ان کے اصولوں کی روشنی میں چند ہم عصر کے سوانحی خاکوں کا جائزہ لیا جا سکے۔ سوانح نگار کے لئے کوئی معین فارمولا نہیں ہے۔ شاعر ناول نگار اور ... مصور کی طرح سوانح نگار کو بھی اپنے اسلوب بیان کے ساتھ ایمانداری برتنی ہوتی ہے۔ لیکن وہ بھی انہی کی طرح ہیئت اور طریقۂ اظہار کے انتخاب میں آزاد ہوتا ہے۔ یہ چیز ناقابل برداشت ہوتی اگر ساری سوانح عمریاں باسول اور لاک ہارٹ کی سوانحی تصانیف یا حیات جاوید اور شبلی کے نمونے پر لکھی جاتیں علاوہ بریں یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک پوری سیرت کے مقابل اس کا ایک باب بہتر ہو اور ایک مخصوص واقعہ کا فنی بیان ایک طویل سلسلہ واقعات سے زیادہ انکشاف کر سکتا ہو۔ اردو میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً شبلی کی حیات معاشقہ اور حیات شبلی کا ایک رنگین ورق میں شبلی کی حیات کے جنسی پہلو اور قید یاغستان میں مصنف کی پٹھانوں کے ہاتھوں گرفتاری اور فرار کا بیان ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی کا نام ہی اس کی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے گو اس میں کچھ صحافیانہ انداز نمایاں ہے۔ شرر کے شاعرانہ و عاشقانہ مضامین اور وضعداران لکھنؤ از محمد ہادی میں بھی کئی اشخاص کی سیرت کے صرف ایک ایک پہلو کا ذکر ہے چاند سلطانہ از وزیر حسن، چاند بی بی کے عہد شباب کی داستان ہے عطیہ بیگم فیضی کا اقبال پر تازہ کتابچہ اقبال جو عطیہ کے نام ان کے خطوط اور اقبال کے قیام جرمنی سے متعلق ہے اقبال کی شخصیت اور صلاحیت پر غیر معمولی روشنی ڈالتا ہے انگریزی میں اڈمنڈ گاس کی باپ اور بیٹا FATHER AND SON اور ہیرالڈ نکلسن کی — BYRON LAST JOURNEY. اسی قسم کے نمونے ہیں۔ اولی الذکر دو مزاجوں کی نہیں بلکہ دو پودوں کی کشمکش

کی داستان ہے۔ ایک طویل سوانح عمری اس میں کچھ اضافہ نہیں بلکہ کمی ہی کر سکتی تھی۔ ثانی الذکر بائرن کی زندگی کے آخری سال کا بیان ہے اور نہ صرف زیادہ حقیقی اور قابل فہم ہے بلکہ باقاعدہ رومان سے زیادہ رومان انگیز ہے وہ بائرن کو اس کی زندگی کے آخری سرے سے دکھاتی ہے اور PETROSPECTIVE BIOGRAPHY. کا ایک کامیاب نمونہ ہے

عہد جدید کی خصوصی شعبوں میں مہارت کی وجہ سے بھی افراد کی زندگی کے بعض پہلو بعض دیگر پہلوؤں سے زیادہ نمایاں اور قابل ذکر ہوتے ہیں۔ سوانح نگاروں کے معاملے میں بھی یہی صادق آتا ہے یعنی وہ بھی بعض پہلوؤں پر خصوصی روشنی ڈال سکتے ہیں بعض پر نہیں۔ خود پیغمبر اسلام کی سیرت کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو بہت سی سوانح عمریاں صحیح معنوں میں اسی ذیل میں آنے کی مستحق ہیں۔ شاعروں کی سوانح عمریوں میں اکثر غیر شاعر نظر انداز ہو جاتا ہے اور فلسفی یا فاتح کی سوانح حیات میں اس کی دوسری صفات دھندلی پڑ جاتی ہیں۔

نیم شخصی مرقعوں کے علاوہ سوانحی مضامین سوانحی مطالعے سوانحی خاکے کرداری خاکے مزاحیہ خاکے وغیرہ مختصر سوانح عمری کی مختلف جدید شکلیں ہیں اور روز افزوں ترقی پر ہیں۔ اردو میں خوش قسمتی سے ان شکلوں کے تقریباً تمام نمونے پائے جاتے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کی نذیر احمد اور رسلیم کی سرگزشتیں نئے ادب کے معماروں کا سلسلہ 'چند ہم عصر' گنج ہائے گراں مایہ' مردم دیدہ' شیش محل ' خدوخال وغیرہ مذکورہ بالا اقسام کی بعض "قابل ذکر مثالیں ہیں۔ البتہ ابوالکلام آزاد کی تصنیف چیدہ شخصیتیں کے بعض مضامین اور مضامین شرر میں شاید ہی کوئی مضمون مذکورہ اقسام کی کسی ایک باقاعدہ اور معین شکل کے تحت لایا جا سکتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ چند ہم عصر' مولوی صاحب مرحوم کے مضامین کس قسم کے ہیں۔ اس کی تازہ ترین اشاعت جو اردو اکاڈیمی نے شائع کی ہے تقریباً پچیس سوانحی مضامین پر مشتمل ہے جو کوئی پچاس سال کی مدت میں سپرد قلم کئے گئے یہ مولوی صاحب کے اپنے معاصرین کی جن میں سے بعض ان کے بزرگ ہیں اور بعض خورد کتاب حیات پر تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں مولوی صاحب مرحوم کی تبصرہ نگاری اور "مقدمہ بازی" میں امتیاز حاصل تھا اور اپنی دیدہ دری اور تجزیاتی صلاحیت کے باعث وہ اس کے لئے موزوں بھی تھے۔ مولوی صاحب کے موضوعات میں کافی تنوع پایا جاتا ہے اور وہ زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً سیاست' شعر وادب ، علم و فن وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب کو سب سے زیادہ داد اس کی ملنی چاہیئے کہ انہوں نے ایک گمنام شخص نور خاں کی سیرت و کردار کا اسی قدر عمدہ مرقعہ پیش کیا ہے کہ اس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ اس کے بعد عام ہے۔ اسی طرح انہوں نے ایک اچھوت نام دیو مالی کے کام میں انہماک، لگن اور سپردگی کے جذبے کی ایک جاندار تصویر کھینچی ہے۔ یہ ایک نہایت قابل قدر رجحان ہے۔ انگریزی سوانح نگاری میں یہ بحث بڑی معرکہ آرا رہی ہے کہ عظمت موضوع سوانح کا لازمی جزو ہے یا نہیں۔ بعض سرگرم حامیوں اور تصانیف کے باوجود انگریزی لغات قومی سوانح نگاری کی اشاعت تک غیر مشہور افراد کے موضوع سوانح بننے کے حق کو تسلیم نہیں کیا

گیا اس سے پہلے معدودے چند کتابوں مثلاً جانسن کی حیات ساویج میں کارلائل کی حیات اسٹرلنگ اور فریمن پامر کی الائیس فری من پامر کے سوا بہت کم تصانیف اس روایت کی علمبردار نظر آتی ہیں۔

مولوی صاحب نے موضوعات کا مواد ان سے براہ راست گفتگو، اپنے ذاتی مشاہدے اور مطالعے، موضوع کے عزیزوں رشتہ داروں، حلقہ احباب اور ملاقاتیوں سے اخذ معلومات، سرکاری دستاویزات، اخبارات و رسائل سے اقتباسات لطائف وظرائف کی یکجائی وغیرہ مختلف طریقوں سے حاصل کیا ہے۔ بلکہ انہوں نے حالی کی طرح اخبارات سے اقتباسات خطوط و آرار، قطعات تاریخ وفات وغیرہ بھی شامل کئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے لوگوں کے عادات و اطوار کا برسوں تجزیاتی مشاہدہ کیا تھا اور اس سے مفید مطلب نتائج اخذ کئے تھے۔ اس معاملہ میں ان کا ایک اہم ادبی تحریک یعنی اردو کی ترقی کی مہم سے وابستہ ہونا بلکہ اس کا روح رواں ہونا بڑا ہی مفید ثابت ہوا۔ لاتعداد افراد سے میل جول نے ان میں شخصیت کی پرکھ کی غیر معمولی استعداد پیدا کر دی۔ عموماً وہ ذرا سی دیر میں آدمی کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیتے تھے اور اندازہ لگا لیتے تھے کہ اپنے اصول اور کسوٹی پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ سیاسیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد حکومت برطانیہ نے مانٹیگو اور چمسفورڈ کو ہندوستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے بھیجا تھا چنانچہ تاریخ میں ان کی رپورٹ پر مبنی اصلاحات انہی دو حضرات کے نام سے موسوم ہیں۔ مانٹیگو نے ہندوستان میں اپنی مصروفیات اور ملاقاتوں پر مشتمل ایک روزنامچہ بھی AN INDIAN DIARY. کے نام سے شائع کیا ہے حیرت ہوتی ہے کہ اس صاحبِ نظر شخص نے چند منٹ کی ملاقاتوں میں ہندوستانی مشاہیر کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ تقریباً سو فیصدی صحیح ہے۔ خصوصاً گاندھی جی، پنڈت نہرو، قائداعظم وغیرہ سے متعلق آرار قابل ملاحظہ ہیں یہی بات مولوی صاحب کے تبصرے میں بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات عام مشاہدے سے متعلق ہے۔ ویسے سرسید سمیت بہت سے لوگ چالاک افراد کے ہاتھوں دھوکہ بھی کھا چکے ہیں۔ ذاتی تعلقات کی نوعیت بھی ایک الگ چیز ہے۔ مولوی صاحب کے جن سے جتنے زیادہ گہرے مراسم تھے ان کی اتنی ہی زیادہ پتہ کی باتیں بتائی ہیں۔ ان کے مضامین کی طوالت واختصار کا انحصار، نہ صرف مواد پر بلکہ ان کے اپنے معیار، مذاق اور پسند ناپسند پر ہے اسی لئے ان کے ذاتی تعلقات اور ان کا شخصی عنصر ان کے مضامین کو خاص دلکشی بخشتے ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ سے ان کے درک اور بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مولوی صاحب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ افراد پر انفرادی نہیں اجتماعی نظر ڈالتے ہیں۔ وہ اکثر ایسی باتیں استنباط کرتے ہیں جن سے اجتماعی مفاد وابستہ ہو یا جن سے اجتماعی مسائل پر روشنی پڑتی ہو۔ ان کی نظر میں قومی ہمدردی، جذبہ ایثار، کردار کی استواری، صداقت وغیرہ بعض بنیادی اوصاف نہایت اہم ہیں وہ عموماً ذاتیات میں نہیں پڑتے اور خصوصاً نجی باتوں کا ذکر بہت کم کرتے ہیں حالانکہ شخصی مرقع نگاری کے امام لٹن اسٹراچی نے پبلک اور نجی زندگی میں کوئی امتیاز نہیں برتا بلکہ بسا اوقات نجی تفصیلات ہی کے ذریعہ وہ اپنے

موضوع کے کردار کو بے نقاب کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے برخود غلط امریکی مقلدوں نے یہ سمجھ کر کہ اس کا مقصد بت شکنی ہے خود بھی مشاہیر پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا جس کی ہر طرف سے بجا طور پہ مذمت کی گئی اسی طرح کی ایک تصنیف DIBBLE کی ہے جس میں پیغمبر اسلام کے تقدس پر حملہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس شخص کی دلچسپی کسی قومی تحریک سے ہو اور وہ خود بھی قومی ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہو اور اس نے اس کے ایک مظہر قومی زبان کی ترویج و ترقی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہو جس کا نقطۂ نظر اپنے بزرگ ہم عصروں ہی کی طرح انفرادی نہیں اجتماعی ہو اس سے شخصیت کی رنگا رنگی اور ڈرامائیت کی مرقعہ کشی کی توقع مشکل ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولوی عبدالحق کا جذبہ ایک مشنری کا جذبہ تھا اور اس نے ان کو زندگی کے اعلیٰ ترین منازل پر پہنچایا۔ لیکن شخصی مرقعہ نگاری ایک الگ فن ہے اور ایک بلند تر نصب العین کی دھن میں مگن شخص کے لئے شخصیت کا غیر جذباتی تجزیہ دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دوسرے مثلاً رشید احمد صدیقی کے، شخصی مرقعوں میں جو چلت پھرت حرکت عمل اور زندگی نظر آتی ہے وہ مولوی صاحب کے پوسٹ مارٹم میں نظر نہیں آتی۔ مولوی صاحب کے حالات و واقعات اور جزئیات کے انتخاب اور ان پر تبصرے کی نوعیت سے مولوی صاحب کی اپنی مثالیت اپنے اعلیٰ نصب العین اور بلند کردار کے باعث وہ زندگی بھر بلند کردار کے متلاشی رہے۔ اپنی مثالیت پسند اور بلند پایہ شخصیت صاف ظاہر ہے دراصل مولوی صاحب کو اشخاص سے زیادہ اقدار سے دلچسپی ہے۔ اسی لئے جہاں رشید احمد صدیقی کے یہاں فرد قابل قدر ہے اور اس کے انسانی رشتے اہمیت رکھتے ہیں مولوی صاحب کی سیرت نگاری میں خالص ادبی نہیں اخلاقی نقطۂ نظر موجود ہے۔ مولوی صاحب کردار نگاری کے لئے پوری عمارت تیار کرتے ہیں۔ رشید صدیقی نمایاں جزئیات کے انتخاب سے اپنے موضوع کی اہم ترین خصوصیات کو ظاہر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ لیکن رشید صدیقی کے یہاں ہیرو پرستی کا جذبہ ملتا ہے مولوی عبدالحق کردار کے دونوں پہلو دکھاتے ہیں۔ مثلاً جہاں ان کی باعظمت شخصیت کے اظہار کے لئے مولانا محمد علی کو پودوں میں دیو آتش فشاں پہاڑ اور گلیشیر سے تشبیہہ دی ہے، وہاں ان کی انتہا پسندی اور ذاتیات سے الجھ پڑنے کی کمزوری (جسے وہ ہندوستان کی خام تربیت کا نتیجہ بتاتے ہیں) کا بھی ذکر کیا ہے رشید صاحب کے مولانا محمد علی کا کچھ اور ہی رنگ ہے۔ رشید احمد صدیقی زندگی اور اس کے مشاہدے سے محظوظ ہوتے ہیں اور قاری کو بھی اس سے لطف اندوز کرانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ نفسیاتی فضا ابھارنے میں اپنے مشاہدات کو مکالمے اور بیان کے امتزاج سے بڑی چابکدستی سے پیش کرتے ہیں۔ وہ اسٹیج تعمیر کر کے کردار پر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو احسن مارہروی کی مشاعرے میں شرکت کے الزام میں پیشی سے متعلق حصہ جس میں مکالمے کے ذریعہ ڈرامائیت پیدا کی گئی ہے۔ اس کے برعکس مولوی صاحب نہایت بلند نظری اور بالغ نظری سے اظہار رائے کرتے ہیں۔ ان کا انداز عموماً بیانیہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ مولوی صاحب بنیادی طور پر مولانا حالی کے طرز سوانح نگاری سے متاثر ہیں حالات و واقعات سے نتائج استنباط کرنے کا انداز

بھی انہیں کا سا ہے اور رشید احمد صدیقی نے جدید فن شخصیت نگاری سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ یہی لئے ان کے یہاں لٹن اسٹریچی کا سا افسانوی انداز ملتا ہے۔

مولوی صاحب کے بعض سوانحی مضامین پر جو سب سے بڑا اعتراض کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں کہیں کہیں خطبہ تدفین FUNERAL ORATION کی سی شان پائی جاتی ہے لہٰذا خراج تحسین ادا کرنے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مضامین اس لحاظ سے واقعی خطبہ تدفین کی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ تعزیتی جلسوں میں پڑھے گئے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کے مضامین میں بھی کہیں کہیں مولوی صاحب کی بے لاگ فطرت مرحومین کی حیات کے تاریک گوشوں کو بے نقاب کرنے سے باز نہیں آئی اور اس بندۂ حق نے حق بات کے اظہار میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ ان کی اس خصوصیت پر احباب متفکر اور اغیار نالاں ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ مولوی صاحب کی قوت مشاہدہ اور باریک بین نظر ایکس رے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا کھرا اور استوار کردار بھی اس سلسلے میں کسی کی خوبیوں کے دبانے یا خامیوں کے اجاگر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ان کے خلوص کی شدت ان کو ہمدردانہ تنقید پر مائل کرتی ہے اور وہ اتنی بلند نظر شخصیت کے مالک ہیں، کہ ان خوبیوں اور خامیوں کے بیان کو ذاتیات سے بالاتر سمجھتے ہیں، بہ شرطیکہ (اور یہ بہت بڑی شرط ہے) ان کی شریعت میں ان باتوں کا اظہار جائز ہو۔ لیکن یہاں یہ اعتراف ضروری ہے کہ باوجود اپنی طبعی آزادی اور فطری بیباکی کے مولوی صاحب اخلاق کے معاملے میں اس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں جو اس کا قائل ہے کہ "ڈھکی ہوئی چیزیں ڈھکی ہی رہنے دو" کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں" لہٰذا انہیں بھی اشارے کنائے پر اکتفا کرنا پڑا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے باعث بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے جدید اصول سوانح نگاری سے انحراف کر کے قاری کو ایسے مواد سے محروم کر دیا جس تک اس کی رسائی محال تھی اور مولوی صاحب کی بیباک شخصیت اگر چاہتی تو اسے پاتال سے کھینچ لاتی۔ قاری کو اس خیال سے بھی جھنجھلاہٹ ہوتی ہے کہ مولوی صاحب نے خود کو سماج کا ٹھیکیدار کیوں سمجھ لیا اور باوجود صلاحیت کے حالی کے (یادگار غالب اور حیات جاوید کے معاملہ میں) نقش قدم پر چل کر اپنے سوانحی موضوعات کے حالات کو روشنی سے کیوں محروم رکھا؟ ابھی اردو ادب کو ایک روسو یا اسٹراچی کے سے ادیب کا کب تک انتظار کھینچنا پڑے گا؟

مولوی صاحب کی تحریر کا کمال ان کا ایجاز و اختصار اور جامعیت ہے۔ ان کی تقریر کی طرح ان کی تحریر کا بھی ایک ایک لفظ گنجینۂ معنی کے طلسم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو ادب میں الفاظ کے غیر ضروری اور غیر متعلق استعمال سے اس قدر اجتناب کی مثال شاید ہی کسی اور مصنف کے یہاں ملتی ہے۔ ہمارے ادب میں ایسے انشاپرداز تو بہت مل جائیں گے جنہوں نے عبارت آرائی و رنگینی، شان و شوکت وغیرہ کا نہایت فراخدلانہ صرف کیا ہو، لیکن ایسے صاحب قلم کم نظر آئیں گے جنہوں نے زبان کا صحیح مصرف سمجھ کر تراش و کفایت پر توجہ دی ہو، محاوروں کے برمحل صرف کے نمونے

لاتعداد افراد نے پیش کئے ہیں لیکن کم سے کم الفاظ کو زیادہ سے زیادہ معنی کا حامل بنانا مولوی عبدالحق ہی کا حق تھا مولوی صاحب کے یہاں یہ خصوصیت ابتدا ہی سے نمایاں ہے گو عمر کے ساتھ ساتھ اس میں ترقی بھی ہوتی گئی۔ اردو کا کیا ذکر یہ سعادت دنیا کے بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوئی ہے شکسپیئر کا نام جو ادبا کے سرفہرست نظر آتا ہے تو اس کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے۔ شکسپیئر کی ایک اور اہم صفت جو عظیم ادب کی بنیاد ہے۔ یعنی باریک مشاہدہ اس کا ذکر مولوی صاحب کے سلسلے میں اس سے پہلے آچکا ہے۔

مولوی صاحب کی زبان کی ایک اور خوبی اس کی بے مثال سادگی ہے۔ اردو نثر میں سادگی کی روایت باغ و بہار، سرسید کے مضامین اور حالی کی تحریر میں بھی ملتی ہے۔ لیکن باغ و بہار اپنی تمام باغ و بہار خوبیوں کے باوجود کچھ حد تک قدیم وضع قلعہ معلیٰ کی زبان کی نمائندگی کرتی ہے۔ اور متروکات کو بھی اپنے اندر شامل رکھتی ہے۔ سرسید کی نثر رواروی میں لکھی گئی ہے اور باوصف اپنے خلوص روانی اور جوش کے اعتدال توازن اور صفائی کا بہت کم مظاہرہ کرتی ہے۔ حالی کی سادگی پہ بیشتر روکھی پھیکی اور بے رنگ ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مولوی صاحب کے یہاں ایک خاص کیف و سرور اور لطافت و شگفتگی کا عالم نظر آتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک طرف حالی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی سادگی طرز میں جان ڈالنے اور اس میں پرکاری پیدا کرنے کی بہت کم کوشش کی تو دوسری طرف رنگین بیانوں پر یہ الزام عائد ہوسکتا ہے کہ انہوں نے غیر ضروری الفاظ کے پرے پرے جما دیئے لیکن مولوی صاحب کا طرز تحریر سنجیدہ، مدلل، سلیس، رواں، واضح، اور شگفتہ ہے۔ بقول مولانا عبدالماجد، چند ہم عصر کی ایک اور قابل داد خصوصیت یہ ہے کہ مضامین کے سن تصنیف میں برسوں کے تفاوت کے باوجود ان میں مولوی صاحب کی زبان و بیان کی انفرادی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

آخر میں یہ کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ یہ ہنگامی مضامین ہیں انہیں شخصی موقعوں کے معیار سے جانچنا نامناسب ہے۔ لیکن ان سے اتفاق مشکل ہے کیونکہ مولوی صاحب کے تمام مضامین ہنگامی نوعیت کے نہیں ہیں اور نہ سارے مضامین کا فنی معیار ایک سا ہے۔ بلکہ ان سے ان کے فنی ارتقا کا اندازہ بھی بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جو مضامین کسی کی وفات پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں تاثراتی رنگ نمایاں ہیں بعض میں موضوع کے حالات کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے بعض کا رجحان تجزیاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ان کا فن تذکرہ نگاری سے ملتا جلتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس میں حالی اور پھر شخصی مرقعہ نگاری کا رنگ آتا جاتا ہے۔ گدڑی کا لعل کسی طرح شخصی مرقع کے فن سے باہر نہیں ہے البتہ مولوی صاحب کے سلسلے میں ہمیں ایک چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ سرسید کی تحریک کی پیداوار تھے۔ اور انہوں نے سرسید اور حالی کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ شبلی اور اکبر کے تیور بھی دیکھے تھے چنانچہ سرسید

اور حالی کے مشنری جذبے کے ساتھ ان میں شبلی اور اکبر کی سی تلوار کی کاٹ بھی آ گئی تھی حالات و مسائل پر غیر شخصی وغیر جذباتی نظر لیکن فیصلے کے بعد شدید جذباتیت کا مظاہرہ ان کی شریعت میں جائز تھا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، کردار کی کسوٹی ان کے نزدیک اجتماعی مسائل سے دلچسپی اور ان کے حل سے وابستگی تھی۔ وہ انسانی عظمت کو اس پیمانے سے ناپتے تھے اور اس میں وہ ہر قدم پر محنت شرافت اخلاق اور صداقت پر زور دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے مضامین میں انسان اور زندگی کے بارے میں جو بلیغ اور پختہ خیالات ملتے ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں۔ مولوی صاحب از اول تا آخر اسی اصلاحی اور اخلاقی رو میں رواں ہیں اسی کی ایک شق مظلوم سے ہمدردی کا جذبہ بھی ہے۔ شبلی کے مقابلے میں حالی کی حمایت (بقول شخصے وہ کبھی شبلی پر چوٹ کرنے کے موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ دبستان لکھنؤ پر ان کی عنایت بھی اس کا شاخسانہ تھی گو کبھی اس کا اعتراف نہیں کرتے تھے) اور اردو زبان سے عشق بھی کچھ حد تک یہی، اسی جذبے کی پیداوار تھا گو مولوی صاحب کی انفرادیت اور عظمت کا راز اردو زبان سے ان کی اس محیر العقول محبت میں مضمر تھا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی مثال اس قدر بے پناہ محبت کی کہیں اور ملتی ہو۔ وہ سپردگی وہ انہماک وہ استغراق اور وہ دھن جو جنون کی سرحد سے ٹکراتی تھی عظیم ترین دماغوں ہی کا حصہ ہے۔ مشرقی ممالک میں خصوصاً جہاں لوگ تعمیری کاموں کے کم عادی ہوتے اور اپنی زندگی عموماً انتشار میں بسر کر دیتے ہیں اپنے دائرۂ عمل کو مخصوص کر لینا ایک نادر چیز ہے۔ سچ یہ ہے کہ اردو زبان کے تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں کو ان کے جوش انہماک اور سرگرمی نے جس حد تک اجاگر کیا کسی نے نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو سے ان کی یہ لگن متعدی ثابت ہوئی اور تحریک پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی بنی جس طرح پچھلی صدی کے اواخر میں ہندی اردو کے جھگڑے نے سرسید کے دل میں ہندو مسلم اتحاد سے مایوسی پیدا کر کے ایوان پاکستان کی پہلی اینٹ رکھ دی تھی۔ سچ یہ ہے کہ ادب اور زندگی کے مسلمہ تعلق کے مدنظر مولوی صاحب اپنے اصول و معیار میں حق بجانب بھی تھے۔

سیرت

علم محنت اور کوشش سے حاصل ہوتا ہے۔ عقل زندگی کے تجربوں سے آتی ہے۔ علم بغیر عقل کے کار آمد نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات نقصان رساں ہوتا ہے۔ سعدی نے سچ کہا ہے کہ "یک من علم را دہ من عقل می باید" اور عقل بغیر علم کے اکثر غلط رستہ پر لے جاتی ہے۔ علم اور عقل دونوں کے تعاون پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے لیکن ایک چیز اور ہے جو ان سے بھی برتر اور افضل ہے۔ وہ انسان کی سیرت (یعنی کیرکٹر) ہے اس میں کچھ فطرت کا عطیہ ہوتا ہے جو پیدائشی ہے اور کچھ ماحول اور تعلیم و تربیت کا اثر۔ جہاں یہ نہیں وہاں علم و عقل دونوں بیکار ہیں۔ (بابائے اردو)

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

افکارِ عبدالحق

آمنہ صدیقی کی یہ تالیف ہمارے ادب میں ایک نئی تحریک کا علم ہے۔ اس دور میں جبکہ قاری کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ کسی مصنف کے تمام کارناموں کا مطالعہ کرے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ایک جلد میں ان کارناموں کا نچوڑ پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ انگریزی میں ہمیں بے شمار ایسی کتابیں ملتی ہیں۔ جن میں کسی جدید مصنف کے مخصوص خیالات کو اس طرح انتخاب کر کے یکجا کر دیا گیا ہے کہ اس مصنف کی پوری شخصیت اور اس کے تمام اہم خیالات نہایت جیتے جاگتے طریقہ پر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اردو میں "افکار عبدالحق" اس قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اور چونکہ یہ اپنے مقصد میں پورے طور پر کامیاب ہے۔ اس لئے ایک ایسی مثال قائم کرتی ہے کہ اس کی پیروی ضرور ہو گی۔ اور اس طرح ایک نئی تحریک سامنے آجائے گی۔ مؤلفہ نے اپنے اغراض اور مقاصد کو بھی دیباچہ میں واضح کر دیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ تالیف انہوں نے مولوی صاحب کو خود پیش کی تھی۔ اور مولوی صاحب نے اس کو بڑی خوشی سے قبول کیا تھا۔ اسی امر سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ اس قسم کی جو تصانیف یورپ میں چھپی ہیں۔ ان میں سے جو پرانے مصنفین سے متعلق ہیں۔ ان کے سلسلے میں مصنف سے رائے لینے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ مگر جو زندہ مصنفین سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک متعلقہ مصنف کو بھی دکھائی گئیں تاکہ وہ بھی یہ کہہ دے کہ اس کی شخصیت اور اس کی تصانیف کی یہاں نمائندگی ہوئی کہ نہیں۔ ہم افکار عبدالحق کی بابت یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر عبدالحق صاحب خود اپنے افکار کو جمع کرتے تو وہ بھی وہی کرتے جو آمنہ صدیقی نے کیا۔

اس کتاب میں سب سے پہلے آمنہ صدیقی کا لکھا ہوا مقدمہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ جس کے بابت مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں ہوتی کہ اس سے جامع مطالعہ مولوی صاحب کا اب تک اردو میں پیش نہیں ہوا۔ مولوی صاحب پر لکھا بہت کچھ گیا ہے۔ اور میرے بھی دو مضمون اسی سلسلے میں موجود ہیں۔ جن میں سے ایک مولوی صاحب

کے کاموں کا عام جائزہ ہے۔ اور دوسرا " ان کی "تحقیق نگاری" کا اردو تنقید میں مقام مقرر کرتا ہے۔ مگر میرے دونوں مضمون آمنہ کے مقدمہ کے مقابلہ میں ایسے ماند پڑ جاتے ہیں۔ جیسے سورج کی روشنی میں چراغ۔ یہ مقدمہ کتاب کے چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ قوم کی زندگی میں زبان کی اہمیت جتاتے ہوئے مولوی صاحب کی زبان کے رائج کرانے میں عملی کوششوں کو سراہتا ہے۔ "دنیا کی کسی زبان کی تاریخ میں کسی عہد میں بھی کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی کہ جس نے تمام زندگی اس زبان کی خاطر معرکہ آرائی میں صرف کر دی ہو۔ یہ فخر صرف اردو زبان ہی کو حاصل ہے کہ اسے عبدالحق جیسا سپاہی میسّر ہے۔ جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے وقف کر دیا۔" پھر یہ مقدمہ مولوی صاحب کی شخصیت کو بڑی پہلودار بتا کر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ "الغرض وہ سب کچھ کیا جو ایک عظیم ثقافتی رہنما کو کرنا چاہیے۔ وہ یقیناً ایک عظیم ثقافتی رہنما ہیں۔" مولوی صاحب اور انجمن ترقی اردو کا تعلق، ان کے مقدمات، ان کے خطبات، ان کے تبصرے اور ان کے طرز ادا پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مگر سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ وہ حصّہ ہے جہاں مولوی صاحب کے تنقیدی نظریات کو ان کی تصانیف سے اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ نظریات ان کی تصانیف کے پس منظر میں تھے۔ اور ان کے مطابق رائیں ہر طرف بکھری پڑی تھیں۔ آمنہ کا خاص کام یہی ہے کہ انہوں نے اس اہم پہلو پر ہماری توجہ کو لگایا۔ اور پھر اس کتاب میں ان سب نظریات کو یک جگہ کر دیا۔ مقدمہ میں جو صفحات مولوی صاحب کی تنقید نگاری پر ہیں اور کتاب میں جو انتخابات تنقید سے متعلق ہیں ان کو ملا کر جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ مولوی صاحب کا تنقید نگار کی حیثیت سے جائزہ لینے کے لئے اس قدر کافی ہے کہ آمنہ کے کام کو اگر حرف آخر نہیں تو اہم بنیادی کامیابی ضرور کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کی شاید سب سے اہم افادیت اسی میں ہے کہ یہ مولوی صاحب کو بحیثیت تنقید نگار کے پورے طور پر نمایاں کرتی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ کتاب مولوی صاحب کی ہستی کا ایک اور پہلو بھی سامنے لاتی ہے۔ جو ان کی علمی تصانیف میں بالکل چھپا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کی تنقیدوں سے میری واقفیت بہت عرصے سے ہے۔ اور اپنی کتاب "اردو میں تنقید" میں ایک باب "تحقیق اور تنقید" بالکل ان پر وقف کر چکا تھا۔ مگر مولوی صاحب کی بیدار مغزی اور ان کی زندگی پر وسیع نظر کا مجھے اس وقت تک احساس نہیں ہوا۔ جب تک کافی عرصہ تک میں کراچی میں ان کے پاس آ کر کافی وقت تک بیٹھا نہ رہا۔ انہوں نے میرے ساتھ جو شفقت کا سلوک کیا اس کا بھی کہیں اور ذکر کر چکا ہوں یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ مولوی صاحب کے پاس سے میں ہمیشہ زندگی کے بابت کوئی نہ کوئی اہم خیال ضرور لے کر اٹھا۔ اکثر میں یہ سوچتا گیا کہ اگر مولوی صاحب ادب کے علاوہ زندگی پر مضامین (ESSAYS) لکھتے تو وہ سر سید کے بعد اردو کے سب سے بڑے مضمون نگار ہی نہ ہوتے بلکہ ان کے مضامین زندگی کی

رہبری میں ویسی ہی اہمیت رکھتے۔ جیسی انگریزی میں بیکن اور جانسن کے مضامین کی ہے۔ مجھے یہ خیال بھی نہ گزرا کہ مولوی صاحب کی تحقیقی اور تنقیدی تصانیف میں ایسے حصے موجود ہیں۔ جن کو اگر الگ کر لیا جائے تو مختصر مگر مکمل "ایسیز" ہو سکتے ہیں۔ جب میں نے آئینہ کے مقدمہ میں پڑھا۔ ان کی ان گنت تحریروں میں بعض ٹکڑے اور جملے ایسے فکر انگیز نظر آتے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر مولوی صاحب ادب کی طرف توجہ نہ کرتے تو وہ یقیناً بہت بڑے فلسفی ہوتے۔ انہوں نے انسان اور اس کے جینیس کے بارے میں کہیں کہیں ایسی باتیں بھی کہی ہیں۔ جو صداقت کے تابندہ چہرے سے تہ در تہ نقاب اٹھانے میں بڑی معاون ثابت ہوئی ہیں۔" تو میں پہلے چونکا اس لئے نہیں کہ مولوی صاحب کو مفکر حیات کہنا۔ تعجب انگیز بات ہے۔ بلکہ اس لئے کہ مجھے مولوی صاحب کے وہ افکار یاد آئے جو باتوں میں انہوں نے ادا کئے تھے۔ اور جن کے تحریروں میں وجود کی طرف میری توجہ نہیں گئی تھی۔ مقدمہ کو ختم کرتے ہی انتخاب میں میری توجہ "حیات و کائنات" کی سرخی پر گئی۔ اور میں نے اس کے ماتحت جمع کئے ہوئے ٹکڑوں کو پہلے پڑھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ مولوی صاحب پھر سے زندہ ہو گئے۔ اور میں ان سے زندگی کی اہم باتوں پر رائے لے رہا ہوں۔ اور وہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میں اگر یہ بتاؤں کہ مولوی صاحب کے پاس میرا بہت زیادہ آنا جانا۔ اس وقت شروع ہوا۔ جب کہ میں اپنی پریشانیوں کی انتہا کو پہونچ کر ایک عجیب قسم کی ناامیدی کے عالم میں آگیا تھا۔ اس وقت مولوی صاحب کے خیالات نے میرے ساتھ وہی کچھ کیا جو میرے والد کرتے بلکہ شاید میرے والد بھی نہ کر پاتے کیوں کہ وہ پرانے قسم کے مذہبی انسان تھے اور میں پہلے ذہنی تسکین کی تلاش میں تھا۔ اور پھر اپنی دنیا بنانا چاہتا تھا۔ پسپائی کے عالم میں میں اپنے مخصوص کام بھی چھوڑ بیٹھا تھا۔ اور مولوی صاحب نے جن خیالات سے مجھے پھر سے اپنے کام میں لگایا تھا۔ وہ سب مجھے اس انتخاب میں پھر سے ملے۔ بلکہ بہتر طریقے پر ملے۔ مولوی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ "وہ کام کے آدمی تھے" انہیں معنوں میں جیسے اکبر نے سرسید کے بابت کہا تھا۔ "ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا" کام کرنا اور کام میں لگانا ہی مولوی صاحب کا سب سے اہم انسانی کام تھا۔ میرے لئے ان کی یہ اہمیت سب سے زیادہ عظمت رکھتی ہے۔ اور انتخاب میں جب میں نے ذیل کا اقتباس دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ مولوی صاحب کی پوری روح میرے سامنے آگئی ہے۔ اور جو کچھ مولوی صاحب نے متعدد بار کہا تھا۔ وہ سب نہایت اختصار اور نہایت زیادہ زور دار طرز میں کہہ رہے ہیں۔

"انسان فطرتاً کاہل معلوم ہوتا ہے۔ محنت کرنا نہیں چاہتا۔ میرا عقیدہ یہ ہے۔ کہ سب انسانی نیکیوں میں سوائے کاہل کے کاہلی جرم ہے۔ گناہ ہے عطیۂ الٰہی سے انحراف اور کفران نعمت ہے۔ یاد رکھیئے کہ جو اقوام یا افراد کام کرنے سے ہچکچاتے اور محنت سے جی چراتے ہیں۔ انہیں کبھی آزادی نصیب نہ ہوگی۔ وہ ہمیشہ غلام رہیں

گے اگرچہ ان کے ہاتھوں میں آزادی کے منشورکیوں نہ ہوں۔ کام سے انسانیت آتی ہے۔ سیرت اور اخلاق بنتے ہیں۔ ظاہر و باطن کی اصلاح ہوتی ہے۔ ہم جان دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اسی میں پتّا مارنا پڑتا ہے۔ عزیز اشغال اور محبوب عادتوں کو ترک کرنا پڑتا ہے۔"

میں مولوی صاحب کی ہستی کی یاد میں اس کتاب پر تبصرہ سے ہٹ گیا؛ نہیں اس کتاب کی کامیابی یہی ہے کہ مولوی صاحب کے زندہ جاوید عناصر کو اکٹھا کر دیتی ہے۔ مولوی صاحب کا عام طور پر خیال آتے ہی لفظ "ٹھوس" ساتھ ساتھ آتا ہے۔ لغت۔ مقدمے۔ تبصرے۔ تنقید۔ لسانیات یہ سب ٹھوس چیزیں ان کے نام سے ایسی وابستہ ہو گئی ہیں کہ "چند ہم عصر" ایسی لطیف چیز کو بھی لوگ علمی کتاب کہہ کر الگ ہی رکھ دیتے ہیں۔ ان کو معلم ادب اور طالب ادب کی دلچسپی کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ زندگی کو زندہ کرنے والوں اور مردوں کو زندگی دینے والوں میں ان کا شمار کرتے وقت لوگ اپنا سر کھجلاتے تھے۔ مگر آمنہ صدیقی کی کتاب کے بعد مولوی صاحب کو عظیم ناقدان ادب کے ساتھ ساتھ عظیم ناقدان حیات کے ساتھ بھی جگہ دی جائے گی۔ اس انتخاب میں کچھ حصے ایسے ہیں جو چند جملے یہ ایک پیراگراف میں ان کو اقوال کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے۔ کچھ حصے ایسے ہیں جو اپنی جگہ پر مستقل مختصر مضمون ہیں ان کا مجموعہ الگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تعلیمی درس میں ہی نہیں بلکہ عام قاری کے لئے بھی پیش کئے جا سکتے ہیں اور ان سے مولوی صاحب کو مضمون نگار کی حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ "مذہب و سائینس" کے ۱۳ ٹکڑے جدید دور کے اہم ترین موضوع پر ۱۳ مکمل (ESSAY) کا مجموعہ ہے۔ جس میں ہر (ESSAY) اپنی جگہ پر فن کا نمونہ بھی ہے۔ امید ہے کہ آسکر وائلڈ کے اقوال اور چسٹرٹن کے مضامین پڑھنے والے اس کتاب میں دونوں چیزوں کا مجموعہ دیکھیں گے۔ اور ہمارے جدید دور میں ایک ایسی ہستی نے جس کو محض محقق و عالم سمجھا گیا ہے۔ خالص ادب میں جو اضافہ کیا ہے اور زندگی کی تشکیل میں جو حصہ لیا ہے۔ اس سے مستفید اور محظوظ ہوں گے۔

غیر زبانوں کو سیکھنے کا روشن پہلو

دوسرے کی زبان سیکھنے سے خود ہماری زبان پر نیز ہمارے دلوں پر اثر پڑتا ہے۔ اور زبان کے ساتھ زبان والوں کی طرف سے دلوں میں اُنس اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔

(خطبات ص ۱۳)

افسر صدیقی امروہوی

چار مُلاقاتیں

میں دسمبر ۱۹۴۷ء کی تیس تاریخ کو دہلی سے رات کے وقت ریل میں سوار ہوا اور ۳۶ گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد جب کراچی کے قرب وجوار میں پہنچا تو نئے سال کی پہلی تاریخ کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس سفر میں میرے ساتھ میرے ایک عزیز شاگرد سید غلام نبی آذج بھی تھے۔ نئی بستی، مختلف ماحول اور اجنبی باشندے۔ اول اول طبیعت بیحد پریشان رہی لیکن رفتہ رفتہ دل مانوس ہونے لگا آخر مشاعروں کی شرکت ادبی مجلسوں میں آمد و رفت اور مقامی آبادی کے تعلیم یافتہ طبقے کے ساتھ میل جول ہو جانے کی وجہ سے وطن کے اردو نواز لیل و نہار فراموش ہو گئے۔

آذج مرحوم کچھ مدت کے بعد فیروز اسکول ڈرگ روڈ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور وہیں رہنے لگے۔ اس مقام پر ایک بزرگ اور تھے جن کا نام حاجی احمد اور تخلص فخری تھا۔ یہ پانی پت کے باشندے، مولانا حالی کے دیکھنے والے، مولوی وحیدالدین سلیم کے تربیت یافتہ اور ڈاکٹر عبدالحق کے ساتھیوں میں تھے۔ فخری صاحب رجمنٹل منشی تھے۔ انگریزوں کو دیسی زبان سکھاتے تھے ایک روز آذج مرحوم کے ساتھ مجھے بھی ان کے مکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ بڑے تپاک سے ملے تعارف کے بعد آمد و رفت اور آمد و رفت کے بعد تعلقات کی استواری قدرتی بات تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مولوی عبدالحق انگلش اردو ڈکشنری مرتب فرما رہے تھے۔ فخری صاحب بھی اس ڈکشنری کے لئے ترجمے کا کام کر رہے تھے اور ان کی خط و کتابت مولوی عبدالحق سے رہتی تھی جب ان کا کوئی خط وصول ہوتا وہ مجھے ضرور دکھاتے۔ فخری صاحب کی مسلسل ملاقاتوں اور مولوی عبدالحق کے نپے تلے الفاظ والے خطوط کے مطالعہ نے دل میں یہ تمنا پیدا کر دی کہ کسی نہ کسی طرح اس شخص کو دیکھنا چاہیئے جس کے سرمایۂ حیات کا ایک ہی مصرف ہے! اردو کا تحفظ اور اس کی توسیع! بظاہر یہ اُمید بر آنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے میں نے برائے تسکینِ خاطر کُل ہندوستان انجمن ترقی اُردو کی رکنیت عمومی اختیار کر لی تاکہ اس ذریعہ سے کبھی نہ کبھی "المکتوب نصف الملاقات" کا مقصد پورا ہو سکے اور یہ ترکیب کارگر

بھی ہوئی مگر افسوس ہے کہ اس زمانے کے جو خطوط مولوی صاحب کے میرے نام آئے تھے وہ سب ضائع ہو گئے اور انجمن کی وہ مطبوعہ کتابیں بھی موجود نہ رہیں جو رکن عمومی بن جانے کے بعد میرے نام قیمت طلب آتی رہتی تھیں۔

۱۹۳۵ء میں بعض ذاتی اسباب کی بنا پر مجھے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ بمبئی سے پونا ہوتا ہوا حیدرآباد جا کر مولوی صاحب کی ملاقات کا شرف ضرور حاصل کروں گا۔ اس سلسلے میں چند تعارفی خطوط بھی میں نے مولوی صاحب کے نام لے لئے تھے لیکن گردش تقدیر نے پونا سے آگے جانے کی اجازت نہ دی اور وہیں سے واپس آجانے کے لئے مجبور ہوا۔

مقامی انجمن ترقی اردو کی رکنیت تو میں کئی سال پہلے سے اختیار کر چکا تھا اور اب مجلس منتظمہ میں شامل تھا کہ انجمن کی مقامی شاخ کے نام علی گڑھ اردو کانفرنس کا دعوت نامہ آیا۔ مجلس منتظمہ نے فیصلہ کیا کہ ایک نمائندہ بھیجا جائے یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ گھر کے آرام و آسائش کو چھوڑ کر کون اتنا لمبا سفر اختیار کرتا۔ ہر ایک نے پہلوتہی کی آخر کار سے

للّٰہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست   آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

میرے بھیجے جانے پر اتفاق رائے ہوا۔ یہ فیصلہ سن کر میرے دل پر کیا کیفیت گزری کچھ نہ پوچھئے۔ یہ ایک وجدانی چیز تھی جسے الفاظ میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔

مقررہ تاریخ پر میں کراچی سے روانہ ہوا۔ ایک روز دہلی میں قیام کرتا ہوا اسی روز شام کو علی گڑھ پہنچا جس روز اردو کانفرنس کا اجلاس تھا اور مقالات پڑھے جانے والے تھے۔ سامان میں نے اپنے ایک قدیم مرحوم دوست منشی محمد وقار علی تاج صدیقی امروہوی کے یہاں رکھا جو علی گڑھ کے ایک ہندو بیرسٹر کے یہاں محرری کرتے تھے اور کانفرنس کے اجلاس میں جا پہنچا۔ مولوی صاحب بہ نفس نفیس صدر تھے۔ مشتاق آنکھوں نے دیکھا اور متمنی دل نے عزت و احترام کے جذبات کے ساتھ پذیرائی کی۔ میرے مقالہ کا عنوان تھا "سندھ میں اردو کے آثار قدیمہ" یہ مقالہ جناب صدر نے بروقت مجھ سے لے لیا اور بعد میں رسالہ اردو میں شائع کر دیا گیا۔ یہ تھی میری پہلی ملاقات جس میں مجھے بالمشافہ لیکن بہت ہی مختصر اور رسمی گفتگو کرنے کا موقع ملا۔

اس سے اگلے سال یعنی ۱۹۳۷ء میں ایک روز اردو کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی اس کانفرنس کے پروگرام میں ایک مشاعرہ بھی تھا اس مرتبہ بھی مقامی انجمن نے نمائندگی کے لئے مجھے ہی انتخاب کیا۔ میں کراچی سے روانہ ہوا اور دہلی پہنچ کر اپنے ایک ہموطن دوست سید سبط احمد غافل کی قیام گاہ پہ سامان جا رکھا۔ غافل صاحب نواب سائل مرحوم کے بہترین شاگردوں میں تھے میں اور وہ مشاعرے کی شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ قیام گاہ سے چلنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ اسی دوران میں ٹاؤن ہال کو جہاں مشاعرہ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مرکز اردو دہلی کے من چلے سامعین کی کثرت نے اس طرح محصور کر لیا کہ کسی دروازے سے اندر جانا ممکن نہ ہو سکا چار و ناچار جس قدر کلام سنا جا سکا ہال

کے باہر ہی سے سُنا۔

اس کانفرنس کی سبجکٹ کمیٹی کی میٹنگ سے قبل مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی مرحوم نے کراچی کی انجمن کے حالات پوچھے یہاں اردو کی اشاعت میں پیش آنے والی مشکلات دریافت کیں اور چند مخلصانہ مشورے دیئے۔ یہ دوسری ملاقات تھی۔ میں نے انجمن کی عمارت فنڈ میں کراچی کی انجمن کی طرف سے پچاس روپے کے عطیہ کا اعلان اسی کانفرنس میں کیا تھا۔

انجمن ترقی اردو کراچی کی ابتدا تو خواجہ ولایت حسین انبالوی کے دستِ مبارک سے ۱۹۱۴ء میں ہوئی تھی لیکن پہلے پہل صرف مشاعرے ہوتے تھے وہ بھی اسی طرح کہ آج یہاں شعرا جمع ہو گئے کل وہاں نہ کوئی دفتر تھا نہ کوئی اثاثہ اس وقت اردو کو عام بول چال کا ذریعہ بنانے کے لئے غالباً یہی پروگرام زیادہ مناسب تھا کہ مرکز اردو سے سیکڑوں میل دور رہنے والوں کے ایک حصے کو اردو کی طرف ملتفت کرنے کے لئے مشاعرے ترتیب دیئے جائیں۔ یہ تدبیر خاطر خواہ کارگر ہوئی اور ہمدردان اردو کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ ۱۹۲۳ء میں بوہرہ جماعت کے ایک خوش ذوق و مخلص فرد سیٹھ فدا علی ایم علی بھائی کے گرانقدر عطیے سے ایک دار المطالعہ و کتب خانہ قائم کیا گیا جو قیام پاکستان کے زمانے تک موجود تھا اور ماضی قریب میں ہماری قوم کی غفلت و بےحسی کی نذر ہو گیا اس طرح ۱۹۳۹ء میں کراچی کی انجمن کو قائم ہوئے پچیس سال ہو چکے تھے اس لئے تجویز کیا گیا کہ انجمن کا جشن نقرئی منایا جائے۔ اس جشن کے پروگرام میں ایک اردو کانفرنس کا انعقاد تھا اور ایک مشاعرہ کا۔ کانفرنس کی صدارت کے لئے مولوی عبدالحق صاحب منتخب کئے گئے اور مشاعرے کی صدارت کے لئے جناب سیماب اکبر آبادی کا انتخاب ہوا تاریخ مقررہ پر مولوی صاحب تشریف لائے ان کے ساتھ پنڈت کیفی دتاتریہ بھی تھے۔ مولوی صاحب کا قیام شہر کے ایک مخیّر رئیس اور انجمن کے صدر خان فضل الٰہی خاں صاحب کے دولت خانے پر صدر میں تھا۔ کیفی صاحب شیورتن موہٹہ کے ہوا بندر والے مکان میں ٹھہرائے گئے تھے۔ میں بحیثیت معتمد انجمن دونوں جگہ باقاعدہ حاضری دیتا تھا مزید برآں سیماب صاحب کی ضروریات کی بہم رسانی بھی میرے ہی ذمہ تھی جو ایک اعلیٰ قسم کے ہوٹل میں مقیم تھے۔ کیفی صاحب کے خلوص، رواداری اور وسیع المشربی کا اندازہ مجھے اسی موقع پر ہوا۔ وہ جب تک زندہ رہے میرے ساتھ مراسلت کا سلسلہ جاری رکھا۔

میں نے انجمن کے اس اجلاس کے لئے جو پچیس سالہ باتصویر روئداد مرتب کی تھی اس کا ذکر مرکزی انجمن کی پچاس سالہ رپورٹ میں آچکا ہے۔ مشاعرہ کی روئداد ہی کیا۔ واہ وا اور سبحان اللہ کی ایک مجلس تھی جو رات کو ۹ بجے خالق دینا ہال میں شروع ہوئی اور کوئی ۶ گھنٹے جاری رہ کر ۳ بجے ختم ہوئی۔ مولوی صاحب کو شعر و سخن سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ مشاعروں کے انعقاد کو کوئی بڑی اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن اس مشاعرے میں وہ آخر وقت تک جمے رہے اور ایک ایک شاعر کے کلام کو بغور سُنا اس کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ میری غزل خوانی کا نمبر صدر مشاعرہ

سے پہلے اور تقریباً ۱۰ بجے آیا تھا دوسرے دن سبجکٹ کمیٹی کے اجلاس کے خاتمہ پر مولوی صاحب نے میری کمر ٹھوکی اور چند مخصوص الفاظ میں میری غزل کی تعریف کی جس کے یہ معنی تھے کہ وہ صدر مشاعرہ کی غزل سن کر مشاعرے سے رخصت ہوئے تھے۔

اِدھر تو انجمن کا پچیس سالہ اجلاس ہو رہا تھا اُدھر مجلس منتظمہ دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب کے قیام کے دوران ایک روز باہمی اختلاف کا مسئلہ ان کے سامنے پیش ہوا مولوی صاحب نے چاہا کہ فریقین آپس میں صلح صفائی کرلیں لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ میں کسی فریق میں شامل نہیں تھا اس لئے مرحوم نے ازراہِ شفقت مجھے مشورہ دیا؎

ہو رہی ہو اگر کہیں کھٹ پٹ　　　اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

میں نے اپنا استعفیٰ اسی وقت پیش کر دیا۔ مولوی صاحب فریقین کی کش مکش اور غیر مصالحانہ طرزِ عمل سے اس قدر بددل واپس گئے کہ آئندہ یہاں کی انجمن کے کسی مراسلے کا جواب نہیں دیا۔ یہ میری تیسری ملاقات تھی جس میں مجھے مرحوم سے بار بار ملنے اور اُن کے خیالات سے استفادہ کرنے کا بہترین موقع حاصل رہا۔

اس ملاقات میں مولوی صاحب کے بعض محاسن کی کچھ جھلکیاں بھی نظر آئیں جن میں سے ان کی دو خصوصیتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ایک شوق مطالعہ دوسری قوت حافظہ۔ یہ احساس مجھے کس طرح ہوا اس کی تفصیل بھی سُن لیجئے۔

سندھ میں فارسی کے ایک بہت بڑے ادیب و شاعر تھے۔ میر علی شیرؔ قانع ٹھٹوی انہوں نے ۱۱۷۲ھ میں یہاں کے فارسی گو شعرار کا ایک تذکرہ مقالات الشعرا کے نام سے لکھا تھا یہ تذکرہ بہت کمیاب تھا۔ جب سے مجھے اس تذکرے کا علم ہوا تھا دل میں تمنّا تھی کہ ایک نظر دیکھ لوں۔ اتفاق سے اس کا مخطوطہ عزیز دوست مولوی دین محمد وفائی مرحوم مالک و مدیر رسالہ اتحاد کراچی کو کہیں سے مل گیا۔ معاً انہوں نے مجھے اطلاع دی اور میری طلب پر میرے پاس بھیج دیا۔ میں ان دنوں صاحبِ فراش تھا مگر دیوانگی دیکھئے کہ اسی بیماری کی حالت میں چار سو صفحے کے اس تذکرے کی نقل کر ڈالی۔ یہی تذکرہ تھا جس کی بنیاد پر میں نے اپنا مقالہ علی گڑھ کی اردو کانفرنس میں پڑھا تھا۔ مولوی صاحب کو اس تذکرے کا نام تمام مصروفیتوں کے باوجود یاد رہا اور ایک روز مجھ سے فرمائش کی کہ مقالات الشعرا دکھاؤ۔ میں جب دوسرے وقت حاضر ہوا تو مقالات الشعرا لیتا گیا یہ شام کے ۷ بجے کا وقت تھا۔ چار سو صفحات باریک تحریر، رات کا وقت لیکن دوسری صبح کو پہنچا تو حضرت پورے مقالات الشعرا کا مطالعہ فرما چکے تھے۔ کیا یہ بات ان کے غیر معمولی شوق مطالعہ اور حیران کن قوت یادداشت کی دلیل نہیں۔

مقامی انجمن سے تو میں مستعفی ہو ہی چکا تھا اس کے بعد ذاتی معاملات میں کچھ ایسا الجھاؤ واقع ہوا کہ مشاعروں کی شرکت ادبی جلسوں کی شمولیت اور شعر و سخن کا انہماک تمام باتیں بالائے طاق ہو گئیں۔ شب و روز بڑی بے کیفی میں گزر رہے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں وہ انقلاب عظیم رونما ہوا جسے "قیام پاکستان" کہتے ہیں۔ اس کے کچھ مدت بعد میں نے کراچی کی سکونت بھی چھوڑ دی اور مستقلاً حیدر آباد سندھ میں رہنے لگا۔

۱۹۶۰ء تک یہی صورت حال برقرار رہی۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ مولوی صاحب اور انجمن کا کتب خانہ کب اور کس طرح

کراچی پہنچا؟ پاکستان میں اردو کو قومی زبان منوانے کے سلسلے میں کیا کیا دشواریاں پیش آئیں؟ انجمن کی باگ ڈور کن کن صاحب اقتدار کے ہاتھوں میں رہی اپریل ۱۹۶۱ء کے مہینے میں (تاریخ یاد نہیں) ایک دو روز کے لئے کراچی آیا اور انجمن کے دفتر میں اپنے ایک عزیز سے ملا۔ کچھ دیر گفتگو رہی۔ اسی عزیز کے ساتھ واپس ہو رہا تھا کہ وسطی منزل میں مولوی صاحب تشریف فرما نظر آئے میں سامنے پہنچا اور سلام علیک کی۔ مرحوم نے نظر اٹھا کر دیکھا کھڑے ہو کر گرمجوشی کے ساتھ معانقہ کیا اور حیرت و استعجاب کے جذبات میں ڈوب کر فرمایا "ارے تم ابھی زندہ ہو میں نے تو خیال کیا تھا کہ ختم ہو گئے" میں نے جواب دیا "قبلہ صورتاً تو واقعی موجود ہوں لیکن وقعتاً کب کا دفن ہو چکا کوئی نہیں جانتا کہ اب سے ۳۵ سال پہلے ~

زمینِ سندھ سے نسبت تھی کیا مجھے قمر ۔۔۔ خدا نے بھیج دیا خدمتِ زباں کے لئے

کہنے والا شخص کہاں ہے اور کس حال میں زندگی کے گنے چنے دن پورے کر رہا ہے" اس معانقہ کے وقت میری آنکھوں میں آنسو تھے اور مولانا کی آواز بھرآئی ہوئی سی تھی شاید یہ قبل از وقت تاثر تھا اسی حادثہ کا کہ یہ ملاقات بالکل آخری ہے اس کے بعد ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع کبھی نہ مل سکے گا۔

میں نے آئندہ کے لئے اپنی خدمات کی پیش کش کی اور انہوں نے جواب میں مذکورہ عزیز کی طرف اشارہ کیا یہ اشارہ بڑا بامعنی تھا۔

دو تین دن کراچی میں قیام کر کے میں حیدر آباد چلا گیا اور شاید ایک ہفتہ ہی گزرا ہوگا کہ مولانا کو بحالی صحت کے لئے جناح اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ وہاں سے مری اور مری سے راولپنڈی لے جایا گیا راولپنڈی سے پھر واپس آئے اور سول اسپتال میں داخل ہوئے۔ بدقسمتی نے مجھے حیدر آباد سے نکلنے کا موقع نہ دیا اور اسی حالت میں ایک دن خبر ملی کہ وہ آفتابِ ادب جس کی تابانی نے مخالفین اردو کو نظر خیرگی سے دوچار کر دیا تھا اور جس کی تابناک شعاعوں نے ظلمت کدۂ ہند کے بعد مملکت پاکستان کے ایک ایک گوشے کو مرکز علم و عمل بنا دینے کا تہیّہ کر لیا تھا، اُفق کراچی میں غروب ہو گیا۔ زبان پر یک لخت انا للہ و انا الیہ راجعون آیا مگر دل کی گہرائیوں سے آواز نکلی کہ ~

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق ۔۔۔ ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

شعر اور زندگی

شعر کہیں بند نہیں ہے۔ وہ اسی قدر وسیع ہے
جس قدر کہ زندگی۔
شاعری خود ایک بڑا کمال ہے اور ایسا بڑا کمال کہ اگر کسی شخص میں
صحیح طور سے موجود ہو تو اسکے سامنے دوسرے کسب و کمال ہیچ ہیں۔
(بابائے اردو)

بیگم محمد شریف
صدر انجمن ترقی اردو خواتین

مسیحائے اردو

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آج بابائے اردو مرحوم و مغفور کی برسی ہے گو اس محسن اردو کو جسمانی طور پر ہم سے جدا ہوتے دو سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ مگر روحانی طور پر وہ ہمارے ساتھ ہیں۔ اور ہمیشہ ہماری رہبری کرتے رہیں گے۔ غیر منقسم ہند میں اس مسیحائے اردو نے اردو زبان کے بقا و تحفظ کے لئے جو کچھ کیا وہ محتاج تعارف نہیں۔

کراچی آکر مجھے بھی مرحوم سے نیاز حاصل ہوا۔ موصوف نے انجمن ترقی اردو کل پاکستان کی مجلسِ نظما میں میرا نام خود ہی رکھ لیا۔ نیز محترم نے ۱۹۵۲ء میں مجھے انجمن ترقی اردو خواتین پاکستان کا تاحیات صدر نامزد فرما کر ایک بڑا بار مجھ پر یہ کہہ کر رکھ دیا کہ خواتین میں اردو کی ترقی کا کام تم ہی بہتر طور پر کر سکتی ہو۔ پھر اس وقت سے برابر انجمن کے سالانہ جلسوں کا افتتاح کرتے ہوتے۔ انجمن کے کاموں کی تعریف فرما کر شفقتِ پدری کے ساتھ ہماری حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔

بابائے اردو اُن چند ہستیوں میں سے تھے۔ جنہوں نے قوموں کی قسمت بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ مرحوم کی جہاندیدہ نظروں نے وقت کی رفتار کو سمجھا اور ملت کی تعمیر اور قومی ثقافت کی تزئین و تحسین اور علم و ادب کی خدمت کے لئے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف کر دیا۔ چنانچہ سر سید رحمۃ اللہ کے زمانے سے لے کر آخر وقت تک وہ بڑے انہماک کے ساتھ برابر اردو کی ترویج و ترقی کا کام کرتے رہے۔ ترقی اردو کی تحریک بابائے اردو کی مساعی جمیلہ کی بدولت ایسے زمانے میں کامیاب ہوئی۔ جب کہ اغیار نے اردو کو مٹانے کے لئے پوری طرح تیاری کر لی تھی۔ مرحوم اردو کے بڑے پُرجوش علمبردار تھے۔ انہوں نے انتہائی مشکل اور پیچیدہ حالات میں اردو

کے لئے جہاد کیا۔ اور اپنی جانفشانیوں سے ہندوستان میں اردو کے پرچم کو بلند رکھا۔ حیدر آباد میں جامعۂ عثمانیہ کی تاسیس اور اس کے ذریعہ اردو کے دامن کو جدید علوم و فنون سے مالامال کرنے اور اس کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش کھڑا کرنے کے لئے موصوف نے جو جد و جہد کی وہ ہماری تاریخ میں ان کے نام کو ہمیشہ نمایاں رکھیگی۔

تقسیم ہند کے بعد انجمن کی بیش قیمت کتابوں کے ذخیرہ کو سخت نقصان پہنچا۔ اور اس کا بڑا حصہ فسادات کی نذر ہوگیا۔ بابا اپنے باقی ماندہ علمی اثاثہ کے ساتھ پاکستان تشریف لے آئے۔ کیونکہ ان کی اردو کو الگ گھر مل گیا تھا اور جہاں اس کے پروان چڑھنے پھلنے پھولنے کی ان کو پوری امید تھی۔ چنانچہ کراچی آنے کے بعد آپ نے انجمن ترقی اردو کل پاکستان بنیادوں پر قائم کی اور اردو، قومی زبان، سائنس تین معیاری اردو رسالے جاری کئے۔ آپ نے اردو میں تاریخ۔ ادب۔ فلسفہ اور دیگر علوم و فنون پر نہ صرف خود تحقیقی مضامین اور کتابیں لکھیں بلکہ اہل علم و قلم حضرات کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ اور ان سے کتابیں لکھوا کر انجمن کے پریس میں طبع کروائیں۔ مرحوم نے اپنی بے لاگ تنقیدوں، تبصروں اور مقدموں کے ذریعہ نئے لکھنے والوں کی تربیت و ہمت افزائی فرمائی اور اردو میں تحقیق کا بلند معیار قائم کیا۔ آپ نے اردو قواعد کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ اردو انگلش لغات آپ کی ہی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ جن سے بے شمار طلبہ و مترجمین فیضیاب ہو رہے ہیں۔

مرحوم نے زمانے کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے محسوس کیا کہ ہماری قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنی قومی زبان اردو کو علوم و فنون کے حصول کا ذریعہ نہ بنالے۔ اسی خیال کے تحت انہوں نے کراچی میں اردو کالج قائم کیا۔ جہاں نہ صرف ادب بلکہ تمام مضامین مثلاً سیاسیات، قانون، معاشیات، سائنس تجارت، اور دیگر علوم کا ذریعہ تعلیم اردو زبان ہے۔ موصوف نے اپنی جد و جہد سے یہ ثابت کر دیا کہ اردو نہ صرف اہل ملک کی مشترکہ زبان ہے۔ بلکہ اس کے اندر جملہ علوم و فنون یعنی فنی سائنسی اور قانون وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بننے کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اور صرف اردو ہی اہل پاکستان کی قومی زبان بن سکتی ہے۔ مرحوم نے اپنی تحریر و تقریر میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم بذریعہ اردو دی جائے اور ان کو ویسی ہی ڈگریاں دی جائیں جیسی کہ مغربی طرز کی یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت انہوں نے اردو یونیورسٹی قائم کرنیکی کوشش کی تھی تاکہ اپنی زندگی ہی میں اردو کے مستقبل کو محفوظ کر دیں۔ لیکن افسوس ہے۔ ان کی یہ آرزو تشنۂ تکمیل رہی۔

مرحوم انجمن ترقی اردو خواتین پاکستان کی اردو خدمات سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ چنانچہ انجمن کے ایک سالانہ جلسہ میں (جس کی صدارت بیگم برکی صاحبہ فرما رہی تھیں) مرحوم نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں انجمن کے کاموں سے بہت خوش ہوں اور بیگم محمد شریف صاحبہ اور اراکین انجمن کو مبارکباد دیتا ہوں

کہ انہوں نے اردو کی ترویج و ترقی کے لئے بہت نمایاں کام کیا ہے۔ انجمن نے پاکستان کے مختلف مقامات پر شاخیں قائم کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خواتین مردوں سے زیادہ اپنی قومی زبان کی اہمیت کو سمجھتی ہیں۔" موصوف نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "اردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضا ہے میں چاہتا ہوں کہ اردو یونیورسٹی قائم کر کے اردو زبان کے مستقبل کو محفوظ کر دوں۔ مگر اس کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ خواتین یونیورسٹی کے قیام میں میری مدد کریں گی۔" افسوس ہے کہ بابا کی زندگی میں اردو یونیورسٹی قائم نہ کی جا سکی۔ ہمارے دل میں جو عقیدت و محبت مولانا مرحوم کی ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان کی اس آخری آرزو اردو یونیورسٹی کو قائم کرنے کے لئے پوری جدوجہد کریں۔ اور اپنی قومی زبان اردو کی ترویج و ترقی کے لئے دامے، درمے، قدمے، سخنے کام کر کے اس کو وہ اعلیٰ مقام دلا دیں۔ جس کی کہ یہ درحقیقت مستحق ہے۔ دعا ہے کہ پروردگار ہم کو بابائے اردو کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

الفاظ کی سیرت

الفاظ بھی ایک طرح انسان کی طرح جاندار ہیں۔ وہ بھی انسان کی طرح پیدا ہوتے، مرتے، بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتا ہے۔ جو خود اس کی ذات سے پنہاں ہے۔ وہ گذشتہ زمانے کی تہذیب اور معاشرت کی یادگار ہے۔ وہ قومی ترقی کے ساتھ ترقی کرتا اور قومی تنزل کے ساتھ تنزل کرتا ہے۔ یہ بھی انقلاب زمانہ سے انسان کی طرح کبھی ادنا سے اعلا اور اعلا سے ادنا شریف سے رذیل اور رذیل سے شریف ہو جاتا ہے۔ لیکن ہر لفظ زبان میں ایک منصب رکھتا ہے۔ اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہے۔ جو اس کی سیرت سے آگاہ ہے، یہ انشاپردازی کا بڑا گر ہے۔ (تنقیدات عبدالحق ص ۱۱)

الفاظ کی سلاست اور ترکیب کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکا دیتی ہے۔ وہ ان سے بے خبر گزر جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ شاعر نے ان سلیس الفاظ اور معمولی تراکیب میں کیا کیا کمال بھر رکھے ہیں۔

(مقدمات دوم، ص ۱۸)

تحسین سروری

شمعِ انجمن

یہ شاید ۱۹۳۲ء کی بات ہوگی، میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا، ہمارے گھر میں میرے منجھلے بھائی صاحب کو کتابوں اور رسالوں کا بہت شوق تھا۔ یہ تو نہیں معلوم وہ کس قسم کا لٹریچر پڑھتے تھے، صرف اتنا یاد ہے کہ وہ دن رات مصروفِ مطالعہ رہتے تھے۔

ایک رات میں اپنا سبق پڑھتا بیٹھا تھا۔ منجھلے بھائی صاحب حسبِ عادت کسی رسالے کی ورق گردانی میں منہمک تھے۔ ایک دفعہ وہ ورق الٹ کے، رسالے میں چھپی ہوئی تصویر پر رک گئے۔ اور ان کی زبان سے نکلا۔ اچھا! یہی ہیں مولوی عبدالحق صاحب!!۔ یہ سن کر میں ان کے ہاتھ میں کھلے ہوئے رسالے پر جُھک گیا۔

یہ ایک بڑے میاں کی تصویر تھی جو بالکل سیدھے کھڑے ہوئے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی، ایک ہاتھ میں چھڑی۔ دوسرا ہاتھ کرسی پر ٹکا ہوا، آنکھوں پر عینک۔ داڑھی، شیروانی اور پاجامہ یک ٗن سفید۔ چہرے پر وقار اور آنکھوں میں رُعب دار کشش۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب بی، اے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ مولوی عبدالحق صاحب بی، اے کون بزرگ ہیں۔ یہ تھی مولوی صاحب سے میری پہلی ملاقات۔

یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ اس کے بعد نہ میں نے کبھی مولوی عبدالحق کے بارے میں کچھ سوچا نہ کبھی انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

۱۹۳۵ء کے آغاز کے ساتھ ہی مجھے کچھ کچھ شاعری کا چسکا لگ گیا تھا اور گھر والوں کی چوری سے مشاعروں میں بھی شریک ہونے لگا۔ اس زمانے میں میرا کوئی دوست نہیں تھا۔ لہٰذا میں اپنی فرصت کا زیادہ وقت کتب خانہ آصفیہ میں گزارتا۔ وہاں ہندوستان بھر کے اخبار و رسائل آتے تھے، یہ سب میری نظر سے گذرتے۔ ان کے علاوہ میں باقاعدہ طور پر عروض و بلاغت، صنایع بدایع اور اساتذۂ قدیم کے دواوین پڑھتا رہتا لیکن

شاید ہی کچھ میرے پلے پڑا ہو۔

سنہ ۳۶ء و ما سنہ ۳۷ء کا زمانہ ہوگا کہ ماہر القادری صاحب سے مراسم پیدا کیے۔ تقریباً ہر روز ان کے گھر جانا میرا معمول ہوگیا۔ اس کے بعد میرا حلقۂ احباب بڑھنے لگا۔ ساتھ ہی مشاعرے بازی میں اضافہ ہوا۔ اور طبیعت آوارگی پسند بھی ہوگئی "نگار" میں جوش، و علی اختر کے کلام کے موازنے بھی میں دیکھتا رہا۔

ایک روز ایک دوست نے حسرت ترمذی صاحب سے تعارف کرایا۔ جو فتح پور سیکری سے حیدر آباد آکر دفتر امور دستوری (ہوم سیکریٹریٹ) میں کسی عہدے پر فائز تھے۔ حسرت صاحب کا مکان "میری پارٹی" کے ابھرتے ہوئے۔ شاعروں اور بڑھاوے دینے والے بزرگوں کی آماجگاہ بن گیا۔ یہاں ہر روز ہر قسم کے ادبی موضوعات پر بحثیں ہوتیں۔ پھر یہ صحبتیں مشاعرے کی صورت اختیار کرلیتیں۔ انہیں صحبتوں میں میں نے سنا کہ لکھنؤ کے کچھ نوجوان ادیبوں نے فرانس کے ادیبوں کی انجمن پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن کے طور پر "انجمن ترقی پسند مصنفین" نام کی ایک تنظیم بنائی ہے۔ جس کے افتتاحی اجلاس میں مولوی عبدالحق اور منشی پریم چند سرپرستوں کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ منشی پریم چند کے نام سے میں بخوبی واقف ہوچکا تھا۔ لیکن خدا جانے یہ عبدالحق کون شخص تھے۔ دوسری طرف حضرت علی اختر کے مکان پر طالبان شعر و ادب کے جمگھٹے ہوتے۔

حسرت صاحب ہی کے مکان پر میں نے سنا کہ اورنگ آباد سے انجمن ترقی اردو دہلی کو منتقل ہو رہی ہے۔ گویا یہ زمانہ سنہ ۳۸ء کا تھا۔ انجمن کی منتقلی کے سلسلے میں بار بار مولوی عبدالحق کا نام سننے میں آیا۔ چند روز بعد انجمن ترقی اردو والے مولوی عبدالحق کی تصویر بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ تو وہی مولوی عبدالحق نکلے جن کی تصویر میں نے چھ سال قبل دیکھی تھی۔ سر مو فرق نہیں۔ وہی آن بان وہی چہرہ مہرہ، وہی آنکھیں، وہی سفید داڑھی ———

انجمن ترقی اردو ——— یہ نام بھی میرے لئے نیا نہیں رہا تھا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں پورے ممالک محروسہ سرکار آصفیہ و برار میں انجمن کا شائع کردہ نصاب ہی پڑھایا جاتا تھا۔ ہر کتاب کے سرورق کی پیشانی پر "نصاب درسیۂ عثمانیہ" ——— بیچوں بیچ حضور نظام کی تصویر۔ تصویر کے نیچے مرتبہ انجمن ترقی اردو (ہند) لکھا ہوتا تھا۔

۳۵ سے ۴۰ ۱۹ء تک کا زمانہ کچھ گڈمڈ سا ہے۔ مطلب یہ کہ واقعات کچھ تسلسل کے ساتھ یاد نہیں رہے۔ البتہ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ انہیں پانچ چھ سال کے دوران جوش صاحب نے دہلی سے "کلیم" جاری کیا۔ پھر اس کے ساتھ لکھنؤ کے دور میں ترقی پسندوں نے اپنا "نیا ادب" ضم کردیا جس کے بعد سے اس کا نام "نیا ادب اور کلیم" ہوگیا۔ لکھنؤ میں ایک دھماکا ہوا۔ یعنی "انگارے" شائع ہوئی۔ اور ضبط ہوئی۔ سید سبط حسن نے "آزادی کی نظمیں" مرتب کرکے شائع کروائی۔ یہ بھی ضبط ہوئی۔ جوش صاحب نے "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" نظم لکھی۔ اس پر سنا کہ ان سے

کچھ باز پُرس ہوئی۔ چند روز بعد اسی قسم کی ایک اور نظم مشہور ہوئی۔ یہ نظم بھی جوشؔ صاحب سے منسوب تھی، لیکن۔ جوشؔ صاحب کی اس میں گھن گرج نہیں تھی۔ پھر معلوم ہوا۔ اس نظم میں گھن گرج اس لئے نہیں ہے کہ یہ جوشؔ ملسیانی کی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو بھوپال کا وہ یادگار مشاعرہ، جس میں حیدر آباد سے حضرت فانیؔ بدایونی مرحوم شریک تھے۔ اور جگرؔ صاحب نے فانیؔ صاحب کی غزل پڑھی تھی۔

فانیؔ دکن میں آکے یہ عقیدہ کھلا کہ ہم !
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

اس مشاعرے کے بعد کسی ریڈیو مشاعرے ہی میں جگرؔ صاحب نے اپنی مسلسل غزل سنائی تھی۔ اور یہ غزل کافی دنوں تک موضوع بحث بنی رہی۔

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

یہ گاڑی اسی طرح چلتی رہی۔ میں روایتی شاعری اور پرانے، اور رسمی قسم کے مشاعروں سے متنفر سا ہو گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا۔ جب کہ ہر نیا شاعر "جوشیلے جذبات" کے اظہار پر آمادہ تھا۔ دوسروں کا دیکھا دیکھی میں بھی اس رَو میں بہ گیا۔ اور دل میں یہ بات جاگزیں ہو گئی کہ پرانا ادب اور قدیم شاعروں کا کلام پڑھنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس کے علاوہ خیالات رکیک اور گندہ ہو جاتے ہیں۔ اور خواہ مخواہ قصیدے اور مسائل حیات سے بَرا اشعار لکھنے کی ترغیب ہوتی ہے۔

۱۹۴۱ء میں قاضی عبدالغفار مرحوم کی سرپرستی میں حیدر آباد کے چند نوجوانوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی۔ اس نئی انجمن نے وہ وہ کام کر دکھائے کہ لوگ حیران رہ گئے۔ لیکن اس انجمن نے ہمارا دماغ کچھ ایسا خراب کیا کہ ہم اوپر ہی اوپر اڑنے لگے۔

۱۹۴۰ء سے انجمن ترقی اردو کی عملی سرگرمیاں کافی تیز ہو گئیں۔ اردو کی ترویج و اشاعت کل ہند پیمانے پر ہونے لگی۔ انجمن کی شاخیں کشمیر سے لے کر ملیبار تک قائم ہوئیں۔ مولوی صاحب کے طوفانی دورے، ہندی پرچارنی سبھا اور گاندھی جی سے نوک جھوک میں، کا کافی چرچا ہونے لگا۔

یہ جو میں نے چند غیر متعلق واقعات بیان کئے ہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ میں جیسے جیسے ان باتوں سے باخبر ہوتا گیا۔ انجمن اور مولوی صاحب کے نام سے بھی کافی واقفیت حاصل ہو گئی۔ لیکن یہ بھی واضح کر دوں کہ میں انجمن کی علمی حیثیت کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ اور مولوی صاحب کے متعلق یہ خیال تھا کہ یہ صرف اردو کے مبلغ ہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ مولوی کا لاحقہ لگایا جاتا ہے۔

حیدر آباد کی انجمن ترقی پسند مصنّفین نے ۴۳ء میں "یوم حالیؔ" منایا۔ جس کی صدارت مولوی صاحب نے کی۔ اگرچہ اس سے قبل چند بار مولوی صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن مذکورہ یوم حالی کے بعد سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ زمانہ مولوی صاحب کے طوفانی دوروں کا تھا۔ مستقر تو دہلی تھا، لیکن ہر وقت کسی نہ کسی جگہ کے لئے پا بہ رکاب رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حیدر آباد میں اکثر دکھائی دیتے۔

ناگپور اردو کانفرنس (۱۹۴۴ء) میں بھی مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ حیدر آباد سے نظرؔ (حیدر آبادی) سلیمان اریبؔ اور میں گئے تھے۔ وہیں ہم نے پہلی دفعہ پنڈت دتاتریہ کیفیؔ کو دیکھا۔ یہ لطیفہ یاد رہ گیا ہے کہ ایک طرف سے مولوی صاحب اور کیفیؔ صاحب مرحوم آتے دکھائی دیئے۔ اخترؔ شیرانی مرحوم نے ان کی طرف دیکھ کر ہم سے کہا "ولایتی میم اور دیسی پوپ کو دیکھا"۔ ہم لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔ کیفیؔ صاحب گورے چٹے آدمی، چہرہ داڑھی مونچھ سے صاف، سر کے بال روئی کی طرح سفید، چھوٹا سا قد اور ضعیفی کے بوجھ سے کسی قدر جھکے ہوئے مولوی صاحب کا سیاہی مائل، سانولا رنگ، میانہ قد، سفید داڑھی اور تنے ہوئے۔ اسی مناسبت سے اخترؔ شیرانی نے پنڈت کیفیؔ کو ولایتی میم اور مولوی صاحب کو دیسی پوپ کہا تھا۔ لطف کی بات یہ کہ یہ دونوں بزرگ سردی کی شدت کے باعث کالے اور موٹے موٹے چسٹر پہنے ہوئے تھے۔ غرض اخترؔ مرحوم کی یہ پھبتی بھی عجب مزہ دے گئی۔

مجھے اب تک حیرت ہے کہ ادب کے ٹھوس حقائق اور قومی زبان کی اہمیت کو سمجھے بغیر، مولوی صاحب کی شخصیت اور ان کی بزرگی کا نقش ہمارے دل پر کیونکر جم گیا تھا — یہ کیا بات تھی کہ مولوی صاحب کے سامنے ہر شخص ہیچ معلوم ہوتا تھا۔

۴۶ء میں ہندوستان میں عارضی حکومت اور حیدر آباد میں سر مرزا اسمٰعیل کی وزارت عظمیٰ قائم تھی۔ سر مرزا نے جو مولوی صاحب سے کچھ پرخاش رکھتے تھے، انجمن کو ریاست حیدر آباد کی طرف سے ملنے والی ..... امداد بند کر دی۔ اگرچہ حیدر آباد میں مولوی صاحب اور انجمن کے طرفدار کافی تعداد میں تھے۔ اور سب صاحب اقتدار بھی تھے، لیکن صورت حال ایسی تھی کہ حکومت کے فیصلے کے خلاف سرکاری حلقوں میں کوئی کچھ نہ کر سکا۔ لیکن ہم لوگ جو چند "سر پھرے نوجوانوں کی جماعت" کی شکل میں تھے۔ حکومت کے اس اقدام کی مذمت کرتے پھرتے۔ اسی دوران میں رائے پور میں چھتیس گڑھ کالج کی طرف سے کل ہند اردو کانفرنس ہوئی۔ اور بمبئی، کلکتہ اور حیدر آباد کے ادیب و شاعر (ان میں زیادہ تعداد ترقی پسندوں کی تھی۔) مدعو کئے گئے۔ اس کانفرنس میں ہم حیدر آبادی شاعروں (نظرؔ، اریبؔ، کنولؔ پرشاد کنول، شریمتی شیل بالا اور میں)

کی خواہش پر مرحوم شاہد صدیقی نے ایک رزولیوشن مرتب کیا، جس میں ریاست حیدرآباد کے انجمن ترقی اردو کی امداد بند کرنے کی مذمت اور دوبارہ جاری کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ شرکائے کانفرنس نے اس کی پُرجوش انداز میں تائید کی۔ یہ سب کچھ مولوی صاحب کے خلوص، ان کے جذبۂ ایثار اور اردو سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ تھا کہ، ہندوستان کے ہر گوشے میں ان کی آواز پر لبیک کہنے والوں کی کافی تعداد موجود تھی۔

پھر سنہ ۱۹۴۷ء کا ۱۴ اگست آگیا۔ ملک تقسیم ہوا، سارا معاملہ تتر بتر ہو گیا۔ مولوی صاحب کے متعلق عجیب عجیب باتیں سننے میں آنے لگیں۔ چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ مولوی صاحب حیدرآباد آئے ہوئے ہیں۔ ایک شام، عابد روڈ پر علی شبّر حاتمی صاحب کی کتابوں کی دوکان (کتاب خانہ) کے سامنے کار میں بیٹھے ہوئے میں نے مولوی صاحب کو دیکھا، قریب جاکر ادب سے سلام کیا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ گفتگو کا موقع بھی نہ آیا تھا کہ حاتمی صاحب آگئے۔ مولوی صاحب نے معذرت خواہی کے انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے رخصتی سلام کیا۔ مولوی صاحب کی کار کسی طرف کو نکل گئی۔

دسمبر سنہ ۴۷ء کے آخری ہفتے میں کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں شرکت کی غرض سے حیدرآباد سے دس بارہ آدمیوں کا ایک وفد لکھنؤ گیا تھا۔ اس میں ... میں بھی تھا۔ وہاں میں نے سنا کہ دہلی میں انجمن ترقی اردو کا اثاثہ لٹ گیا۔ اور کتب خانے کو آگ لگا دی گئی۔ اس خبر سے کافی دکھ ہوا۔ مولانا حسرت موہانی اور جگر مرحوم بھی کافی رنجیدہ تھے۔ اور ہر شخص نے شرپسندوں کی کافی مذمت کی۔

جنوری سنہ ۴۸ء کے پہلے ہفتہ میں ہم لوگ لکھنؤ سے حیدرآباد واپس ہوئے۔ نئے سال کے آغاز کے ساتھ ہی اہل حیدرآباد کی تحریک آزادی میں شدت پیدا ہو گئی۔ کسی کو کچھ خبر نہ تھی کہ دنیا کے کیا حالات ہیں۔ ہر شخص کنوئیں کا مینڈک تھا۔ لہٰذا انجمن اور مولوی صاحب کی ہمیں کوئی اطلاع نہ ملی۔ ایک دفعہ صرف یہ خبر ملی ہے کہ مولوی عبدالحق پاکستان فرار ہو گئے ہیں۔

اس زمانے میں میں نشرگاہ حیدرآباد (دکن ریڈیو) میں ملازم تھا، نظم و نثر کے ریڈیائی مسودات لکھنے کا کام میرے ذمے تھا۔ اس کے علاوہ ایک یہ کام بھی ایزاد کیا گیا کہ ہر روز اقبال اور اساتذۂ قدیم کا کلام انتخاب کر کے نشر کرواؤں۔ کلام اقبال کے پورے مجموعے تو سامنے ہی رہتے تھے، لیکن شعرائے قدیم کا کلام فراہم کرنے میں بڑی دشواری ہوتی۔ میں نے اس کا تذکرہ شعبۂ موسیقی کے عزیز قریشی سے کیا۔ انہوں نے کہا، پریشان کیوں ہوتے ہو۔ اوپر مہتمم صاحب (اسٹیشن ڈائریکٹر) کے اجلاس کے برابر والے کمرے میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں ہر قسم کی کتاب ملے گی۔ میں بھاگا بھاگا ہوا۔ اوپر گیا۔ ایک بڑے سے کمرے میں چاروں طرف چھت تک اونچی الماریاں کتابوں سے پٹی پڑی تھیں۔ مجھے اپنی اس لاعلمی پر بڑا افسوس ہوا۔ اور افسوس بھی محض اس کا کہ خود دفتر میں اتنی ساری کتابیں ہونے کے باوجود میں خواہ مخواہ اتنے دن پریشان رہا۔ خیر، تو میں نے ایک ایک الماری کھول کر جائزہ

لیا، میرے مطلب کی بے شمار کتابیں دکھائی دیں۔ اب میں کافی مطمئن ہوگیا۔ ایک الماری میں دیکھا کہ ساری ہی انجمن ترقی اردو کی مطبوعات رکھی ہیں، کافی دیر تک میں ان کتابوں کو الٹ پلٹ کرتا رہا۔ مجھے اپنی جہالت پر شرم بھی آرہی تھی کہ میں اب تک انجمن ترقی اردو کو اردو کی بقا کے لئے آواز بلند کرنے والا محض ایک پلیٹ فارم سمجھتا رہا۔ مجھے اب تک نہیں معلوم تھا کہ اس نے نصابی کتب کے علاوہ ایسی بیش بہا علمی وادبی کتابیں بھی شائع کیں۔ بیش بہا کتابیں تو میں اس وقت کہہ رہا ہوں، ورنہ اس وقت کی یہ نئی اطلاع ہی میرے لئے اہم تھی کہ انجمن ایک اشاعتی ادارہ بھی ہے۔

اس روز میں لائبریری سے شعرائے قدیم کے کچھ دواوین کے ساتھ انجمن کی مطبوعات میں میر کا تذکرۂ نکات الشعرا اور مصحفی کا تذکرۂ ہندی لے آیا، خاص طور پر مولوی صاحب کے مقدمات پڑھے، ان میں کچھ عجیب طرح کا لطف محسوس ہوا۔ اس کے بعد بھی اسی طرح دفتر سے میں کتابیں لا لاکر پڑھنے لگا۔

ریڈیو کے لئے میری مشکل تو حل ہوگئی، لیکن میں ایک نئے مرض کا شکار ہوا۔ یعنی کلاسکی ادب کا شوق ہوگیا۔ اب تو مولوی صاحب کے وہ تمام مقدمات پڑھتے رہنا میرا معمول ہوگیا۔ جو مطبوعات انجمن میں شامل رہتے تھے۔

مولوی صاحب کا طرز تحریر، ان کا لب ولہجہ اور انداز بیان مجھ پر ایک خاص اثر کرگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تحقیق جیسے سنگین فن کو مولوی صاحب نے پانی کرکے رکھ دیا تھا۔ اس کیلئے انہوں نے جو۔۔۔۔ پیرایہ نکالا وہ حد درجہ دل نشیں اور موثر تھا۔ مولوی صاحب قیاسات کے تیشے سے تاریخ اور واقعات کے جو پیکر تراشتے تھے۔ اتنے جاندار ہوتے کہ وہ بھی سانس لیتی ایک مخلوق معلوم ہوتے۔

رفتہ رفتہ میں نے انجمن ترقی اردو کی وہ تمام کتابیں خرید لیں جو صرف ادب اور شاعری سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں خطبات عبدالحق اور چند ہم عصر اور شعراء کے وہ تمام تذکرے جنھیں انجمن نے شائع کیا تھا۔ میرے لئے زیادہ دلچسپی کا باعث تھے۔ اب مطبوعات انجمن کی حد سے شوق جو گزرا ہے تو، یہ تخصیص ختم ہوگئی۔ چند ہی ماہ میں میرے پاس ہر جگہ کی چھپی ہوئی بھی ڈھیروں کتابیں ہوگئیں۔ جن میں زیادہ تعداد دواوین، تذکروں اور لسانیات وتاریخ ادب کی تھی میں کوشش کرتا تھا کہ مولوی صاحب اپنے مضامین یا کسی کتاب کے مقدمہ میں جن جن مطبوعہ کتب کا ذکر کرتے ہیں وہ سب فراہم کرلوں۔

اسی سال یعنی ۱۹۴۸ء کے ماہ دسمبر میں سقوطِ حیدرآباد کے بعد پاکستان آنے کا ارادہ کرکے بمبئی چل دیا۔ وہاں ۲۱ اکیس دن رہا۔ بائیسویں دن کراچی آنے والے ایک جہاز میں بیٹھ گیا۔ سنہ ۱۹۴۹ء کے سال کا پہلا دن سمندر میں آیا۔ دوسری جنوری کی صبح سورج طلوع ہونے سے قبل کراچی کی بندرگاہ نمودار ہوئی۔

کراچی میں نئے حالات اور نئے ماحول سے مانوس ہونے میں چند ماہ گذر گئے۔ قدرے اطمینان ہوا تو پھر وہی کتابیں جمع کرنے کا شوق شروع ہوا، حیدرآباد میں جو ذخیرہ جمع ہو گیا تھا وہ بھی کراچی منگالیا۔

چند روز بعد خیال آیا کہ انجمن ترقی اردو چلنا چاہیئے۔ مولوی صاحب سے ملاقات کے علاوہ مولوی عمریافعی صاحب کا ایک اہم پیام بھی مولوی صاحب کو پہنچانا تھا۔ چنانچہ میں شاردامندر پہنچا، بہت جلد مولوی صاحب کی رہائش گاہ معلوم ہو گئی۔ شاردامندر کی تینوں وسیع اور دو دو منزلہ عمارتیں خالی خالی سی تھیں۔ ہر طرف سامان بے ترتیب پڑا ہوا۔ مولوی صاحب پہلی عمارت کی دوسری منزل کے آخری کمرے میں فروکش تھے۔ میں جس وقت پہنچا ہوں، وہ کمرے کے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ اکیلے ہی تھے۔ جیسے ہی میں نے سامنے جاکر سلام کیا۔ حسب عادت مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ خالی کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ گویا مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب میں نے اپنا نام بتایا تو انہوں نے میرے نام کو دہرایا۔ چند لمحے تامل کیا۔ پھر بولے ، اچھا تم حیدرآباد سے آئے ہو؛ میں نے جواباً کہا جی ہاں؛ وہ کچھ دیر کھوسے گئے۔ میں بھی خاموش بیٹھا رہا۔ پھر مولوی صاحب نے خود ہی سکوت کو توڑتے ہوئے انقلاب حیدرآباد کی گفتگو چھیڑ دی۔

جب مولوی صاحب اس موضوع سے تھک گئے تو میں نے مولوی عمریافعی صاحب کا پیام سناکر ان کے کتب خانے سے متعلق کچھ بات کی۔ معلوم ہوتا تھا۔ وہ میری بتائی ہوئی بات سے مطمئن سے ہو گئے ہیں۔ جب یہ بات بھی ختم ہو گئی تو میں مولوی صاحب کو رخصتی سلام کرکے چلا آیا۔

اس وقت میں نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب بجھے بجھے سے ہیں۔ آنکھوں میں تردد و تشویش کے آثار پائے جاتے تھے۔ ممکن ہے انجمن کے ہندوستان میں لٹ جانے اور کراچی میں بے سروسامانی کی حالت میں آنے کا ملال ہو۔

اس روز کے بعد سے میں برابر مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ چونکہ کلاسکی ادب اور خاص کر مولوی صاحب کی تحریریں پڑھنے کا نیا نیا شوق تھا۔ اور طبیعت تحقیق کی طرف مائل ہونے لگی تھی۔ اس لئے عجیب عجیب سے سوال مولوی صاحب سے کیں کرتا؛ وہ نہایت فراخ دلی سے جواب دیا کرتے۔

ایک روز میں نے عجیب سا سوال کیا کہ جب تک انجمن ہندوستان میں ـــــ اس پر زور دیتی تھی کہ اردو میں جو موٹے موٹے عربی الفاظ اور نامانوس فارسی ترکیبیں ہیں۔ انہیں ترک کرکے ہلکے پھلکے الفاظ استعمال کرنا چاہیئے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ چونکہ ہندو قوم ایسے لفظوں اور ترکیبوں کی وجہ سے اردو کو بدیسی زبان بتاتی تھی؛ اس لئے اس خیال کو ذہنوں سے نکالنے کے لئے آسان اردو کی تحریک چلائی گئی۔ لیکن پاکستان

مسلمانوں کا ملک ہے؛ اور مسلمانوں کو عربی فارسی سے جذباتی تعلق ہے۔ لہذا یہاں ایسی زبان کی ترغیب دلانا کس حد تک مفید ہوگا؟

مولوی صاحب نے فرمایا نہیں یہ بات نہیں۔ جہاں تک ہو سکے زبان کو سادہ اور عام فہم ہونا چاہیئے۔ بھاری سے بھاری خیال کو سادہ و سلیس زبان میں بیان کرو تو خیال کی خوبی نکھر آتی ہے۔ میں اب بھی یہی کہوں گا۔ کہ اردو کو نامانوس ترکیبوں اور ثقیل لفظوں سے پاک کرو۔

قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی مرحوم جب انجمن سے وابستہ ہوئے تو ۱۹۴۹ء کے نصف آخر سے رسالۂ اردو" جاری ہوا۔ قاضی صاحب مرحوم کو پہلے "اردو" کا ایڈیٹر بنایا گیا، لبعدمیں وہ نائب معتمد کے عہدے پر فائز کئے گئے۔ ان کے آنے کے بعد رفتہ رفتہ انجمن کی سرگرمیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ قاضی صاحب نے ایک عمدہ کام یہ کیا کہ کراچی کے ایک کتب فروش کو انجمن کی بعض کتابیں چھاپنے پر آمادہ کر لیا۔ اس میں انجمن کو ایک پیسہ بھی خرچ کرنا نہیں پڑا تھا۔ بلکہ رائیلٹی کے طور پر انجمن ہی کو کتابیں ملتی تھیں۔ جنھیں انجمن فروخت کرتی تھی۔ انتخاب جدید، انتخاب کلام میر، مثنوی خواب وخیال، نیا ادب، کیفیہ، مختصر تاریخ تمدن، اور چھوٹی ڈکشنری کے پہلے پاکستانی ایڈیشن اسی معاہدہ کے تحت طبع ہوئے تھے۔

چونکہ اب قاضی صاحب اور سید ہاشمی فرید آبادی سے بھی میرے مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ اس لئے اب انجمن کی آمدورفت پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ اب مولوی صاحب کے خیالات سے استفادہ کرنے کے علاوہ قاضی صاحب مرحوم کی شفقت بھی شامل حال ہو گئی۔

کتابیں جمع کرنے کا سلسلہ چونکہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اسی سلسلے میں ایک دفعہ مجھے میرزا سعادت یار خاں رنگین آبادی کی منظوم تصنیف "شش جہت رنگیں" کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہو گیا۔ یہ کافی ضخیم کتاب تھی، اس کو میں کئی روز تک پڑھتا رہا۔

اس کے بعد دنیا بھر کے کتب خانوں کے کٹیلاگ دیکھ ڈالے، ہندوستان کے مختلف اصحاب علم سے مراسلت کی، آخر میں پتہ چلا کہ مجھے جو نسخہ ملا ہے وہ بڑا اہم ہے، اس لئے کہ سوائے انڈیا آفس (لندن) کے اس کا کوئی دوسرا نسخہ کسی جگہ موجود نہیں۔ میرے پاس چونکہ شعرائے اردو کے تقریباً تمام ہی مطبوعہ تذکرے موجود تھے۔ نیز میں نے رنگین کی اس تصنیف کے متعلق کچھ اور ذرائع سے بھی ضروری معلومات جمع کر لی تھیں، اس لئے میں نے ایک خالص تحقیقی مضمون لکھنا شروع کیا جو کئی ماہ میں جا کر مکمل ہوا۔ اس کے بعد میں ڈرتا ڈرتا مولوی صاحب کی خدمت میں پہنچا اور مضمون ان کی طرف بڑھا دیا۔ مولوی صاحب نے کچھ دیر ورق گردانی کی، اس کے بعد پوچھا، کیا تم نے لکھا ہے؟ میں نے رکتے رکتے کہا۔ جی ہاں۔ پھر پوچھا کیا کروں اسے؟ میں نے کہا،

آپ ذرا دیکھ لیجئے۔ کہا، اچھا دیکھ لوں گا۔

دو تین دن بعد جب قاضی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے یہ مژدہ سنایا کہ آپ نے مولوی صاحب کو جو مضمون دیا تھا۔ وہ اردو میں اشاعت کے لئے میرے پاس آگیا ہے۔ اور مولوی صاحب مضمون کی تعریف کر رہے تھے۔ یہ مولوی صاحب کی طرف سے میری بہت بڑی حوصلہ افزائی تھی۔

میرا یہ مضمون ۱۹۵۱ء میں اردو کے شمارہ جنوری میں "شش جہت رنگیں" کے عنوان سے چھپا۔ جو ٹائپ کے تیس صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد میں نے پھر ایک تحقیقی مضمون "سراج اور پروانہ" لکھا۔ جو اسی سال کے شمارہ اپریل میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی بھی مولوی صاحب نے تعریف کی۔

جیسے جیسے میں مولوی صاحب کے اسلوب اور ان کے طریقۂ تحقیق سے متاثر ہوتا گیا، مولوی صاحب کو قریب سے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوتا رہا۔ اور ان کی شخصیت کا نقش میرے دل پر اور گہرا ہوتا گیا۔

۱۹۵۱ء ہی میں ایک وقت ایسا آیا کہ قاضی احمد میاں اختر مرحوم کی تحریک اور مولوی سید ہاشمی فرید آبادی صاحب کی سفارش پر میں انجمن ترقی اردو میں ملازم ہو گیا۔ اور شعبہ مطبوعات کا انتظام میرے سپرد ہوا دفتر کے اوقات کے بعد اوپر (اس وقت تک مولوی صاحب عمارت کی چھت پر اپنے رہائشی کمرے تعمیر کروا چکے تھے) مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر مختلف علمی و ادبی مسائل پر بات چیت کرتا۔

مذکورہ سال سے انجمن کافی سرگرم عمل ہو چکی تھی، عملہ بھی بڑھنے لگا۔ اور انجمن نے نیچے کے ایک کمرے میں ایک چھوٹا سا ذاتی پریس قائم کر لیا تھا۔ "قومی زبان" تو ۴۸ء سے اور "اردو" ۴۹ء سے جاری ہو گیا تھا۔ اب سائنس، معاشیات اور تاریخ و سیاسیات بھی شائع ہونے لگی۔

۵۱ء سے ۵۳ء تک تین سال کے دوران مولوی صاحب نے انجمن کی طرف سے دو عالیشان جلسے بھی کئے۔ ایک کل پاکستان اردو کانفرنس، اور دوسرا جلسہ انجمن کی پچاس سالہ جوبلی کا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایجی ٹیشن بھی بھلایا نہیں جا سکتا؛ جبکہ مولوی صاحب اردو کی فریاد لے کر پیدل اسمبلی گئے تھے۔ اس وقت کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ مرحوم اسمبلی کے گیٹ پر مولوی صاحب کے استقبال کو موجود تھے۔ اس روز کراچی میں مکمل ہڑتال تھی۔ سارے معاملات بند، سارا کاروبار معطل تھا۔ اور مولوی صاحب کے پیچھے اخباری اطلاع کے بموجب ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔

اس موقع پر یہ سمجھنا نہ چاہیئے کہ انجمن کو مستقل طور پر آسودگی نصیب ہو گئی تھی۔ ہمیشہ سرد و گرم کا سامنا رہا؛ چنانچہ ۱۹۵۱ء کے ابتدائی زمانے میں انجمن کی حالت بڑی سقیم ہو گئی۔ حکومت نے امداد بند کر دی تھی۔ مولوی صاحب سخت پریشان تھے۔ آخر انہوں نے کارکنان انجمن کے نام ایک نوٹس جاری کیا؛ جس میں انجمن

کامالی موقف بیان کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ اب آپ کی خدمات کی انجمن کو ضرورت نہیں رہی۔ جب انجمن اس قابل ہوگی۔ آپ کو تکلیف دی جائے گی۔ مولوی صاحب نے خود اپنے قلم سے اس نوٹس کی تین چار نقلیں کیں، ان میں سے ایک نوٹس اب تک میرے پاس موجود ہے۔ جس پر مولوی صاحب کے دستخط کے نیچے ۲۰ر فروری ۱۹۵۱ء درج ہے۔ اس نوٹس کے متعلق میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ یہ حکومت کو ایک طنز آمیز دھمکی تھی۔

۱۹۵۲ء کا زمانہ تھا۔ "چند ہم عصر" کے چوتھے ایڈیشن کے چھاپنے کی نوبت آئی۔ اس وقت چوں کہ قاضی احمد میاں صاحب اختر مرحوم سندھ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اسلامیات ہو کر چلے گئے تھے۔ اس لئے اس کی ترتیب کا اعزاز مجھے بخشا گیا۔ میں نے یہ کام شروع کر دیا۔ مولوی محمد ریاضی صاحب انجمن کی جوبلی کی تقریبات میں شرکت کے لئے حیدرآباد (دکن) سے آکر کچھ دن کے لئے مولوی صاحب کے مہمان کی حیثیت سے رک گئے تھے۔ انھوں نے بھی ترتیب کے کے سلسلہ میں کچھ مشورے دیئے اور مولوی صاحب کے کچھ ایسے مضامین کی نشان دہی بھی کی جو واقعی چند ہم عصر میں شامل ہونے کے قابل تھے۔ میں نے مولوی صاحب کی اجازت سے ان مضامین کو نقل کر کے کاتب کو دے دیا۔ ایک مضمون "پروفیسر ری ہرٹ سک" تو خود مولوی صاحب نے نظر ثانی کے ساتھ نقل کر کے دیا تھا۔ اسی دوران میں مولوی صاحب کوئٹہ تشریف لے گئے طے یہ ہوا کہ کاپیاں تو میں پڑھوں گا۔ اور پروف مولوی صاحب کے پاس بذریعہ ڈاک کوئٹہ بھیجے جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب مجھ سے زیادہ کتابت کی غلطیاں نکالتے تھے۔ کتاب ابھی تک طباعت ہی کی منزل میں تھی کہ مولوی صاحب کوئٹہ سے کراچی واپس ہو گئے۔ اب چند ہم عصر کی طباعت کے آخری مرحلے پر ایک روز مولوی صاحب نے مجھ سے دریافت فرمایا۔ کیا چند ہم عصر اسی طرح چھاپ دو گے؟ میں نے عرض کیا۔ کس طرح۔ کہنے لگے۔ ارے بھئی ناشرین جس طرح کتاب کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں، اس طرح اس کتاب پر بھی ہونا چاہیئے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ نیا ایڈیشن پرانے ...... یشنوں سے کس حد تک مختلف ہے۔ اور اس میں کیا کیا۔ اضافے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا، کس سے لکھواؤں؟ کہا۔ تم لکھو۔

تب تو میں سمجھا مولوی صاحب مذاق کر رہے ہیں۔ تاہم میں نے عرض کیا۔ بھلا مولوی صاحب آپ کے اور آپ کی کتاب کے بارے میں میں کیا قلم اٹھا سکتا ہوں۔ لیکن مولوی صاحب بہ اصرار کہنے لگے۔ جیسا کچھ لکھ سکتے ہو۔ لکھو اور مجھے دکھالو۔

میں اپنی جگہ پر آیا۔ اور سنبھل سنبھل کر دو صفحات پر مشتمل ایک دیباچہ لکھا۔ خود جانے کی ہمت نہ ہوئی، سوچ رہا تھا کیا کروں، اتنے میں تمنائی صاحب آگئے۔ میں نے انہیں صورت حال بتا دی۔ وہ میرا دیباچہ لے کر مولوی صاحب کے پاس گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آئے۔ اور کہا مولوی صاحب کہہ رہے ہیں۔ نیچے دیباچہ لکھنے والا کا نام لکھوالاؤ۔ میں نے اپنا نام اور تاریخ لکھ دی۔ تمنائی صاحب کوئی آدھے گھنٹے بعد نیچے آئے۔ اور وہ دیباچہ مجھے دکھایا۔ میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب نے ایک جگہ ایک پوری سطر کو کاٹ کر پھر صاد کر دیا ہے۔ اسی

سطر کے نیچے میں نے ایک لفظ "بدرجہ اتم" لکھا تھا، انہوں نے اسے کاٹ کر "بدرجۂ کمال" بنا دیا۔ پھر یہ دیباچہ تمنائی صاحب انجمن پریس لے گئے؛ جب کتاب چھپ کر آئی۔ تو اس میں یہ دیباچہ شامل تھا۔

یہ بظاہر ایک معمولی سا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مولوی صاحب کی بڑائی پوری طرح ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ایک ایسا شخص جس کا ملک کے اہل علم احترام کرتے ہوں، اور مستند اہل قلم اپنی کتاب پر اس کی رائے کے خواہش مند رہتے ہوں؛ ایسے شخص کا مجھ جیسے نوآموز اور بے استعداد شخص کو یہ حکم دینا کہ تم میری کتاب پر دیباچہ لکھ دو، یہ بہت بڑے ظرف کی بات ہے۔

دراصل مولوی صاحب علمی معاملات میں چھوٹے بڑے کے قائل ہی نہ تھے۔ دوسروں کی عزت کرتے تھے؛ لیکن اپنی عظمت کا انہیں کوئی احساس ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے چھوٹے آدمی (جو کسی غرض سے ان کے قریب ہوتے رہے ہیں) بڑے آدمی بن کر نکلے۔ اور کمال یہ ہے کہ مولوی صاحب کی برائی بھی کرتے رہے۔

۱۹۵۴ء کے وسط میں میں تین ماہ کی چھٹی لے کر، حیدرآباد (دکن) گیا۔ اتفاق سے وہاں زیادہ دن رُک جانا پڑا۔ میں نے وہاں سے رخصت میں توسیع کی درخواست بھیجی لیکن اس وقت کے مددگار معتمد کا مراسلہ ملا کہ چونکہ انجمن کی مالی حالت نازک ہے، اس لئے آپ کی خدمت تخفیف میں آگئی۔

جنوری ۱۹۵۵ء کے شروع میں میں کراچی واپس آیا؛ سیدھا انجمن کے دفتر پہنچا؛ یہاں کے حالات دگرگوں تھے۔ حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب آج کل ایک خاص شخص کے زیر اثر ہیں۔ اور پوری مجلس نظار مولوی صاحب کی مخالف ہے۔ اور سید ہاشمی صاحب انجمن چھوڑ کر لاہور چلے گئے ہیں۔ تاہم میں مولوی صاحب سے ملا، ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اپنی ملازمت کا ذکر کیا تو کہا۔ ہاں، ہاں آجانا، پھر ایک درخواست دے دو۔ دوبارہ تمہارا تقرر کر لیا جائے گا۔ اتنے میں "شخص مذکور" آگئے۔ مجھے مولوی صاحب کے پاس بیٹھا دیکھا تو ان کا چہرہ فق ہوگیا۔ اس وقت وہ صاحب انجمن کے شریک معتمد (جوائنٹ سیکرٹری) تھے۔

بیسیوں مرتبہ میں مولوی صاحب سے ملا، اور ملازمت کی درخواست کی، اور ہر دفعہ وہ ملازم رکھنے پر آمادہ نظر آتے، لیکن "شخص مذکورہ" نہیں چاہتا تھا کہ پرانے آدمیوں میں سے انجمن میں کوئی آئے۔ پھر تو میں انجمن کی ملازمت سے بالکل ہی ناامید ہوگیا۔

۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۸ء تک انجمن ایسے ہی کچھ انتشار کا شکار رہی۔ انجمن کے سارے کاروبار معطل ہوگئے۔ اور کتب خانے سر بہ مہر کر دیئے گئے۔ اب مولوی صاحب اپنی رہائش گاہ میں اکیلے رہ گئے۔ ایک مدت تک اہل ملک اپنے بابائے اردو سے بالکل بے خبر رہے، اخبارات میں بھی مولوی صاحب یا انجمن سے متعلق کوئی اطلاع نہیں چھپی۔

اب مولوی صاحب کے پاس صرف ابن انشا اور ۔۔۔۔۔۔ جایا کرتے تھے۔ میں بھی کبھی کبھی — جاتا۔ انجمن کا طباعتی پروگرام اور رسائل تو بند ہو گئے تھے۔ لیکن ایک قومی زبان تھا جو مولوی صاحب کی نگرانی میں جاری رہا۔

جب حالات انتہا کو پہنچ گئے۔ اور مولوی صاحب کی کس مپرسی دیکھ کر جی امڈ آنے لگا۔ تو ابن انشا سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے لیل و نہار میں ایک مضمون لکھا۔ جس میں مولوی صاحب کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے مولوی صاحب کی حالت زار کا نقشہ کھینچ دیا۔ اب کیا تھا، قوم چونکی، اخبارات میں مولوی صاحب کی تائید میں بیانات اور اداریے چھپنے لگے۔ اس کے چند ہی ہفتے بعد لیل و نہار نے ایک پورا "عبدالحق نمبر" نکال دیا۔ جس کے سرورق پر مولوی صاحب کی نہایت دیدہ زیب قلمی سہ رنگا تصویر بھی چھپی تھی۔

عبدالرؤف عروج "نیا راہی" میں کام کرتے تھے: انہوں نے بھی ایک عبدالحق نمبر نکال دیا۔ مولوی صاحب کا مخالف گروپ ایک پروپیگنڈہ یہ بھی کر رہا تھا کہ بابائے اردو دراصل اردو اور انجمن ترقی اردو کے حق میں نہایت غیر مخلص ہیں۔ یہ عجیب بے عقلی کی بات تھی۔ میں نے ایک مضمون "مولوی عبدالحق اپنے خطوط کے آئینے میں" لکھا جو نیا راہی کے عبدالحق نمبر میں چھپا۔ جس میں میں نے ثابت کیا تھا کہ مولوی صاحب کی اصل کمزوری ہی اردو اور انجمن ترقی اردو ہے۔

ان تمام واقعات کے رونما ہونے تک ۱۹۵۸ء ختم ہو گیا۔ ۱۹۵۹ء کے ماہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں میں ہندوستان چلا گیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ ڈھائی سال تک میں کراچی واپس نہ ہو سکا۔

ہندوستان ہی میں مجھے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ، صدر مملکت نے انجمن کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور مجلس نظمار کو ختم کر کے انجمن مولوی صاحب کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اس خبر سے مجھے بڑی تسکین ہوئی۔ اخبار وں اور رسالوں کے ذریعہ مولوی صاحب کے متعلق جو اطلاعات ملتی تھیں وہ کافی طمانیت بخش تھیں۔ کبھی کبھی ان کی علالت کی خبریں بھی نظر سے گزرتیں، جو میرے لئے تشویش کا باعث ہوتیں۔

پورے ڈھائی سال بعد ۵ اگست ۱۹۶۱ء کو میں کراچی واپس ہوا۔ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب سخت علیل ہیں، پھر دو تین دن بعد یہ اطلاع ملی کہ حالت چونکہ نازک ہے۔ اس لئے صدر ایوب نے اپنے طبیب خاص سے علاج کروانے کے لئے مولوی صاحب کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔ پھر چند روز بعد سننے میں آیا کہ چونکہ مولوی صاحب کے مرض میں افاقے کی کوئی صورت نہیں، لہذا انہیں کراچی واپس لا کر جنرل ہسپتال میں رکھ گیا ہے۔ ہر روز اخبارات میں پریشان کن خبریں ہی شائع ہوتی رہیں: ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کی منحوس صبح کو آخر یہ خبر پڑھی کہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق انتقال فرما گئے۔

مولوی صاحب کی تجہیز و تکفین کے بعد میں نے گھر آ کر سلیمان اریب (ایڈیٹر، رسالہ صبا، حیدرآباد دکن)

کو ایک طویل خط لکھا، جس میں مولوی صاحب کی میت کا آنکھوں دیکھا حال اور ان کی شخصیت پر اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار تھا۔ سلیمان اریب نے میرے اس خط کو جوں کا توں اگست کے بعد کے شمارہ "صبا" میں شائع کر دیا۔

یہ تھے مولوی عبدالحق جنہیں میں تقریباً تیس سال سے جانتا تھا۔ ان سے زیادہ دن قریب نہ رہنے کے باوجود ان کی عالمانہ شخصیت کا مجھ پر بڑا گہرا اثر پڑا۔

مولوی صاحب کتنے بڑے ادیب تھے۔ تنقید و تحقیق میں ان کا کیا درجہ تھا۔ اردو کی انہوں نے کیا خدمت کی ہے: اس کی تفصیل بتانے کا اس مضمون میں کوئی موقع نہیں۔ البتہ صرف اتنا ضرور کہوں گا کہ اس زمانے میں اگر لفظ "عظیم" کی اتنی مٹی پلید نہ ہو گئی ہوتی میں کہتا۔ مولوی عبدالحق ایک عظیم انسان تھے۔

بعض لوگ اُن پر مختلف قسم کے الزام لگاتے ہیں۔ الزامات کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اس لئے میں ان سب کو دہرانے سے قاصر ہوں۔ صرف اتنا ہی کہوں گا کہ الزام لگانے والوں نے حق و انصاف سے کام نہیں لیا۔ اور موقع کی مناسبت سے جھوٹے الزام تراشے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب نہایت سیدھے آدمی تھے اور مصلحت اور ریاکاری سے بہت دور تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی طرف سے لوگوں کو کچھ شکایتیں پیدا ہو جاتی تھیں، لوگ سمجھتے تھے کہ مولوی صاحب نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا جو مقصد بنالیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اور سوچتے ہی نہ تھے۔ ایسا شخص دنیاداروں کو کس طرح خوش رکھ سکتا تھا یہ کسی نے سنجیدگی سے نہیں سوچا۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ پہلی دفعہ میں مولوی صاحب کی بے جان تصویر سے ملا تھا۔ آخری دفعہ ان کے جسدِ مردہ سے ملاقات ہوئی۔

اس میں شک نہیں مولوی صاحب کی طبیعت میں چڑچڑاپن اور مزاج میں درشتگی بہت زیادہ تھی، لیکن ان کی کوئی بات مجھ جیسے نیاز مندوں کو بُری نہ لگتی۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا کہ ہمارا کوئی انتہائی مخلص بزرگ ہم پر برس رہا ہے۔ میں ان کے چڑچڑے پن سے بہت گھبراتا تھا، اور کوشش کرتا کہ دفتر کے کسی کام کے سلسلہ میں ان کا سامنا نہ ہو۔ لیکن کبھی نہ کبھی سامنا ہو ہی جاتا۔ ایک دفعہ عجیب واقعہ ہوا کہ، انجمن کے سلسلۂ مطبوعات میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب "روایت کی اہمیت" چھپی تھی۔ مولوی صاحب ظاہر ہے بعض معاملات میں قدامت پسند تھے۔ اور عبادت صاحب ہر معاملہ میں "جدیدیت" کے قائل ہیں۔ انہیں دنوں عبادت صاحب کراچی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مولوی صاحب سے اپنی کتاب کے لئے گرد پوش (ڈسٹ کور) کا ذکر کیا۔ مولوی صاحب نے سنی ان سنی کر دی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عبادت بریلوی گرد پوش کے انتہائی خواہش مند تھے۔ چنانچہ لاہور جاکر کسی آرٹسٹ سے ڈیزائن تیار کروایا۔ اور مطبوعات انجمن کے سول ایجنٹ کے مشورے سے بلاک بنوا کر گرد پوش چھپوالیا۔ میں ایک روز دفتر کے بعد گھر جاتے ہوئے سول ایجنٹ کے شوروم گیا۔ وہاں دیکھا "روایت کی اہمیت" کا گرد پوش چھپ کر لاہور سے آگیا ہے مجھے یہ

گردپوش نہایت بھلا لگا۔ زمین اس کی کتھئی رنگ کی تھی۔ اس پر سفید خطوط میں ایک بے منڈی کی عورت یا اسی قسم کی کسی ڈراؤنی شکل کی عورت کی شبیہ ظاہر کی گئی تھی۔ دراصل یہ تجریدی آرٹ کا ایک نمونہ تھا۔ بہرحال میں وہ گردپوش لے کر بھاگا بھاگا ہوا۔ انجمن پہنچا۔ مولوی صاحب اس وقت کتب خانۂ خاص میں مصروف مطالعہ تھے۔ مجھے جو دیکھا، پوچھا۔ تم ابھی گئے نہیں؟ میں نے عرض کیا۔ گیا تو تھا۔ لیکن آپ کو یہ گردپوش دکھانے آیا ہوں مولوی صاحب نے میرے ہاتھ سے وہ گردپوش لے لیا۔ جیسے ہی اسے دیکھا، ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ گردپوش کو فرش پر پھینک کر نہایت درشت لہجے میں بولے ——— "کیا روایت ایسی بھونڈی شکل کی ہوتی ہے؟ تم سے کس نے کہا تھا کہ یہ واہیات کام کرو۔ کیا انجمن کو بدنام کروگے؟" اب میں کہتا ہی رہ گیا کہ اس گردپوش کی تجویز اور تیاری سے میرا کوئی تعلق نہیں، لیکن مولوی صاحب میری بات سنتے ہی نہ تھے۔ اپنی ہی کہے جاتے تھے۔ اور ان کی برہمی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ان کو اسی حالات میں چھوڑ کر میں بھاگ آیا۔ پھر کئی روز تک انھیں منہ نہ دکھایا۔ دوسرے روز سول ایجنٹ کو ٹیلی فون کے ذریعہ مولوی صاحب کی طرف سے یہ ہدایت دی گئی کہ روایت کی اہمیت کا گردپوش استعمال نہ کیا جائے۔ (لیکن اس کے باوجود گردپوش کے ساتھ چوری چوری کتاب بکتی رہی) اب کبھی کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ "مکروہ شکل" مولوی صاحب کے سامنے لائے۔ لیکن آخر وقت تک مولوی صاحب یہی سمجھتے رہے کہ یہ سب کچھ کیا دھرا میرا ہی تھا۔

مولوی صاحب کی بیسیوں خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ شخصیت پرستی کے سخت خلاف تھے وہ اچھے اور نیک آدمیوں کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت ضرور کرتے تھے، لیکن ان کا خیال تھا کہ ایسی شخصیت پرستی انتہائی نقصان رساں ہے۔ جس میں احساس کمتری کا جذبہ شامل ہو۔ نام و نمود کو بھی وہ لغو چیز سمجھتے تھے۔ وہ صرف کام کو اہمیت دیتے۔ وہ کہتے تھے کہ پہلے کام کرو، اس کے بعد غلط یا صحیح کا معیار قائم کرو۔

میرے سامنے کئی ایسے اشخاص آئے۔ جنہوں نے مولوی صاحب پر کوئی مضمون یا کتاب لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مولوی صاحب برا سا منہ بنا لیتے، اور کہتے، بھئی، اس کے بجائے تم ڈاک کے ٹکٹ یا پرانے سکے کیوں نہیں جمع کرتے اگر کچھ لکھنے پڑھنے کا شوق ہے تو اردو پر لکھو، کام کرنا چاہتے ہو تو انجمن کے لئے کچھ کرو۔

جو لوگ مولوی صاحب کی اس کمزوری سے واقف ہوگئے تھے، وہ اردو اور انجمن کے لئے کام کا ڈھونگ رچا کر کافی فائدہ اٹھاتے تھے۔

حیرت ہوتی ہے کہ حیدرآباد جیسی ریاست میں عمر کا طویل حصہ گزارنے کے باوجود مولوی صاحب نے توڑ جوڑ، سازش اور فریب کاری کا گر نہیں سیکھا تھا۔ جب تک حیدرآباد میں رہے۔ کسی بڑے سے بڑے آدمی سے بھی نہیں دبے۔ بلکہ سب پر ان کا رعب جمارہا۔ ہندوستان اور پاکستان کے بھی کسی بڑے آدمی کے سامنے انہیں کسی نے

حدکا ہوا۔ نہیں دیکھا۔ البتہ انجمن کے لئے چندہ وصول کرنے کے معاملے میں وہ بہت چھوٹے آدمی بن جاتے تھے۔ کم سواد سرمایہ داروں اور کمتر درجے کے آدمی کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہوئے ہرگز نہیں شرماتے تھے۔

اگر کوئی شخص اردو کے لئے غیر مخلص یا انجمن کے لئے بے فیض پایا جاتا تو اس کو مولوی صاحب پورے ملک اور پوری قوم کا دشمن سمجھتے تھے۔ اکثر حیدرآبادی جو کبھی "وابستۂ دامان آصفیہ" ہونے پر فخر کرتے تھے اپنے سابق شاہ ذیجاہ قدر قدرت بندگانعالی کو صرف "نظام" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب آخر وقت تک اپنی تحریروں اور تقریروں میں اعلیٰ حضرت حضور نظام" کہتے رہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مولوی صاحب حضور نظام کی جاہ و ثروت اور ان کی بادشاہت سے مرعوب تھے۔ بلکہ ان کے دل میں سابق والئ حیدرآباد کی محض اس لئے عزت تھی کہ ان کے عہد میں ریاست میں علم و فن کو ترقی ہوئی۔ اور سب سے قابل قدر کام یہ ہوا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھی۔

مولوی صاحب کا پھکڑ پن اور ان کی برجستہ گوئی اور مزاح آمیز جملے بازی بہت مشہور تھی۔ لیکن میں نے کسی کو مولوی صاحب پر جملے کستے ہوئے نہیں سنا۔ البتہ عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم ہی ایک ایسے شخص تھے۔ جو نیچے ہی سے بلند آواز میں مولوی صاحب کو بری بری گالیاں دیتے ہوئے اوپر جاتے تھے اور مولوی صاحب بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے۔ یہ بھی عجب سماں ہوتا تھا! تعجب ہوتا تھا کہ مولوی صاحب کو بھی گالی دینے والا کوئی شخص اس دنیا میں موجود ہے۔

مولوی صاحب کے طنز اور مزاح کا ایک دلچسپ واقعہ سنیئے۔ ۱۹۵۱ء کی اردو کانفرنس کا افتتاح مرحوم گورنر جنرل غلام محمد نے کیا تھا۔ اور صدارت سردار عبدالرب نشتر کی تھی۔ (اس زمانے میں مرحوم نشتر پنجاب کے گورنر تھے۔) غلام محمد اس وقت مفلوج ہو چکے تھے۔ کانفرنس کے افتتاح کے روز جب وہ اپنی کار سے اترے تو بمشکل دو آدمیوں کے سہارے اپنی نشست تک آسکے تھے۔

دوسرے روز نواب صاحب بھاولپور نے علمی نمائش کا افتتاح کیا۔ افتتاح کے بعد مولوی صاحب جب ہال سے باہر نکلنے لگے۔ ایک جگہ سیڑھیاں تھیں۔ جن پر سے اترنے کے لئے احتیاط لازمی تھی۔ اس لئے مولوی صاحب کا ایک بازو سردار نشتر نے تھام لیا۔ دوسرا بازو اے۔ ڈی۔ نقوی تھامے ہوئے تھے۔ اس وقت مولوی صاحب کو پچھلی شب کا وہ سماں یاد آگیا۔ جبکہ غلام محمد مرحوم کو دو آدمی سہارا دیتے ہوئے۔ ڈائس پر لائے تھے۔ مولوی صاحب بیچ کی سیڑھی پر تن کر کھڑے ہو گئے۔ اور گردن کو بھی اونچا کیا۔ کہنے لگے۔ "او ہو! اب تو میں گورنر جنرل ہو گیا"۔ نقوی صاحب اور نشتر صاحب بری طرح ہنس پڑے۔ اور راستہ چلتے ہوئے دیر تک ہنستے رہے۔

بشیر نیاز

ایک انٹرویو

باباۓ اُردو سے ایک ملاقات اسلامیہ کالج میں ہوئی، وہ مدعو کئے گئے تھے، میں طالب علم تھا۔ میں نے انھیں دُور سے دیکھ

دوسری ملاقات اُن سے اُردو کالج میں ہوئی۔

یکم ستمبر ۶۰ء کی سہ پہر کا ذکر ہے۔ اُردو روڈ والے اُردو کالج کے اندر انجمن ترقی اُردو کی بالائی منزل میں باباۓ اُردو ایک لمبے سے کمرے میں ایک بڑے سے پلنگ پر سینے سے گھٹنے لگائے بیٹھے تھے، جیسے وہ کہیں اور چلے گئے ہوں، اور اُن کا ہمزاد پڑا ہو۔ اس شخص کو جو اُردو کے اچھے دن دیکھنے کے لئے زندہ تھا، بہ ایں حالت دیکھ کر کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ کچھ ایسے جیسے ایک نوجوان آدمی کو عاقبت یاد دلادی جائے۔

اور اُن کے اردگرد کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ اور ان کتابوں کے بیچ میں وہ خود بھی ایک کتاب سے پڑے تھے۔ جس کا گرد پوش ایک سفید سا کرتہ پاجامہ ہو۔ یہ کتاب اردگرد کی ان ساری کتابوں پر بھاری تھی۔ وہ کئی ادبی تحریکوں کا تذکرہ تھی ... ادبی افکار کا مخزن ۔ اب اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں؛

وہ بے حد نحیف تھے، اور اس کان پر شدید لقوے کا اثر بھی تھا۔ میں اس سے قبل انھیں اسلامیہ کالج کے اجلاس میں یہ کہتے سن چکا تھا۔

"اگر اُردو کو اس کا مقام مل جائے تو میں ایک بار پھر جوان ہو جاؤں گا"

اس وقت جب میں اُن سے ملنے گیا تو وہ میری آمد سے بے خبر رہے۔ خاموش۔ میں نے بہت قریب جاکے انھیں مخاطب کیا۔ قبر کی سی یا کسی تہ خانے کی سی سرد خاموشی ٹوٹ گئی۔

"باباجی!" میں نے کہا۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ مجھے اس طرح محسوس ہوا جیسے مجھے ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ "آپ لیٹے رہئے۔" میں نے کہا۔

مگر انھوں نے پرواہ نہ کی۔ جیسے یہ اُن کے لئے کوئی بہت سخت ناقابل عمل بات ہو۔

اور وہ پلنگ سے اُٹھ کر سیدھے کرسی تک چلے آئے۔ جو دیوار کے ساتھ بچھی تھی، اور کہنے لگے۔
"کہئے۔ کیا بات ہے؟" میں ایک اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
میں نے کہا۔ "میں ان دنوں چند ادیبوں سے انٹرویو کر رہا ہوں۔ اسی سلسلے میں آپ سے باتیں کرنے حاضر ہوا ہوں۔ لیکن مجھے اب احساس ہوا ہے کہ میں نے آپ کو تکلیف دی ہے۔
ان کی آواز میں دبدبہ موجود تھا۔ وہ کہنے لگے۔
"میں اب بھی جوان ہو سکتا ہوں۔ اگر اُردو کو اس کا مقام مل جائے۔
میں نے سوال کیا۔
"ان دنوں آپ کا معمول کیا ہے۔ آپ کا وقت کس طرح کٹتا ہے؟"
کہنے لگے۔ "میں نے کچھ دن ہوئے آنکھ کا آپریشن کرایا ہے۔ بینائی پوری طرح واپس نہیں آئی۔ ڈاک میں جو خط وغیرہ آتے ہیں وہ پڑھوا کر سنتا ہوں اور اُن کے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ اس کے بعد مضامین کا املا کروا دیتا ہوں ــــ اس سے قبل یوں ہے کہ ٹھنڈے پانی سے نہاتا ہوں، اخبار پڑھواتا ہوں ناشتہ کرتا ہوں۔ کتابیں جو آتی ہیں وہ پڑھوا کر سنتا ہوں۔ پھر کچھ لوگ آ جاتے ہیں تو اُن سے ملاقات کر لیتا ہوں۔ اس کے علاوہ معمول یہ ہے کہ برنس گارڈن ٹہلنے کے لئے جاتا ہوں۔ اب کچھ دنوں سے تعطل پڑا ہوا ہے۔ اب بھی ارادہ ہے کہ اس معمول کو دوبارہ شروع کروں۔"
میں نے پوچھا۔ "اردو کا فروغ اور اردو یونیورسٹی کا قیام جو آپ کی زندگی کا خواب ہے۔ وہ ان دنوں کس مرحلے میں ہے اور اس کے لئے آپ ان دنوں جذباتی طور پر کیسا محسوس کر رہے ہیں؟"
بابائے اُردو نے فرمایا۔ "میری ذات کچھ بھی نہیں۔ میں بھی کچھ نہیں، بس اُردو یونیورسٹی ہی سب کچھ ہے ــــ ابتک ایسا تھا کہ انجمن ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی جو نااہل بھی تھے اور اُن کو علم و ادب سے دلچسپی بھی نہیں تھی ... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روپیہ بھی ضائع ہوا۔ اور کوئی کام بھی نہیں ہوا ... میں نے صدر کو لکھا، انھوں نے سب کو برخاست کر کے ایک بورڈ بنا دیا ہے۔ کچھ تجاویز صدر کے سامنے ہیں۔ انجمن کی جدید تنظیم ہوگی، اس کے بعد انجمن کام شروع کرے گی۔ میرے پاس اعلیٰ درجہ کی علمی ادبی کتابوں، اور علمی اصطلاحات کا ایک انبار موجود ہے۔ انجمن کی تنظیمِ جدید کے بعد میں ان سب کی اشاعت کا انتظام کروں گا۔"
میں نے بابائے اردو سے سوال کیا۔
"باباجی ــ یہ بتائیے۔ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس کی ادبی اقدار کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے۔؟ ادبی معاملات میں ان دنوں جو کچھ ہو رہا ہے کیا آپ اس کی ترقی کے قائل ہیں۔؟"
باباجی کہنے لگے ــ
"ادبی اعتبار سے یہ دور خوب ہے۔ مگر لسانی اعتبار سے یہ دور خوب نہیں۔ ایک بات یاد رکھئے۔ اگر کسی زبان

کا ادب رہے، مگر زبان نہ رہے، تو اس کا کیا فائدہ ــ اس دور کا فائدہ تو جب تھا کہ تمام اسکولوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہوتا ــــ میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ دور لسانی زوال کا دور ہے۔

میں نے پوچھا۔ " تو اس دور میں جو ادب تخلیق کیا جا رہا ہے، اس کی کوئی افادیت نہیں ہے ۔؟

باباجی نے کہا۔

" وہ ادب جو لسانی ترقی سے خالی ہو وہ ادب نہیں اور نہ اس کا کوئی مقام ہے ۔ وہ کبھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ لفظ زبان میں اپنے افادے کی رو سے یا اپنی قوت سے آتا ہے ۔ خود نہیں لایا جاتا ۔

اس زمانے میں دو جریدوں "نقش" اور "نقوش" میں جھگڑا چلا ہوا تھا، جس میں "نقوش" کو اس بات کی شکایت تھی کہ نقش اس کے مضامین بغیر اجازت لئے چھاپ دیتا ہے ۔ اس تنازعے کے حوالے سے میں نے باباجی سے پوچھا

باباجی ۔ ان دونوں نقش اور نقوش میں جو جھگڑا چل رہا ہے، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

باباجی نے کہا۔ ان کے مابین جھگڑا کیا ہے ؟

میں نے جھگڑے کی مختصر کیفیت بیان کی۔ باباجی نے کہا ۔

" ڈائجسٹ یہ نہیں ہوتا کہ ایک پرچہ دوسرے پرچے کے مضامین چھاپ لے ۔ ڈائجسٹ سب لباب ہوتا ہے، پورا مضمون نہیں ہوتا ۔ لندن سے ایک پرچہ آیا کرتا تھا۔ "ریویو آف ریویوز" یہ مضامین کا خلاصہ یا لب لباب دیا کرتا تھا، اور بہت مقبول ہوا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد اگر انہی مضامین کو تفصیل سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی تو لوگ اصل منگا کر پڑھ لیتے تھے لیکن یہ اس طرح ایک پرچے سے دوسرے مضامین چھپ جانے پر یہ لوگ برا کیوں مانتے ہیں، اس سے تو ان لوگوں کا پروپیگنڈا ہی ہوتا ہے، اور اُردو کا بھلا بھی "

میری یہ مختصر سی ملاقات تھوڑی دیر تک رہی اور میں انہیں زیادہ زحمت نہ دینے کے خیال سے چلا آیا ۔

عوام کی زبان

عوام کی زبان بمنزل قلب کے ہے۔ جس سے تمام اعضاء کو خون پہنچتا رہتا ہے۔ اور اُن کی تقویت کا باعث ہوتا ہے جب تک زبان کو عوام کی بولی سے مدد ملتی رہتی ہے۔ اور وہ عوام کی بولی کا ساتھ دیتی رہتی ہے۔ وہ زندہ رہتی اور پھلتی پھولتی رہتی ہے۔ اور جس وقت سے اس کا تعلق عوام کی بولی سے ختم ہو جاتا ہے۔ تو اسی وقت سے اس مردنی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔

خطبات مقالات

سخاوت مرزا

بابائے اردو اور مولوی محمد عمر یافعی کے مراسم

ابو محمد عمر یافعی ابن صلاح بن یحیٰ عرب نژاد تھے۔ ان کے جد امجد یحیٰ بن عبد الحبیب حضر موت سے نواب ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم (۱۲۴۴ھ/۱۲۷۳ھ) کے عہد حکومت میں وارد حیدرآباد ہوئے۔ نواب سراج الملک اور نواب سر سالار جنگ اول (متوفی ۱۳۰۰ھ) جیسے مدبر، اور قدرشناس وزراء کی سرپرستی کی وجہ سے ان کو یہاں جمعیت عرب میں ملازمت مل گئی کچھ عرصہ بعد وطن جاکر اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے آئے اور حیدرآباد دکن میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

مولوی عمر یافعی مرحوم کے والد ماجد صلاح بن یحیٰ بن عبد الحبیب بھی جمعیت عرب میں ملازم تھے۔ تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں حیدرآباد ہی میں وفات پائی۔

مولوی عمر یافعی حیدرآباد میں ۲۳ رجون ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے یہیں نشو و نما پائی۔ مدرسہ نظامیہ میں علوم فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی اور جامعۂ پنجاب سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا اس کے بعد حیدرآباد کے مشہور فاضل و شاعر مولانا رضی الدین کیفی حیدرآبادی سے، علوم متداولہ میں مزید مہارت حاصل کی۔ ابتدا میں یہ بھی جمعیت عرب میں کچھ دنوں ملازم رہے۔ اُس کے بعد محکمۂ فنانس، صدر محاسبی، ریکارڈ آفس حیدرآباد میں بحیثیت ہیڈ کلرک خدمات انجام دیں۔ اور ۱۹۵۲ء میں وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں مولوی عبد الحق مرحوم کی دعوت پر پنجاہ سالہ جوبلی انجمن میں شرکت کے لئے گئے تھے واپسی کے بعد کئی سال تک بعارضہ جگر و ضعف اعصاب فریش رہے اور ۱۹۶۱ء میں مولوی عبد الحق کی وفات کے ایک ہفتہ بعد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ دائرہ میر مومن کے متصل قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ ان کے بھانجے عفیف یافعی بی۔ اے اور حسین یافعی منشی فاضل موجود ہیں۔

یافعی مرحوم اعلیٰ علمی ذوق رکھتے تھے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ ان کا محبوب مشغلہ اہل علم اور ادیبوں کی صحبت، خصوصاً معیاری کتب قلمی اور مطبوعہ کی تلاش ان کا عمیق مطالعہ، اور نایاب کتب کی مختصر و جامع یادداشتیں مرتب کرنا تھا تقریباً آخر عمر تک جاری رہا۔ خط نستعلیق خوب لکھتے تھے ان کے مسودے صاف اور جاذب نظر ہوا کرتے تھے۔ سینکڑوں یادداشتیں لکھی ہوں گی۔ بعض میری نظر سے گزری ہیں ۱۹۴۷ء میں ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ جبکہ میرا مضمون سید شاہ کمال الدین کڑپوی کے دکنی دیوان پر رسالہ اردو میں شائع ہوا تھا اور وہ میری ملاقات کے متمنی تھے اس کے بعد مجھ سے اکثر ملاقات ہوتی رہی ان کا میرا ساتھ کوئی بیس اکیس سال تک رہا میرے تحقیقی مضامین ان کو پسند تھے۔ مولوی عبدالحق مرحوم سے میری تعریف کیا کرتے تھے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ افسوس کہ ایک مخلص دوست بچھڑ گیا۔

جہاں تک میرا خیال ہے مرحوم کی گفتگو سے پتہ چلا کہ مولوی صاحب مرحوم سے ان کے روابط جامعۂ عثمانیہ کی تاسیس ۱۹۱۷ء کے قبل سے تھے۔ اور اس زمانہ میں ۱۹۱۳ء انجمن ترقی اردو کا مستقر، حیدرآباد تھا پھر یہاں سے اورنگ آباد منتقل ہوگیا ـــــ مولوی عبدالحق ۱۹۱۷ء میں دارالترجمہ کے ناظم بھی تھے۔ اور یافعی صاحب کے استاد کیفی کا بھی دارالترجمہ سے تعلق تھا ــــ اس وقت عمر یافعی کی عمر کوئی پچیس چھبیس سال کی ہوگی ــــ مرحوم، مولوی رضی الدین کیفی کے خاص شاگرد تھے۔ جن کی صحبت کی وجہ سے ان کو حیدرآباد کے مشہور علماء ادبا اور شعراء مثلاً حکیم شمس اللہ قادری۔ صفی اورنگ آبادی، مولوی عبدالقیوم مولوی مرتضیٰ معتمد حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس۔ ملا عبدالباسط۔ مولوی جمال الدین لوزی۔ آغا حیدر حسن دہلوی۔ مولوی اکبر علی مدیر اخبار صحیفہ وغیرہ۔ کی علمی مجلسوں سے مستفید ہوئے اور معرکتہ الآرا مشاعروں میں شریک رہے جن میں ظہیر دہلوی اور سائل دہلوی بھی شریک تھے۔ ریکارڈ آفس حیدرآباد میں جہاں تاریخ ہند و دکن کا نادر و نایاب ذخیرہ ہے۔ ملازمت کی وجہ سے تاریخی معلومات میں خاص عبور پیدا ہوگیا تھا۔ جب یافعی مرحوم کے بعض قدیم رفقا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر عبدالقادر سروری۔ مولوی سید محمد ایم۔ اے، ڈاکٹر میر ولی الدین سید نصیر الدین ہاشمی، فارغ التحصیل ہوئے۔ اور شمس اللہ قادری کا اردوئے قدیم ڈاکٹر زور کی روح تنقید، اور نصیر الدین ہاشمی کی دکن میں اردو شائع ہوئی۔ تو ایک انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ قائم ہوئی جس کے ایک رکن نواب بہادر یار جنگ، اور مولوی عمر یافعی بھی تھے۔ ایک علمی و ادبی رسالہ مکتبہ انہیں اصحاب کی کوشش سے جاری ہوا۔ جس میں انجمن ترقی اردو کے مطبوعات پر بھی تنقید اور تبصرے شائع ہوا کرتے تھے۔ انتخاب کلام میر مرتبہ مولوی عبدالحق مرحوم پر بھی تنقید شائع ہوتی تھی جو یافعی مرحوم کے ایک شریک کار قطب الدین ناشی نے لکھی تھی! بیان کیا جاتا ہے کہ اسی سلسلہ میں مولوی عبدالحق ان سے کچھ کشیدہ خاطر ہوگئے تھے، پھر بعد میں مولوی

صاحب سے صفائی ہوگئی اور آخر دم تک مولوی صاحب مرحوم سے مخلصانہ تعلقات قائم رہے۔ یافعی مرحوم اور مولوی عبدالحق کا ساتھ تقریباً ۱۹۱۷ء تا ۱۹۶۱ء کوئی چالیس بیالیس سال تک رہا۔ عمر یافعی کو اردو کے قدیم سے دلچسپی، مولوی عبدالحق کے مضامین کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ چنانچہ یافعی مرحوم بعض مضامین مثلاً آٹھ ویں صدی ہجری کی نظم و نثر اردو کا نمونہ (معراج العاشقین) دیوان خاکی (دکنی) وغیرہ مجلہ مکتبہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئے ہیں۔ یافعی صاحب مرحوم مولوی عبدالحق صاحب کو فراہمی کتب قدیم میں بجید ہاتھ بٹاتے تھے حتیٰ کہ مرحوم نے اپنا بیش قیمت کتب خانہ انجمن ترقی اردو کی نذر کردیا تھا۔ نیز عمر یافعی صاحب نے ہزاروں اردو اصطلاحات کا ذخیرہ، محمد قاسم صاحب حیدرآبادی کے ذریعہ مولوی صاحب مرحوم کو بھجوایا تھا۔

یافعی مرحوم کئی مرتبہ مولوی عبدالحق مرحوم کی دعوت پر اورنگ آباد بھی گئے تھے۔ ایک مرتبہ اورنگ آباد میں ایک مشاعرہ انجمن کی طرف سے منعقد ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے یافعی صاحب کو بلوایا اور یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ اپنے دوست صفی اورنگ آبادی کو ضرور لیتے آنا۔ یہ مشاعرہ نہایت کامیاب رہا۔ صفی صاحب کا کلام مولوی صاحب مرحوم کو بہت پسند آیا۔ اور بار بار پڑھوایا۔

تقسیم ہند سے قبل مولوی صاحب مرحوم ایک مرتبہ دہلی سے اورنگ آباد تشریف لے گئے تھے۔ مولوی صاحب نے یافعی صاحب کو اورنگ آباد بلوایا خاص مقصد یہ تھا کہ انجمن ترقی اردو کے لئے کچھ نئی تالیفات و تصنیفات غیر مطبوعہ فراہم کئے جائیں۔ بہرحال کچھ تالیفات و تصنیفات وغیرہ مولوی صاحب مرحوم ہمراہ لے گئے تھے۔

مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۵۳ء میں انجمن کی پنجاہ سالہ جوبلی منائی تو مولوی عمر یافعی کو بھی خاص طور پر غرض شرکت کراچی آنیکی دعوت دی تھی۔ یافعی صاحب کراچی تشریف لے گئے۔ مولوی صاحب مرحوم خود یافعی صاحب کو لینے کے لئے بندرگاہ پر پہنچے! اپنا خصوصی مہمان رکھا اور اپنے ساتھ ہم طعامی اور ہم نشینی کا شرف عطا فرمایا اور ہر وقت ہر مجلس میں مولوی صاحب کے ساتھ رہے۔ جس کا ذکر مولوی یافعی مرحوم نے میرے موسومہ یک خط میں کیا ہے۔ فرمایا کہ مولوی صاحب کے ساتھ اس طرح رہنے کی وجہ سے بعض شوخ طبع اشخاص نے پھبتی بھی اڑائی کہ یہ مہمان کون ہیں ؟ جو ہمیشہ بابائے اردو کے ساتھ رہتے ہیں۔ معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ یہ چاچائے اردو ہیں۔ غرض یافعی صاحب مولوی صاحب مرحوم کے ساتھ کئی ماہ تک مہمان رہے اور مجبوراً رخصت ہوئے واپسی کے کچھ عرصہ بعد یافعی صاحب ایسے بیمار ہوئے کہ پھر جانبر نہ ہوسکے۔ جگر اور کمزوری اعصاب اور ضعف کمر کا عارضہ تھا کئی سال تک فریش رہے۔ اور بالآخر مولوی صاحب کی وفات کے ایک ہفتہ بعد ہی ۱۲ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور حیدرآباد کے مشہور اور قدیم قبرستان دائرہ میر مومن کے عقبی حصہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

زمانہ علالت میں مولوی صاحب مرحوم کو عمر یافعی صاحب کی کیفیت سے میں ہی اکثر اطلاع دیا کرتا تھا مولوی صاحب مرحوم ــــ میرے خطوط کے جواب میں جو الفاظ تحریر فرمایا کرتے تھے وہ مرحوم کے کمال خلوص و محبت پر دلالت کرتے ہیں۔ عمر یافعی صاحب کو انجمن کے ہنگاموں کا بڑا ملال تھا۔ کہا کرتے تھے کہ افسوس کہ مولوی صاحب کو کوئی اچھا رفیق کار نہیں ملا اور وہ پھر خود بھی کراچی آنے والے تھے، چنانچہ مولوی صاحب نے مجھکو تحریر فرمایا تھا کہ یافعی صاحب کے ساتھ آپ بھی ضرور آئیے، مگر یافعی مرحوم کو سخت علالت نے لاچار کر رکھا تھا (مگر ــــ ۱۲ر جولائی ۵۵ء) ایک دوسرے خط میں مولوی صاحب مرحوم نے مجھ کو لکھا کہ " یافعی صاحب کی علالت کا حال پڑھ کر مجھے بہت افسوس اور ملال ہوا۔ یہاں تو وہ خوب چلتے پھرتے تھے۔ وہاں جانے کے بعد یہ کیا ہو گیا۔ ملاقات ہو تو بہت بہت سلام کے بعد میری طرف سے مزاج پرسی کیجئے گا یہاں اکثر احباب ان کا حال پوچھتے رہتے ہیں "

(مکتوب ۲۰ر اپریل ۵۴ء)

مکتوب مورخہ ۸ر دسمبر ۵۴ء میں مولوی صاحب نے تحریر فرمایا کہ " یافعی صاحب کا ایک مدت سے خط نہیں آیا، ان کے احوال سے ضرور مطلع فرمائیے اب ان کی صحت کیسی ہے، ان کی صحت کے متعلق مجھے بیحد تشویش ہے "

مکتوب مورخہ ۷ر اپریل ۱۹۵۷ء میں مولوی صاحب نے تحریر فرمایا کہ " افسوس یافعی صاحب ابتک رو بصحت نہیں ہوئے۔ ان کی علالت کا سلسلہ ابتک جاری ہے۔ اس لئے مجھے بہت تشویش ہے "

غرض ۵۴ء سے لیکر ۱۹۵۸ء تک تقریباً ہر خط میں مولوی عمر یافعی مرحوم کی صحت کے متعلق مولوی صاحب مغفور نے افسوس اور تشویش کا اظہار فرمایا ہے۔

مکتوبات عبدالحق مرتبہ مولوی جلیل احمد قدوائی میں مولوی صاحب مرحوم کا صرف ایک مکتوب شائع ہوا ہے۔ عمر یافعی مرحوم کے اعزہ کے پاس مولوی صاحب کے بیسیوں مکتوبات محفوظ ہیں۔ جن سے ان کے باہمی تعلقات اور علمی و ادبی مراسلت پر روشنی پڑتی ہے۔

افسوس ہے کہ مولوی صاحب کا ایک مخلص دوست بھی مرحوم کی وفات کے چند ہی روز بعد چل بسا۔ جس نے سالہا سال مولوی صاحب کا ساتھ دیا تھا۔ اور بڑی علمی خدمت کی تھی۔

عمر یافعی مرحوم کی بعض تالیفات اور مقالے یادگار ہیں۔ یافعی مرحوم کی اردو نہایت شستہ اور رفتہ تھی۔ انداز بیان سلجھا ہوا ہوتا تھا۔ اور خطوط میں ظرافت کا عنصر بھی ہوتا تھا۔ میں نے اپنے نومولود لڑکے کا تاریخی نام نکالا اور لکھا کہ اس میں دو عدد کا اضافہ ہوتا ہے تو لکھا کہ " بہتر ہے اسے آئندہ کے لئے اٹھا رکھئے "۔ میں نے ایک مرتبہ ایک خانگی معاملہ میں مرزا فرحت اللہ بیگ سے سفارش کے لئے لکھا تھا تو تحریر فرمایا کہ " میاں فرحت مل گئے تھے۔ میں نے بھی ان سے کہا ہے، وعدہ تو کیا ہے۔ لیکن ایک ہندوستانی کے وعدہ کو ایک ہندوستانی ہی خوب جان سکتا ہے۔

ہم تو رہے ایک دکنی بھائی والسلام، عمر الیافعی ۸ر امرداد ۱۳۵۱ف (۱۹۴۵ء)

عمر یافعی نے مولانا حسرت موہانی کی طرح دکن کے اہم شعراء کے کلام کا انتخاب کا سلسلہ معہ حالات و تنقید شروع کیا تھا چنانچہ شفیق اورنگ آبادی۔ محمد صدیق ہشیر علی خاں ایمان، ہمت حیدر آبادی بخن اورنگ آبادی وغیرہ رسالہ مکتبہ حیدر آباد میں شائع ہو چکے ہیں۔ تذکرہ جات شعراء مصحفی پر بھی ایک مضمون لکھا تھا اور بیان کیا جاتا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کے حوالہ کیا تھا۔ نیز بعض تراجم بھی فارسی سے کئے تھے مثلاً ملفوظ شاہ مسافر اورنگ آبادی... (معاصر عالمگیر) ترجمہ تاریخ گلستان بیجاپور، ترتیب دیوان کیفی حیدر آبادی (استاد خود) دیوان صفی اورنگ آبادی وغیرہ۔ گل رعنا شفیق اورنگ آبادی پھر ہند و شعراء فارسی جو انجمن سے شائع ہو چکا ہے مگر نام ظاہر نہیں کیا۔ نام و نمود سے ہمیشہ گریز کرتے تھے ایک خاموش کارکن تھے مرنجان مرنج تھے۔ خدا مغفرت کرے۔

تعلیم اور اخلاق

تعلیم گاہوں کا ماحول بدلنے کے لئے ہمیں ایسے ذی کمال اور صاحب اخلاق معلموں کی ضرورت ہے جو اپنے فن میں بڑے ڈوبے ہوئے ہوں۔ جن کے انہماک کی یہ حالت ہو کہ ان میں اور ان کے فن میں کوئی دوئی باقی نہ رہے۔ یہ صاحب کمال گو دنیاوی اعتبار سے ناقص انسان ہوتے ہیں مگر یہ وہ لوگ ہیں جن سے انسانی تمدن اور ترقی کو عظیم الشان فائدہ پہنچا ہے ہماری تعلیم گاہوں اور یونیورسٹیوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے اہل کمال کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائیں۔ ان کے آنے سے ہماری تعلیم گاہوں کی فضا کچھ اور ہی ہو جائے گی لیکن ایسے لوگ اخباروں میں اشتہار دینے سے اور درخواستیں طلب کرنے سے نہیں ملتے۔ وہ درخواستیں نہیں دیتے سفارشیں بہم نہیں پہنچاتے۔ وہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے در بدر نہیں پھرتے ہمیں ان سے درخواست کرنی چاہیئے۔ ان کی عزت سے ہماری عزت اور علم کی عزت ہے ہمیں ایسے استادوں کی ضرورت نہیں جنہیں علم سے زیادہ اپنی تنخواہ عزیز ہے اور جو شب و روز اپنی تنخواہوں کے اضافے اور ترقی کے لیے اپنے افسروں اور وزیروں کی دربار داری کرتے ہیں اور سفارشوں اور سرٹیفکٹوں کے بل پر ترقیاں حاصل کرنے کی دھن میں رہتے ہیں۔ اس میں اس میں علم کی بے وقری ہے۔ خود شاگردوں کے دل میں ایسے استادوں کی عزت نہیں رہتی۔ وہ اس مغالطے میں نہ رہیں کہ طالب علم ان ترکیبوں کو نہیں سمجھتے۔ طالب علموں سے بڑھ کر کوئی استادوں کو نہیں سمجھتا۔ اگر استادوں کو کوئی ایسا موقع ملے کہ وہ شاگردوں سے اوجھل رہ کر اپنے شاگردوں کی رائیں اپنے متعلق سن سکیں تو انہیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ان کی رائیں باون تولے پاؤ رتی صحیح ہیں۔

(خطبات ص ۳۹۶-۳۹۷)

قاضی محمد اختر

بابائے اردو اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے مراسم

۱۶ اگست ۱۹۵۵ء کو دنیائے علم و ادب نے یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی تھی کہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی بہ عارضۂ قلب اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے۔ مرحوم سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامی تاریخ کے سربراہ اور پروفیسر تھے۔ ایک مدت دراز سے وہ درد گردہ نیز عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ اور آخر کار اسی بیماریٔ دل نے ان کا کام تمام کیا۔

قاضی احمد میاں اختر مرحوم ۱۸۹۷ء میں بمقام ریاست جوناگڑھ (کاٹھیاواڑ) ایک خالص علمی گھرانے میں پیدا ہوئے اور جاگیردرانہ فضا میں پروان چڑھے۔ ان کا بچپن ہر قسم کی نعمت و آسائش اور فارغ البالی میں بسر ہوا حصول علم کا ذوقِ فطری مبداء فیاض کی جانب سے عطا ہوا تھا۔ لہٰذا اوائل عمر ہی سے ان کا طبعی رجحان کسبِ علم و فن کی جانب رہا۔ ابتدائی مطالعہ قرآنِ مقدس سے شروع ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عربی و فارسی زبان میں بھی استعداد بہم پہنچائی جن اساتذہ سے انہوں نے مذکورہ زبانوں کی تعلیم حاصل کی وہ اپنے عہد کے فاضل یگانہ تھے۔ اور یہی ان کی مادری زبانیں تھیں۔ انہوں نے باقاعدہ درسی اور نصابی تعلیم صرف مڈل تک بہادر مدرسہ جوناگڑھ میں حاصل کی جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ میٹرک کا امتحان دینے اٹاوہ بھی گئے تھے لیکن ہمشیرہ کی علالت کی خبر سن کر دورانِ امتحان ہی واپس چلے آئے۔ اور پھر کبھی کسی تعلیمی ادارے سے وابستہ نہیں ہوئے۔ بلکہ اپنے ذاتی رجحان ذوق و شوق اور فطری ذہانت ہی سے اس قدر علم حاصل کیا کہ بیک وقت پانچ زبانوں کے ماہر ہو گئے۔ یعنی۔ عربی۔ فارسی۔ اردو۔ انگریزی اور گجراتی اس کے علاوہ طب اور موسیقی میں بھی مہارت بہم پہنچائی۔

قاضی صاحب مرحوم کی علمی و ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۱۴ء سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے لڑکپن کے زمانہ میں الہلال، وکیل، پیسہ اخبار، اور تہذیب الاخلاق کے پرچے دیکھا کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ طبیعت شعر گوئی پر بھی

مائل سنی شعر میں ان کے استاد سید حسین میاں ترمذی تھے۔ اور اردو لکھنے کی طرف انہیں مولانا شاہ محمد جان صاحب نے رغبت دلائی جو لکھنؤ کے مدرسہ عالیہ فرقانیہ میں پروفیسر تھے۔ قریب قریب اسی سال انہوں نے اختر تخلص اختیار کیا اور ادبی دنیا میں اختر جوناگڑھی کے نام سے مشہور ہوئے۔

انہیں مضمون نگاری سے بے حد شغف تھا۔ ان کی مضمون نگاری کا آغاز رسالہ "مخزن" سے ہوا۔ بعد ازاں وہ ان کے بلند پایہ علمی، تاریخی اور تحقیقی مضامین۔ ترجمے، غزلیں اور نظمیں اس زمانہ کے مشہور رسائل مثلاً۔ الناظر معارف وغیرہ میں شائع ہوتی رہیں۔ انہوں نے جوناگڑھ سے ایک ادبی رسالہ "شہاب" جاری کیا جس میں "مختلف النوع" مضامین ومقالات وغیرہ شائع ہوا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اختر شیرانی مرحوم کے رسالوں "خیالستان" اور "رومان" وغیرہ کے لئے بھی لکھتے رہے۔

قاضی صاحب مرحوم کا مرغوب موضوع اسلام اور اسلامی تاریخ وتمدن تھا۔ اور اس موضوع پر متعدد بلند پایہ اور گرانقدر مضامین ان کے قلم سے نکلے۔ اور علمی حلقوں میں مقبول ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی اردو زبان۔ شعر و ادب اور تنقید پر بھی وہ گہری نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان موضوعات پر بھی انہوں نے کئی بصیرت افروز مضامین سپرد قلم کئے ہیں۔ تحقیق کا چسکا انہیں شروع سے تھا اور کئی ایسے موضوعات پر انہوں نے تحقیقی مقالے لکھے۔ جو واقعی بے حد دقیق اور دقت طلب تھے۔ اس ضمن میں ولی پر ان کے متعدد تحقیقی مقالے قابل ذکر ہیں۔ ولی پر انہوں نے انتھک تحقیق کی اور اسے گجراتی ثابت کیا۔

وہ ایک موروثی جاگیردار تھے اور روپے پیسے کی فراوانی تھی۔ انہوں نے اس ثروت و دولت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور ہزاروں روپے کتابوں کی خرید کر ایک عظیم الشان ذاتی کتب خانہ قائم کیا۔ جوناگڈھ میں وہ ایک نمایاں حیثیت کے مالک اور عمائدین شہر میں تھے۔ دربار میں انہیں بے انتہا رسوخ حاصل تھا۔ اور نواب جوناگڈھ ہر سیاسی، سماجی و معاشرتی مسئلہ میں ان کی رائے طلب کرنا مقدم فریضہ سمجھتے تھے۔ یہاں اگر ان کے ادبی و علمی پہلو سے ہٹ کر سیاسی پہلو پر لکھا جائے تو خوف طوالت مانع ہوتا ہے۔ بس اس قدر جان لیجئے کہ وہ جمیعت المسلمین کے صدر تھے۔ پاکستان کے ساتھ جوناگڈھ کے الحاق کے سلسلے میں مرحوم کی کوششوں کو بہت دخل ہے۔ اسی سیاسی جرم کی پاداش میں انہوں نے اپنا گھر۔ جاگیر۔ جائیداد۔ سب کچھ چھوڑ دیا۔ اور بے سروسامان پرتگالی جزیرہ دیو میں پناہ لینے کے بعد ۴۸ء میں کراچی پہنچے۔ اس بے سروسامانی میں انہیں اگر کسی چیز کی فکر تھی تو وہ ان کی نادر روزگار کتابیں تھیں۔ جو جوناگڈھ رہ گئی تھیں۔ بالآخر وہ کتابیں یہاں پہنچیں اور قاضی صاحب کو سکون نصیب ہوا۔ ان کی زندگی میں کتنا عظیم انقلاب برپا ہوا تھا۔ لیکن میں نے کبھی ان کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار نہیں دیکھے جو کسی انسان کی کل کائنات کے لٹ جانے پر ہمیشہ کے لئے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان کی دنیا ہی بالکل بدل گئی

تھی، لیکن وہ نہ بدلے۔ وہی شگفتہ طبیعت وہی لطیفوں پر قہقہہ لگا کر خود بھی ہنسنا اور احباب کو بھی ہنسانا۔

یہاں آکر سنہ ۴۹ء میں وہ انجمن ترقی اردو سے منسلک ہو گئے تھے اور سنہ ۵۳ء تک یہیں رہے۔ مولوی عبدالحق صاحب قبلہ مرحوم ان سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ اور قاضی صاحب بھی اکثر ہم سے مولوی صاحب کی بے لوث خدمات کا تذکرہ کرتے۔

کراچی آنے کے بعد ان کی دو کتابیں منظر عام پر آئیں۔ قطع نظر ان متعدد مضامین کے جو منتظر اشاعت ہیں۔ یوم اقبال کے سلسلے میں انہوں نے اقبال اکیڈمی کی فرمائش پر ایک تنقیدی مقالہ بعنوان "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" لکھا تھا جو بعد کو ایک کتابی صورت میں شائع ہوا۔ دوسری کتاب "تذکرہ اہل دہلی" ہے۔ "آثار الصنادید" کا یہ حصہ قاضی صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کیا تھا۔

قاضی صاحب بے حد شگفتہ طبع اور خوش مزاج انسان تھے۔ غصہ انہیں چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ اپنی اولاد سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اور خصوصاً میری والدہ کے انتقال کے بعد تو وہ ہم بچوں کو دیکھتے ہی آبدیدہ ہو جاتے تھے گھر میں وہ اکثر اپنی کاٹھیاواڑی زبان (جو گجراتی سے بالکل مختلف ہے) استعمال کرتے تھے۔ نفاست پسندی کا یہ عالم تھا کہ دوستوں کے رخصت ہونے کے بعد خود اپنے ہاتھ سے ماچس کی تیلیاں اور سگریٹ کے ٹکڑے اٹھا کر چلمدان میں ڈال دیا کرتے تھے۔ اسی طرح کپڑوں اور روزمرہ کے استعمال کی اشیاء اور کتابوں کے معاملہ میں بھی وہ بے حد نفاست پسند تھے۔

سنہ ۵۳ء میں وہ انجمن کو استعفیٰ دے کر سندھ یونیورسٹی چلے گئے تھے۔ جہاں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ۱۸ اگست سنہ ۵۵ء کو وہ اس جہان بے ثبات سے رخصت ہوئے۔

اوپر کی سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ قاضی صاحب اور بابائے اردو میں بڑے گہرے تعلقات تھے۔ یوں تو یہ تعلقات بہت پرانے تھے۔ لیکن جب قاضی صاحب انجمن سے منسلک ہوئے تو ان تعلقات میں اور بھی گہرائی پیدا ہو گئی۔ قاضی صاحب کی وفات کا بابائے اردو کو بے انتہا غم ہوا۔ جس کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل تقریر سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے ۲۰ اگست سنہ ۵۵ء کو انجمن ترقی اردو پاکستان کے اس جلسے میں کی جو قاضی صاحب کی یاد میں منعقد ہوا تھا۔

تقریر بابائے اردو

آج ہم ایک ایسے عزیز کے سوگ میں جمع ہوئے ہیں جس کی وفات نہ صرف اس کے عزیز و اقربا اور احباب کے لئے ایک الم ناک سانحہ ہے۔ بلکہ ایک قومی حادثہ ہے۔ ایسا صاحب فضل و کمال، ایسا محقق، اسلامی تاریخ کا ایسا ماہر ایسا صاحب نظر اب ہم میں کوئی نظر نہیں آتا۔ اس نے سینکڑوں ادبی۔ علمی مقالے اور مضامین لکھے۔

جن سے اس کی عالمانہ تحقیق اور وسعت معلومات کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ سراسر علمی شخص تھے۔ یہی ان کا شغل اور یہی ان کا مقصد حیات تھا۔ وہ علم کے شیدائی، علم دوست اور اہل علم کے قدردان تھے۔ اکثر لوگ علمی امور میں ان سے مشورہ لینے آتے تھے۔ اور وہ نہایت فراخ دلی سے ان کی مدد کرتے تھے۔ علم و فضل و تبحر کے ساتھ وہ قدیم تہذیب اور آداب کا اعلا نمونہ تھے۔ وہ جوناگڈھ کے نہایت معزز اور خوشحال جاگیر دار تھے۔ دربار جوناگڈھ میں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ اور نواب صاحب جوناگڈھ انکا بہت احترام کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے اثر اور سفارش سے اکثر اہل علم اور علمی اداروں کو ریاست سے بیش قرار امداد دلوائی۔ اور قومی تحریکوں کے لئے بڑے بڑے چندے دیئے۔ جب جوناگڈھ پر ہماری پڑوسی دوست حکومت نے جو اہنسا پر عقیدہ رکھتی ہے۔ بزور غاصبانہ قبضہ کرلیا۔ تو وہاں کے مسلمان شرفا کی جان و مال خطرے میں پڑ گئی۔ خصوصاً اِن لوگوں کا عزت و آبرو کے ساتھ صحیح سلامت بچنا محال تھا۔ جن کا تعلق دربار اور فرماں روائے ریاست سے تھا۔ قاضی صاحب ان سب میں نمایاں تھے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جان سلامت لے کر نکل بھاگیں۔ چنانچہ انہوں نے سب کچھ وہیں چھوڑا اور پرتگالی علاقہ میں جاکر پناہ لی کئی مہینے وہیں رہے۔ اس زمانے میں ان پر جو گذری ہوگی۔ اس کا اندازہ آپ کرسکتے ہیں۔ آخر وہ کسی طرح کراچی پہنچے یہ وہی زمانہ تھا کہ میں بھی انجمن کو لے کر کراچی پہنچا تھا۔ ہم سب مہاجر تھے۔ اور سب کچھ کھو کر آئے تھے۔ میری درخواست پر انہوں نے میرے ساتھ انجمن میں کام کرنا شروع کیا۔

انجمن کی مالی حالت اس وقت سقیم تھی۔ اور اب بھی کوئی اچھی نہیں اور بظاہر کوئی امید نہیں معلوم ہوتی ہے کہ اسے وہ دن نصیب ہوں گے۔ جو اس نے کبھی حیدرآباد اور دلی میں دیکھے تھے۔ اس لئے انجمن ان کی شایان شان خدمت نہ کرسکی انہوں نے بڑی محنت، دیانت اور خلوص سے انجمن کی خدمت انجام دی جب تک وہ انجمن میں رہے میں بڑی بے فکری سے مشرقی پاکستان وغیرہ دوروں پر نکل جاتا تھا۔ اور بعض اوقات دو دو مہینے غیر حاضر رہتا تھا کیونکہ مجھے کامل اطمینان تھا کہ انجمن کے کام میں کوئی فرق نہیں آنے گا۔ ان کے جانے کے بعد سے میں چند روز کے لئے بھی کراچی سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ جب انہوں نے اپنا استعفا پیش کیا تو میں نے اس پر لکھا "بدرجہ مجبوری نہایت افسوس اور رنج کے ساتھ میں آپ کا استعفا منظور کرتا ہوں۔ آپ کے رہنے سے مجھے بہت اطمینان تھا۔ محنت اور جستجو سے سب کچھ مل سکتا ہے۔ مگر انسان نہیں ملتا" سندھ یونیورسٹی میں وہ شعبۂ اسلامی تاریخ کے صدر ہو گئے تھے۔ اب وقت آیا تھا کہ وہ کسی قدر آسائش اور آسودگی سے زندگی بسر کریں اور اپنے علمی کام جاری رکھیں۔ لیکن خدا کو یہ منظور تھا کہ یکایک قلب کی حرکت بند ہونے سے وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اِنا للہ وَ اِنا اِلیہ رَاجِعُون۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر کسی کی موت پر چالیس شخص اس کے لئے دعائے مغفرت کریں تو اللہ تعالی اس کی مغفرت کرتا ہے۔ قاضی صاحب مرحوم کی وفات پر ہزارہا آدمیوں نے ان کے لئے دعائے مغفرت کی ہے، ہمیں

امید ہے کہ ان دعاؤں کی برکت اور ان کے نیک اعمال کی بدولت اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے گا۔

قاضی صاحب کی وفات سے ایک بڑا صدمہ یہ ہوا کہ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے بے سہارا رہ گئے۔ اوران کی پرورش اور غور و پرواخت کرنے والا کوئی نہ رہا۔ قاضی صاحب کی وفات کے تیسرے چوتھے روز ان کے بچے دو فارم لئے میرے پاس آئے۔ جن میں فیس کی معافی کی درخواست تھی اور میری تصدیق کی ضرورت تھی۔ یہ فارم دیکھ کر میرے دل کو چوٹ سی لگی۔ یہ مقامِ عبرت ہے۔ وہ جو کل تک سینکڑوں حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتا تھا۔ آج اس کے بچے فیس کی معافی کے لئے درخواست لئے پھرتے ہیں۔ دوستو! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں نہ معلوم کب پیغامِ اجل آجائے گا۔ اس لئے جب تک زندہ ہیں۔ دوسروں کی حاجت روائی اور بھلائی کی کوشش کریں۔ اور دوسروں کے دل دکھانے اور ان کو نقصان و ضرر پہنچانے ان کی زندگی کو برباد کرنے سے احتراز کریں۔ اگر کسی سے خطا ہو تو معاف کردیں۔ معافی میں جو عجیب لذت اور وقار ہے۔ وہ سزا دینے انتقام لینے اور برا بھلا کہنے میں نہیں۔ جن لوگوں نے اپنے علم وفضل اپنی دولت یا اپنے عمل و کوشش سے بندگانِ خدا کی خدمت کی ہے۔ وہ مرتے نہیں زندہ رہتے ہیں۔ اوران کا نام ہمیشہ خیر سے یاد کیا جاتا ہے۔ قاضی صاحب مرحوم انہیں نیک اور برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔"

بابائے اردو اور قاضی صاحب مرحوم میں مراسلت بھی رہی۔ میرے پاس بابائے اردو کے بہت خطوط ہیں، ان میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ بیشتر خطوط ۵۲ء کے لکھے ہوئے ہیں جب کہ بابائے اردو کوئٹہ میں تھے۔

مکتوبات بابائے اردو

۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء

شفیق مکرم زاد لطفہٗ

کئی روز ہوئے فصیح الحق عباسی صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ کی رفیقۂ حیات کا زچگی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ آپ کو اس سے جو صدمہ ہوا ہوگا۔ وہ ظاہر ہے میں دو تین روز سے یہ ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مگر آپ کے چوبحلہ کا زینہ ایسا کڈھب ہے کہ اس سے چڑھ کر آپ تک پہنچنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بیماری کے بعد اب تک مجھ میں پوری توانائی نہیں آئی۔

اب آپ کے سامنے بچوں کی پرورش اور نگہداشت کا معاملہ ہے یہ عورتیں ہی خوب کر سکتی ہیں مرد سے نہیں ہو سکتا اور مرد بھی ایسا جو ملازم ہے۔ خدا کرے یہ انتظام آپ کے خاطر خواہ ہو جائے تاکہ آپ کو کچھ اطمینان ہو جائے آپ کے تمام احباب کو اس سانحہ کا کمال افسوس ہے۔

خیر طلب

عبدالحق

۱۴ راکتوبر ۱۹۵۲ء

مشفقی مکرمی قاضی صاحب السلام علیکم

سید ہاشمی صاحب کا خط اور کانفرنس کا پروگرام اور قرار دادیں وصول ہوئیں۔ یہ خط میں انہیں کو لکھنا چاہتا تھا لیکن وہ ۶ ار کو لاہور جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ شاید ان کو وقت پر نہ پہنچتا لہٰذا آپ کو لکھ رہا ہوں۔ اگر وہ لاہور نہ گئے ہوں تو یہ خط دکھا دیجیے گا۔

۱۔ ڈاکٹر ابو ظفر صاحب کے مضامین میرے سامنے نہیں ہیں۔ قطعی طور سے نہیں کہہ سکتا کہ تینوں بجنبہ چھاپ دیئے جائیں یا ان میں سے کوئی ایک مضمون۔ ---------------- ۔ اگر ان میں کوئی ایک جامع مضمون ہو تو خیر ورنہ تینوں شائع ہونے چاہئیں۔

۲۔ بعض قرار دادیں ایسی سخت اور تند زبان میں لکھی گئی ہیں کہ یہاں والے اسے برداشت نہ کر سکیں گے۔ اگر ان کو پڑھ کر سنائی گئیں تو مارے خوف کے بُرا حال ہو جائے گا۔

ان میں ابھی اتنی جرأت کہاں۔ یہ غلاموں کے غلام ہیں۔ اگر ۰۰۰۰۰۰ نے ایک ذرا دھمکی دی تو قدموں میں گر پڑیں گے اس قسم کی قرار دادیں ہم اپنی جوبلی میں کانفرنس (اگر وہ ہوئی تو) پیش کر سکتے ہیں ۰۰۰۰۰۰ والے اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے میں ان قرار دادوں کو نرم الفاظ میں لکھ کر دوں گا۔

۳۔ ابھی سے سید صاحب نے عبدالماجد صاحب کو جوبلی کی دعوت دیدی میرے خیال میں جوبلی کا ہونا دشوار نظر آتا ہے۔ اتنا روپیہ کہاں ہے۔ اور پھر اس کا انتظام ایک بڑے جھمیلے کی چیز ہے۔ ہمارے پاس ایسے اشخاص بہت کم ہیں۔ جو اس قسم کے کام پوری تندہی اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔ اور اسراف نہ ہونے دیں۔ اس موقع پر شبّر یاد آتا ہے۔ عمر بھر میں ایک ہی شخص ملا تھا۔

۰۰۰۰۰ صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ مگر کاہل اور بے پروا ہیں۔ ان پر آنکس کی ضرورت ہے۔ ورنہ کام کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ ان کو بار بار جتانے اور آرڈ دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔

۰۰۰۰۰۰۰۰ نزاع کے رسالے اردو انگریزی میں تقریباً تیار ہیں۔ اگر کرنٹ کانفرنس تک تیار ہو جائیں۔ تو بہت اچھا ہو۔

۰۰۰۰۰۰۰ صاحب کو اشد تاکید کیجائے ؟ قیصر[1] صاحب سے اس رسالہ کے متعلق مراسلت کرتے رہیں اور جو مضمون یہاں نہیں وہاں سے منگائے جائیں اور جو وہاں نہیں یہاں سے بھیج دیئے جائیں۔

۰۰۰۰۰۰ صاحب سے اپنے سامنے خط لکھوانے چاہئیں ورنہ نہیں لکھیں گے یا دیر کریں گے اور ٹالتے رہیں گے۔

عبدالحق

[1] وحید قیصر ندوی صاحب

کوئٹہ

مورخہ ۶؍اکتوبر سنہ ۱۹۵۲ء

مشفقی ومکرمی زاد لطفہ السلام علیکم

سیّد ہاشمی صاحب کا خط ملا انہوں نے رسالہ کا جونام تجویز کیا ہے وہ بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کسی ترمیم کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اس نام کی اطلاع سیّد وحید قیصر کو ــــ بھی کردی جائے۔ وہ بنگالی میں اس کا ترجمہ کرالیں گے۔

زیبا صاحب سے فرما دیجئے وہ قیصر صاحب کو لکھ دیں گے۔

معلوم نہیں قیصر صاحب نے دردائی صاحب کی بنگالی لغت واپس کی یا نہیں۔ کل ہی ایک خط انہیں لکھ چکا ہوں۔

اب تک قومی زبان کا پرچہ نہیں آیا۔ آج اکتوبر کی ۶ ہوگئی ہے۔ ۔۔۔۔ صاحب کہاں ہیں۔ اور کس حال میں ہیں۔ بیگم صاحب کی آمد کی خوشی میں وہ سب کچھ بھول گئے۔

یہ خط لکھ چکا تھا کہ قومی زبان کے پرچے پہنچے

خیر طلب ــــــــــــــــــــ عبدالحق

کوئٹہ

مورخہ ۷؍اکتوبر سنہ ۱۹۵۲ء

جناب قاضی صاحب۔ کل آپ کے کاغذات وصول ہوئے۔ تین سو روپے کا چیک ارسال ہے

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ میونسپلٹی کا چیک وصول ہوگیا ہے۔ دستخط کے لئے بھیجا گیا ہے۔ کس کے دستخط کے لئے اور کہاں؟ ــ۔۔۔۔۔ــ۔ امید ہے مطبع کا کام بخوبی چل رہا ہوگا۔

ڈاک وصول ہوگئی۔

یہاں تجویز یہ ہو رہی ہے کہ جو رقم کانفرنس کے لئے جمع کی گئی ہے وہ بجائے آمد و رفت کے اخراجات شعرا کے نذرانے پنڈال بنانے اور خاطر مدارت اور دعوتوں میں صرف کرنے کے لئے مرکزی انجمن ترقی اردو کو پیش کردی جائے۔ یہ تجویز کمیٹی نے منظور کرلی ہے۔ اس سے انجمن کو ایک معقول رقم علمی وادبی کاموں کے لئے مل جائے گی۔

عبدالحق

یہ خط لکھ چکا تھا کہ آپ کا رجسٹری لفافہ پہنچا۔ چیک پر دستخط کر دیئے ہیں۔

عبدالحق

۸ر اکتوبر ۱۹۵۲ء

مشفقی و مکرمی جناب قاضی صاحب

آپ نے تار سے پنجاب یونیورسٹی کی سیلکشن کمیٹی کی اطلاع بھیجی۔ جو کل چار بجے پہنچی۔ اس وقت کوئی گاڑی نہیں جاتی تھی۔ آج اگر میں کوئٹہ میل سے جاتا تو وہاں کل یعنی ۹ر اکتوبر کو سات بجے پہنچتا اور کمیٹی ۴ بجے تھی۔ لہذا کسی صورت سے بھی میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ رجسٹرار کو چاہیئے تھا کہ دو چار روز پہلے اطلاع کرتے۔

یہاں کی کانفرنس کے متعلق کل آپ کو لکھ چکا ہوں۔

عبدالحق

تاریخ و سیاسیات کے چار پرچے ابھی پہنچے۔ شکریہ۔

کوئٹہ

۹ر اکتوبر ۱۹۵۲ء

مشفقی و مکرمی

کل کا خط اور آج کی ڈاک مل گئی۔

چیک بعد دستخط واپس

رسالوں کی ترسیل کے متعلق اسٹیٹ بنک کا فارم آپ لفافے میں رکھنا بھول گئے۔ جب آئے گا تو دستخط کرکے بھیج دوں گا۔

خفیہ پولیس نے اچھا پوچھا کیا ہے۔ ہمیں ۔ ۔ ۔ کے ذاتی معاملات کے متعلق کچھ علم نہیں۔ اور جو کچھ ہم جانتے ہیں۔ اس سے ان کو اپنی کاروائی میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

عبدالحق

کوئٹہ

۱۲ر اکتوبر

مشفقی جناب قاضی صاحب تسلیم

آپ کا خط پہنچا۔ یہ بڑی خوشی خبری ہے کہ الحاج محمد اکرم صاحب نے لیتھو پریس کے لئے دس گیارہ ہزار روپے دینے منظور کئے ہیں۔ مگر مجھے اس میں شبہ ہے جب تک رقم ہاتھ میں نہ آجائے۔ اس قسم کے وعدے قابل اعتماد نہیں۔

کانفرنس کے نہ ہونے کے متعلق میں نے آفتاب حسن کو اطلاع کر دی تھی۔ اور لکھ دیا تھا کہ وہ حسلیم صاحب کو کہلا بھیجیں۔ اور خطبے کی تیاری بند کر دی جائے۔

سب رس کے پروف میں دیکھتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے آپ کے پروف ریڈر اس کی تصحیح کا کام نہ کر سکیں گے اس زبان سے وہ نا آشنا ہیں۔ ویسے بھی تصحیح کا کام بخوبی نہیں ہوا۔ اس خط کے ساتھ میں صرف رسالہ تاریخ و سیاسیات کی غلطیوں کی فہرست بھیج رہا ہوں۔ جو سرسری طور پر میری نظر سے گزریں۔

رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی کا خط آپ کو ۷ کو ملا اور آپ نے اسی دن بھیج دیا۔ اور مجھے بھی اسی روز مل گیا مگر اس وقت کوئی گاڑی لاہور نہیں جاتی تھی۔ دوسرے ۸ وقت پر نہ پہنچتا۔ اچھا ہی ہوا مفت میں زحمت ہوتی۔ میں جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اور وہ کمیٹی کوئی ضروری بھی نہ تھی۔

باہر کا کام نہیں ملا یا آپ کو اپنے کام سے اتنی فرصت نہیں کہ بیرونی کام کر سکیں۔ ابراہیم سے کیسے انہوں نے کام دلانے کے بڑے بڑے وعدے کئے تھے۔

میں بخیریت ہوں اب کے سردی ذرا پہلے سے شروع ہو گئی ہے یہاں کی انجمن کا سالانہ اجلاس ۲۵؍ اکتوبر کو ہوگا۔ اس کے انتظار میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ کیونکہ کانفرنس کے لئے جو رقم جمع کی گئی تھی۔ وہ اسی اجلاس میں ہماری انجمن کو پیش کیجائے گی اس کے بعد کراچی کا قصد کروں گا۔

خیر طلب عبدالحق

حسن حبیب صاحب کا خط ملفوف ہے۔ اس کا جواب میں نے لکھ بھیجا ہے۔ یہ خطوط کی مثل میں لگا دیجئے یہ خط ۲۵؍ ستمبر کو لکھا گیا اور لفافہ پر بھی ۲۵ کی مہر ہے مجھے ۱۱؍ اکتوبر کو ملا۔ دفتر میں پڑا رہا۔ حالانکہ لفافہ پر۔ "ارجنٹ" لکھا تھا۔ دریافت فرمائیے کہ ایسا کیوں ہوا۔

کوئٹہ

۱۴؍ اکتوبر ۱۹۵۲ء

مشفقی جناب قاضی صاحب۔

آپ نے بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کا مراسلہ اور اپنا خط تو بھیجا مگر میرا وہ مراسلہ جو انہوں نے میرے دستخط کے لئے واپس کیا تھا۔ وہ لفافہ میں نہیں۔ رکھنا بھول گئے۔ لہذا کاغذات واپس ارسال ہیں۔

اہلکار کتب خانہ کے متعلق میں منظوری دے چکا ہوں آپ نے مراسلے کو دیکھے۔ میں نے مہتمم صاحب کتب خانہ کی تحریک پر رخصت با تنخواہ منظور کی ہے۔

۔۔۔۔۔۔۔ کے علمی کاموں کی فہرست مجھے نہیں پہنچی۔ آپ لفافہ میں رکھنا بھول گئے۔ اس کی ضرورت

بھی نہ تھی۔ اب نہ بھیجیے گا۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ پر کام کا بار آپڑا ہے۔ زیبا صاحب اور تمنائی سے کچھ کام لیجیے۔ میں فوراً آجاتا۔ لیکن میں یہاں کی انجمن کے سالانہ جلسے کی انتظار میں ہوں۔ جس میں وہ ہماری انجمن کو اچھی خاصی رقم پیش کرنے والے ہیں۔

شب کو سردی بڑھ گئی ہے۔ اس سال سردی کچھ پہلے شروع ہو گئی ہے۔

زیبا صاحب کا خط پہنچا۔ میں کئی بار لکھ چکا ہوں کانفرنس نہیں ہو گی۔ نہیں ہو گی۔ نہیں ہو گی۔

عبدالحق

چیک کی رسید یا تو براہ راست ہیڈ مسٹرس صاحبہ کو بھیج دیجیے ورنہ مجھے بھیج دیجیے میں ان کو پہنچا دوں گا۔

عبدالحق

۱۹ر جولائی ۵۳

جناب قاضی صاحب

میں کل شعیب صاحب سے ملا تھا۔ گورنر جنرل کے وقد اور ——— کارپوریشن سے قرض کے متعلق گفتگو ہوئی۔ وہ دونوں کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آج ہی دونوں امور کے متعلق ان (شعیب صاحب) لکھ کر بھیج دیا جائے وہ طے کر لیں گے۔ اس سے آپ تکلیف فرما کر تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے آئیں یہ دونوں کام ہو جائیں گے۔

عبدالحق

کراچی

۲۱ر جولائی ۱۹۵۵ء

مشفقی مکرم زاد لطفہ السلام علیکم

خواجہ عبدالمجیب صاحب ایم۔ایس۔سی (پنجاب) انجمن ترقی اردو کالج میں کام کرتے ہیں۔ گذشتہ سال امریکہ گئے تھے۔ وہاں سے ایم۔ایس کی ڈگری حاصل کی۔ اصطلاحات حیاتیات کی کمیٹی میں بھی میرے پاس بہت دنوں تک کام کیا۔ بہت محنتی قابل اور فرض شناس اور مستعد نوجوان ہیں۔ سندھ یونیورسٹی میں لکچرار کی کوئی جگہ خالی ہے۔ یہ بھی اس کے امیدوار ہیں۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ امید ہے آپ ان کی اعانت فرمائیں گے۔ میری رائے میں یہ مستحق امداد ہیں۔

خیر طلب عبدالحق

۸ر دسمبر

مکرم و مہربان جناب قاضی صاحب! السلام علیکم

منسٹر تعلیم صاحب کی ملاقات کے وقت آپ بھی موجود تھے۔ اُن کے انداز گفتگو سے مترشح ہوتا تھا کہ انجمن کو حکومت سے امداد کی زیادہ توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ سال ختم ہونے کو ہے اور اب تک انجمن کو مطلق کوئی امدادی رقم نہیں ملی۔ اگر ملی بھی تو وہ اتنی کم ہوگی کہ اس سے انجمن کا کچھ بھلا نہ ہوگا۔ انجمن نے ادبی و علمی کاموں کی جو تجاویز پیش کی تھیں اُن کے متعلق بھی اب تک کوئی جواب وصول نہیں ہوا اور نہ ـــــ اُن اسکیموں کے متعلق کوئی اطلاع ملی جو وزارت کے ایما پر مرتب کرکے پیش کی گئی تھیں۔ غالباً حکومت کے پیش نظر اور بہت بڑے بڑے کام ہیں اور وہ انجمن کے کام کو قابل اعتنا نہیں سمجھتی اور اور شاید اُس کی نظر میں ان کاموں کی کچھ زیادہ قدر بھی نہیں۔ حالانکہ ساری مملکت میں یہی ایک ایسا ادارہ ہے جو حقیقی علمی و ادبی کام کر رہا ہے۔

حکومت ایک بہت بڑی مشین ہے۔ مشین میں جذبات نہیں ہوتے۔ حکومت کے کارفرما اور کارکن اس مشین کے کل پرزے ہیں جو اپنے کارخانے کی مشین کی طرح احساس جذبات

اور وزرا سے خالی ہیں اس لیے وہ ادبی اور علمی کارگزاریوں
کو اس نظر سے نہیں دیکھ سکتے جس کی وہ مستحق ہیں۔

اس کے علاوہ صوبائی عصبیت کا جذبہ جو پاکستان
بننے کے بعد زیادہ قوی ہوتا جاتا ہے اکثر اوقات ان کاموں
میں رکاوٹ اور تاخیر کا باعث ہوتا ہے۔ پاکستان کے
لیے یہ بہت خطرناک ہے جو زندگی اور حکومت کے مختلف شعبوں
پر چھا رہا ہے۔

ان حالات میں انجمن کو سخت مشکلات کا سامنا ہے۔
سرمایہ کے نہ ہونے سے جو منصوبے کے پیش نظر ہیں وہ
ٹھٹھر کر رہ گئے ہیں۔ بہت سی علمی کتابوں اور لغات
کے مسودے اشاعت کے انتظار میں پڑے ہیں۔ علمی
اصطلاحات کا کام نامکمل رہ گیا ہے۔ انجمن مقروض ہے۔
روزمرہ کے کاموں کا انجام دینا بھی دشوار ہو گیا ہے۔
اب تک بڑا بھلا کام جو کچھ بھی ہوا محض ہمت کے بل بوتے
پر ہوتا رہا۔ اب وہ بھی جواب دیتی نظر آتی ہے۔

لہذا میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ پنشن کی رقم جو
حکومت کی فیاضی و قدردانی اور جناب فضل الرحمن صاحب
کی عنایت و ہمدردی سے مجھے عطا ہوئی ہے وہ انجمن کی نذر کر دوں۔
یہ بہت حقیر رقم ہے۔ تاہم اگر اس سے انجمن کا ایک ادنا سا
کام بھی انجام پا گیا تو میرے لیے یہ بڑی مسرت و اطمینان کا
موجب ہوگا۔ مجھے اس پنشن کے قبول کرنے میں بہت پس و پیش
تھا۔ اگر عین وقت پر فضل الرحمن صاحب کا مہر آمیز للہ

ہمدردانہ خط نہ آجاتا تو میں غالباً اس کے لینے سے انکار
کر دیتا ۔ میں پاکستان میں خدمت کے لیے آیا تھا، میری
غیرت گوارا نہیں کرتی کہ میں اس پر بار ہوں ۔ اس لیے
میری رائے میں اس کا مصرف اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ
وہ انجمن کے کام آئے ۔ میں نے اپنی ضروریات بہت کم
کر دی ہیں اور اور کم کر سکتا ہوں ۔ ابھی مجھ میں بفضلہٖ
اتنی توانائی ہے کہ اپنی قوت لایموت پیدا کر سکوں ۔ میں نے
زندگی کی بہت سی بہاریں دیکھی ہیں ۔ ہر بہار کے بعد خزاں
لازم ہے ۔ اس کی بہار دیکھنی باقی ہے

فی الحال میں ماہ جنوری ۱۹۵۲ء سے نصف پنشن انجمن
کو پیش کروں گا ۔ چند ماہ بعد مجھے ایک ایسے کام مل جانے کی
توقع ہے جس سے مجھے کم و بیش ڈیڑھ سو روپے ماہانہ مل
سکیں گے اور یہ میری گزر اوقات کے لیے کافی ہوں گے ۔ اس
کے بعد میں پنشن کی پوری رقم (بعد منہائی انکم ٹیکس) انجمن
کی نذر کر دیا کروں گا اور اس سے قبل جس قدر رقم مجھے
وصول ہوئی ہے وہ بھی رفتہ رفتہ ادا کر دوں گا ۔

ظاہر ہے کہ اس سے انجمن کا کام نہیں چل سکتا ۔ بعض
احباب کے مشورے سے کچھ اور تدبیریں بھی کی جائیں گی ۔ اگر
اس کے بعد بھی کامیابی نہ ہوئی تو پھر یا تو اس کام کو خدا حافظ
کہنا پڑے گا یا انجمن کو کسی ایسے مقام پر منتقل کرنے کی
کوشش کی جائے گی جہاں اس کے چلنے کا امکان ہو ۔

عبدالحق

غلام حسین اظہر

بابائے اردو اور حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

جہاں ماضی کی اور بہت سی یادیں ذہنوں سے محو ہوگئیں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی بات بھی اب قصۂ پارینہ ہی ہو کے رہ گئی ہے۔ لیکن گاہے گاہے قصۂ پارینہ کی بازخوانی بھی لطف سے خالی نہیں ہوتی، کبھی کبھار مستقبل کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بھی، ماضی کی طرف پلٹ کر ماضی کے دھندلے دھندلے نقوش دیکھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے خیال پیدا ہوا کہ قومی زبان کے "بابائے اردو نمبر" میں جہاں مولوی عبدالحق کی اور خدمات کا ذکر کیا جائے گا۔ ان کی حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلہ میں جو اہم خدمات ہیں ان کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا بلکہ کسی حد تک مفید ہے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی سرگرمیوں میں مولوی صاحب کس حد تک شریک رہے۔ اور انہوں نے کونسے اہم کام سرانجام دیئے ان کے بیان کرنے سے پہلے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا مختصر سا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ بہت سے لوگ ہو سکتا ہے اس ادارہ کے نام سے ہی آشنا نہ ہوں۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس جیسا تعلیمی ادارہ تھا، جس کا مقصد علم کی اشاعت اور علم کا ذوق وشوق پیدا کرنا تھا۔ ۱۳۲۳ ف (۱۹۱۴ء) میں اس ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔ مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم اس ادارہ کے بانی تھے۔ اس ادارہ کے پیش نظر یہ مقاصد تھے۔

۱:۔ علمی سوسائٹی کا قیام۔

۲:۔ توسیع دائرہ تعلیم

۳:۔ اصلاح تعلیم

ان مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے یہ لائحۂ عمل اختیار کیا گیا۔

(۱) علوم وفنون کے تراجم اُردو زبان میں کئے جائیں

(ب) حیدر آباد کی تاریخ و جغرافیہ مرتب کرانا۔

(ج) نصاب تعلیم کا ایک موزوں اور مناسب حال سلسلہ مہیا کرنا۔

(د) ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تعلیم تک سلسلہ قائم کرنا۔

(ھ) جامعہ کے قیام کی تحریک۔

(و) تعلیم زراعت کی طرف توجہ۔

(ز) علم طب کی طرف توجہ

(ح) تعلیم صنعت و حرفت کی طرف توجہ

اور یہ حقیقت ہے کہ حیدر آباد کی تعلیمی ترقی میں اس کانفرنس کا نمایاں حصہ ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے لئے فضا پیدا کرنا، اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مدارس کی تعمیر، ان کے لئے بہتر کتابوں کی تیاری اور ان کو ارزاں فروخت کرنا، کتب خانوں کا قیام، ابتدائی تعلیم کا مفت، بلا فیس آغاز، مدرسین کو اچھی تنخواہیں دلانا۔ یہ سب کچھ اسی کانفرنس کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے ادارے سے مولوی صاحب کیسے الگ رہ سکتے تھے، ان کی تو زندگی کا مقصد ہی قوم کی تعلیمی ترقی تھا۔ اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ اسی فکر میں گذرا۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس ادارہ میں نمایاں حصہ لیا، اور اہم خدمات سرانجام دیں، ان میں سے ایک مولوی صاحب بھی تھے۔ مولوی صاحب نے اس ادارہ کی تیسری کانفرنس میں جو ۱۳۲۷ ف میں منعقد ہوئی، اس ادارہ کے اراکین اور حکومت کو ایک اہم کام کی طرف توجہ دلائی؛ انہوں نے علوم و فنون کے ایک اعلیٰ کتب خانہ کی شدید ضرورت پر پر مغز تقریر کی۔ اور آخر کار ان کی یہ کوششیں بارآور ہوئیں۔ مولوی صاحب کی تقریر ملاحظہ ہو۔

"چند سال ہوئے ہیں کہ ہمارے محترم صدر نشین صاحب نے ایک مشرقی کتابوں کا ذخیرہ فراہم کرنے کے لئے توجہ مبذول فرمائی، اور اگرچہ اس وقت اس کام کو بے فائدہ سمجھا گیا۔ اور بعض وقت اس کی تخفیف کی بھی رائے دی گئی۔ لیکن آج اس کے قیام کے فوائد ظاہر ہو رہے ہیں، سینکڑوں طالب علم اس سے مستفید ہوتے ہیں، اور اس کی وجہ سے حیدر آباد میں علم و فن کا ایک شوق اور ولولہ پیدا ہو گیا ہے اب اس کتب خانہ میں سب سے کم ذخیرہ اُردو زبان کا ہے اردو زبان کی کتابوں کی متعلق کوئی ذریعۂ دریافت نہیں ہے، اسی وجہ سے بہت بڑی دقت پیش آتی ہے، بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں اردو میں لکھی جا چکی ہیں، لیکن گمنامی میں پڑی ہیں، اور ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ اگر سب کتابیں فراہم ہو جائیں تو کتب خانہ کی ایک عمدہ شاخ قائم ہو جائے گی۔ ضرورت ہے کہ اُردو کتابوں کی ایک فہرست مرتب ہو۔ جس سے معلوم ہو سکے کہ ہر ہر مبحث پر کون کون سی کتابیں اردو میں موجود ہیں، اگر اس طرح کتابیں

ایک جگہ جمع ہو جائیں گی۔ تو یہ بہت آسانی سے ممکن ہو گا کہ ایک شخص جس کو خدا نے کسی خاص فن کی مناسبت اور استعداد عطا کی ہے، صرف اردو کی کتابیں دیکھ کر تصنیف و تالیف کر سکے، پس مجھے امید ہے کہ آپ تمام حضرات اس تحریک کو بالاتفاق منظور کرینگے جس سے تقریباً ہر شخص کے لئے علوم و فنون کا دروازہ کھل سکتا ہے۔

(تحریک پنجم اجلاس سوم بتاریخ ۵، ۶ بہمن ۱۳۲۷ف) (روداد ص ۵۷)

اسی ادارہ کے مختلف جلسوں کے موقع پر مولوی صاحب نے نہایت اہم کاموں کی طرف توجہ دلائی۔ انہیں امور میں سے ایک مسئلہ اردو زبان میں علوم و فنون کے ترجمہ، اور اردو میں تدریس کا تھا۔ مولوی صاحب کے نزدیک یہ مسئلہ کتنی اہمیت رکھتا تھا، اس کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے پہلے اجلاس میں ہی اس مسئلہ کو اٹھایا مولوی صاحب نے نہایت ہی دلنشیں اور پرسوز الفاظ میں، اس ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔ مولوی صاحب مرحوم کی یہ تقریر ملاحظہ ہو۔

تقریر مولوی عبدالحق صاحب. بی۔ اے مہتمم تعلیمات

جناب صدر مجلس و معزز حضرات!

یہ رزولیوشن جو آپ صاحبوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے نہایت ضروری اور اہم ہے اور اس پر ہماری علمی ترقی کا بہت بڑا انحصار ہے۔ کوئی ملک ترقی یافتہ نہیں ہو سکتا ہے جب تک اس کی زبان میں علوم و فنون موجود نہ ہوں تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ملک نے غیر زبان کے ذریعہ سے ترقی کی ہو۔ ہندوستان ہی ایک ایسا بدنصیب ملک ہے جو علم و فن حاصل کرنے کے لئے غیر زبان کا محتاج اور دست نگر ہے۔ جو حالت ہماری اس وقت ہے وہ دوسری قوموں پر بھی گزری ہے۔ مثلاً ایک زمانہ تھا کہ رُوما میں یونانی زبان کا ایسا ہی زور تھا۔ جیسا آجکل ہمارے یہاں انگریزی زبان کا ہے۔ اور جو خبط ہمارے ملک میں انگریزی بولنے، انگریزی لکھنے، انگریزی پوشاک، انگریزی خوراک اور انگریزی رسم و رواج کا ہے بعینہٖ یہی حالت وہاں تھی۔ بچوں کو پہلے یونانی پڑھائی جاتی تھی۔ اور پھر اپنی زبان لاطینی۔ لیکن جب تک وہ دوسری زبان کے دست نگر رہے کچھ نہ ہوئے اور جب انہوں نے اسے ترک کر کے علوم و فنون اپنی زبان میں سیکھنے شروع کئے تو انہوں نے وہ ترقی کی کہ اب تک یادگار ہے اور لاطینی زبان کا اثر اب تک دنیا کی زبانوں پر باقی ہے۔ غیر زبان کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرنے میں نہ صرف دماغ پر بیجا بار پڑتا ہے بلکہ جدت و جودت طبع بھی ایک حد تک معطل ہو جاتی ہے۔ اور اس تعلیم سے جس قسم کے لوگ ہم اپنے ملک میں پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں ہو سکتے۔

علاوہ اس کے اردو زبان خاص ملکی اور آریائی زبان ہے۔ باہر سے نہیں آئی ہے نہیں پیدا ہوئی۔ کسی شاہی فرمان یا علما کے فتوے یا کسی مجلس کے مشورہ سے نہیں قائم کی گئی۔ بلکہ خود ضرورت نے اُسے پیدا کیا۔ ہندوستان بجائے خود ایک براعظم ہے جس میں بیسیوں قومیں آباد اور سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ناگزیر تھا کہ جب مختلف اقوام کے لوگ باہم ملیں۔ تو کوئی ایسی زبان بولیں۔ جو سب سمجھ سکیں اور وہ زبان غیر نہ ہو بلکہ اپنے ملک کی ہو۔ اردو زبان درحقیقت اس ملک کی زبان ہے۔ اُسے پراکرت سے وہی تعلق ہے جو دوسری ہندی زبانوں کو ہے۔ علم اللسان کی رو سے دیکھا جائے تو یہ سب باہم بہنیں ہیں۔ چنانچہ اس کے اصلی عنصر یعنی افعال، ضمائر، حروف سب کے سب ہندی ہیں۔ البتہ اسماء وصفات عربی، فارسی، ترکی اور دیگر زبانوں کے شامل ہیں۔ لیکن اس کی بنیاد اور ساخت ہندی ہے دوسری خوبی اس میں یہ ہے کہ باقی تمام ہندی زبانیں خاص خاص مقامات سے مخصوص ہیں۔ مثلاً مرہٹی صرف مرہٹواڑی اور مہاراشٹر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ تلنگی تلنگانہ میں، بنگالی بنگالہ میں مگر اردو تمام ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک۔ دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے یہ قائم رہنے والی شے نہیں لیکن ان کا یہ کام ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ ملک کے جو ہونہار طالب اُن کی امداد سے تعلیم حاصل کریں وہ ملک کے حق میں باعث برکت ہونگے۔ اور ان کے اثر سے دوسرے مستفید ہونگے اور اسی طرح اس برکت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہیگا اور ان کی یہ امداد خیر دایم ہوگی

حضرات! سرسید احمد خاں مرحوم نے تعلیم کی اشاعت میں بہت بڑا کام کیا ان کا نام ہمیشہ یادگار رہیگا لیکن ہماری بدقسمتی سے اس نیک کام میں بھی ایک نقص پیدا ہوگیا۔ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ مدرسہ قائم کر دینے سے آدمی سرسید ہوجاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہرکس و ناکس مدرسہ قایم کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا چندہ جمع کیا مدرسہ قائم ہوا۔ طالب علم بھی آنے لگے لیکن سرمایہ کافی نہ ہونے سے مدرس اچھے نہ ملے۔ تعلیم ناقص ہونے لگی۔ کچھ عرصہ بعد لوگوں کا روپیہ اور طالب علموں کی عمریں دونوں ضائع ہوگئیں وہ یہ نہ سمجھے کہ مدرسے بنانے سے آدمی سید احمد خاں نہیں بنتا۔ بلکہ مدرسہ قائم کرنے سے ہزار درجہ یہ بہتر ہے کہ یہ روپیہ جو اس طرح رائیگاں کیا جاتا ہے وظائف دینے میں صرف کیا جائے تاکہ کم استطاعت اور ہونہار طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے ملک کا نام کریں۔ جو مدارس اس وقت موجود ہیں ہمیں انہیں سے کام لینا چاہیے وہ ہماری ضروریات کے لئے بالکل کافی ہیں۔ ہم اُن پر اس قدر صرف نہیں کرسکتے جو سرکار کرتی ہے اور اس لئے اگر ہم غریب اور ہونہار طالب علموں کی وظائف سے اعانت کریں تو وہ بہت زیادہ مفید ہوگا۔

حضرات! آپ نے تاریخ میں مطالعہ کیا ہوگا کہ بعض اوقات ایک ایسا فرد کامل نکل آتا ہے جو ملک و قوم میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا کردیتا ہے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کی کایا پلٹ ہوجاتی ہے اور سارا دلدر دور ہوجاتا ہے کیا تعجب ہے کہ جو سرمایہ ہم جمع کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے صرفہ سے انہیں غریب طالب علموں میں ایک ایسا جوہر قابل نکل آئے جو ہمارے ملک کی اصلاح کے لئے ایسی سعی کرے جس سے تمام اہل وطن کو اور

آئندہ نسلوں کو فائدہ پہونچے اور ہم معراج ترقی تک پہونچ سکیں۔ ایسا شخص اگر لاکھوں اور کروڑوں روپیہ کے صرفہ سے بھی حاصل ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ بہت سستا ہے۔ ہم اگر چاہتے ہیں کہ آگے بڑھیں۔ ہماری اگر یہ تمنا ہے کہ ہمارا ملک ترقی کرے تو ہمیں غریب مگر محنتی اور ذہین اور ہونہار طلبہ کی اعانت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیے کیونکہ انہیں میں سے کچھ لوگ ایسے پیدا ہو جائینگے جو چراغ ہدایت اور دلیل راہ کا کام دینگے فقط

(منقول از روئداد انجمن ترقی تعلیم حیدرآباد

۲۷ر و ۲۸ فروری ۱۳۲۶ف صفحہ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ و ۲۲۱)

مفت تعلیم کے مسئلہ کو پیش کرنے والوں میں بھی مولوی صاحب سب سے آگے تھے، انہوں نے اس مسئلہ کی ضرورت کو کس شدت سے محسوس کیا ہے۔ اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے کیجئے افسوس کہ روداد میں مکمل تقریر نہیں۔ صرف خلاصہ دیا گیا ہے۔ لہٰذا وہی درج ذیل ہے

خلاصہ تقریر مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے

فری ایجوکیشن کا مسئلہ جو اب اس وقت کانفرنس کے روبرو پیش ہے دراصل کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے نہ صرف باہر کے لئے بلکہ یہاں بھی ۱۳۱۱ف میں ہی اس مسئلہ نے ایک حد تک مکمل صورت اختیار کر لی تھی اس وقت یہاں ایک ایجوکیشنل بورڈ بھی تھا جس میں یہ مسئلہ پیش ہوا اور اس نے طے کر دیا تھا کہ ابتدائی تعلیم مفت ہونی چاہئے۔ لیکن اتفاقات سے ابھی تک یہ مسئلہ عملی طور پر صورت پذیر نہیں ہوا ہے کہا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ قبل از وقت ہے اور اس کی بڑی دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب تک خود پبلک کی طرف سے مطالبہ نہ ہو تعلیم مفت نہ ہونی چاہئے۔ لیکن اس دلیل کی صحت تسلیم کرنے میں میری طرح غالباً اکثر عقول قاصر ہونگے۔ بہرکیف آج پبلک کی طرف سے مطالبہ اس امر کو ثابت کرنے والا ہوگا کہ اب اس کا وقت آگیا ہے۔

دوسری وجہ یہ کہی جاتی ہے کہ فیس کی وجہ سے شوق ہوتا ہے یعنی جب لوگ پیسے دیتے ہیں تو اس چیز کے حاصل کرنے کے لئے تعلیم میں بھی جی لگاتے ہیں۔ اگر تعلیم مفت دی جائیگی تو وہ قدر کر کے تعلیم بھی حاصل نہ کرینگے یہ وجہ بھی جیسی کچھ ہے ظاہر ہے اس کی تردید خود عملی طور سے اس طرح ہوتی ہے کہ اورنگ آباد کے بعض مدرسوں میں فیس معاف ہے مگر وہاں طلبا کی کوئی کمی نظر نہیں آتی بلکہ تعداد زیادہ ہے۔ چنانچہ یہاں متعدد مدرسے خاص دھیڑ مانگ وغیرہ اقوام کے لئے ہیں جن میں سرکار کی عنایت سے فیس معاف ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ باوجودیکہ ان اقوام کی آبادی بہت کم ہے لیکن ہندو مسلمان دونوں سے ان کی تعداد تعلیم بالغان زیادہ ہوتی ہے۔ ان قوموں کو صرف فیس ہی معاف نہیں

بلکہ کتابیں کاغذ دوات قلم سلیٹ وغیرہ بھی سرکار سے دی جاتی ہیں کیا ہندو مسلمان، دھیڑ اور مانگ سے بھی گئے گزرے ہوگئے جبکہ یہ قومیں زیادہ شریف ہیں تو وہ زیادہ مستحق ہیں اگر یہ وجہ صحیح تسلیم کی جائے تو لازم آئے گا کہ ان اقوام کے مدرسوں میں بھی فیس لگائی جائے جس سے اس اصول کے مطابق ان کی تعداد دگنی ہوجائے ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ یہ خیال کہ بغیر اجرت کے بھی تعلیم ہوسکتی ہے یہاں کا نہیں بلکہ باہر سے آیا ہے۔ یہ کہنا محض ناواقفی پر مبنی ہے۔ ہندو مسلمان دونوں کے پاس تعلیم کے لئے معاوضہ کا لینا گناہ ہے اور دونوں کے پاس قدیم زمانہ میں تعلیم بالکل مفت ہوتی تھی درا صل یہ خیال یہیں کا ہے اور یہاں سے باہر چلا گیا ہے فیس معاف کرنے سے سرکار کا زیادہ نقصان بھی نہیں ہے وہ لاکھوں روپیہ تعلیم کے لئے صرف کر رہی ہے ایک خفیف رقم معاف کر دینے سے ان کا کوئی ہرج نہ ہوگا بلکہ تعلیم کے فوائد عام ہوںگے بکثرت طلبہ ایسے ہیں جو کھانے پینے سے بھی محتاج ہیں لیکن شوق رکھتے ہیں کہ اس سخت غربت کی حالت میں بھی تعلیم پائیں ایسی حالت میں ہونا یہ چاہیئے کہ نہ صرف ان کی فیس معاف ہو بلکہ ان کے مایحتاج کا بھی بندوبست ہو فیس پر ان کو مجبور کرنا کسی طرح روا نہیں رکھا جا سکتا ابتدائی مدارس کی تعداد اور ان کی قلیل آمدنی مدفیس کے لحاظ سے فیس کا جاری رہنا کسی طرح مناسب نہیں کہا جا سکتا۔ میسور۔ بڑودہ۔ ٹراونکور۔ جے پور وغیرہ وغیرہ ریاستوں سے قطع نظر جنجرہ کی سی چھوٹی سی ریاست نے فیس معاف کر دی ہے تو یہاں بدرجۂ اولیٰ معاف ہونی چاہیئے۔ جہاں جہاں فیس معاف کی گئی ہے طلبہ کی تعداد میں کثرت سے اضافہ ہوا ہے بس کوئی وجہ نہیں کہ اگر یہاں بھی معاف کر دی جائے تو کیوں نہ طلبہ کی تعداد بڑھے وہ ضرور بڑھیگی۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس انجمن ترقی تعلیم حیدرآباد دکن کے دوسرے سالانہ جلسہ کی روئداد جو اورنگ آباد میں بتاریخ ۲۹، و ۳۰ فروری ۱۳۲۵ف منعقد ہوا صد ۶۱-۶۲

مولوی عبدالحق صاحب نے حکومت کو اس طرف توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ عوام سے بھی پر زور اپیل کی کہ وہ بھی اس کام میں ہاتھ بٹائیں۔ انہوں نے امراء کو بھی اس کام کے لئے آمادہ کیا اور انہیں اس حقیقت سے آشنا کیا، کہ ان کے سرمائے کا بہترین مصرف یہ ہے کہ قوم کی فلاح وبہبود کے کام آئے، اور قوم کی فلاح وبہبود اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ تعلیم کے میدان میں آگے نہ بڑھے، مولوی صاحب کی دور بین نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ مفت تعلیم کا مسئلہ صرف حکومت سے ہی حل نہیں ہوسکتا، اس کے لئے حکومت کے علاوہ عوام کے تعاون کی بھی اشد ضرورت ہے، اس مسئلہ کو بھی انہوں نے عوام کے سامنے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی پہلی نشست میں ہی پیش کیا اور پر زور دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ کسی قوم کی ترقی کے لئے عوام کا تعلیم یافتہ ہونا کس قدر ضروری ہے، مولوی صاحب نے حاضرین کو ان الفاظ میں مخاطب کیا۔

تقریر مولوی عبدالحق صاحب مہتمم تعلیمات اورنگ آباد

جناب صدر مجلس و اہل کانفرنس!

جو تحریک اس وقت آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے وہ اس قدر مفید اور اہم ہے کہ مجھے مطلق اس امر کا اندیشہ نہیں ہے کہ اس بھری مجلس میں کوئی ایک شخص بھی اس سے اختلاف کریگا۔ کیونکہ ملک کی آئندہ بہبودی و فلاح ان نوجوانوں پر ہے جو تعلیم حاصل کرکے کارزار زندگی میں آئینگے۔

جن حضرات نے بیس پچیس سال قبل تعلیم پائی ہے انہیں معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں تعلیم کس قدر سستی تھی لیکن اب جس طرح اور اشیا مہنگی ہوتی جاتی ہیں تعلیم بھی روز بروز گراں ہوتی جاتی ہے اور ایک متوسط الحال شخص اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم کسی طرح نہیں دلا سکتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض ہونہار طالب علم معمولی تعلیم پاکر رہ جاتے ہیں اور آگے قدم نہیں بڑھا سکتے جو ملک کے حق میں سراسر مضر ہے۔

سرکار نے مدارس قایم کیے ہیں اور تعلیم کی اشاعت اور توسیع میں برابر کوشش کی جارہی ہے وظائف بھی دیے جاتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ سرکار ان تمام طالب علموں کی امداد کرسکے۔ اور نہ شاید سرکار اس کا بخوبی انتظام کرسکتی ہے اس لیے اہل ملک کا فرض ہے کہ وہ ایسے ہونہار کم استطاعت طلبہ کی تعلیم کا انتظام اپنے ذمہ لیں۔ جو لوگ تعلیم یافتہ ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ اس نیک کام میں سب سے بڑھ کر حصہ لیں۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو علم کی سچی قدر کرسکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے ملک کو کس قدر فایدہ پہونچے گا۔ اور جو لوگ کہ صاحب جاہ و ثروت ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کے غریب اور ہونہار طلبہ کی حوصلہ افزائی کریں۔ اُن کی اعلیٰ تعلیم میں اپنی دولت کا ایک حصہ صرف فرمائیں۔ کیونکہ خدا نے جو دولت انہیں عطا کی ہے اس کے شکریہ کا سب سے بہتر یہی طریقہ ہے۔ نیز انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ جو دولت اس وقت اُن کے قبضہ میں ہے وہ کہاں سے آئی اور کس کس طریقہ سے آئی ہے اور اُن تک پہونچانے میں ہزاروں اور لاکھوں غربا نے محنت و مشقت کی ہے اس لئے انہیں ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ساری دولت اپنے اوپر صرف کریں اس میں دوسروں کا حصہ بھی شریک ہے اور کم سے کم اس کا ایک حصہ اُن تک پہونچانا چاہئے۔ جنہوں نے ان کے دولت مند بنانے میں اپنا خون اور پسینہ ایک کردیا ہے اور اس کا سب سے بہتر اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ ملک کے ان ہونہار اور کم استطاعت بچوں کی امداد کی جائے۔ جو بوجہ افلاس اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ گویا یہی سارے ملک کی زبان ہے۔ اور اس لیے وہ تمام ملک کے باشندوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کا اعلیٰ ذریعہ ہے۔ کیونکہ تمام اقوام کے اتحاد سے وہ پیدا ہوئی، بڑھی اور پھلی پھولی ہے۔ غیر زبانوں کے میل سے اس کی شان اور دوبالا ہوگئی بندی

الفاظ میں دل نشینی کی شان ہے تو عربی فارسی الفاظ میں شان و شوکت۔ غرض اس میل سے اس میں ہر قسم کے خیالات کے اظہار کی صلاحیت اور وسعت پیدا ہو گئی۔ اور اس قابل ہے کہ اس میں علوم و فنون کے ترجمے کیے جائیں۔

حضرات! انگریزی ہر شخص کی زبان نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان میں کس قدر لوگ ہیں جو انگریزی جانتے ہیں۔ اور ممالک محروسہ میں تو اس سے بھی کم ہیں فارسی زبان جو اس قدر غیر نہ تھی اور جو صدہا سال تک سرکاری اور درباری زبان رہی۔ جب وہی مادری زبان نہ بن سکی تو انگریزی کا ملکی زبان بننا محال ہے۔ انگریزی زبان اور یورپین علوم و فنون کی تعلیم جاری رہے اور ایک انگریزی ہی نہیں بلکہ میری تمنا ہے کہ میرے ہموطن ہفت زبان بلکہ ہفتاد زبان ہوں لیکن اس لیے کہ وہ اپنی زبان کو علم سے مالا مال کریں۔ جو لوگ کہ تعلیم یافتہ ہیں یا جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ .... انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ان پر بڑی ذمہ داری ہے انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ جو علم انہوں نے حاصل کیا ہے وہ صرف ذاتی تقریر اور نمود و نمایش کے لئے نہیں ہے بلکہ ان کا فرض ہے کہ جو کچھ انہوں نے حاصل کیا ہے۔ وہ دوسروں تک پہونچائیں اور اپنی زبان کو علمی زبان بنانے کی کوشش کریں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ جس طرح ہم نے بہت سی عزیز چیزیں ضائع کر دی ہیں اپنی عزیز زبان کو بھی ہات سے کھو دیں۔

حضرات! یہ وہ زمانہ ہے کہ بے زبان جانوروں اور پرانے کھنڈروں پر لاکھوں اور کروڑوں روپیہ صرف کیے جاتے ہیں۔ کیا ایک ایسی زبان کو ترقی دینے اور زندہ رکھنے کے لیے جسے کروڑوں بندگان خدا بولتے ہیں، سالانہ کچھ زیادہ رقم ہے، یہ کچھ بھی نہیں۔ اور اگر آپ اس تجویز کو منظور کریں اور سرکار سے درخواست کریں تو یقین ہے کہ سرکار ہماری التجا کو ضرور پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گی۔ سرکار نے اس سے بہت پہلے اس ضرورت کو محسوس کیا تھا اور صرف کثیر سے ایک سر رشتہ علوم و فنون قائم کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ بعض وجوہ سے قایم نہ رہ سکا شاید وہ قبل از وقت تھا لیکن اب اس کا وقت آگیا ہے۔ لوگوں میں عام طور سے بیداری پیدا ہو گئی ہے اور ملک کے تعلیم یافتہ اور پر جوش اصحاب اس کام کو کرنے کے لئے مستعد ہیں۔ اور اس لیے کامل اور قوی امید ہے کہ یہ روپیہ اب زیادہ احتیاط اور خوبی کے ساتھ ملک کی خدمت میں اور ترقی میں صرف ہوگا۔ اب ہم پر لازم ہے کہ اس کام کو بہر زمانہ کیا جائے اور ثابت کر دیا جائے کہ اپنے ملک کو علم کی روشنی سے منور کرنا چاہتے ہیں۔

مجھے پورا وثوق ہے کہ آپ صاحب جو ملک کی فلاح و بہبودی کی تدابیر سوچنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ میری اس تحریک سے کامل اتفاق فرمائینگے۔

منقول از:- حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس انجمن ترقی تعلیم حیدر آباد کے پہلے سالانہ جلسہ کی روداد جو حیدر آباد دکن ۲۷ و ۲۸ فروری ۱۳۲۴ف کو منعقد ہوا - صہ ۶۸ - ۶۹ - ۷۰ - ۷۱

مولوی عبدالحق صاحب، حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی سرگرمیوں میں ہمیشہ حصہ لیتے رہے، لیکن افسوس ہے کہ بقیہ اجلاس کی روبدادیں نہیں مل سکیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا۔ کہ مولوی صاحب نے ان مجالس میں کن کن امور کی طرف توجہ دلائی، بہرحال انہیں چند تقاریر سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کتنی گراں قدر خدمات سرانجام دیں، اور انہوں نے جو مسئلہ بھی اٹھایا، وہ کتنی اہمیت کا حامل تھا۔ اگر صرف ان کی اس قدر خدمات ہی ہوں تو بھی ہر خدمات ناقابل فراموش ہیں: مفت تعلیم، اردو زبان میں تدریس، اور اردو میں علوم و فنون کے منتقل کرنے اور اردو علوم کے کتب خانہ کے قیام کی کس قدر ضرورت تھی، اس کی اہمیت جتانے کی ضرورت نہیں، یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سرسید کے بعد مسلمانوں میں صرف ایک شخصیت ایسی نظر آتی ہے جس نے قوم کی ترقی کے لئے ہر چیز کو تج دیا۔ اور وہ شخصیت مولوی عبدالحق صاحب کی ہے۔ شاید مستقبل میں کوئی ایسی شخصیت ابھرے، لیکن فی الحال تو ایسی شخصیت کا کہیں دور دور تک نام و نشان دکھائی نہیں دیتا۔

خالص زبان

زبان کے خالص ہونے کا خیال درحقیقت سیاسی ہے لسانی نہیں۔ اس کا باعث قومیت کا بے جا فخر اور سیاسی نفرت ہے۔ جرمنوں نے فرانسیسی لفظوں کے خلاف جہاد کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مدت تک ان کے ملک میں فرانس کا ادبی اور سیاسی تسلّط رہا۔ یہ خیال ان کے دل میں کھٹکتا تھا اور اس غصّے میں انہوں نے فرانسیسی لفظ نکالنے شروع کیے۔ اسی طرح اور اسی بنیاد پر زکس نے جرمنی لفظوں اور یونانیوں نے ترکی لفظوں کا اخراج شروع کیا۔ سیواجی کے زمانے میں مرہٹی سے فارسی لفظوں کے خارج کرنے کی تحریک ہوئی۔ آئرلینڈ میں محض انگریزوں کی مخالفت میں آئرش زبان کے زندہ کرنے کی جدوجہد جاری ہوئی۔ ترکوں نے عربی فارسی لفظوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ ایرانیوں نے بھی ایک زمانے میں عربی لفظوں کے نکال دینے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہے۔ مگر اب ترکوں کی دیکھا دیکھی عربی لفظوں کے نکال دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ ان سب کی تہ میں سیاسی غم و غصہ ہے اگر بدگمانی نہ سمجھی جائے تو غالباً یہی خیال بعض جماعتوں میں ہماری زبان سے عربی فارسی الفاظ کے اخراج کا محرک ہے۔ لفظ جب ایک بار زبان میں آگیا اور رائج ہوگیا تو وہ ہمارا ہو جاتا ہے، غیر نہیں رہتا۔ اسے غیر سمجھ کر نکال دینا سخت بے دردی ہے۔ وہ اب جائے تو کہاں جائے۔ کیوں کہ اب اس کا رنگ روپ بدل گیا ہے۔ بعض وقت اس کا تلفظ اور مفہوم بھی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ اصلی وطن میں تو اس کا ٹھکانا نہیں رہا اور یہاں سے دیس نکالا مل گیا۔ اس کی حالت یہودیوں کی سی ہو جاتی ہے یعنی نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ نہ گھرانہ در برا۔ زبان میں یہ ہٹلری جائز نہیں۔ (خطبات ص ۴۷۰-۴۷۱)

گلڈ اشاعت گھر کی مطبوعات

چائے والا

(ناول) اے حمید۔ قیمت : ۔ ۴ روپے

اے حمید کی نثر میں پھولوں کی شگفتگی اور چاندنی راتوں کی دلکشی ہے وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے اپنے ناولوں کا تانا بانا بنتا ہے مصوروں کی طرح ان میں رنگ بھرتا اور سنگتراشوں کی طرح اپنے کرداروں کی نوک پلک کو درست کرتا ہے۔

"چائے والا" اس کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ اردو کا ایک خوبصورت ناول

تھکے ہارے

خدیجہ مستور :۔ اردو افسانے کا کوئی تذکرہ خدیجہ مستور کے بغیر نامکمل ہے وہ ان افسانہ نگاروں میں ہیں جنہوں نے اردو افسانے کو آگے بڑھایا اور شہرت دوام بخشی "تھکے ہارے" انکے نئے افسانوں کا مجموعہ ہے ان افسانوں میں روح عصر بھی ہے اور چابکدستی بھی قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے

پاکستانی شاعری (انگریزی)

مترجمہ۔ جی الانا :۔ پاکستانی شاعری کا ایک نمائندہ انتخاب جس کو انگریزی زبان میں پہلی بار کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ مسٹر جی الانا جو خود بھی انگریزی کے خوش گو شاعر ہیں، انہوں نے اس انتخاب کو مرتب کیا ہے۔ صفحات ۲۰۶۔ قیمت دس روپے

ہفت کشور

جعفر طاہر : صفحات ۲۳۵۔ قیمت ۷ روپے

جعفر طاہر کا پہلا مجموعہ جس پر ۱۹۶۲ء کا آدم جی انعام ملا۔ جعفر طاہر جدید شاعری کی آبرو ہے اور "ہفت کشور" سنگ میل ہے

جاگتے جزیرے

احسن احمد اشک : قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے۔ اشک کی شاعری ارض پاکستان کے اس خطے کی شاعری ہے جو گنگناتی ندیوں اور لہلہاتے کھیتوں کی سرزمین ہے، ان افسانوں کا نغمہ ہے جنکی زندگی میں دکھ بھی ہے اور سکھ بھی بنگلہ دیس کے اردو شاعر اشک کے پچیس سالہ مشق سخن کا حاصل ہے۔

پوز پری آکاس

شیخ ایاز کے سندھی کلام کا مجموعہ وادیٔ مہران کے خوش گو شاعر شیخ ایاز کا سندھی ادب میں ایک ممتاز درجہ ہے اور ان کا یہ مجموعہ سندھی شاعری میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ قیمت ۸ روپے ۲۵ پیسے

پنجابی لوک کہانیاں

مرتب و مترجم شفیع عقیل۔ شفیع عقیل۔ اردو کے ممتاز ادیب و صحافی ہیں انہوں نے پنجابی لوک کہانیوں کا یہ مجموعہ بڑی محنت و جد و جہد سے مرتب کیا ہے اور اردو ادب میں ان کہانیوں سے ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے یہ نیا باب اردو کے ذخیرے میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ (زیر طبع)

ہاڑے

سائیں فیروز کے پنجابی کلام کا مجموعہ

سائیں فیروز پانچ دریاؤں کے دیس پنجاب کا شاعر ہے اس کی شاعری میں فن کی عظمت اور زندگی کی ہلچل اور گہما گہمی ہے

قیمت :۔ ۳ روپے ۵۰ پیسے

گلڈ اشاعت گھر۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

ادارہ

رسالہ حسن اور بابائے اردو

بابائے اردو کی ادبی زندگی کا آغاز ۸۸ - ۱۸۸۷ء سے ہوتا ہے جب کہ اُن کی عمر ۱۷-۱۸ سال تھی - اُن کے ابتدائی مضامین "تمر مور گزٹ"، "محمڈن نیشنل میگزین" اور "حسن" وغیرہ میں شائع ہوئے - اول الذکر دو جریدوں کے دو مضامین "گندم" اور "مذاق" ۔ "نورس"، عبدالحق نمبر اور بعد ازاں "ہم قلم" عبدالحق نمبر میں شائع ہو چکے ہیں - رسالہ "حسن" میں بھی ان کے مضامین شائع ہوئے، جن میں سے ایک "قاہرہ کی مسجد عمرو" دستیاب ہوا ہے - یہ مضمون جون ۱۸۹۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا - جبکہ بابائے اردو مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں بی - اے کے طالب علم تھے -

رسالہ "حسن" کا شمار اردو کے اُن چند علمی رسالوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے اردو خواں طبقے میں علمی ذوق پیدا کیا - یہ رسالہ ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۷ء) میں حسن بن عبداللہ عماد نواز جنگ نے حیدر آباد سے جاری کیا - سات سال تک یہ ماہوار رسالہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا - اس رسالے کو اس زمانے کے تقریباً تمام ممتاز ادیبوں کا تعاون حاصل تھا - بابائے اردو نے اس رسالے کے عمدہ مضامین کا انتخاب شائع کیا - یہ انتخاب ۲۰×۲۶/۸ سائز کے ۲۰۳ صفحات پر مشتمل ہے - اس انتخاب کی تاریخ طباعت معلوم نہ ہو سکی - قیاس ہے کہ ۱۹۱۰ء سے پہلے شائع ہوا - اس میں حسب ذیل مضامین شامل ہیں -

۱ - ابن رشد اور اس کے ہمعصر	نواب عماد الملک مولوی سید حسین
۲ - علم اللسان	شمس العلماء مولوی سید علی
۳ - طلسم اعضائے انسانی	شمس العلماء مولوی سید علی
۴ - قبل از اسلام اہل عرب کا حال	مولوی محمد ذکاء اللہ
۵ - تاج محل آگرہ	نواب عماد نواب جنگ بہادر
۶ - قد آدم	محمد عبدالکریم خاں صاحب آزاد

۷۔ نیچر کی چیزوں کی تسخیر میں ہزار درجہ زیادہ
فائدہ ملکوں کی تسخیر سے ہے — مولوی ذکاءاللہ
۸۔ النظر فی التاریخ — مولوی غلام الثقلین ۔ بی ۔ اے ۔ بی ایل

انتخاب کے شروع میں آٹھ صفحات کا دیباچہ ہے جو بابائے اردو کے قلم سے ہے ۔ یہ شاید بابائے اردو کا پہلا دیباچہ ہے ۔ ذیل میں یہ دیباچہ اور مذکورہ مضمون شائع کئے جاتے ہیں ۔

دیباچہ انتخاب حسن

بلاشبہ پریس کا موجد دنیا کا محسن گزرا ہے اس زمانہ کی تہذیب و شائستگی کا بڑا انحصار پریس پر ہے اگر آج یہ صفحہ ہستی پر سے ناپید ہو جائے تو پھر دنیا کی جیسی بدتر حالت ہو جائیگی اُس کی تصویر ہر ایک سمجھ دار شخص اپنے خیال میں کھینچ سکتا ہے ۔

یہ اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایسا زمانہ ملا ہے جو پریس کا زمانہ ہے اور جس میں کسی زبان کا ترقی کرنا بہ نسبت قدیم زمانہ کے بہت آسان ہے ۔ اردو میں اس وقت بڑی ضرورت ایسے لوگوں کی ہے جو مغربی علوم کے خزانے یہاں لاکر بچھا دیں اسے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو اس میں ایسی قوت پیدا کر دیں کہ اعلیٰ اور دقیق مضامین بلند اور نازک خیالات بآسانی ادا ہو سکیں ۔ اسے ان لوگوں کی ضرورت ہے جو اس کی نظم و نثر میں حسن و تناسب فصاحت و بلاغت جوش اور خصوصاً وسعت پیدا کر دیں اور پھیکے ۔ پژمردہ رکیک اور نکمی نظم و نثر اور بیہودہ اور لغو فسانوں اور ناولوں کے پنجہ سے آزاد کریں ۔

اس کام کے لئے ملک کو علاوہ اعلیٰ تصانیف کے بڑی ضرورت علمی میگزینوں یا رسالوں کی ہے ۔ ان رسالوں میں ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ مختلف خیالات اور مضامین کو معقول طور پر چند صفحوں میں بیان کر سکتے ہیں بہت سے مضمون ایسے ہوتے ہیں انہیں الگ کتاب کی صورت میں شائع کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔ میگزینوں میں وہ بلا تکلف درج ہو کر شائع ہو سکتے ہیں ۔ اکثر ملک و قوم کی بہبودی یا اصلاح کے لئے وقتاً فوقتاً خیالات اظہار کرنے پڑتے ہیں یا کسی قسم کی نئی تحریک کرنی پڑتی ہے تو ان کی اشاعت کا ذریعہ میگزین سے بڑھکر اور کوئی نہیں ۔ علاوہ اس کے ناظرین کو بھی مختلف وجوہ سے میگزینوں کے پڑھنے میں زیادہ آسانی اور دلچسپی ہوتی ہے بہ نسبت کتابیں پڑھنے کے ۔ اور اس لئے عمدہ میگزین کا اثر ملک پر بہت قوی اور پائیدار ہوتا ہے اور اگر اس کی زبان اور مضمون بھی فی الحقیقت اعلیٰ درجہ کے ہوں تو وہ ملک کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ اور خصوصاً ہمارے ملک کے لئے جو اس کا بے انتہا محتاج ہے ۔

اس موقع پر اگر میں اردو کے اس میگزین کا ذکر نہ کروں تو غلطی ہوگی جس نے اردو زبان اور ادب اور مسلمانوں پر ایسا قوی اثر ڈالا جو اب تک باقی ہے اور عرصہ دراز تک باقی رہے گا ۔ جس شخص نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب یہ بے مثل میگزین جاری ہوا اور نیز اسے بھی دیکھا ہے جس نے جاری کیا ۔ جس کی نظروں میں اس تیرہ و تاریک زمانہ کا تعصب جہالت تنفر اور طوفان

مخالفت سمایا ہوا ہے وہی کچھ اس کی اصلی قدر و منزلت کرسکتا ہے۔ اور جو لطف اسے آتا ہے وہ دوسرے کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے گو وہ طوفان اب ہوا ہو گیا ہے۔ لیکن اس کی فصیح اور پرجوش تحریریں اب تک پڑھنے والوں کے دلوں پر اثر کرتی ہیں اور کرتی رہیں گی۔ سرسید کا یہ ایک بڑا کام تھا اور ان کے خیالات کے اظہار کا آلہ بھی تہذیب الاخلاق کا پرچہ تھا۔ کوتہ اندیش لوگوں نے اس کی مخالفت میں کئی پرچے جاری کئے۔ لیکن بجائے اس کے کہ اسے کمزور کرتے اس کی قوت اور بڑھ گئی اور اس کا جوش اور زور دن بدن بڑھتا گیا۔ سچ کی رونق مخالفت سے بھی ایسی ہی بڑھتی ہے جیسے تائید سے بلکہ مخالفت سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔

اس پرچہ نے مسلمانوں کے خیالات اور اردو زبان میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور اس لحاظ سے یہ پرچہ اپنا نظیر آپ ہے اس کا اردو زبان کے کسی دوسرے میگزین سے مقابلہ کرنا۔ بعینہ ایسا ہے جیسے خالص سونے کی انگوٹھی کا مقابلہ ملمع کی انگوٹھی سے اس میں ہزار آب تاب ہو لیکن سونے کی بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس زمانہ میں کوئی میگزین اس سے زیادہ خوبی اور لیاقت کے ساتھ جاری ہو لیکن وہ جوش خروش وہ پر آشوب زمانہ اور خصوصاً سرسید کا سادہ زبردست دل و دماغ کہاں سے آئے گا۔

شبے مجنوں بہ لیلیٰ گفت کائے محبوب بے ہمتا
ترا عاشق شود پیدا ولے مجنوں نخواہد شد

لیکن اس میں شک نہیں کہ تہذیب الاخلاق کے بعد علمی رسالہ کی حیثیت سے حسن ہی ایک ایسا رسالہ تھا جو اس کے جانشین ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے بلکہ اسے کئی ایک لحاظ سے تفوق حاصل تھا۔ ایک تو یہ کہ اس میں لکھنے والے بعض ایسے نامور اہل قلم ہیں۔ جن کے علم و فضل پر ملک و قوم کو ناز ہے مثلاً فاضل اجل عالیجناب نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی بی۔ اے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ریاست حیدر آباد اور عالیجناب شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی بی۔ اے ایل بی وغیرہ وغیرہ جن کے بے بہا مضامین اس مجموعہ میں درج ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے زور قلم سے خود تہذیب الاخلاق محروم رہا یہ مضامین فی الحقیقت اس قابل ہیں کہ بار بار چھاپے جائیں اور ملک میں شائع کئے جائیں یہ محققانہ اور فاضلانہ مضامین اردو لٹریچر میں اپنی نظیر آپ ہیں اور سوائے رسالہ حسن کے دوسری جگہ نظر نہیں آتے۔

دوسرے تہذیب الاخلاق کا مقصد خاص تھا اور حسن کا عام تہذیب الاخلاق کے مضامین کا دائرہ بہت محدود تھا مگر حسن کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا اس میں ہر علم و فن کے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے چنانچہ مذہبی تاریخی سوشل، تمدنی ملکی (پولیٹیکل) محققانہ مضامین ہر قسم کے پائے جاتے ہیں۔

تیسرے چونکہ ہر ماہ سب سے عمدہ مضمون کے لئے ایک اشرفی نذر کی جاتی تھی اس لئے بہت عمدہ عمدہ مضامین ایسے آجاتے تھے جو کسی اور میگزین کو نصیب نہیں ہو سکتے تھے۔

حسن کے بعد اردو زبان میں کوئی قابل وقعت میگزین نہیں رہا اگرچہ تہذیب الاخلاق مرحوم نے پھر ایک بار جنم لیا

مگر نظر بد نے اسے نہ چھوڑا پھر بند ہو گیا اس کے بعد کچھ عرصہ تک سناٹا رہا اب پھر بعض بے چین دلوں میں گدگدی اٹھی ہے ایک دو میگزین بھی جاری ہوئے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ ان کے رنگ ڈھنگ بھی اچھے ہیں۔ دیکھئے کب تک رہتے ہیں خدا ان کی عمر میں برکت دے۔

لیکن ان رسالوں میں بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ بہت سی علمی تحقیقاتیں جو مدتوں کے مطالعہ اور محنت کے بعد تحریر کیجاتی ہیں ایک دفعہ چھپ کر ایسی گم ہو جاتی ہیں کہ ڈھونڈے سے نہیں ملتیں۔ اردو جو پہلے ہی سے کم بضاعت ہے اس میں ایسی تحریروں کا ہونا مغتنمات سے ہے خصوصاً ان حضرات کے لئے جنہیں علمی مضامین پڑھنے اور لکھنے کا شوق ہے اور جو یہ چاہتے ہیں کہ ہماری زبان بھی رفتہ رفتہ دنیا کی وسیع اور اعلیٰ زبانوں میں شمار کی جائے۔ اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ یہ بیش قیمت موتی جو زمانہ کی ناقدردانی اور کچھ اپنی غفلت سے کنکروں اور ٹھیکریوں کے ساتھ خس و خاشاک میں پڑے ہیں ایک بار پھر پبلک کے سامنے پیش کئے جائیں۔ پرکھنے والے پرکھیں گے اور قدر دان سر اور آنکھوں پر رکھیں گے۔ ہم یہاں جناب نواب عماد نواز جنگ بہادر (حسن بن عبداللہ) کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اپنی عنایت سے اس انتخاب کے چھاپنے کی اجازت دی۔

اس بات کا لکھدینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ میں کل وہی مضامین نہیں ہیں جن پر انعام دیا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض مضامین ایسے بھی ہیں جو اس قابل نہیں کہ انہیں دوبارہ چھاپا جائے۔ انتخاب کیوقت اس امر کا زیادہ تر لحاظ رکھا گیا ہے کہ صرف وہی مضامین منتخب کئے جائیں جن میں کوئی خاص علمی بات ہے یا جنکا شائع کرنا ملک کے لئے مفید ہوگا۔

عبدالحق بی۔ اے
حیدرآباد دکن

قاہرہ کی مسجد عمرو

گو اسلامی سلطنتیں دنیا سے قریب قریب مٹ چکی ہیں۔ اور وہ پرانی تزک و شان صرف قصے کہانیوں میں رہ گئی ہے مگر پھر بھی اس زمانہ کی یادگاریں اور عظیم الشان عمارتیں اُن لوگوں کا نشان دے رہی ہیں۔ گو وہ خود مٹنے کو ہیں۔ مگر اُن مٹے ہوؤں کا پتہ کچھ ان ہی سے لگ سکتا ہے یہ چیزیں دیکھ دیکھکر یا ان کے حالات پڑھ کر دل میں کسی قدر مسرت پیدا ہوتی ہے کہ ہم بھی کچھ تھے مگر مسرت کیسی یوں کہئے کہ پرانے زمانہ کا خیال آتے ہی اپنی اور اپنے بزرگوں کی حالت کا مقابلہ کر کے کچھ تھوڑی دیر کے لئے رو لیتے ہیں ؎

ہم نے مانا بھی کہ یہ دل سے بھلا دیں قصے — یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے — دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے

کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد مگر
یادگاروں کو زمانہ سے مٹادیں کیونکر

اس وقت ہم مسلمانوں کی ایک مشہور عمارت - خانہ خدا یعنی "قاہرہ کی مسجد عمرو" کے تاریخی حالات لکھتے ہیں جو ہمیں امید ہے کہ دلچسپی سے خالی نہ ہونگے۔

ہجری کے بیسویں سال (۶۴۱ء) حضرت عمرؓ کی خلافت میں عمرو بن العاصؓ نے مصر پر لشکرکشی کی۔ پہلی شاہی جمعیت جس نے اسلامی فوج کا مقابلہ کیا۔ اس قلعہ کی فوج تھی جس کے قرب میں ایک ایسی اسلامی عمارت بننے والی تھی جس میں اُس "وحدہٗ لاشریک لہٗ" کے نام کی گونج اب تک سُنائی دے رہی ہے اس محاصرہ کے حالات مختلف روائتوں نے اس قدر پیچیدہ کر دیئے ہیں۔ کہ ہم اس کا کچھ فیصلہ نہیں کرسکتے۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ خواہ یہ محاصرہ ایک مہینے تک رہا ہو یا سات مہینے تک۔ آخر کار محصورین نے اپنے آپ کو اس مسلمان سپہ سالار کے حوالے کر دیا۔

اب اس نے اپنے لشکر کا رُخ اسکندریہ کی طرف پھیرا۔ کہتے ہیں کہ جب شمال کی طرف مارچ کرنے کے لئے خیمے وغیرہ اکھاڑے جا رہے تھے۔ تو معلوم ہوا کہ عمرو کے خیمے میں ایک قمری نے گھونسلا بنا لیا ہے مہمان نوازی کے خیال سے جو اُن لوگوں کی گھٹی میں شامل تھا حکم دیا کہ اس خیمے کو ہاتھ تک نہ لگے اور یونہی گھڑا رہنے دیں۔ اور چنانچہ جب وہ اسکندریہ سے واپس آیا تو اس خیمے کو وہیں پایا اور اس جگہ ایک شہر آباد کیا۔ جس کا نام الفسطاط (خیمہ) رکھا۔

اُس وقت اگر قلعہ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر آس پاس کا سین دیکھا جاتا، تو آج کل کے سین سے بالکل مختلف نظر آتا۔ دریائے نیل کا رُخ اُن دنوں کسی قدر مشرق کی طرف تھا۔ اور سیدھا قلعہ کے مغرب کی طرف کو بہتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے مغربی دروازے سے ہم کشتی میں بیٹھ سکتے تھے۔ مگر آج کل کے قلعے اور دریا میں پورے ایک چوتھائی میل کا فاصلہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ نیا گاؤں جو آج کل ہم خشک زمین پر آباد دیکھتے ہیں کسی دن پانی میں تھا۔ قلعہ سے آگے بڑھ کر عیسائیوں کی چند عبادت گاہیں نظر آتی تھیں۔ چند تو نئی قاہرہ کی حدود کی شمال و مغرب کو اور کچھ جنوب کی طرف واقع تھیں۔ اس وسیع میدان میں جو قلعہ کے جنوب اور مشرق کی طرف واقع ہے۔ آج کل چند ٹوٹی پھوٹی قبریں نظر آتی ہیں۔ مگر اُس وقت یہ ایک لق و دق میدان تھا۔ جس میں کہیں کہیں مزروعہ زمین کے ٹکڑے دکھائی دیتے تھے۔ اور علاوہ اُن چند مکانوں کے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے کوئی عمارت کا نشان نظر نہیں آتا۔

قلعہ کے ذرا شمال کی طرف گھاس کا ایک قطعہ تھا جس میں انگور کی بیلیں اور چند درخت لگے ہوئے تھے یہاں عمرو کی فوج کے ایک بہادر سپاہی کیسہ ابن کلثوم نے محاصرہ کے وقت اپنا خیمہ لگایا۔ اور جب وہ لوگ فتح اسکندریہ کے بعد واپس آئے تو اُس نے اپنی وہی پرانی جگہ پسند کی۔ مگر عمرو کا مکان اُس سے کسی قدر مشرق کی طرف واقع تھا۔ اسی اثنار میں مسلمانوں کے معزز خلیفہ حضرت عمرؓ نے تمام نئے فتح کئے ہوئے ملکوں کے حاکموں کے نام یہ احکام جاری کئے کہ وہ اپنے

اپنے صوبوں میں مسجدیں بنوائیں۔ چنانچہ عمرو کے نام بھی یہ حکم صادر ہوا۔ کہ وہ دریائے نیل کے ساحل پر ایک مسجد تعمیر کرائے عموماً لوگوں کی یہ رائے تھی کہ اس عمارت کے لئے کیسبہ کے مکان اور باغ سے عمدہ اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے عمرو نے اس سے یہ درخواست کی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کے بدلے میں جو جگہ وہ پسند کرے میں دینے کو تیار ہوں۔ مگر کیسبہ نے اپنی خوشی سے وہ زمین مسلمانوں کی عبادت گاہ کے لئے دیدی۔ اس دریا دلی کی تعریف میں جو نظم اس وقت لکھی گئی تھی اب تک موجود ہے۔ اس لئے اس عالیشان مسجد کی بنیاد اسی جگہ پر ۲۱ ہجری ۶۴۲ء میں رکھی گئی۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس ایک ایسے شخص کی شہادت موجود ہے جس نے اس مسجد کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جس کا رقبہ وہ لکھتا ہے ۵۰ درع العمل × ۳۰ درع العمل ہے جس کے چاروں طرف ایک سڑک تھی۔ اور چھ دروازے تھے جن میں سے دو عمرو کے مکان کے مقابل تھے (یعنی مشرق کو) دو شمال کو اور دو مغرب کو۔ اور اس طرح جنوب کی طرف کی جگہ بند تھی۔ جو قبلہ کا رُخ تھا۔ جس کی طرف نماز پڑھتے وقت تمام دنیا کے مسلمانوں کے منہ پھرتے ہیں۔ مسجد کی چھت بہت نیچی تھی اور فرش پتھر وغیرہ کا بنا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ صرف چھوٹے چھوٹے کنکر پڑے تھے۔ کہتے ہیں کہ قبلہ رکھتے وقت پیغمبر خدا کے ۸۰ اسّی صحابی موجود تھے۔ جو مسلمانوں کی نظروں میں اس کی وقعت اور تقدس کو اور بڑھا دیتا ہے۔ مگر اس مسجد میں ایک نہایت ہی تعجب انگیز بات یہ تھی کہ اس میں اور مسجدوں کی طرح جو ہم آج کل دیکھتے ہیں محراب بالکل نہ تھی۔ میرا اس سے مطلب یہ ہے کہ وہاں کوئی اندر سے خالی محراب جو عموماً ہم دیکھتے ہیں نہیں تھی۔ مگر بجائے اس کے یہاں کچھ نہ کچھ ضرور تھا جس سے مکہ کا رُخ معلوم ہوتا تھا مگر ہاں عمرو نے ایک ممبر ضرور رکھا تھا جس کی نسبت حضرت عمرؓ نے اٹھا دینے کا حکم دیا۔ اور کہا "کیا تمہارے لئے کھڑا ہونا کافی نہیں ہے جبکہ اور مسلمان تمہارے قدموں کے نیچے بیٹھتے ہیں۔

یہ تھی عمرو کی اصل مسجد۔ ایک سادہ مکان (۲۸۰۹ × ۴۴ × ۷۰۳ امیٹرز) کا جس کے نیچے جھکی ہوئی چھت کئی ستونوں کے سہارے کھڑی تھی جو شاید کسی قریب کے گاؤں سے یا میم فس سے جو دریائے نیل سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے منگائی گئی تھی۔ اس کی دیواریں غالباً پکی مگر زیادہ تر قیاس یہ ہے کہ کچی اینٹوں کی چنی ہوئی تھیں۔ جن کا کھردرا پن یہ بتاتا تھا کہ ان پر پلاسٹر نہیں کیا گیا۔ فرش کنکر کا تھا۔ روشنی کا وہی انتظام تھا جو آج کل ہے یعنی چھت میں ایک بڑا سا مربع سوراخ ہے یہ بالکل ایک سادہ مسجد تھی۔ نہ اس میں مینارے تھے۔ نہ اس میں کسی قسم کی بیرونی یا اندرونی آرائش کا سامان تھا۔ صرف ایک منبر تھا جو تھوڑے دنوں بعد وہ بھی پھنکوا دیا گیا۔ لیکن باوجود اس کے یہی مسجد تھی جس کا نام بعد میں تاج الجوامع رکھا گیا اس میں کچھ شک نہیں کہ گو یہ ایک معمولی سادہ مسجد تھی گو اس سے کسی قسم کی شان و شوکت ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ مگر عبادت اور نماز کا جوش و خروش جو اس وقت تھا آج باوجودیکہ وہ ایک بڑی پُر شان و شوکت اور عظیم الشان مسجد ہے۔ گو اس وقت وہ تاج المساجد اور عمارت کی خوبی کے لحاظ سے لاثانی ہے اسمیں وہ بات ہرگز نصیب نہیں جس مقصد کے لئے یہ بنائی گئی تھی۔ یا جس خیال سے اس کے بانی نے اس کا بنیادی پتھر رکھا تھا۔ وہ دن اسلام کے آغاز کے

دن تھے - اور اُس وقت کے مسلمان اپنے سیدھے سادے فرائض کو اس خوبی اور جوش سے ادا کرتے تھے جو ہماری قسمت میں نہیں - مفتوحہ ممالک کی دولت نے انہیں ابھی تک عیش و عشرت کی طرف مائل نہیں کیا تھا - اور ابھی تک وہ ان مضر اور بیہودہ خیالات سے بچے ہوئے تھے جو آج ہماری تباہی کا باعث ہوئے - اُن دنوں میں اُن کے مذہبی مُلکی سب معاملات کے لئے یہ ایک مسجد کافی تھی - وہاں کا گورنر (حاکم) اُس کا واعظ اور نماز جمعہ کا امام ہوتا تھا - بڑی خوشی کی بات ہے کہ عمرو کا ایک وعظ جو انہوں نے اس مسجد میں جمعہ کے روز کہا تھا ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے جس کا ترجمہ ہم یہاں لکھتے ہیں اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرمانروا کے وعظ میں اخلاقی نصائح اور انتظامی احکام کس خوبی سے ملے جلے ہیں - بحیرا بن ذاکر اسے اس طرح بیان کرتا ہے - میں اور میرا باپ عیسائیوں کی عید الغطاس کے چندروز بعد جمعہ کی نماز پڑھنے گئے ابھی ہم نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ چند شخص ہاتھ میں کوڑے لئے آدمیوں کو ڈھکیلتے ہوئے ہمارے پاس آپہنچے - میں نے پوچھا " ابا - یہ کون ہیں؟ میرے والد نے جواب دیا " بیٹا - محافظ ہیں " - اتنے میں موذن نے اذان دی اور عمرو ابن العاص منبر پر کھڑے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے قد کے مگر گٹھے ہوئے آدمی تھے - سر بڑا تھا اور آنکھیں سیاہ - بشرہ سے نہایت سنجیدہ معلوم ہوتے تھے لباس قیمتی تھا - سر پر عمامہ اور جسم پر قبا تھی - اول تو چند الفاظ میں خدا کی حمد و ثنا کی اور پھر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کی - بعد لوگوں کو احکام سنائے - میں نے سنا کہ وہ زکوٰۃ کے دینے - رشتہ داروں کو دیکھنے - اعتدال سے رہنے حد اعتدال سے تجاوز نہ کرنے اور دوسرے فضول کاموں اور عیش و عشرت سے رکنے کی ہدایت کرتے تھے - اور کہا

" اے انجمن قوم! چار غلطیوں سے بچو کیونکہ وہ آرام کے بعد مصیبت پیدا کرینگی - دولت کے بعد افلاس اور کمال کے بعد زوال - خبردار اپنے بیہودہ اور عیش و عشرت کے اسباب مت بڑھاؤ - اپنے مال کو ضائع مت کرو - اور کسی معاملہ میں اس قدر باتیں نہ کرو جنہیں تم پورا نہیں کرسکتے یہ صحیح ہے کہ انسان کو کسی قدر فرصت کی ضرورت ہے - اپنے جسمانی آرام کے لئے - اپنے منافع اور فوائد کی نسبت سوچنے کے لئے اور اپنی نیچرل خواہشات کے پورا کرنے کے واسطے - لیکن جو شخص ایسا کرنا چاہے اُسے چاہیئے کہ اعتدال سے کام لے اور تھوڑے ہی پر قناعت کرے - اور فرصت کے وقت اُسے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنی زندگی غفلت میں نہ گزار دے - اور نیک کاموں سے بے پرواہ ہو جائے اور خدا کے احکام سے بالکل غافل رہے

اے انجمن قوم! اس میں کچھ شک نہیں کہ ستارہ جوزا طلوع ہوا ہے اور سیارہ سہیل غروب ہو گیا ہے مطلع صاف ہے دنیا سے تمام آفت اٹھ گئی ہے شبنم کم ہو گئی ہے چراگاہ میں سبز گھاس لہلہا رہی ہے - بھیڑوں نے بچے دیدیئے ہیں - اب گڈرے کو اپنے ریوڑ کی خوب حفاظت کرنی چاہیئے تم اپنے کھیتوں میں جاؤ - خدا کی رحمت تمہارے ساتھ ہے - اُن تمام نعمتوں سے حظ اُٹھاؤ - یعنی دودھ - بھیڑیں اور شکار - اپنے گھوڑوں کو کھیتوں میں چھوڑ دو اور موٹا ہونے دو - اور اُن کی خوب حفاظت کرو اور اُن سے اچھی طرح سلوک کرو - کیونکہ وہ تمہیں دشمنی سے بچاتے ہیں - اور تمام مال غنیمت کا انحصار اُن ہی پر ہے - اور کاپٹس سے (اہل مصر) جو تمہارے پڑوسی ہیں نہایت ہی مہربانی سے برتاؤ کرو - اور غیر عورتوں کی طرف سے

ہوشیار رہو۔ ان کے بدن ایسے سیدھے ہیں جیسے نیزے کیونکہ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ غارتگر ایمان ہیں اور تمام قوتوں کی زائل کردینے والیاں مجھ سے امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا کہ انہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا۔ کہ "بیشک میرے بعد خدا مصر کا ملک تمہیں دے گا۔ اس لئے وہاں کے باشندوں سے مہربانی کا سلوک کرو۔ کیونکہ وہ تمہارے اقربا اور تمہاری رعیت ہیں"۔ اس لئے میں تمہیں کہتا ہوں کہ تم اپنے ہاتھ اٹھالو۔ اپنے جوش ضبط کرو۔ اور اپنی آنکھوں پر پردہ ڈال لو۔ میں یہ نہیں سننا چاہتا کہ تم میں سے کوئی موٹا ہو جائے مگر اس کا گھوڑا دبلا ہو خیال رکھو کہ میں تمام گھوڑوں اور آدمیوں کو دیکھوں گا اور جس کسی کا گھوڑا بغیر کسی معقول وجہ کے دبلا ہوگا۔ اسی مقدار سے میں اس کی تنخواہ کاٹ لوں گا اور یاد رکھو کہ تم قیامت تک دشمن کی سرحد پر آباد رہو۔ اس لئے بہت سے دشمنوں نے تمہیں گھیر رکھا ہے۔ تمہاری زمینوں تمہاری دولت اور ترقی۔ تمہارے وسیع مقبوضات اور تمہاری لازوال نعمتوں پر ان کا دانت ہے اور ہر وقت وہ اسی تاک میں لگے ہوئے ہیں۔ امیرالمومنین حضرت عمرؓ نے مجھ سے ذکر کیا۔ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کہتے تھے کہ "جب خدا تعالیٰ تمہیں مصر پر قابض کریگا۔ تو تم ایک بڑی فوج بنانا کیونکہ وہ فوج تمام دنیا کی فوجوں سے اعلیٰ ہے"۔ تب حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ کہ "اے پیغمبرؐ خدا۔ یہ کیوں؟ تو آپؐ نے جواب دیا کہ" اس لئے کہ وہ اور ان کی بیویاں قیامت تک دشمن کی سرحد پر مقیم ہیں"۔ اس لئے اے انجمن قوم! تم ان چیزوں کے لئے جو خدا نے تمہیں عنایت کی ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کرو۔ اور سبز میدانوں میں مزے اڑاؤ۔ اور جب شاخیں سوکھ جائیں گی۔ پانی گرم ہو جائیگا۔ مکھیاں بڑھ جائیں گی۔ دودھ کھٹا ہو جائیگا۔ سبزی معدوم ہو جائیگی اور پھول پودوں پر سے مرجھا کے گر پڑیں گے۔ تب تم اٹھو اور خدا کی عنایت سے اپنے شہر کو واپس جاؤ۔ اور یاد رکھو کہ جب تم گھر واپس جانے لگو تو تم اپنی حیثیت کے موافق کوئی نہ کوئی تحفہ اپنے گھر ضرور لے جاؤ۔ جو کچھ مجھے کہنا تھا میں نے کہدیا۔ اور اب میں تمہیں خدا کے حوالے کرتا ہوں"۔

تاریخی حالات

اب ہم اس مسجد کے کچھ تاریخی حالات لکھنا چاہتے ہیں۔ کہ باوجود اس قدر انقلابات اور تباہیوں کے یہ کیونکر قائم رہی۔ اور اس میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ زمانہ نے اور اس زمانہ کے لوگوں نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ اس کی رونق کیونکر بڑھی۔ اور کیونکر گھٹی۔

اول ہم اس مسجد کی ترقی کے زمانہ (اس سے میرا مطلب عمارت کی ترقی ہے) کے حالات لکھتے ہیں۔

اسے بنے کوئی بتیس برس ہوئے تھے کہ مسلمہ نے ۵۳ھ ہجری (۶۷۳ء) میں اسے بڑھانا چاہا۔ کیونکہ لوگوں کو عموماً یہ شکایت تھی کہ مسجد بہت چھوٹی ہے۔ اس لئے خلیفہ معاویہؓ کے حکم سے اس حاکم نے مسجد کو مشرق کی جانب کسی قدر بڑھا دیا۔ اور شمال کی طرف کچھ خالی جگہ شامل کردی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس قدر بڑھائی گئی۔ مگر چونکہ عمرو کے مکان

تک بڑھائی گئی تھی۔ اس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ کچھ زیادہ حصہ ایزاد نہیں کیا گیا۔ مسلمہ نے علاوہ اس کے دیواروں پر پلاسٹر کروا دیا اور آرائش کا بھی کچھ سامان مہیا کیا۔ اور خلیفہ کے حکم بموجب مسجد کے چاروں کونوں میں اذان کے لئے چار خاص جگہیں بنوائیں غالباً وہ چھوٹی چھوٹی مینار ہونگی۔ جن کے متعلق ایک ایک زینہ بھی تھا چھبیس ۲۶ سال تک پھر اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اس کے بعد ۷۹ھ (۹۸-۶۹۹ء) ۸۰ میں عبدالعزیز ابن مروان (برادر خلیفہ وقت) نے اس مسجد کو بالکل از سرنو بنوایا۔ اور مغرب کی طرف سے بہت کچھ وسعت دی۔ اور مسلمہ نے جو خالی زمین کا حصہ شمال کی طرف زیادہ کر دیا۔ وہ بھی اس نے چار دیواری میں شامل کرلیا۔ دس برس بعد عبداللہ ابن عبدالملک نے اس کی چھت کو جو بہت نیچی تھی اونچا کروا دیا۔

عبدالعزیز کی کاٹ چھانٹ کے چودہ برس بعد قرۂ ابن شارق نے اسے پھر بنایا اور بڑھایا اور یہ کام غالباً نو مہینے تک جاری رہا یعنی ۹۲ھ (۷۱۰ء اکتوبر) سے شروع ہو کر ۹۳ھ کو نویں مہینے میں ختم ہوا۔ چنانچہ اس زمانہ میں جمعہ کی نماز چوک (قیصریہ) میں ہوتی تھی۔ قرہ نے جنوب کی جانب عمرو کا مکان بھی شامل کر دیا۔ جس کے بدلے میں اُن کے ورثا کو کچھ روپیہ دے دیا گیا۔ اور کہتے ہیں کہ قرہ ہی تھا جس نے پہلے پہل اس مسجد میں قبلہ دکھانے کے لئے محراب بنائی۔ اب اس مسجد میں گیارہ دروازے تھے۔ چار مشرق کی طرف، چار مغرب کی طرف اور تین جنوب کو اس وقت مسجد شمال و مشرق کی طرف بہت وسیع ہوگئی قرہ نے ایک منبر بھی بنوایا جو ۳۶۵-۳۶۸ھ ہجری ۹۷۵-۹۷۹ء تک موجود تھا۔

قریب قریب اسی زمانہ میں (۹۷ھ ۷۱۵-۱۶ء) مسجد کے اندر ایک کمرہ بیت المال کے لئے تعمیر کرایا گیا۔ مگر اب یہ ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا کہ یہ کہاں تھا۔ اور اس کی شکل کیسی تھی کسی قدر مشکل ہے۔ اس جگہ اس کے فیصلہ کے لئے بحث کرنی مناسب نہیں معلوم ہوتی ۱۳۳ھ ۷۵۰-۵۱ء میں جبکہ بنو امیہ کی خلافت کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ صالح ابن علی گورنر مصر نے شمال کی طرف چار قطاریں ستونوں کی اور زیادہ کر دیں اور ایک پانچواں دروازہ مشرق کی طرف اور تعمیر کروایا جس کا نام باب الکحل تھا۔ ۱۷۵ھ (۷۹۱-۹۲ء) میں موسیٰ بن علی نے شمال کی طرف ایک صحن (رحبہ) اور زیادہ کر دیا۔ اس رحبہ کو ہم ایک خیال سے مسجد کا حصہ نہیں کہہ سکتے۔ گو اس میں کچھ نہیں۔ کہ یہ خالی جگہ موسیٰ نے مسجد کے ساتھ کر دی تھی جسے کوئی اور استعمال نہیں کرسکتا تھا۔

اور اخیر میں عبداللہ بن طاہر (۲۱۲ھ ۸۲۷ء میں) نے حکم دیا کہ موجودہ مسجد کو دُگنا کر دیا جائے اور چنانچہ مغرب کی طرف اُسی قدر اور اُسی شکل کی اور زمین زیادہ کی گئی۔ ایک مورخ کہتا ہے کہ "عبداللہ ابن طاہر نے مسجد میں ایک بڑی محراب بنوائی اور مغرب کے طرف کی کل زمین زیادۃ الخازن تک زیادہ کی" اس وقت مسجد کا طول وعرض (۱۹۰×۱۵۰) کیوبٹ یا ساعد تھا جب ہم پانچ سو سال بعد میں بھی اس مسجد کو دیکھتے ہیں تو اس کا رقبہ وہی پاتے ہیں جو ابن طاہر کے وقت میں تھا۔

مسجد کا کل رقبہ ۴۲۰۰۰ مربع ذرع النبی یا ۲۸۰۰۰ ذرع العمل تھا۔ تاریخ نے اس کی حالت ہمیں یہاں

تک بتا دی ہے - اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں - کہ اس کے بعد کیا واقع ہوا - اس کے بعد مسجد کی آرائش کا زمانہ آیا - جو ۲۱۲-۵۶۸ھ (۸۲۷-۱۱۷۲ء) تک رہا اور اس زمانہ میں اس میں کچھ تبدیلیاں ہوتی رہیں - گو مسجد کو زیادہ وسعت نہیں دی گئی - اور نہ کوئی حصہ اُس میں زیادہ کیا گیا مگر آرائش وغیرہ کی تکلفات نے اُس کی حالت بہت کچھ درست کر دی۔

اس سے پہلے ۱۳۳ھ (۷۵۰ء) میں خاندان بنو امیہ کے زوال کے بعد الفسطاط کے جنوب و مشرق میں ایک فوجی چھاؤنی پڑ گئی تھی اور ۱۶۹ ہجری ۷۸۵ء میں ایک جامع مسجد بنوائی گئی اور پھر ۲۵۴ھ ۸۶۸ء میں احمد ابن طولون گورنر مصر نے جو قریباً خود مختار ہو گیا تھا اور مصر کے ایک خاندان کا بانی ہوا - ایک گاؤں مشرق و جنوب کی طرف آباد کیا اور ۲۶۳ھ ۸۷۶ء میں ایک مسجد بنوائی - جو اب تک موجود ہے - اسی زمانہ میں جس کا ذکر کر رہے ہیں پھر قاہرہ خاص کی بنیاد پڑی - ۳۵۸ھ ۹۶۹ء جس میں دو بڑی عالیشان مسجدیں الاظہر اور الانور (موخر الذکر کا دوسرا نام مسجد الحاکم بھی ہے) تعمیر ہوئیں مگر مسجد عمرو میں جو کچھ بعد میں زیادہ کیا گیا وہ زیادہ قابل لحاظ نہیں - کیونکہ اس سے مسجد کی عمارت وغیرہ میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہوئی - بلکہ جو کچھ زیادہ کیا بھی گیا وہ مسجد کے بیرونی احاطہ کے متعلق تھا۔

المقریزی لکھتا ہے کہ قاضی الحارث نے ۲۳۷ھ ۸۵۱ء میں کچھ ایزاد کیا - جو اسی کے نام سے مشہور ہے - اور یہ زیادۃ الخازن کے شمال میں واقع ہے - جسے ابو بکر خازن نے ۲۳۷ھ ۸۵۱ء میں تعمیر کروایا - اور ۲۵۸ھ ۸۷۲ء میں رحابہ ابی ایوب اور زیادہ کیا گیا - اسی ابو ایوب نے صحن میں نمازیوں کے سایہ کے لئے ایک شامیانہ کھڑا کیا - (جسے فاطمیہ خلیفہ الحاکم نے ۴۰۱ھ - ۱۰۱۰ء میں اکھڑوا دیا) یہ تمام حالات ہم نے شمالی اور مغربی حصہ کی بابت لکھے ہیں مگر افسوس ہے کہ ہمیں مشرقی حصہ کے حالات معلوم نہیں ہو سکتے - اس میں کچھ شک نہیں کہ اس طرف بھی کچھ نہ کچھ زیادہ ضرور کیا گیا تھا - جس کا اب کوئی نشان باقی نہیں - جو غالباً ۷۰۲ھ ۱۳۰۲ء میں گر گیا - یہ ہے ایزاد شدہ حصہ کی تاریخ

اب ہم دوسرے زمانہ کے حالات لکھنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں - اس میں سب سے پہلا واقعہ قابل غور یہ ہے کہ ۲۷۳ھ (۸۸۶ء) میں مسجد میں آگ لگ گئی جس سے تمام ابن طاہر کا زیادہ کیا ہوا حصہ جل گیا - جسے بعد میں احمد ابن طولون کے جانشین اور بیٹے نے ۶۴۰۰ دینار کے خرچ سے بنوایا۔

الاخشید کے زمانہ میں یعنی ۳۲۴ھ ۹۳۶ء میں ستونوں پر نقش و نگار کئے گئے اور سروں پر سونے یا چاندی کا پانی پھروایا گیا - اور جہاں کہیں جوڑ تھے - اُن پر خوش رنگ پتھر یا شیشے لگائے گئے ۳۳۶ھ ۹۴۷-۴۸ء میں بیت المال کے گنبد کے نیچے ایک فوارہ بنایا گیا ۳۸۷ھ ۹۹۷ء میں مسجد پر پلاسٹر ہوا اور سفیدی کرائی گئی کہتے ہیں کہ اس وقت بہت سے پتھروں وغیرہ کے نقش و نگار مٹا دیئے گئے تھے جو غالباً ابن طولون یا اخشیدیہ خاندان کے وقت تھے - کیونکہ ان خاندانوں میں ایسے فنون کا بہت کچھ چرچا تھا۔

فاطمیہ خلیفہ الحاکم نے ۴۰۳ھ ۱۰۱۲-۱۳ء میں ۲۴۰۰ جلدیں قرآن شریف اور نو سیپاروں کی مسجد میں بھیجیں

جن میں سے بعض سونے کے حروف سے لکھے تھے اور جن میں ہر ایک مسجد میں استعمال کر سکتا تھا۔ اور علاوہ اس کے اس نے خصوصاً اسی مطلب کے لئے ایک بڑا شمع دان بھیجا۔ جس پر ایک لاکھ درہم لگے تھے۔ یہ اس قدر بڑا تھا کہ اس کے اندر لیجانے کے لئے مسجد کا ایک دروازہ بڑا کرنا پڑا۔ تین سال بعد اسی خلیفہ نے صحن کا شامیانہ اُکھڑوا دیا۔

فاطمیہ خلیفوں کے زمانے میں اس مسجد میں چند اور بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ چنانچہ خلیفہ المستنصر نے محراب کے سامنے چاندی کی ایک زنجیر لٹکائی۔ سنہ ۴۳۸ھ (سنہ ۱۰۴۶-۴۷ء) اسی زمانہ میں محراب کے ستونوں پر چاندی کے حلقے لگائے گئے جنہیں صلاح الدین نے بعد میں اتروا دیا۔

اس زمانہ سے لیکر الفسطاط کے جلنے تک اس میں کچھ کچھ تبدیلیاں ہوتی رہیں اور کسی قدر کچھ اور بھی ایزاد ہوا۔ مگر یہ قابل ذکر نہیں معلوم ہوتیں سنہ ۵۶۴ھ سنہ ۱۱۶۸-۶۹ء میں امور سے۔ یروشلم کے بادشاہ نے مصر پر فوج کشی کی اور الفسطاط کے جنوب میں خیمے لگائے۔ اس لئے فاطمی خلیفہ العاضد کے حکم سے اُس کے وزیر شاہور نے اس شہر میں آگ لگا دی۔ تاکہ غنیم اس پر قبضہ نہ کرے۔ اس آتش زنی نے مسجد کو بھی نقصان پہونچایا۔ مگر یہ فرض کر لینا کہ اس کی تمام اصلی عمارت کو نقصان پہنچا ایک غلطی ہے۔ دیواریں گو قابل مرمت تھیں مگر پھر بھی کھڑی رہیں بیشک چھت اور تمام لکڑی کا کام بالکل غارت ہو گیا جس سے مرمت کی ازحد ضرورت واقع ہوئی۔ چار سال بعد (۵۶۸ھ سنہ ۱۱۷۲-۷۳ء) میں مسلمانوں کے نامور بہادر صلاح الدین نے مصر پر اپنا تسلط جما لیا۔ اُس نے اُس پرانی مسجد کو پھر تعمیر کروا دیا۔ قبلہ اور محراب از سر نو بنوائے۔ اور فرش سنگ مرمر کا بنوایا۔ اور اپنا نام اس پر کھدوا دیا۔ اس کے علاوہ اُس نے کئی اور تبدیلیاں کیں جن کا ذکر کرنا یہاں مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مسجد کا اب یہ زمانہ ختم ہوتا ہے۔ اور ایک نیا زمانہ شروع ہوتا ہے جس کا ذکر ہم آگے کرتے ہیں۔

مسجد کی طرف سے بے پروائی اور اس کی بربادی

آخر اس عالیشان مسجد کا وہ زمانہ آپہنچا جبکہ اس کا کوئی سرپرست نہ رہا۔ اور اس بے توجہی اور بے پرواہی کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ اس کی تباہی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ الیوبیہ خاندان کے زمانہ میں سنہ ۵۶۸-۶۴۸ھ (سنہ ۱۱۷۲-۱۲۵۰ء) اس کا یہی حال رہا اور اُن لوگوں نے کچھ توجہ نہ کی۔ ہم یہاں ایک قابل سیاح کی تحریر سے کچھ اقتباس کر کے لکھتے ہیں۔ جس نے الصالح نجم الدین کے زمانہ میں جسے صلاح الدین کے خاندان کا اخیر بادشاہ سمجھنا چاہیئے (سنہ ۶۳۷-۶۴۷ھ - سنہ ۱۲۴۰-۱۲۴۹ء) اس مسجد کو خود دیکھا۔ اور اس کا بڑا دلچسپ حال لکھا ہے اس سیاح کا نام سعید المغربی جو اسکندریہ میں ۶۳۹ھ سنہ ۱۲۴۱ء میں پہنچا اور مصر میں قریب دس برس کے رہا۔ اس مسجد کے حالات وہ اس طرح لکھتا ہے "پس میں شہر میں داخل ہوا اور ان تنگ گلیوں میں سے مجھے گزرنا پڑا جہاں لوگ کثرت سے اسباب اور بوجھ اٹھائے اور مشکیں اونٹوں پر لادے جا رہے تھے جس سے چلنے میں مجھے سخت تکلیف ہوئی۔ آخر کار میں مسجد میں پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ تنگ گلیوں نے اس مسجد کو گھیر رکھا ہے۔ اور اس

بات میں یہ مسجد اشبیلہ اور مراکش کی مسجدوں سے جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے مختلف ہے۔ پھر میں اس کے اندر داخل ہوا یہ ایک بہت بڑی اور قدیم مسجد ہے جس میں آرائش اور سجاوٹ وغیرہ کا کوئی سامان نہ تھا۔ سادہ چٹائیاں دیواروں پر لگی ہوئیں اور فرش پر بچھی ہوئی تھیں اور میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ مرد۔ عورت صرف رستہ کم کرنے کے لئے یا جلدی پہنچنے کی خاطر ایک دروازے سے دوسرے دروازے ہوکر مسجد میں سے گزرتے تھے جس سے اس کا تمام فرش خراب ہوگیا تھا۔ اور بہت سے خوانچے والے (بیچنے والے) اس میں میوے اور بسکٹ وغیرہ بیچ رہے تھے اور مسجد کے مختلف حصوں کے لوگ ان سے لے کر کھا رہے تھے اور اس مقدس جگہ کی عزت ووقار کا کچھ خیال تک نہیں کرتے تھے۔ اور بہت سے بچے اپنا کاسۂ گدائی لے کر اُن لوگوں کے سامنے کھڑے تھے جو کچھ کھا رہے تھے۔ اور اس طرح اپنی گزر اوقات کی فکر کر رکھی تھی۔ اور اُن سے بھی جو باقی بچ رہا وہ انہوں نے مسجد کے کونوں میں پھینک دیا۔ چھت اور گوشوں میں سینکڑوں مکڑیوں کے جالے لگے ہوئے تھے۔ بچے صحن میں کھیل کود رہے تھے۔ اور دیواروں پر کوئلہ۔ تارکول اور سُرخ رنگ سے نہایت بیہودہ اور بدنما خط میں خدا جانے بیفکروں نے کیا کیا لکھ ڈالا تھا۔ باوجود ان تمام خرابیوں کے مسجد سے شان وشوکت کے آثار نمودار تھے۔ اور خیالات پر ایک قسم کا اثر پڑتا تھا۔ اور یہ بات اشبیلہ کی مسجد میں ہرگز نصیب نہیں ہوسکتی۔ باوجودیکہ وہاں چمن وآرائش کے تمام سامان موجود ہیں میں نے معلوم کیا۔ کہ بغیر کسی ایسی چیز کے دیکھنے سے جو یہاں موجود تھی میرے دل پر اس کا اثر نہایت صاف اور طمانیت بخش پیدا ہوا۔ تب غور کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ اس میں ایک خاص راز ہے اور وہ یہ ہے کہ اس مسجد کی تعمیر کے وقت پیغمبرؐ صاحب کے اصحاب کرام یہاں کھڑے تھے اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ طلبا اپنے معلموں کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے ہیں۔ جو قرآن دینیات اور صرف ونحو وغیرہ کی تعلیم کے لئے مقرر ہیں۔ اور جب میں نے اُن کی گزر اوقات کی نسبت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا انحصار شرعی زکوٰۃ پر ہے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا جمع کرنا بہت دشوار کام ہے۔ جب تک کہ کوئی دباؤ نہ ہو یا سخت تکلیف نہ اٹھائی جائے۔ اس کے بعد میں مسجد سے چلا آیا اور دریائے نیل کے ساحل پر جا پہنچا۔

اوپر کا بیان مسجد کی بُری حالت اور لوگوں کی کم توجہی پورے طور سے ظاہر کر رہا ہے۔ جبکہ خاندان صلاح الدین کا زوال قریب آپہنچا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے مملوک بادشاہ عزیز الدین ایبک نے (۶۴۸-۶۵۵ھ ۱۲۵۰-۱۲۵۷ء) میں مسجد پر پلاسٹر کروایا اور اس کی مرمت کی ستونوں کو درست کروایا۔ اور تمام فرش سنگ مرمر کا بنوا دیا (مگر اس میں صحن شامل نہیں) باوجود اس مرمت کے بی برس کے زمانہ میں (۶۵۸-۶۷۶ھ ۱۲۶۰-۱۲۷۷ء) شمال کی جانب کی دیوار کسی قدر جھک گئی تھی اور گرنے والی تھی۔ قاضی نے پہلے اس کا بذات خود ملاحظہ کیا۔ اور پھر معماروں سے مشورہ کیا۔ فوارہ گروا دیا تاکہ مسجد کی بنیاد کو اس سے نقصان نہ پہنچے۔ اس نے نیز شمالی دیوار کے پیچھے پشتہ بند ھوا دیا۔ تاکہ گرنے سے بچی رہے اور ساتھ ہی کئی کمرے چھت کے اوپر کے گروا دیئے تاکہ اس سے بہت بوجھ نہ پڑے۔ اس کے تمام اخراجات مسجد کی متعلقہ آمدنی سے ادا کئے گئے مگر باوجود اس کے یہ معلوم ہوا کہ مسجد اب تک محفوظ حالت میں نہیں۔ اس لئے سلطان سے یہ

درخواست کی کہ خزانۂ عامرہ میں سے اس کی تعمیر کا روپیہ عنایت کیا جائے ۔ چنانچہ شمالی دیوار پورے طور سے بنوا دی گئی ۔ مسجد پر پلاسٹر کیا گیا ۔ ستون پوش ہوئے ۔ غرض کہ پوری پوری مرمت ہوگئی ۔ اکیس برس بعد (۶۸۷ھ ۱۲۸۸ء) سلطان کلعون کے زمانہ میں عزالدین الفرم کی زیر نگرانی اس کی کسی قدر مرمت ہوئی ۔ اور مسجد کی حالت اور کم توجہی کا اندازہ اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ "اس کے کئی حصوں میں کوڑے کے ڈھیر نکلے"

دوسرا بڑا تاریخی واقعہ جس سے مسجد کو سخت نقصان پہونچا ۷۰۲ھ ۱۳۰۲ء کا زلزلہ تھا اب مسجد کی درستی وغیرہ کا تمام اہتمام سلطان محمد ابن کلعون نے امیر سالار کو سونپ دیا جس نے الفطاط کے مشرقی حصہ کی تمام مسجدیں منہدم کروا دیں اور اُن کے ستون نکلوا لئے ۔ تاکہ ان سے اس مسجد کے صحن میں فرش بنوایا جائے ۔ اور اُس نے اسی پر کفایت نہیں کی ۔ بلکہ خاص اسی مسجد کے بڑے بڑے ٹکڑے جس سے باقی مسجد کا فرش بنا ہوا تھا ۔ اُکھڑوا لئے اور ان سب کو جمع کرکے مسجد کے دروازے کے سامنے ایک بڑا ڈھیر لگوا دیا ۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ اُس صحن کا فرش کبھی نہ بنا !! یہ تھی میر سالار صاحب کی تعمیر مسجد اور یہ تھا اُن کا انتظام ۔ جس نے مسجد کی رہی سہی حالت کو اور بھی ردّی کر دیا ۔ یہ حالت دیکھ کر ناظرین کچھ متعجب نہ ہونگے ۔ جب وہ یہ سنیں گے کہ تھوڑے عرصہ کے بعد مشرقی جانب کے دو ستون بھی گر پڑے اور دوسری بات جو ہم انہیں بتانے والے ہیں وہ یہ ہے کہ مسجد کی حالت بالکل خراب ہوگئی ۔ اس کی محرابیں جھکنے لگیں اور قریب تھا کہ رکوع سے سجدہ میں جا پڑیں ۔ اور لطف یہ تھا کہ اُس وقت سلطان برقوق (۸۰۱ھ ۱۳۹۹ء) کی وفات کے بعد سلطنت کے امرار اور وزرا اپنے اپنے دھندوں میں لگے تھے اور مزے اڑا رہے تھے آخر خدا کے ایک بندے کے دل میں اسلامی حمیت نے جوش مارا وہ اٹھا اور اُس نے تمام اہتمام اپنے سر لیا ۔ یہ شخص برہان الدین ایک بڑا سوداگر تھا ۔ اس نے مسجد کو از سرنو تعمیر کرانے کا ارادہ کیا ۔ اور اس کے اخراجات اپنے اور بھائیوں کے ذمہ لئے ۔ قبلہ کی جانب کی ساری مسجد کو اُکھڑوا دیا اور پھر سے بنایا ۔ یعنی بڑی محراب سے لیکر صحن تک ۔ دیواروں میں جو جگہیں کمزور ہوگئی تھیں یا قابل مرمت تھیں ان کی مرمت کرائی ۔ اور تمام مسجد پر پلاسٹر کروایا " اس طرح یہ مسجد پھر نئی کی نئی ہوگئی ۔ ایک ایسی حالت کے بعد جبکہ یہ بالکل گرنے والی تھی ۔ آخر خدا تعالیٰ جل شانہٗ نے ایسے شخص کو کھڑا کر دیا جس نے اسے سنبھال لیا باوجودیکہ یہ شخص نہایت بخیل اور کنجوس تھا "

یہ کام ۸۰۴ھ (۱۴۰۱ء) میں ختم ہوا ۔ المقریزی نے ۸۲۳ھ (۱۴۲۰ء) کے حالات لکھ کر مسجد کا بیان ختم کر دیا ہے ۔ اس لئے ہم اس وقت کی چند باتیں یہاں لکھتے ہیں ۔ جن سے وہ خوب واقف تھا ۔ ان دنوں مسجد میں نہایت مشہور و معروف قرآن شریف کی دو جلدیں موجود تھیں ۔ ایک تو ان میں سے عصمٰی بنت عبد العزیز حاکم مصر کے نام سے مشہور تھا المقریزی نے اس کی ابتدائی تاریخ کا پتہ لگایا ہے ۔ جبکہ یہ قرآن عبد العزیز کے حکم سے ۷۶ھ ۶۹۵-۹۶ء میں لکھا گیا تھا ۔ دوسری جلد مصحف عثمان کے نام سے مشہور تھی ۔ مگر اکثر لوگ اس واقعہ کو غیر صحیح سمجھتے تھے ۔ المقریزی نے مسجد کے

ان خاص حصوں کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں جہاں نمازیں وغیرہ پڑھی جاتی تھیں۔ ان میں ایک چھت بھی تھی۔ جس کے گرد نمازی سات دفعہ طواف کرتے تھے اور بعض بعض مقاموں پر کچھ دعائیں بھی پڑھتے تھے۔ اُس نے نیز ان دو مختلف ستونوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ جہاں دینیات پر لکچر دیئے جاتے تھے۔ اس نے ایک روایت لکھی ہے کہ ۷۵۹ھ ۱۳۵۸ء کی دبا سے پہلے یہاں کوئی چالیس لکچر دیئے گئے اور ہم پہلے لکھ چکے ہیں یہ مقام ابن سعید سیاح کے لئے نہایت دلچسپ تھے۔

اب ہم المقریزی کو چھوڑتے ہیں جو اس مسجد کی تاریخ میں ہمارا بڑا رہبر تھا۔ کیونکہ اس کے بعد اس نے مسجد کی نسبت کچھ نہیں لکھا اور یہی وجہ ہے کہ بعد کی تاریخ پر کسی قدر اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ سلطان قیبطی نے (جس کا زمانۂ حکومت ۸۷۲-۹۰۱ھ ۱۴۶۸-۱۴۹۶ء تک رہا) اس کی کچھ مرمت وغیرہ کرائی۔ اس کا ذکر علی پاشا مبارک مصر کے وزیر پبلک انسٹرکشن (وزیر تعلیم) نے لکھا ہے۔ اس کے بعد کچھ تھوڑا سا پتہ پموکاک کے نقشہ مسجد سے معلوم ہوتا ہے۔ جو اُن کی کتاب "حالات مشرق" میں درج ہے یہ کتاب ۱۷۴۳ء (۱۱۵۶ھ) میں چھپی۔ یعنی سلطان قیبطی کی تعمیر سے ۱۵۰ برس بعد۔ اس نقشہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی تھی۔ مگر جب ہم اس نقشہ کو غور اور تحقیق سے دیکھتے ہیں تو اس میں کئی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اور اس لئے ہم اس پر پورا پورا اعتبار نہیں کرسکتے۔

سب سے اخیر میں مسجد پھر از سرِ نو تعمیر کی گئی۔ یہ کام مراد بے نے سرانجام دیا (۱۲۱۲ ہجری ۱۷۹۸ء) اس میں کچھ شک نہیں کہ گو یہ مسجد کیسی ہی کیوں نہ تھی۔ مگر آج کل کی مسجد مراد بے ہی کی مسجد ہے۔ اس نئی تعمیر کے حالات ہم شیخ الغزلی سے لیں گے۔ جو نپولین کے دیوان کے ایک ممبر بھی تھے۔ جنہوں نے فرنچ کے حملوں اور اس کے بعد کے زمانہ کے حالات لکھے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مسجد ایک زمانہ دراز سے ویران اور خراب حالت میں پڑی تھی الفطاط کے جل جانے کے وقت سے نماک اور مٹی کے تودوں میں کھڑی تھی۔ صرف چند مکان دریائے نیل کے کنارے پر کسی قدر فاصلہ پر رہ گئے تھے۔ اور وہ بھی زیادہ تر شمال کی طرف واقع تھے۔ اور وہ چند آدمی ان مکانوں کے رہنے والے بھی پاس کی چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں نماز وغیرہ پڑھ لیا کرتے تھے اور بڑی مسجد کی طرف جو کسی وقت ایک عالیشان مسجد تھی رُخ بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ پھر آگے لکھتے ہیں" میں نے یقیناً وہ وقت دیکھا ہے جبکہ رمضان کے آخری جمعہ کو لوگ یہاں جمع ہوتے تھے۔ اور القاہرہ اور مصر اور بلاق کے لوگ تفریح کے لئے یہاں آتے تھے۔ اور اُن کے ساتھ شاہزادے اور بڑے بڑے امیر بھی ہوتے تھے اور گوئیے۔ قلندر۔ مداری اور حسین عورتیں (غواصی) وغیرہ سب صحن میں جمع ہوتے تھے۔

یہ تمام شان و شوکت کوئی تیس برس سے بالکل جاتی رہی (یعنی قریب ۱۷۷۰ء سے) مسجد اور اس کے آس پاس کی عمارت کی تباہ حالت کی وجہ سے چھت اور ستون بالکل گر پڑے ہیں" تب مراد کو چند علماء نے

ترغیب دی اور کچھ اسلامی حمیت نے تقاضا کیا۔ اور آخر اُس نے اس مسجد پر زرِ کثیر خرچ کیا۔ جو اس نے بڑے وسائل سے کمایا تھا مگر ایک نیک کام میں لگایا" پھر اس نے اُس کی دیواریں چنوائیں۔ عمارت کو مضبوط کیا۔ ستونوں کو باقاعدہ ترتیب دی۔ اور آرائش کا تمام سامان مہیا کیا۔ دو مینارے بنوائے۔ چھت میں لکڑی بہت عمدہ اور مضبوط قسم کی لگوائی اور تمام مسجد پر سفیدی کروائی۔ اور رجب ختم ہوگئی۔ تو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت عمدہ بنوائی گئی ہے پھر اس نے نہایت عمدہ چٹائیاں (فیوم) بچھوائیں اور چھت میں لیمپ لٹکائے۔ تب ۱۲۱۲ھ میں رمضان کے آخری جمعہ کو ایک مجمع کثیر وہاں جمع ہوا" (۱۸ مارچ ۱۷۹۸ء کو ٹھیک ایک برس بعد جبکہ ابن طاہر نے کچھ حصہ مسجد میں زیادہ کیا تھا) چار مہینے بعد مرآد بے ایمبابہ پر نپولین کے لشکر سے لڑ رہا تھا جسے جنگ اہرام مصری) کہتے ہیں۔ جن پر مشہور چالیس صدیاں گزر گئی ہیں" وہ معزز بوڑھا لکھتا ہے کہ "جب دوسرے سال فرنچ کا لشکر حملہ آور ہوا۔ تو مسجد کو بھی اور عمارتوں اور چیزوں کی طرح سخت نقصان پہنچا۔ یہاں تک کہ اس کی لکڑیوں تک کا پتہ نہیں لگا۔ اور وہ ایک ویران اور غیر آباد پڑی رہ گئی" گو یہ کسی قدر مبالغہ ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ مسجد کو بہت کچھ نقصان پہنچا۔

آج کل جنوب کی طرف کے ستون کسی قدر اچھی حالت میں ہیں۔ شمالی طرف کے ستونوں کے لئے کچھ انتظام کر دیا گیا ہے۔ کچھ سال ہوئے رمضان کے اخیر جمعہ میں قاہرہ کے لوگ پھر جمع ہوئے اور آس پاس کے تمام لوگوں نے مل کر نماز ادا کی۔ مگر اس نمازِ جمعہ کے بعد مسجد کی عجیب حالت ہو گئی ہے۔ جب ہم مسجد میں بڑے دروازے سے داخل ہوئے ہم نے دیکھا کہ دائیں ہاتھ کے ستونوں کا نام و نشان تک نہیں۔ سوائے دو ستونوں کے اور ان کے بیچ میں جو جگہ خالی تھی۔ وہ بھی بند کر دی گئی۔ اس کی نسبت ایک روایت مشہور تھی۔ کہ ایک نیک شخص ان دو ستونوں میں سے بآسانی گزر جاتا تھا۔ خواہ کیسا ہی موٹا تازہ کیوں نہ ہو۔ مگر ایک بدکار خواہ کیسا ہی دبلا پتلا کیوں نہ ہو ہرگز نہیں گزر سکتا تھا اسی لئے رمضان کے آخری جمعہ کی نماز کے بعد اس جگہ بڑا ہجوم ہوتا اور سخت ریل پیل ہوتی تھی۔ اور یہاں اپنی نیکی اور بدی کا امتحان کیا جاتا تھا۔ اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حد درجہ کی خرابی اور بے ترتیبی واقع ہوتی تھی۔ اچھا ہوا بند کر دیا۔ یہاں ایک اور ستون ہے جس کی نسبت عجیب روایت مشہور ہے یہ منبر کے سامنے بائیں طرف ٹھیک بیچ کی محراب کے دائیں جانب بنا ہوا ہے۔ اس کے نیچے کے حصہ کی طرف علاوہ اور ناموں کے جناب رسالت مآب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک بھی کوئی سات بار لکھا ہے۔ نہ معلوم کس مسلمان نے سچے جوش سے یہ نام لکھے ہیں۔ لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس ستون پر پیغمبر صاحب کا نام پہلے ہی سے لکھا تھا۔ یا تو یہ ایک معجزہ ہے یا قدرتاً یہ نام لکھا گیا ہے مگر اصل یہ ہے کہ کسی نے بڑے احتیاط سے کھودا ہے اور چھونے سے کھردرا نہیں معلوم ہوا۔ گویا آہستہ آہستہ کھودنے سے اُس پر ایک نشان سا پڑ گیا ہے۔ لیکن دوسرے لحاظ سے نام اچھا نہیں کھدا اور خط بھی بُرا ہے۔ یہ ایک روایت نہیں۔ ایسی بیسیوں روائتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اسی ستون کی نسبت

اور ایک روایت مشہور ہے کہ عمرو نے خلیفہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ ایک ستون مکہ سے بھیجدیجیئے تاکہ وہ اسی نئی مسجد میں رکھا جائے چنانچہ حضرت عمرؓ نے ستون کو حکم دیا کہ مصر جاؤ۔ مگر وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ انہوں نے تین بار یہی حکم دیا اور تیسری بار زور سے ایک کوڑا بھی لگایا۔ پر اس نے ذرا پرواہ نہ کی۔ تب انہوں نے خدا کی قسم دی اور الفطاط جانے کا حکم دیا۔ اسی دفعہ اس نے ان کا حکم مانا۔ اور وہ لوگ اس پتھر میں چند نسیں سی دکھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کوڑے کے نشان ہیں۔ مگر بیچارے ستون کی بڑی کمبختی ہے۔ کیونکہ رمضان کے آخری جمعہ کی نماز کے بعد تمام لوگ اسے لکڑیوں کوڑوں اور جوتیوں سے پیٹتے ہیں اور اسی طرح یہ غریب اپنی نافرمانی کی سزا بھگتتا ہے ایک اور موقع پر اس مسجد میں لوگ کثرت سے جمع ہوئے جس میں مسلمان ہی شامل نہیں تھے بلکہ ہر قوم کے لوگ موجود تھے۔ یہ موقع استسقا کا تھا یعنی پانی کے لئے دعا مانگی گئی تھی کیونکہ اس دفعہ نیل میں طغیانی نہیں آئی تھی پاسکل کوسٹ کی کتاب عرب کی عمارت وغیرہ پر (جو پیرس میں ۱۸۳۹ء میں چھپی) اس کی جلد اوّل صفحہ ۳۱ میں اس کا پورا حال یوں لکھا ہے۔

جبکہ دریائے نیل میں طغیانی نہیں آتی تو قحط کا بہت اندیشہ ہوتا ہے یہ ایک رسم ہوگئی ہے کہ اراکین سلطنت علمار شیوخ۔ ربی۔ مصری۔ یونانی اور کیتھولک پادریوں کو مسجد عمرو میں جمع کرتے ہیں۔ تب ہر ایک فرقہ مسجد کی حدود کے باہر بیٹھکر خدا سے مدد طلب کرتا ہے مگر سب لوگ ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھتے ہیں یہ رسم نہایت احتیاط اور خضوع کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ ہر ایک مذہب کے لوگ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور آپس میں ان کا برتاؤ ایسا ہوتا ہے گویا وہ ایک خاندان کے ہیں یہ رسم کئی بار ادا ہو چکی ہے لیکن مختلف لوگوں نے اس کے حالات مختلف طور سے لکھے ہیں۔

مسجد میں نماز اب تک ہوتی ہے اور ہر جمعہ کو وعظ کہا جاتا ہے یہ بہت غنیمت ہے مسجد کی آمدنی کچھ کم چار سو روپیہ ہے۔

ہم نے اس مسجد کے تاریخی حالات شروع سے لیکر اب تک پورے طور سے لکھ دیئے اور اس بات کی نہایت کوشش کی ہے کہ حتی الامکان صحیح واقعات لکھے جائیں ان مبالغہ آمیز روایتوں غلط بیانیوں کو بالکل چھوڑ دیا ہے جن سے مسجد کی تاریخ پر اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آج کل کی مسجد وہ مسجد نہیں کہ جس کی بنا عمرو نے ڈالی تھی۔ اس میں اس قدر تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں کہ اگر اس پہلی مسجد کا نقشہ کھینچکر سامنے رکھا جائے تو کوئی یقین نہیں کرنے کا کہ یہ وہی مسجد ہے لیکن پھر بھی ہم مصر کے متعلق ایک نئی کتاب میں پڑھتے ہیں کہ المقریزی لکھتا ہے کہ یہ "ظاہر ہے کہ عمرو کی تعمیر کی ہوئی مسجد کا کسی قدر حصہ اب تک باقی ہے" جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ عمرو کا سارا کام بنائے مسجد کے ۵۸ برس بعد بالکل غارت ہو گیا جسے قریباً بارہ سو برس ہو چکے ہیں اسی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ "اس میں شک ہے کہ عرب نے مصر کی فتح کے وقت علم عمارت میں ایسی ترقی کی تھی کہ وہ ایک ایسی وسیع اور عالیشان مسجد بنا لیتے" اس کے بعد ایک عجیب فقرہ لکھا ہے کہ اگرچہ پچھلے زمانے میں اندرونی حصہ میں بہت کچھ زیادہ کیا گیا" جس کے معنی اگر کچھ ہو سکتے ہیں تو یہی ہیں کہ اس کا رقبہ شروع سے لیکر اب تک اتنا ہی

رہا کچھ زیادہ نہیں ہوا اس کے بعد دوسرے حالات بیان کرنے میں بہت کچھ مبالغہ کیا ہے اور مسجد کی ابتدائی شان و شوکت اور آرائش کی بہت تعریف لکھی ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ مسجد کی شان و شوکت کا زمانہ المقرزی کے زمانے سے پہلے ہو چکا تھا کیونکہ اُس کے وقت میں مسجد نہایت ہی خراب اور برباد حالت میں تھی تو جو کچھ اُس نے لکھا ہے وہ غالباً اور مصنفوں سے لیا ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ تحیر آمیز اور عجیب و غریب حالات لکھتے وقت اُس نے کسی مصنف کا حوالہ نہیں دیا یہ اُس کی عادت ہے اور اس پر اُسے فخر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ عجیب اور دلکش باتیں لکھ کر پڑھنے والے کو حیرت میں ڈال دے۔

اس کا صریح نتیجہ یہ ہے کہ ایسے تمام واقعات بعد میں گڑھے گئے ہیں المقرزی کے یہ تمام حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خیال میں مسجد کی تمام خوبی اور ساری شان و شوکت بڑے بڑے ستونوں اور ان بے شمار قندیلوں پر منحصر تھی۔ جو اس کی چھت میں لٹکی ہوئی تھیں اور یہ ساری آرائش تھوڑی سی جگہ میں تھی یہ مسجد قرطبہ کی بڑی مسجد کا شان و شوکت عمارت آرائش کسی چیز میں مقابلہ نہیں کر سکتی کیونکہ ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ وسیع عمارت کس قدر خراب ہے المقرزی کے اس مقابلہ کو پڑھ کر ہمیں ابن سعید کا وہ ریمارک یاد آتا ہے جو اُس نے اس مسجد کو دیکھ کر کیا تھا جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اُس مشہور سیاح کے الفاظ یہ تھے "ایک عالیشان مسجد۔ قدیم عمارت بغیر کسی آرائش و سجاوٹ کے" اور پھر اُس نے لوگوں کی کم توجہی، مسجد کی غلاظت اور خراب حالت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن تو بھی اُس نے اُس میں "ایک شان پائی اور اس کے خیالات پر ایک بڑا عمدہ اثر ہوا" اور یہ بات مسجد سویل میں نہیں پائی جاتی تھی باوجودیکہ وہ مسجد بڑی عظیم الشان تھی اور نہایت آراستہ تھی۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ "اس میں کوئی ایسی بات ہے جو ان تمام آرائشوں وغیرہ کے لئے کافی ہے" اور اس اثر کی وجہ اُس نے یہ بتائی کہ اس کی تعمیر کے وقت پیغمبر صاحب کے اصحاب وہاں موجود تھے۔ بیشک اُس پرانے سیاح کا یہ خیال نہایت ہی قابلِ تعریف ہے۔ جس سے سچی اسلامی محبت کی بو آتی ہے۔ یہ ایک مسلمان کا خیال ہے مذہبی لحاظ سے مگر تاریخی لحاظ سے بھی اس کا اثر کچھ کم نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن سعید ایک نہایت قابل سیاح تھا۔ اُس نے اندلسیہ اور مغربی افریقہ کی جلیل الشان عمارتیں دیکھی تھیں۔ اور اس لئے اُس نے اور لوگوں کی طرح دھوکہ نہیں کھایا۔ اور اُس کی عمارت کی تعریف نہیں کی بلکہ یہ لکھا ہے کہ عمارت کے لحاظ سے اُس میں کوئی خوبی نہیں۔ اور ساتھ ہی اُس کی خراب حالت کا ذکر کیا ہے۔ مگر باوجود اس کے اُس کے دل پر ساری عمارتوں سے بڑھ کر اسی کا زیادہ اثر ہوا اور کیوں؟ مذہبی خیال سے اور یہی ایک خیال ہے جو ایک دیندار کے دل کا مالک اور اُس کے خیالات کا فرمانروا ہوتا ہے۔ جن لوگوں کا مسلمانوں سے میل جول ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ایک سادہ پاکباز مسلمان کے دل پر ان چیزوں کے دیکھنے سے کس قدر اثر ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات جوش میں آ کر وہ بعضے باتیں خلاف واقعہ بیان کر جاتے ہیں چنانچہ عبد الرشید بیکوی بیان کرتا ہے "کہ اس مسجد کی دیواروں، ستونوں وغیرہ پر کوفی خط میں تمام قرآن شریف لکھا ہے اور سورتوں کے نام سونے کے پانی اور سبز رنگ سے لکھے ہیں" کیا ایک ایسے خلاف واقعہ بات کرنے پر بھی عبد الرشید ایک معتبر مصنف سمجھا جا سکتا ہے؟ یہ بات بالکل ایسی ہی

غیر معتبر ہے۔ جو مسٹر کاربٹ نے موذن کی نسبت بیان کی ہے کہ جب وہ مسجد کے دیکھنے کے لئے گئے تو انہوں نے موذن سے کہا کہ عمرو کی مسجد اس موجودہ مسجد سے بہت چھوٹی تھی۔ موذن یہ سن کر نہایت خفا ہوا اور کہا کہ شروع سے لیکر اب تک اسی قدر وسیع ہے۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ پانی کے لئے دعا اسی جگہ مانگی جاتی تھی۔ غالباً اس خیال سے کہ پیغمبر صاحب کے اصحابؓ کسی وقت یہاں موجود تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس مسجد کی کبھی کبھی مرمت ہوتی رہی۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اسی مبارک خیال نے اس کے قائم رکھنے میں بہت کچھ . . . . مدد دی ہے۔ ورنہ وہ نشانات اور وہ ٹوٹی پھوٹی عمارت جو آج تک باقی ہے کبھی کی صفحۂ دنیا سے مٹ چکی ہوتی۔ اور اس پر بجائے اس کے کہ کوئی تاریخی حالات لکھتا ہے کوئی مرثیہ پڑھنے والا بھی نہ ملتا صلاح الدین نے جو اس وقت تک العاضد کا برائے نام وزیر تھا۔ مسجد کے نہایت قریب دو بڑے مدرسے (مدرسہ ناصریہ مدرسہ کمیہ) بنوائے تھے وہ دونوں اور سینکڑوں اور مدرسے ایسے غارت ہوگئے ہیں کہ آج اُن کا پتہ لگانا بھی ایک امر محال ہے۔

اس "قدیم مسجد" کو کچھ مذہبی خیال نے ہی مقدس اور قابل تعظیم نہیں بنا دیا بلکہ تاریخی لحاظ سے یہ اور بھی زیادہ قابل قدر ہے۔ دنیا میں ایسی بہت کم جگہ ہونگی جن کے دیکھنے سے ایسا عمدہ سچا اور پاک جوش پیدا ہوتا ہوگا اور جو لوگ مصر کی اسلامی تاریخ سے واقف ہیں اُن کے دل پر یہ اثر کوئی معمولی طور سے واقع نہیں ہوگا۔ جو فوارے جوش کی طرح مٹ جائے۔ بلکہ ان کے دل میں وہ حسرت بھرے خیال پیدا ہونگے۔ جو مٹائے نہیں مٹنے کے۔ جب ایک مسافر فرش سے لے کر منارے تک نگاہ دوڑاتا ہے۔ اور پھر اس کی تباہ اور ویران حالت کو غور سے دیکھتا ہے تو اُس کی نظر کے سامنے یقیناً پرانی تاریخ پرانا جاہ و جلال آجاتا ہے جس سے فوراً اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کا جاہ و مال دنیا کی آرائش دنیا کی شان و شوکت سب فانی ہے کسی کو بقا نہیں اور اُس کے منہ سے فوراً قرآن شریف کے یہ پاک الفاظ نکل جاتے ہیں۔ کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔

کہاں ہیں وہ اہرام مصری کے بانی — کدھر ہیں وہ گردان زابلستانی
گئے پیشدادی کدھر اور کیانی — مٹا کر رہی سب کو دنیائے فانی
لگاؤ کہیں کھوج کلدانیوں کا
بتاؤ نشاں کوئی ساسانیوں کا

وہی ایک ہے جس کو دایم بقا ہے — جہاں کی وراثت اُسی کو سزا ہے
سوا اُس کے انجام سب کا فنا ہے — نہ کوئی رہیگا نہ کوئی رہا ہے
مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب
غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب

راقم۔ عبد الحق۔ طالب علم محمدن کالج علی گڑھ (منقول از۔ رسالہ "حسن" بابت ماہ جون ۱۸۹۴ء نمبر ۶۔ جلد ۷)

بابائے اردو کی ایک غیر مطبوعہ تحریر

مقالہ "اسلامی تصوف اور علامہ اقبال" مسٹر اے۔ ایس۔ نور الدین نے اقبال اکیڈمی کراچی کے ری سرچ فیلو کی حیثیت سے لکھا ہے۔

یہ مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اسلامی تصوف سے بحث ہے اس میں آٹھ باب ہیں جن میں کلمۂ تصوف کی تحقیق، تصوف کی تعریف اور اس کی اصل، تصوف کا تاریخی ارتقا۔ دور متاخرین اور دور انحطاط کی تفصیل ہے، اور ہر عہد میں جو جو ترقی ہوئی ہے اور جن بزرگوں نے اس کی تکمیل میں سعی کی ان کا مختصر مگر جامع تذکرہ کیا ہے۔ نیز دور متاخرین میں ایسے بزرگوں کے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے، جنہوں نے علمی حیثیت سے اس کے نظریات کی تشریح و تبلیغ کی آخری باب میں تصوف کے عملی پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ عملی پہلو سے مراد وسیلہ یعنی مرشد۔ ضرورت مرشد، اوصاف مرشد، سالک کے مقامات و احوال سے ہے۔ ان سے اور ان کی جزئیات سے بحث کی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں مقالہ نویس نے اقبال اور ان پر علمی و عملی تصوف کے اثرات اور تصوف میں علامہ اقبال کا مسلک اور ان کے صوفیانہ نظریات کو بیان کیا ہے۔ اس حصے کے بھی آٹھ باب ہیں۔

اوائل اسلام میں تصوف نے کوئی مسلم علمی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ اس زمانے میں زہد و تقویٰ ہی کا نام تصوف تھا اور زاہد و متقی بزرگ صوفی سمجھے جاتے تھے۔

تیسری صدی ہجری سے اس کی حیثیت جداگانہ سمجھی جانے لگی اور اسے علمی شکل دی گئی اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس پر بیرونی اثرات کا پرتو پڑنا شروع ہوا۔ سب سے زیادہ اثر افلاطون یا نوفلاطونی فلسفہ کا ہوا جس کا خلاصہ وحدت الوجود کا نظریہ ہے۔ اس نظریے کے سب سے بڑے مبلغ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی ہیں جو ساتویں صدی ہجری میں تھے شیخ اکبر کی زبردست شخصیت اور غیر معمولی ذہانت نے اس نظریئے کو تصوف کا سب سے بڑا مسئلہ بنا دیا۔ انہوں نے اس عقیدے کی توضیح و تشریح اپنی تصانیف میں ایسے عجیب و غریب اور دلآویز طریقے سے کی کہ مابعد کے تمام

صوفیا اس کے گرویدہ ہوگئے اور اس کی تقلید میں اپنا زور صرف کر دیا اور یہ عقیدہ دینیاتِ اسلام پر چھا گیا۔ فارسی شعرا نے اپنی خوش کلامی اور رنگین بیانی سے اس کی اشاعت میں بڑی سرگرمی دکھائی ہے۔ ان کے سرخیل خواجہ حافظ ہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال نے افلاطون اور خواجہ حافظ پر نہایت سخت و تند تنقید کی ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ مذہب کا ہر فرقہ اپنے عقائد کا ماخذ اپنے آسمانی صحیفے کو قرار دیتا ہے اور اپنے مطلب کے موافق اس کی آیات کی تاویل و توجیہہ کرتا ہے۔ یہی ہمارے صوفیا کے ہر طبقے نے کیا۔ اگرچہ متاخرین میں سے بعض اکابر علماء و صوفیا (مثلاً حضرت مجدد الف ثانی) نے عقیدۂ وحدت الوجود کی تردید میں بہت کچھ لکھا لیکن اس کے اثر کو زائل نہ کر سکے۔

علامہ اقبال کی رائے میں اس عقیدہ نے مسلمانوں میں بے عملی، غفلت، کاہلی، رہبانیت وغیرہ کے خیالات پھیلائے جو قوم کے انحطاط و زوال کے ذمہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس عقیدے کی بڑی شدت سے مذمت کی ہے اور اس کی اثر کو زائل کرنے کے لئے اپنا نظریۂ خودی پیش کیا ہے۔ جو انسان کی عظمت، خود اعتمادی اور قوت کا مظہر ہے۔ اقبال کا یہ فلسفہ اسلامی ممالک میں خصوصاً نیز بعض دیگر ممالک میں رفتہ رفتہ اثر پیدا کر رہا ہے۔

آخری حصے میں مقالہ نویس نے علامہ اقبال کے فلسفے کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال کسی سلسلۂ تصوف کے بانی نہیں اور نہ تصوف پر ان کی کوئی تالیف ہے۔ لیکن قابل مقالہ نویس نے ان کے اردو فارسی کلام اور بعض انگریزی تحریروں سے کافی اقتباسات پیش کر کے ان کے مسلک تصوف اور صوفیانہ نظریات کی تشریح کی ہے۔

مسٹر نور الدین نے اس مقالے کی تحریر و ترتیب پوری محنت و شوق سے انجام دی ہے اور ان کے تمام مصادر و ماخذ سے استفادہ کیا ہے جن تک رسائی ممکن ہے اور تصوف کی پوری تاریخ اور اس کے نظام کا مطالعہ کیا ہے۔ میری رائے میں یہ مقالہ اس پایہ کا ہے کہ مسٹر نور الدین کو یونیورسٹی کی طرف سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی جائے، وہ اس کے مستحق ہیں۔ اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لہذا مناسب ہوگا کہ اسے طبع کر کے شائع کیا جائے۔

دستخط: عبدالحق

مورخہ ۱۱ر جون سنہ ۱۹۵۷ء

بابائے اردو کے معالج

مرتبہ

بشیر نیاز

بابائے اردو کے سوانح نگار کے لئے بہت سا مواد
مرحوم کے معالجین کے پاس بھی ہے، جن سے وقتاً فوقتاً
مرحوم کو سابقہ پڑا ـــــ ان معالجین سے بشیر نیاز صاحب
نے ہماری درخواست پر ملاقاتیں کیں، ان ملاقاتوں کی
تفصیل آپ کو اگلے صفحات پر ملے گی۔ یہ مضمون چونکہ
تاخیر سے موصول ہوا، اس لئے فی الحال اس کا کچھ حصہ شائع
کیا جارہا ہے۔

(ادارہ)

لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید

سابق ایڈمنسٹریٹر جناح اسپتال کراچی

سائل کرنل عبدالرشید صاحب مجھے دراصل آپ کو بابائے اردو کے آخری ایام کے امراض کے سلسلے میں انٹرویو کرنا ہے۔ لیکن پہلے میں آپ سے کچھ ان کی ذات سے متعلق سوال کروں گا۔ کیا آپ یہ بتائیں گے کہ آپ کے ذہن میں بابائے اردو کا ادبی امیج کیا ہے؟

ڈاکٹر رشید میرے نزدیک بابائے اردو پاکستان کے اندر ایک ایسے واحد سکالر رہ گئے تھے۔ جن کی ذات کا تعلق اس دور سے تھا جس نے اسلامی ادب کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اسلامی ادب اور اسلامی سیاسیات کے مفاد کے لئے جو لوگ مسلمانوں نے اس برّعظیم میں پیدا کئے۔ وہ سب کے سب پچھلی صدی کی پیداوار ہیں۔ ان لوگوں میں قائداعظم کو لے لیجئے۔ یا ڈاکٹر اقبال، مولانا شوکت علی، محمد علی یا بابائے اردو کو لے لیجئے۔ موجودہ صدی کے اندر ایسی کوئی نمایاں ہستی پیدا نہیں ہو سکی۔ جو ان لوگوں کے ساتھ ٹکر لے سکے۔ اگر کوئی ہستی ہے بھی تو بہرحال وہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی۔

بابائے اردو اس دور کی سب سے پرانی کڑی تھے۔ جن کے لئے میرے دل میں ازحد احترام تھا۔ خصوصاً جب میں نے ان کا وہ مقدمہ پڑھا جو انہوں نے مولانا ظفر علی خاں کے انگریزی سے ترجمہ شدہ طویل مقالے "معرکہ مذہب و سائنس" پہ لکھا تھا تو اس کے بعد میں ان کی بسیط علمیت اور ان کے بلیغ فکر کا قائل ہو گیا تھا۔

میری نگاہ میں انکا وہ مقدمہ اردو زبان میں ایک منفرد چیز ہے

سائل بابائے اردو کی ادبی اور علمی شخصیت سے ربط و تعارف آپ کا کس وسیلے سے ہوا؟

ڈاکٹر رشید مجھے لکھنے پڑھنے سے پچھلے کوئی تیس؟ چالیس؟ برس سے شغف ہے۔ میں بابائے اردو کا سلسلہ نام سنتا

آرہا تھا۔ میں نے ان کی کتابیں دیکھی ہیں۔ اور پھر اردو کے فروغ کے سلسلے میں ان کی سرگرمیاں میری نظر میں رہی ہیں۔ اور میں انکا مداح بھی رہا ہوں۔

سائل آپ بابائے اردو سے براہِ راست کتنی مرتبہ ملے ہیں۔

ڈاکٹر رشید بابائے اردو سے ملاقات جناح ہسپتال کے اسپیشل وارڈ ہی میں ہوئی۔ آخری ایام میں جبکہ انہیں جناح ہسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا میں یہ دیکھنے گیا تھا کہ ان کی دیکھ بھال کس طرح ہو رہی ہے۔

اس کے علاوہ میں گاہے بگاہے جاتا رہا تھا۔ مگر یہ ملاقاتیں پیشہ وارانہ حیثیت رکھتی تھیں۔

ایک اور ملاقات بابائے اردو سے اس وقت ہوئی۔ جبکہ ہمارے ایک دوست پروفیسر خلیق احمد نظامی جو علی گڑھ سے آئے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے مجھ سے بابائے اردو سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تب میں انہیں لے کر بابائے اردو کے پاس گیا۔

سائل اس ملاقات میں آپ کو یاد ہو گا آپ نے کن موضوعات پہ گفت گو کی۔ ان سرسری ملاقاتوں کا یا بابائے اردو کے تعلق سے کوئی واقعہ آپ کے ذہن میں محفوظ ہو تو بیان کیجئے ــــ

ڈاکٹر رشید اس ملاقات میں بیشتر عبادت ہی ہوتی رہی تھی۔ گفت گو کا کوئی موضوع متعین نہ تھا۔ اور نہ کسی تفصیلی گفت گو کا محل ہی تھا۔

البتہ آپ اس بات کو اگر واقعہ کہنا چاہیں تو کہہ لیجئے اور وہ یہ ہے کہ جب میں پروفیسر خلیق احمد نظامی کو بابائے اردو سے ملانے لے گیا تھا۔ تو ایک تصویر اتاری گئی تھی، جس کی ایک کاپی میرے پاس بھی ہے۔

اس کے علاوہ اور کوئی ایسا واقعہ نہیں میں جس کا تذکرہ کرسکوں۔

سائل کرنل صاحب اب میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ نے کبھی بابائے اردو کی تشخیص کی اور یہ کہ انہیں کیا کیا امراض تھے۔؟

ڈاکٹر رشید بات دراصل یہ ہے کہ میں بابائے اردو کے پاس بہ حیثیت ڈاکٹر کبھی نہیں گیا۔ اس لیے میں نے ان کی تشخیص نہیں کی۔ میں اس امر کے تحت ان کے پاس جایا کرتا تھا کہ ان پر کاملاً توجہ دی جا رہی ہے یا نہیں اور یہ کہ انہیں کوئی تکلیف تو نہیں۔

اُن کا علاج کرنا ماہر کا کام تھا اور میں سمجھتا ہوں جو ان کا علاج کر رہے تھے۔ وہ قطعی اس کے اہل تھے۔

البتہ اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ ضعفِ جگر اور یرقان کے شکار تھے۔

ڈاکٹر انعام احسن

سائل۔ ڈاکٹر انعام احسن صاحب۔ سنا ہے آپ نے بابائے اردو کی آنکھوں کا علاج کیا تھا۔ اس وقت مجھے آپ سے دراصل اسی سلسلے میں گفتگو کرنا ہے۔

ڈاکٹر انعام۔ ذرا ٹھہریئے مجھے اس موقع پر حضرت یوسف کا واقعہ یاد آ گیا ہے۔ حضرت یوسف کے خریداروں میں مصر کی ایک بڑھیا بھی تھی۔ جو سوت کی ایک اٹی بغل میں داب کر حضرت یوسف کی خریداری کرنے آئی تھی۔ بابائے اردو ایک عظیم شخصیت تھے۔ ایک ایسی شخصیت جس کی پہنچ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں تک تھی۔ اور میں آنکھ کے ڈاکٹروں میں اپنے آپ کو بہت چھوٹا ڈاکٹر سمجھتا ہوں۔ جب میں سوچتا ہوں کہ بابائے اردو مجھ سے آنکھ کا علاج کرانے آیا کرتے تھے۔ تو مجھے معاً مصر کی وہ بڑھیا یاد آتی ہے۔

سائل۔ ڈاکٹر صاحب آپ کو یاد پڑتا ہے کچھ۔ آپ نے بابائے اردو کا کب علاج شروع کیا تھا۔؟

ڈاکٹر انعام۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ بابائے اردو نے مجھے ۱۹۵۹ء میں یاد فرمایا تھا۔ انہوں نے مجھے کہلا بھیجا تھا کہ میری آنکھ میں کچھ تکلیف ہے۔ کہو تو کسی وقت آ کے دکھلا جاؤں۔ میں نے عرض کیا آپ تکلیف کیوں کرتے ہیں۔ میں خود حاضر خدمت ہو جاتا ہوں۔ یوں میں بابائے اردو کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

سائل۔ کیا بابائے اردو آپ کو پہلے سے جانتے تھے؟ اور آپ کی بابائے اردو سے کبھی ملاقات ہوئی تھی؟

ڈاکٹر انعام۔ میرے والد احسن مارہروی سے بابائے اردو کے خاص تعلقات تھے۔ اور وہ والد مرحوم کے زبردست دوستوں میں تھے۔ والد علی گڑھ میں استاد تھے۔ اس زمانے میں بابائے اردو دو مرتبہ ہمارے ہاں آئے اور انہوں نے قیام بھی فرمایا تھا۔ میں اس زمانے میں آٹھویں میں پڑھتا تھا۔ بعد میں میں چونکہ سائنس کا طالب علم رہا ہوں۔ اور بابائے اردو جس لائن سے تعلق رکھتے تھے۔ میرا اس سے ربط کم رہا ہے۔ اسی لئے میں ان کی پوری ادبی شخصیت کا تو فہم و شعور نہیں رکھتا۔ البتہ اس زمانے کی کچھ یادیں میرے ذہن میں ہیں۔ جب وہ والد مرحوم کے ہاں آیا کرتے تھے اور شعر و ادب پہ باتیں ہوا کرتی تھیں۔ مجھے کچھ ہلکا ہلکا یاد ہے کہ والد مرحوم نے انہی کے کہنے پر دیوان ذوقی مرتب کیا تھا۔

میں نے بعد میں آنکھوں کے امراض میں اسپیشلائز کیا اور بھوپال میں تھا۔ جبکہ ۱۹۴۳ء میں میں نے پہلی بار بابائے اردو کی آنکھیں دیکھیں۔

اسی وجہ سے جب وہ کراچی آئے تو انہوں نے اپنی آنکھوں کی تکلیف کے سلسلے میں مجھے یاد فرمایا۔

سائل اب جبکہ گفتگو شروع ہو گئی ہے ذرا آپ اس بات کا پس منظر بھی واضح کر دیں کہ آپ نے آنکھوں کے

امراض میں خصوصی تربیت حاصل کرنے کو کیوں ترجیح دی گئی۔

ڈاکٹر انعام۔ بات یوں ہے کہ میں نے ۱۹۳۰ء میں علیگڈھ سے بی۔ ایس۔ سی کی اس کے بعد پٹنہ چلا گیا۔ اور ۱۹۳۶ء میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ کیا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک پٹنہ میڈیکل کالج میں بہ حیثیت استاد کام کرتا رہا۔ پھر بھوپال آیا۔ اور ۱۹۴۶ء کے وسط تک بھوپال میں رہا۔ وہاں سے یو کے۔ چلا گیا۔ وہاں چھ ماہ کورس کیا۔ اور وہاں سے ۱۹۴۸ء تک بحرین میں رہا۔ وہاں سے کراچی آیا ہوں۔ اور یہیں ہوں۔

آنکھوں کے امراض میں اسپیشلائیز کرنے کی ایک وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ میری صحت ہمیشہ سے خراب رہی ہے۔ اگر میں اور لائینوں کی طرف جانے کی کوشش کرتا تو مجھے راتوں کو جاگنا پڑتا۔ اور اس جاگنے سے میری صحت پر اور اثر پڑتا۔ ایک میں اپنے استاد محترم کا ذکر ضرور کروں گا۔ میرے استاد مرحوم ڈاکٹر محمد حسین میرے بڑے شفیق تھے۔ میں ان کو پسند آگیا تھا۔ لہذا میری تربیت انہوں نے اپنی نگرانی میں کی۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک انہوں نے مجھے اپنے پاس رکھا۔

سائل۔ اچھا ڈاکٹر انعام احسن صاحب اب ہم پھر بابائے اردو کی طرف آتے ہیں۔ یہ بتایئے کراچی میں جب پہلی بار بابائے اردو نے آپ کو یاد کیا تو ان کی آنکھ میں کیا عارضہ تھا۔

ڈاکٹر انعام۔ جب بابائے اردو نے مجھے یاد فرمایا تو ان کی آنکھ لال تھی۔ میں نے ان کی آنکھ دیکھی اور ایک مرہم لکھ دیا۔ اس کے بعد بہت دنوں تک انہوں نے مجھے یاد نہیں فرمایا۔ اور میں نے سوچا ہو سکتا ہے۔ انہیں میری ضرورت نہ رہی ہو۔

پھر جب ان کی آنکھ کا آپریشن ہوا۔ اور روشنی پوری طرح نہیں آئی تو انہوں نے مجھے پھر یاد فرمایا۔ اس طرح دو ایک مرتبہ خود ان کے پاس گیا۔ کئی مرتبہ وہ خود بھی میرے کلینک تک تشریف لائے۔

سائل۔ بابائے اردو کی آنکھ کو اصل بیماری کیا تھی۔ یہ شروع کیسے ہوئی۔ اور پھر کیا ہوئی۔؟

ڈاکٹر انعام۔ بابائے اردو جوانی ہی سے "شارٹ سائیٹڈ" جسے ہم ڈاکٹری کی اصطلاح میں (مایو پیا) کہتے ہیں۔ میں مبتلا تھے۔ بعد میں انہیں موتیا بند ہو گیا اور ان کی آنکھوں کے پردے چونکہ شروع ہی سے کمزور تھے۔ اس لئے ان کی آنکھ میں روشنی نہ آسکی۔

سائل۔ ڈاکٹر صاحب یہ بتایئے موتیا بند کی اصل وجہ کیا ہوتی ہے۔ اور اس کا علاج کیسے ممکن ہے۔؟

ڈاکٹر انعام۔ موتیا بند کی اصل وجہ سائنس آج تک معلوم نہیں کر سکی۔ لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ موتیا بند گرم ممالک میں زیادہ ہوتا ہے۔ صحیح تعداد بتانا تو اس وقت میرے لئے مشکل ہے۔ مگر تجربہ شاہد ہے کہ پچپن برس کی عمر کے بعد کافی لوگوں کو ہو جاتا ہے۔ اور اس کو روکنے کی کوئی دوا نہیں ہے۔ روکنے کا ایک

ہی راستہ ہے کہ انسان کی جسمانی صحت بہت اچھی ہو۔ تب کیس موتیا بند قدرے رُک جاتا ہے۔ اگر مریض کی جسمانی صحت اچھی نہ ہو تو اس کے رُکنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ موتیا بند آہستہ آہستہ پک جاتا ہے۔ اور پک جانے کے بعد اس کا آپریشن کیا جاتا ہے۔ اور کامیاب آپریشن کی صورت میں آنکھ میں روشنی لوٹ آتی ہے۔

بابائے اردو کے موتیا بند کا آپریشن اسی لئے کامیاب نہ ہو سکا کہ ان کی آنکھوں کے پردے کمزور تھے۔ اسی وجہ سے ان کی آنکھ میں نگاہ نہ آسکی۔

ڈاکٹر ایم۔اے۔حمید

سائل ۔ ڈاکٹر حمید صاحب۔ آپ نے بابائے اردو کا علاج کیا ہے۔ یہ بتایئے آپ نے بابائے اردو کی کن بیماریوں کا علاج کیا؟

ڈاکٹر حمید۔ جن دنوں مجھے ان کا علاج کرنے کا موقع ملا۔ ان دنوں ان کی سماعت میں فرق آتا جا رہا تھا۔ پھر کچھ اعصابی کمزوری تھی اور اندرونی نزلہ بھی تھا۔

سائل ۔ آپ کا طریق علاج کیا ہے۔ اور بابائے اردو کس طرح آپ سے علاج کرانے آیا کرتے تھے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بابائے اردو سے متعارف کیسے ہوئے۔

ڈاکٹر حمید۔ میں نے علیگڑھ میں تعلیم پائی ہے۔ جہاں میرے والد ڈاکٹر عبدالحمید مرحوم مطب کیا کرتے تھے۔ والد صاحب کے مولوی صاحب سے تعلقات تھے۔ والد صاحب ان کی ادبی اور اردو کے سلسلے کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مولوی صاحب کو چار پانچ ہزار روپے چندہ بھی دیا تھا۔ اور وہ ہومیو پیتھک طریق علاج سے مولوی صاحب کا علاج معالجہ بھی کیا کرتے تھے۔ علیگڑھ کے زمانے میں ہیں انٹر سائنس میں پڑھا کرتا تھا۔ وہاں سے میں کراچی آیا۔ ہومیو پیتھک کا کورس لیا۔ اور والد صاحب کا شاگرد ہوا۔ مولوی صاحب چونکہ والد صاحب کے زیر علاج تھے۔ اسی لئے اُن سے ملاقات ہو ہی جایا کرتی تھی۔ ہفتے میں دو ایک مرتبہ۔ مولوی صاحب کا ہم سے تعلق صرف علاج معالجے تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ اس سے بھی آگے تھا وہ ہومیو پیتھک طریق علاج کے بارے میں بہت سی معلومات رکھتے تھے۔ والد صاحب نے جو ایک کتاب چشمۂ شفا لکھی ہے۔ وہ بھی ان کی نظر سے گذری ہے۔

وہ سمجھتے تھے کہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر اگر کالج میں پڑھکر علاج کریں تو عوام کے لئے بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ ملک غریب ہے۔ علاج کی سہولتیں میسر نہیں۔ جن کی وجہ سے معاشرے کے ہر آدمی کو طبی سہولتیں نہیں مہیا ہو سکتیں اس لحاظ سے ہومیو پیتھک طریق علاج آسان بھی ہے۔ سستا بھی۔ اپنی ان خوبیوں کے پیش

نظر وہ شدت سے آرزو مند تھے کہ اردو کالج کے شانہ بشانہ ایک ہومیوپیتھک کالج بھی قائم کر دیا جائے۔
اس سلسلے میں انہوں نے والد صاحب سے کئی ملاقاتیں بھی کیں۔
یہاں میں ایک واقعہ کا ذکر اور کرتا چلوں۔ اور وہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں جبکہ مجھے علی گڈھ کالج میں داخلہ لینا تھا۔ داخلے کی بڑی مشکلات تھیں۔ مولوی صاحب کو پتہ چلا تو انہوں نے سر ضیاء الدین احمد کے نام مجھے ایک خط دیا۔ جس میں ذکر تھا کہ یہ لوگ قومی کاموں کے معاملے میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ آپ ان کا داخلہ کرا دیجئے۔ اس طرح یہ ایک جذباتی سا تعلق ہے۔ جو مجھے بابائے اردو سے تھا۔
میں شروع شروع میں تو صرف دوائیں لے کر ان کے ہاں جاتا رہا۔ اس کے بعد والد صاحب امریکہ یا جرمنی جاتے یہاں ان کا چھ چھ ماہ تک قیام رہتا تو پھر میں بذات خود ان کا علاج کیا کرتا۔ بہ حیثیت معالج میرا ان کا ربط ۱۹۴۸ء سے قائم ہوا۔ اس طرح میں خود بھی کئی بار ان کے ہاں گیا ہوں۔ اور پھر وہ خود بھی یہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک چھوٹی گاڑی تھی۔ فورڈ پریفیکٹ۔ وہ اسی میں آیا کرتے تھے۔

سائل ۔ آپ نے ان کا کب تک علاج کیا۔ اور اس دوران میں انہیں کیا کیا بیماریاں ہوئیں۔

ڈاکٹر حمید۔ بابائے اردو میرے ہاں ۵۶ - ۱۹۵۵ تک آتے رہے۔ بابائے اردو کو اعصابی کمزوری تھی۔ اور نزلہ ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں عام جسمانی کمزوری بھی تھی۔ اور بعد میں اونچا سننے لگ گئے تھے۔ عام جسمانی کمزوری کی وجہ یہ تھی کہ وہ خوراک کے معاملے میں باقاعدہ نہ تھے۔ بڑے لوگوں کی طرح ان کی طبیعت میں بھی اپنے بارے میں ایک طرح کی لاپرواہی تھی۔ اور جیسے انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ اپنی ذات کے بارے میں کچھ نہ کریں گے۔ نزلہ انہیں پُرانا تھا۔ اور کراچی آجانے کے بعد تو ان کی طبیعت اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ بابائے اردو طبعاً اور مزاجاً خنک آب و ہوا۔ کے عادی تھی۔ مگر کراچی کی آب و ہوا میں رطوبت زیادہ تھی آب و ہوا کی ناسازگاری کے علاوہ بھی ان کے لئے حالات اچھے نہ تھے۔ جنکی وجہ سے انہیں تگ و دو بہت زیادہ کرنا پڑی۔ پھر انہیں یہ بھی خبر ملی کہ دریاگنج میں انجمن ترقی اردو کا دفتر جلا دیا گیا ہے۔ جس سے وہ ساری نادر کتب جل کر خاک ہو گئیں۔ جن سے انہیں عشق تھا۔ ان سب باتوں نے ان کے اعصاب پہ بہت اثر کیا۔

سائل ۔ بابائے اردو آپ کو اپنے مرض کا حال کس طرح بیان کیا کرتے تھے۔!

ڈاکٹر حمید۔ بابائے اردو کا اپنے مرض کا احوال بتانے میں ایک خاص مہارت تھی۔ وہ جب مرض بیان کرتے تو وہ اس قدر جامع، مفصّل اور مکمل ہوتا کہ کچھ اپنی طرف سے استفسار کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ انہیں اپنے امراض کی علامات بتانا آتی تھیں۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اس کے بارے میں بہت کچھ پڑھ

رکھا تھا۔

سائل - ان امراض کے دوران آپ انہیں کون کونسی ادویہ استعمال کراتے رہے ؟

ڈاکٹر حمید میں انہیں عموماً "کالی مسور" دیا کرتا یہ کانوں کے لئے ایک قسم کا تیل ہوتا ہے۔
اس کے علاوہ اعصابی کمزوری دور کرنے کے لئے انہیں "کالی فاس" دیا جاتا۔ ان کے علاوہ "ایڈونیاسٹائو" اور نقص وامیکا یہ کانوں اور اعصابی کمزوری کے لئے اور کبھی کبھار پیٹ کی تکالیف دور کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

سائل - اس دوران میں آپ نے یقیناً ان کے مزاج کے مختلف رنگ دیکھے ہوں گے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں۔ وہ اجاً کیسے تھے۔ ؟

ڈاکٹر حمید- بابائے اردو پرانے لوگوں کی مثال تھے۔ پرانے لوگوں کے کچھ ضابطہ ہائے حیات ہوتے تھے۔ مثلاً اگر کسی سے کسی کام کا وعدہ کر لیا تو وہ کچھ ہی ہو جائے اُسے نبھالینا ضروری ہے۔ کسی سے ایک بار سلوک کر دیا تو وضعداری نبھاتے چلے جا رہے ہیں۔ حالات چاہے بدل جائیں مگر اپنے آپ میں تبدیلی نہیں پیدا کرنا۔ کوئی چلا جائے جان ہو یا نہ جانتے ہو وہ کوئی کام کہہ دے تو اس کی ہر ممکن مدد کرنا - یہ تھے مولوی عبدالحق بابائے اردو جو ہر آدمی پر اعتبار کر لیتے۔ اور وہ آدمی دھوکا دے جاتا اور وہ بعد میں بڑی سادگی سے شکایت کرتے کہ دیکھئے میں نے اس پر اعتماد کیا اور اُس نے آگے سے ایسا کیا۔
عیش ان کی زندگی میں نہ تھا۔ غذا بے حد سادہ استعمال کرتے ، مرغن چیزیں انہیں پسند نہ تھیں۔ وہ جس انداز کی غذا کا استعمال کرتے اسے دیکھ کر میں نے ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ ان کے لئے کوئی پرہیزی غذا تجویز کروں۔ مزاج ان کا عزیبانہ تھا جو بعد میں چڑچڑے پن میں تبدیل ہو گیا۔
اگر میں کچھ اور کہوں تو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ ان کی زندگی میں سادگی، طبیعت میں انکساری اور آرزوؤں میں قوم کا درد تھا۔

انہیں اس بات کا احساس نہ تھا کہ وہ اتنے بڑے آدمی ہیں۔
صوبائیت پرستی سے دور بھاگا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے۔
"پاکستان تو بن گیا ہے مگر یہاں کوئی پاکستانی نہیں ہے۔ جس کو دیکھو اپنے اپنے صوبوں کی عصبیت کو یاد رکھے ہوئے ہے۔ ایک کہتا ہے۔ میں یو۔پی کا ہوں۔ دوسرے کو سندھی ہونے پر فخر ہے۔ اور کسی اور پہ اترا پھر رہا ہے۔"
بابائے اردو ایک شفیق بزرگ تھے۔ جو بزرگوں ہی کی مانند خاطر و مدارت کیا کرتے تھے

چائے کے بے حد شوقین تھے۔ اور اچھی چائے پی اور پلا کے ایک خاص فرحت محسوس کیا کرتے تھے۔ لکھتے تو بہت اچھا لکھتے۔ میرا خیال ہے۔ اردو نثر کے جدید دور میں انہوں نے اردو کو آسان کیا۔ اور ایک بات ان کی یہ تھی کہ ان کی طبیعت والد صاحب سے بہت ملتی جلتی تھی۔

ڈاکٹر سید مشتاق علی شاہ

بہادر شاہ مارکیٹ میں سید مشتاق علی شاہ کا کلینک ہے۔ جہاں وہ پائیوریا کا علاج کرتے ہیں۔ دیکھنے میں طبیعت کے تیز مگر اندر سے ہمدرد، حالات کا دُکھ جھیلے ہوئے۔ اور سادہ سے انسان ہیں۔ دانتوں کے فن کے زبردست ماہر ہیں۔ یہ ان کے پاس ایک ایسا فن ہے۔ جس سے انہوں نے بابائے اردو کا پرانا پائیوریا کا مرض کوئی آٹھ نشستوں میں ختم کر دیا۔ اپنے بارے میں ان کا کہنا ہے۔

"یہ فن ہمارے خاندان کے کچھ لوگوں میں تھا ضرور۔ میں نے ان لوگوں سے بھی فیض حاصل کیا۔ مگر اصل تربیت میں نے کلکتے سے پائی۔ اس فن کی مبادیات کلکتے سے سیکھنے کے بعد اس پر میں نے جس قدر بھی تجربے کئے ہیں۔ وہ میرے اپنے ہیں:"

پائیوریا کے مرض کے بارے میں ڈاکٹر مشتاق علی سے سوال کیا گیا۔

س "ڈاکٹر صاحب پائیوریا کا کوئی علاج کیا۔ اب تک دریافت ہو سکا ہے"؟

ڈاکٹر مشتاق۔ پائیوریا کا کوئی علاج سوائے اس کے نہیں کہ پائیوریا کے مریض کے سارے دانت نکال دیئے جائیں یورپ میں بھی یہی ہوتا ہے۔ دانتوں کے ڈاکٹروں کے پاس جب کوئی مریض آتا ہے تو وہ اس کے پورے دانت نکال دیتے ہیں۔ میں جب دانتوں کے فن میں آیا۔ اور دانتوں کے امراض سے آشنا ہوا تو پائیوریا پر میں نے خاص طور پر توجہ دی۔ میں نے کوئی بیس برس پہلے اس لاعلاج مرض پر تجربے شروع کئے تھے۔ جن کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ آج یہ مرض قابو میں آچکا ہے۔ میں نے پائیوریا کے علاج کے لئے دانتوں کے کچھ پاؤڈر نکالے ہیں۔ جن سے مکمل شفا ہو جاتی ہے۔ اور یہ پاؤڈر غیر ممالک میں بھی بھیجے جاتے ہیں۔

س "ڈاکٹر صاحب یہ بتایئے پائیوریا کا آغاز کس طرح ہوتا ہے۔ اور ان کے اثرات کیا ہوتے ہیں"؟

ڈاکٹر مشتاق۔ پائیوریا کی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض لوگوں کو شروع میں خون آتا۔ بعض کو پیپ آنے لگتی ہے۔ شروع میں اس مرض کا آغاز ایک آدھ دانت سے ہوتا ہے۔ اور پھر یہ بتدریج آگے بڑھتا ہے اور دوسرے سب دانتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ابتداً اس مرض کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اور غیر محسوس طور پر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ بعد میں کسی ایک دانت میں تکلیف بڑھ جاتی ہے۔

تو کہیں جا کے اس کا پتہ چلتا ہے۔

یہ مرض ام الامراض ہے۔ چونکہ منہ جسم انسانی کا دروازہ ہے۔ اس لیئے جب یہ مرض ہو جاتا ہے۔ تو اس کے جراثیم کھانے کے ساتھ لپٹ کر انسانی معدے میں چلے جاتے ہیں۔ اور فساد کا باعث بنتے ہیں۔

اور پھر اس کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اس سے جوڑوں اور آنکھوں پر اثر پڑتا ہے۔ معدے، بانسے اور جگر کو متاثر کرتا ہے۔ یہ سب بیماریاں بابائے اردو کو بھی تھیں۔

ڈاکٹر مشتاق علی سے سوال کیا گیا۔

"ڈاکٹر صاحب یہ بتائیے۔ بابائے اردو کب آپ کے زیر علاج آئے۔"؟

ڈاکٹر مشتاق علی نے کہا۔

یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ جب بابائے اردو میرے پاس آئے۔ انہیں پائیوریا کا مرض تھا۔ مجھ سے فرمایا کہ میں اس کا علاج کروں۔

س "یہ مرض بابائے اردو کو کب سے ہوا۔ اور اس کا کہیں اور علاج کیوں نہ ہو سکا۔"؟

ڈاکٹر مشتاق۔ یہ مرض بابائے اردو کو کوئی پچاس برس سے تھا۔ ان کے پورے دانت پائیوریا سے متاثر تھے۔ ان میں سے آدھے دانت تو نکل چکے تھے جو باقی تھے۔ وہ بھی ہل رہے تھے، ان کے منہ میں کچھ داڑھیں اور سامنے کے کچھ دانت موجود تھے۔

انہوں نے ہندوستان کے ہر بڑے ڈاکٹر سے اس سلسلے میں مشورہ کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس حکیم اجمل خان کا بھی ایک نسخہ موجود تھا۔ جسے وہ استعمال کیا کرتے تھے۔

انہوں نے ڈاکٹر انصاری مرحوم سے بھی مشورہ کیا۔ ڈاکٹر انصاری نے ان سے کہا تھا۔ آپ اپنے دانت نکلوا دیجئے ورنہ آپ کی صحت کے سنبھلنے کی کوئی صورت نہیں۔

بابائے اردو پرانی قدروں کے حامل تھے۔ انکا عقیدہ یہ تھا کہ اگر کوئی مرض ہے تو اس کا علاج بھی ہونا چاہیئے۔ یہ تو کوئی علاج نہیں کہ سر میں اگر درد ہے تو سر کٹوا دیا جائے۔ ہاتھ میں درد ہے تو ہاتھ ترشوا دیا جائے۔

انہیں اس بات پر شدت سے اصرار تھا کہ میں دانت نہیں نکلواؤں گا۔

بابائے اردو کے اس پچاس سال پرانے مرض سے حکیم ڈاکٹر سب جواب دے چکے تھے۔ جو حکیم یا ڈاکٹر ان سے ملتا یہی کہتا۔

آپ کے دانتوں کو پایئوریا ہے۔ آپ اپنے دانت نکلوا دیجیے"۔ مگر بابائے اردو نے دانت نہ نکلوائے
پھرانہیں کہیں سے میرا پتہ چلا انہوں نے مجھے یاد فرمایا اور مجھے کہا۔
"میرے دانتوں کو پچاس برس سے یہ مرض ہے۔ تقریباً ہر مشہور حکیم اور ڈاکٹر کو دکھا چکا ہوں۔
سب کا مشورہ ہے کہ میں دانت نکلوا دوں۔ میں کہتا ہوں۔ مرض ہے تو علاج بھی ہونا چاہیئے۔ آپ
میرے دانتوں کا علاج کر دیں تو میری پرانی رائے کا ایقان ہو جائے۔
میں نے ان کا علاج شروع کیا۔ میں نے ان کی قیام گاہ پر جا کر کوئی آٹھ نشستوں میں ان کا علاج
کیا اور ان کے دانت بالکل اچھے ہو گئے۔

س ۔ڈاکٹر صاحب کیسے ٹھیک مان لیا جائے کہ بابائے اردو کا پایئوریا ایک دم ختم ہو گیا تھا۔ اور ان کے
دانت ٹھیک ہو گئے تھے۔؟

ڈاکٹر مشتاق۔ ایک بات یاد رکھیئے جب آنکھوں کا آپریشن کیا جاتا ہے تو خراب دانت بالکل نکال دیئے جاتے ہیں
اگر دانت اچھے نہ ہوں تو آپریشن نہیں کیا جاتا۔ بابائے اردو کے دانت اچھے ہو گئے تھے۔ اسی
لئے ان کی آنکھوں کا آپریشن کیا گیا۔

س ۔آپ نے اس سے قبل کبھی بابائے اردو سے ملاقات کی تھی۔!

ڈاکٹر مشتاق۔ میں اس زمانے میں بنگلور میں تھا۔ جب کسی اجتماع میں ان سے تعارف ہوا۔ اور مجھے ان سے نیاز
حاصل ہوا۔ کراچی آکر تو میرے ان کے تعلقات معالج اور ڈاکٹر کے نہ رہے تھے۔ میں جب کبھی
بھی مغموم یا رنجیدہ ہوتا ان کے ہاں چلا جاتا۔۔۔۔ ان کی خاطر پر جب غبار آتا مجھے بلا لیا کرتے میں
حالات سے متاثر ہوتا۔ تو گھنٹوں ان کے ہاں بیٹھا رہتا۔

میرے خیال میں کوئی انسان نہ ہو گا جو ان سے متاثر نہ ہو۔ وہ اردو کے جید عالم تھے۔ اور ان کی گرانقدر
خدمات تھیں۔ اور ان کا مجھ سے خلوص اس وجہ سے تھا کہ میرا تعلق مولانا وحیدالدین سلیم کے
خاندان سے ہے۔ اور پھر میرے تو وہ فن ہی سے متاثر تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی پچاس سال
پرانی تکلیف دور ہو گئی۔

وہ مجھے آخری وقت تک یاد فرماتے رہے۔ اس زمانے میں میں لاہور میں تھا۔ جب میں لاہور سے آیا
تھا وہ ہوش میں نہ تھے۔ بہر حال میں نے انہیں دیکھا۔ وہ بلا کے "مزاج دار" تھے۔ ایکا ایکی کسی
سے بات ہی نہ کرتے تھے۔ مگر جس سے خلوص ہو جاتا۔ اس سے بڑے خلوص سے ملتے۔

وہ یاد آتے ہیں تو میری آنکھوں میں آنسو تیر جاتے ہیں۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

بابائے اردو کے خدمتگذاروں

- بشیر احمد
- سیّد بدر عالم
- صوفی عبدالرشید
- اعظم خان سواتی

کے تاثرات — !

مرتبہ

شمیم احمد

بشیر احمد کی کہانی اُسی کی زبانی

بشیر احمد ــــ بابائے اُردو کے قریب ترین خدمت گزار ہیں۔ انہوں
نے مسلسل ۴۳ سال تک روز و شب مرحوم کی خدمت کی۔ ذیل میں اُن
کی داستان، انہیں کی زبانی، درج کی جاتی ہیں۔

میرا نام بشیر احمد ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مولوی عبدالحق صاحب (جن کو بابائے اردو کہتے ہیں) کی خدمت میں گزارا ہے۔ اور تقریباً چالیس سال مولوی صاحب کا خانساماں رہا ہوں۔ اُن کی زندگی کے ہر دور میں خدا نے مجھے اُن کے قدموں سے لگا رہنے کی توفیق بخشی ہے۔ لیکن آپ اگر یہ دریافت کریں گے کہ مولوی صاحب کی شخصیت کو میں نے کیسا پایا تو میرے پاس اس کے جواب میں کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اُن میں کون کون سی صلاحیتیں اور قوتیں کام کر رہی تھیں؟ وہ بحیثیت ایک انسان۔ ایک خادم قوم، اردو کے عاشق اور ادیب کی حیثیت میں کس مرتبہ پر فائز تھے؟ اس کا اندازہ میری بساط سے باہر ہے۔ اس کا اظہار اُن کے دوستوں۔ جاننے والوں۔ عزیزوں اور ادیبوں کو کرنا چاہیئے اور آنے والا زمانہ ہی اس کا صحیح فیصلہ کر سکے گا کہ وہ کس پائے کے آدمی تھے۔ میں نے تو مولوی عبدالحق صاحب کی صرف خدمت کی ہے۔ اور اسی خدمت میں خود بھی بوڑھا ہو گیا ہوں۔

میری نظر میں چالیس طویل سال گھوم رہے ہیں جن میں میں نے ایک ایسے شخص کی گھریلو اور عام زندگی کو اپنے قریب سے دیکھا جس نے اپنی تاریخ آپ بنائی تھی اور بدقسمتی سے میں آپ کے سامنے اس تاریخ کا کوئی اندازہ پیش نہیں کر سکتا لیکن میری خدمات کا یہ طویل عرصہ خود ایک تاریخ ہے۔ جو واقعات اور حالات کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس کا ایک سرا اورنگ آباد سے بندھا ہے اور دوسرا کراچی سے۔ مولوی صاحب نے اس تمام عرصے میں کون کون سی فتوحات کیں۔ اور کون کون سی تاریخی شخصیتوں میں زندگی گزاری میں ان کی نشان دہی کرنے سے قاصر ہوں لیکن میں اس شخصیت کا چہرہ آپ کو ضرور دکھانے کی

کوشش کروں گا۔ جس نے میری پرورش کی ہے۔ مجھے بچوں کی طرح پالا پوسا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میں نے بھی اپنی زندگی میں حق نمک ادا کر دیا ہے۔

دراصل یہ روداد میرے چالیس برسوں کی روداد ہے جس میں مولوی عبدالحق صاحب کی شخصیت کے آفتاب نے میری تاریک زندگی کو بھی منور رکھا۔ اگر میری اپنی بساط بھر یہ روشنی آپ کو اس آفتاب عالم تاب کا کچھ عکس دکھا سکے تو یہ میری سعادت ہوگی۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ مولوی عبدالحق جیسا دھن کا پکا صاحب ارادہ اور نڈر شخص دوبارہ شائد ہی پاک و ہند کی سرزمین سے پیدا ہو سکے۔

مگر میں نے غلط کہا کہ میں ۴۰ سال سے مولوی صاحب کی خدمت کر رہا ہوں کیوں کہ میں ہی نہیں اس سے پہلے میرا خاندان اُن کے خاندان کی خدمت کرتا رہا ہے۔ میں نہ صرف مولوی عبدالحق صاحب کا ہم وطن بلکہ پڑوسی بھی ہوں۔

میرے والد کا نام غفور احمد تھا۔ میری پیدائش میرے وطن ہی یعنی ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں ہوئی۔ ہم لوگ محلہ قانون گویاں میں رہتے تھے۔ اور ہمارا مکان مولوی عبدالحقؒ صاحب کے مکان سے بہت قریب پڑتا تھا۔ اسی لئے ہم کو مولوی صاحب کے خاندان سے پوری واقفیت تھی۔ مولوی صاحب کے والد زمیندار تھے اور اُن کا خاندان ہاپوڑ کے مشہور اور رئیس خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ مولوی صاحب کے دو بھائی اور تھے ایک شیخ ضیارالحق صاحب جو مولوی صاحب سے عمر میں بڑے تھے اور دوسرے احمد حسین صاحب جو بھوپال میں انجینئر تھے۔ یہ مولوی صاحب سے چھوٹے تھے۔ اور آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ ضیارالحق صاحب ہاپوڑ میں بڑے با اثر اور زبردست آدمی سمجھے جاتے تھے۔ اُن کی زندگی سیاسی کاموں میں بسر ہوئی تھی جس کی وجہ سے گورنمنٹ بھی اُن کا لحاظ کرتی تھی اور مالی امداد بھی کرتی تھی۔ ضیارالحق صاحب بڑے دبدبے کے آدمی تھے۔ اور ہاپوڑ کے لوگ اُن کے اثرات کی وجہ سے بے حد خوف کھاتے تھے۔ انہوں نے لاہور سے ایک اخبار بھی نکالا تھا۔ جس نے بڑا خاصا ہنگامہ مچایا تھا۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد وہ مستقل طور پر ہاپوڑ آ گئے تھے۔

مولوی عبدالحق صاحب اگر اپنے خاندان میں کسی سے دلی لگاؤ رکھتے تھے تو اپنے انہی بڑے بھائی سے۔ اُن سے نہ صرف محبت کرتے تھے بلکہ بے پناہ عقیدت بھی رکھتے تھے۔ اُن کے سامنے لحاظ کی وجہ سے بات بھی بہت کم کرتے تھے اور اسی لگاؤ میں شاید اُسی بات کا دخل تھا۔ کہ اس خاندان میں ضیارالحق صاحب پہلے آدمی تھے جنہوں نے کوئی اخبار نکالا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے مولوی صاحب ہر سال پابندی سے ہاپوڑ آتے رہے اس کے بعد آنا جانا موقوف ہو گیا تھا۔

مولوی عبدالحق صاحب کی لاپروائی اور بے نیازی کا حال ہمارے گھر میں پہلے ہی سے "نشر" ہوتا رہتا تھا۔ انہوں

سوائے ضیاء الحق صاحب کے شاید ہی کسی سے کوئی تعلق یا رابطہ رکھا ہو۔ الگ تھلگ رہتے تھے۔ اور کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے۔ اُن کی قابلیت اور پڑھائی کی شہرت بہت تھی۔ اور عموماً سب ہی جانتے تھے کہ ہر وقت پڑھنے کے شوق میں مولوی صاحب نے ساری زندگی اور اس کی دلچسپیوں کو تج دیا تھا۔ اول تو مولوی صاحب ہمیشہ باہر رہے جس کی وجہ سے لوگوں کو اُن کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ بھی نہ تھا۔

میری عمر کوئی گیارہ سال کی ہوگی کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا اور ہم سب لوگ بہت پریشان ہو گئے۔ میری والدہ اکثر مولوی صاحب کے یہاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ اس حادثے کی وجہ سے ضیاء الحق صاحب نے مجھے اپنے یہاں نوکر رکھ لیا۔ میں اُن کے پاس کوئی دو سال نوکر رہا۔ اور اسی زمانے میں۔ میں نے اُن کو بہت قریب سے دیکھا۔ بڑے دبنگ آدمی تھے اور اکثر ہاپوڑ کے باہر بھی آتے جاتے رہتے تھے حالانکہ اُن کو سوائے دہلی اور رامپور کے اور کہیں جانے کی اجازت نہ تھی۔ گورنمنٹ بھی اُن سے خوف کھاتی تھی۔ ایک بار وہ سفر پر جا رہے تھے تو میں نے اُن سے دریافت کیا تھا کہ آپ آخر سفر میں اپنے آدمیوں کو کیوں نہیں لے جاتے۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔ کہنے لگے کہ نہیں۔ میرے ساتھ گورنمنٹ کے ڈو ڈو کتے رہتے ہیں۔ یہ سی۔ آئی۔ ڈی کی طرف اشارہ تھا۔ ضیاء الحق صاحب اپنی والدہ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اور اُن کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے میں نے انہیں اکثر اُن کے پیر دباتے دیکھا تھا والدہ کی عزت کے معاملے میں مولوی عبد الحق صاحب کا بھی وہی حال تھا جو ضیاء الحق صاحب کا۔ کسی بات کو اُن کی ٹال نہیں سکتے تھے حتیٰ کہ مولوی صاحب کی شادی بھی محض والدہ کے اصرار سے ہوئی تھی حالانکہ مولوی صاحب کی مرضی بالکل نہ تھی۔ اور شادی کے ہی دن وہ گھر سے فرار بھی ہو گئے تھے۔

شادی کے معاملے میں دونوں بھائی یکساں طبیعت رکھتے تھے۔ ضیاء الحق صاحب کو بھی شادی سے بڑی نفرت تھی اسی لئے اُن کی شادی بہت عمر میں ہوئی۔ اُن کی شادی بھی والدہ کے اصرار پر ہوئی۔ میں نے اپنی والدہ سے سنا ہے کہ ایک بار ضیاء الحق صاحب نے اپنی والدہ کو بہت ملول اور غمگین دیکھا تو اُن سے افسردگی کا سبب پوچھا۔ جس کے جواب میں اُن کی والدہ نے کہا کہ میری یہ آخری خواہش تھی کہ تمہاری شادی دیکھ لوں۔ جس پر وہ فوراً تیار ہو گئے۔ اور اس طرح اُن کی شادی ہوئی۔ مولوی صاحب کی شادی کا بھی قصہ اسی طرح کا ہے۔ میری والدہ کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب کی شادی بھی ہاپوڑ میں ایک معزز خاندان کی لڑکی سے اُن کی والدہ نے طے کر دی جبکہ مولوی صاحب کا بالکل ارادہ نہ تھا۔ مگر وہ والدہ کی بات کو اس وقت نہ ٹال سکے، اور مجبور ہو گئے۔ لیکن شادی کے دن گھر سے فرار ہو گئے۔ کئی سال تک اُن کی بیوی بیٹھی رہیں،۔ پھر مولوی صاحب نے والدین کے انتقال کے بعد ایک سال بعد اُن کو اُن کے مہر کا روپیہ ادا کر کے طلاق دے دی۔ اس مطلقہ خاتون کی شادی بعد میں ممتاز حسن صاحب (ہاپوڑی) سے ہو گئی۔ مولوی صاحب کا تعلق گھر والوں سے بس برائے نام تھا۔ مزاج ہمیشہ سے سنجیدہ تھا۔ سوائے لکھنے پڑھنے کے

کوئی اور شوق نہ تھا اور نہ کسی چیز کی پرواہ کرتے تھے۔ ضیاءالحق صاحب کے انتقال کے بعد ..... نے ساری جائداد بیچ کر سارا روپیہ اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور خاندان والوں نے مولوی صاحب سے اس سلسلے میں بہت کہا مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ خاندان میں بھی وہ والدہ اور بڑے بھائی کے علاوہ کسی اور کی بات نہ سنتے تھے۔

جس زمانے میں میں ضیاءالحق صاحب کے ہاں ملازم تھا، مولوی عبدالحق صاحب اورنگ آباد میں تھے۔ اور عموماً ہر سال دو چکر بھائی کے پاس لگا لیا کرتے تھے۔ خصوصاً سردیوں میں ضرور ہاپوڑ آتے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس سال بھی آئے جب میں نوکر ہوا تھا۔ میرا کام اور چستی پھرتی دیکھ کر مولوی صاحب بہت خوش ہوئے اور میرے کام کی بڑی تعریف کی۔ اس زمانے میں میں اوپر کا کام کیا کرتا تھا۔ ضیاءالحق صاحب نے کہا کہ یہ اپنے محلے ہی کا لڑکا ہے۔ پھر مختصر حالات میرے بتائے کہ باپ مر چکا ہے۔ ماں اور چھوٹا بھائی ہے اور کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں تو اس کو ساتھ لے جائیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میرے پاس ملازم تو بہت سے ہیں مگر تمام ناکارہ ہے۔ اگر آپ اس کو کھانا پکانا سکھا دیں تو میں اس کو بلا لوں گا کیونکہ کھانے ہی کی مجھے سب سے زیادہ تکلیف ہے۔ اس کے بعد مجھے ضیاءالحق صاحب نے اپنی والدہ کے سپرد کر دیا اور انہوں نے مجھے کھانا پکانے کی تربیت دی۔ مولوی صاحب جب دوسرے سال آئے تو مجھ سے خود پوچھا کہ کہو بھئی کچھ کام سیکھ لیا۔ ضیاءالحق صاحب نے کہا کہ یہ کام سیکھ چکا ہے۔ اگر اب ساتھ لے جانا چاہیں تو لے جائیں۔ اس دفعہ مولوی صاحب کو چونکہ لکھنؤ اور علی گڑھ وغیرہ جانا تھا۔ اس لئے مجھے ساتھ نہ لے جا سکے۔

۱۹۱۸ء میں جب جنگ عظیم ختم ہوئی تھی، اچانک ضیاءالحق صاحب کے نام مولوی صاحب کا خط آیا، بشیر کو اگر آپ بھیج سکیں تو بھیج دیں۔ مجھے اب اس کی شدید ضرورت ہے، اور اسی کے ساتھ اپنے کھانے وغیرہ کی تکلیفوں کا ذکر بھی کیا تھا۔ ضیاءالحق نے میری والدہ سے بات چیت کی۔ گو کہ میں اتنی دور نہیں جانا چاہتا تھا مگر انہوں نے میری والدہ پر زور ڈال کر مجھے جانے کے لئے تیار کر لیا اور ٹرین میں سوار کرا دیا۔ اس وقت میری عمر کوئی تیرہ سال ہو گی۔ جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ٹرینیں فوجیوں کی آمد و رفت سے بھری ہوئی تھیں۔ مجھے بھی کچھ فوجیوں کے سپرد کر دیا گیا اور ان سے ضیاءالحق صاحب نے تاکید کر دی کہ مجھے بھوپال میں اتار دیں اور دوران سفر میرا خیال رکھیں۔ انہوں نے احمد حسین صاحب کو بھوپال تار بھی بھیج دیا تھا۔ اسی لئے احمد حسین صاحب بھوپال کے اسٹیشن پر مجھے خود لینے آئے تھے۔ آٹھ دس روز ان کے پاس یہاں رہا۔ پھر انہوں نے مجھے حیدرآباد کے لئے ٹرین پر سوار کرا دیا اور میں اورنگ آباد پہنچ گیا۔ ایک تو میری عمر بہت کم تھی پھر اجنبی جگہ۔ اس لئے میں بہت پریشان تھا۔ اور گھبرایا ہوا بھی۔ مولوی صاحب وہاں مقبرہ رابعہ دورانی (اورنگ زیب عالمگیر کی بیگم) پر رہتے تھے۔ میں نے تانگے والوں سے بات چیت کی تو انہوں نے

مجھے اجنبی سمجھ کر کرایہ بہت زیادہ بتایا۔ اس لئے میں پیدل چل پڑا۔ مقبرہ اسٹیشن سے کافی دور تھا۔ بڑی مشکلوں سے میں وہاں تک پہنچ سکا۔ اس زمانے میں مولوی صاحب محکمۂ تعلیمات کے مہتمم تھے۔ ان کا بنگلہ مقبرہ سے ملحق تھا اور پرانی قسم کی ایک شاندار عمارت معلوم ہوتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مولوی صاحب نے اس کو چمن زار بنا رکھا تھا۔ مجھے یہ بعد میں معلوم ہوا کہ انہیں درخت لگانے اور باغبانی سے فطری شوق تھا۔ اس بنگلہ کا منظر اس لئے اور بھی خوبصورت تھا کہ اس کے سامنے مقبرہ رابعہ دورانی اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ کھڑا تھا اور دیکھنے والے کے دل پر بڑا اثر کرتا تھا۔ یہ عمارت تاج محل کا ہو بہو چربہ ہے۔

جب میں تھکا ہارا گھر تک پہنچا تو چاؤش سے یہ معلوم ہو کر بڑی مایوسی ہوئی کہ مولوی صاحب دورے پر گئے ہوئے ہیں پوچھنے پر اس سے بھی مایوس کن جواب ملا کہ یہ پتہ نہیں کب تک واپس آئیں گے۔ اس نے بتایا کہ اکثر وہ پندرہ پندرہ دن واپس نہیں آتے۔ میری پریشانی حد کو پہنچ گئی میری یہ حالت دیکھ کر چاؤش مجھے تسلّی دینے لگا۔ اتنے میں نور محمد خاں صاحب جو دولت آباد کے باغات کے مہتمم تھے اور مولوی صاحب کے دوست بھی، تشریف لے آئے اُن کو میرا حال معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا اور کہا کہ مولوی صاحب یہاں اپنے تمام دوستوں سے تمہارا ذکر کر چکے ہیں۔ اور بتا چکے ہیں کہ "میں نے اپنے گھر سے ایک بہت کام کا ہوشیار لڑکا بلوایا ہے۔ تو تم وہی ہو" اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم یہاں اطمینان سے رہو۔ نور محمد صاحب کی آمد کی وجہ سے میری پریشانی خاصی دور ہوگئی۔ انہوں نے میرے کھانے پینے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ مگر مولوی صاحب سے نہ ملنے کی وجہ سے میں کچھ ناامید سا ہو رہا تھا۔ دس پندرہ روز بعد مولوی صاحب بھی آگئے۔ مجھے جو دیکھا تو بہت خوش ہوئے میرا احوال دریافت کرتے رہے اور پھر پوچھا کہو تم نے کھانا اچھا پکانا سیکھا یا نہیں؟ میں نے فوراً کہا "جی ہاں میں ہر قسم کا کھانا پکا لیتا ہوں" جب کہ حقیقت یہ تھی کہ مجھے کھانا پکانے کا ایسا تجربہ نہ ہوا تھا کہ میں اپنے اوپر ذرا بھی اعتماد کر سکتا۔ مولوی صاحب میرا جواب سن کر اتنا خوش ہوئے کہ فوراً فرمائش بھی کر دی اور اپنے دو چار دوستوں کو دعوت بھی دے ڈالی۔ یہ میرے امتحان کا وقت تھا۔ مولوی صاحب نے سیخ کے کباب قورمہ اور ارڈد کی دال کی فرمائش کی تھی جس کو تیار کرتے ہوئے میرا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا۔ مگر خدا کا فضل شاملِ حال تھا کہ میں اس امتحان میں پورا اترا۔ اور اتفاق سے کھانا بھی غیر معمولی طور پر اچھا پک گیا۔ کھانا سب کو پسند آیا اور مولوی صاحب نے بڑی تعریف کی۔ اس طرح گویا میں نے اپنی خدمات کا آغاز کیا۔

مولوی صاحب کے پاس ہمیشہ کئی کئی نوکر رہے اور اس وقت بھی اُن کے پاس کئی نوکر تھے جب میں اُن کی خدمت کو پہنچا۔ مگر درحقیقت وہ سب ایسے ہی تھے جن سے مولوی صاحب بیزار رہتے تھے۔ ناکارہ، کاہل اور ناقابلِ اعتماد۔ اُن میں سے اکثر مولوی صاحب کی چیزیں روپیہ اور کپڑے بھی چوری کر لیتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ مولوی صاحب کو اُن کی حرکات

کا پتہ ہی نہیں تھا۔ انہیں سب کچھ معلوم تھا۔ مگر مجبور تھے۔ وہاں اُن کا کوئی اپنا آدمی تھا ہی نہیں تو وہ کیا کرتے۔ جو نوکر پرانے تھے وہ نئے نوکر کو ٹکنے ہی نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ اُن کو یہ خوف رہتا تھا کہ کہیں نیا نوکر اُن کی جگہ نہ لے لے یا اُن کی لوٹ مار میں اپنا حصّہ بھی نہ لگانے لگے۔ اس وجہ سے انہوں نے بہت سے نوکروں کو کسی نہ کسی الزام میں نکلوا دیا تھا۔ اُن کی کامیابی کی وجہ مولوی صاحب کی بعض کمزوریاں تھیں۔ مولوی صاحب بے حد غصّہ ور اور ضدی تھے اور اس سے بھی زیادہ کانوں کے کچّے۔ یہ اُن کی ایسی کمزوریاں تھیں جن سے نوکروں ہی نے نہیں بلکہ بڑے بڑوں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے۔ مولوی صاحب کو جب غصّہ چڑھتا تھا تو کئی کئی روز نہیں اترتا تھا۔ اسی لئے وہاں کے مرہٹی بولنے والے نوکروں اور آدمیوں نے اُن کا خطاب "ٹیڑھی صاحب" رکھ رکھا تھا۔ ٹیڑھی مرہٹی میں غصّہ کو کہتے ہیں۔ ان مفاد پرست اور خود غرض نوکروں نے آدمی بھگانے کی ترکیبیں بھی عجیب عجیب نکالی تھیں۔ پہلے تو اس کو ویسے ہی خوب تنگ کرتے تھے۔ اور جب کوئی اس سے نہ بھاگتا تھا تو اس کے کاموں میں خود کوئی خرابی پیدا کر دیتے تھے۔ مثلاً اگر باورچی نیا آیا تو اس کے کھانے میں چپکے سے کنکریاں ملا دیتے تھے۔ ادھر مولوی صاحب کا یہ حال تھا کہ اگر مہمانوں نے کھانے کی تعریف کر دی تو وہ صاحب نہال ہو جاتے تھے اور باورچی کی تعریف کر کے آسمان پر چڑھا دیتے تھے اور اگر کسی نے نقص یا خرابی نکالی دی تو پھر وہ شخص دنیا کا بدترین آدمی ہو جاتا تھا۔ اس کو نالائق ٹھہرا کر بری طرح ڈانٹ دیتے۔ جس سے خوفزدہ ہو کر نیا نوکر بھاگ جاتا تھا۔ میرے ساتھ بھی ان نوکروں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ پہلے تو خود مجھے اپنے کارنامے سے سنائے اور پھر کہا کہ میاں تم بھی اسی طرح چلتے پھرتے نظر آؤ گے۔ مگر میں نے یہاں تک حالات کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ میں چونکہ کم عمر تھا۔ اس لئے مولوی صاحب کے اس لق و دق مکان کے بھاڑ کے بھاڑ باورچی خانے سے ویسے بھی جی الجھتا تھا۔ پھر رات کو ملینڈک وغیرہ الگ ٹرّاتے اور میری جان نکل جاتی۔ مگر میں نے ہمت مضبوط کی اور نوکروں کی حرکات پر نظر رکھی، دوسری طرف مولوی صاحب کے مزاج کا اندازہ کیا اور ایک روز موقع دیکھ کر مولوی صاحب کو اُن نوکروں کے تمام کارنامے سنا دیئے۔ جس پر انہوں نے کہا کہ ہاں مجھے معلوم ہے مگر میں یہاں کس پر بھروسہ کر سکتا ہوں اب تم سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لو اور میری ساری "خبرگیری" سنبھال لو۔ اس طرح انہوں نے مجھے ساری چابیاں دلوا دیں اور میں نے آہستہ آہستہ سارے کاموں اور حالات کو اپنے قابو میں کر لیا۔

مولوی صاحب کھانے کے بڑے شوقین تھے اور اس سے زیادہ کھلانے کے، جب تک دسترخوان پر دو چار آدمی نہ ہوں نہ اُن کو کھانے میں مزہ آتا ہے اور نہ وہ ٹھیک طرح کھانا کھا سکتے تھے گویا مہمان نوازی اُن کے خمیر میں تھی۔ میں نے مولوی صاحب جیسا آدمی اس سلسلہ میں دوسرا نہیں دیکھا۔ انہوں نے مجھے سب سے پہلے جو ہدایت کی تھی وہ یہ تھی کہ مجھے تم چاہے جیسا کھانا کھلا دو کھا لوں گا۔ چٹنی بھی شوق کے ساتھ کھا سکتا ہوں مگر میرے

دوستوں کو کوئی شکایت کسی قیمت پر نہیں ہونی چاہیئے - مولوی صاحب خود کھانے میں بڑی احتیاط برتتے تھے - اچھا کھانا کھاتے تھے اور ایک وقت کھاتے تھے - اُن کا معمول یہ تھا کہ صبح کا ناشتہ کر کے پھر بس رات کو کھانا کھاتے تھے - اس وقت تو اُن کے ساتھ لوگ کھانا اور ناشتہ کرتے ہی تھے مگر دوپہر کے وقت بھی وہ دسترخوان پر ضرور موجود رہتے تھے - لوگوں کو کھاتا دیکھ کر اور کھانے پر اُن کی رائے سُن کر خوش ہوتے تھے یا برہم ہو جاتے تھے - مولوی صاحب کا ایک قول بہت مشہور ہو گیا تھا "یہ حماقت کی بات ہے کہ لوگ اس پر یقین کر لیتے ہیں کہ آدمی کی عمر مقرر ہوتی ہے - آدمی چاہے تو اپنی عمر بڑھا سکتا ہے - اور اس کی ترکیب صرف یہ ہے کہ وہ کھانے میں احتیاط برتے" اور اس پر مولوی صاحب ساری عمر کاربند رہے - کھانے میں گوشت بہت کم کھاتے تھے - مگر پرندوں کا گوشت بہت پسند کرتے تھے - مچھلی کے بھی بہت شوقین تھے - میٹھی چیزوں میں لوکی کی کھیر بہت پسند کرتے تھے - ناشتہ پر چنوں کا ہونا نہایت ضروری تھا - چنے کے اتنے شوقین تھے کہ اگر کسی روز موجود نہ ہو تو نہایت خفا ہوتے تھے دوستوں کو دعوت دینے کے بہانے ڈھونڈتے تھے اور ایسے موقعوں پر شب دیگ اور نہاری بہت پکواتے تھے - پھلوں میں پپیتہ بے حد پسند کرتے تھے -

مولوی صاحب کا دوسرا شوق سیر سپاٹے کا تھا - سفر کے اور گھومنے پھرنے کے بڑے عادی تھے - میں نے اُن کے ساتھ تقریباً سارے ہندوستان کی سیر کر لی تھی - یہ شوق صرف بڑے سفر تک ہی محدود نہ تھا بلکہ روزانہ کی ٹہل سے لے کر سرکاری دوروں تک یکساں دلچسپی روا رکھتے تھے - مولوی صاحب چونکہ اورنگ آباد میں صدر مہتمم تعلیمات تھے - اس لئے انہیں اکثر اپنے ماتحت اضلاع کا دورہ کرنا پڑتا تھا - چار اضلاع اُن کے حلقے میں شامل تھے اورنگ آباد - پربھنی - ناندیڑ اور بیڑ - مولوی صاحب کا دستور تھا کہ پربھنی اور ناندیڑ کے دورے پر تو ٹرین سے جاتے تھے مگر اورنگ آباد اور بیڑ کے اضلاع میں وہ بہت پر لطف اور دلچسپ دورہ کرتے تھے - ایک خوبصورت بیل تانگا اپنے لئے رکھ رکھا تھا - جس میں تین چار آدمی خوب اچھی طرح بیٹھ جاتے تھے - نوکر پیشہ لوگ بیل گاڑیوں میں ساتھ ساتھ چلتے اور اس طرح یہ شاندار دورہ جاری رہتا - اکثر ڈیڑھ دو ماہ تک ہر ضلع میں گزارتے - یہ گویا مولوی صاحب کی "ہوبی" کہلائی جا سکتی ہے - سیر سپاٹا جب سفر کی مد میں آتا تو وہ عموماً گرمیوں کی چھٹیوں کا زمانہ ہوتا تین ماہ کی یہ چھٹیاں مولوی صاحب ہمیشہ ریاست سے باہر گزارتے - عموماً پہاڑوں پر جایا کرتے تھے اور ایسے سفر میں میرا ساتھ رکھنا بے حد ضروری خیال کرتے تھے - میں نے مولوی صاحب کی خدمت کے طفیل، شملہ، دارجلنگ مسوری، الموڑہ اور نینی تال سب جگہ کی سیر کر لی تھی - روزانہ کے معمول میں صبح کی ٹہل ایک ایسی چیز تھی جو مولوی صاحب سے کبھی نہیں چھوٹی - سونے کی عادت بہت کم تھی - رات کو دو بجے تک سوتے اور چار ساڑھے چار بجے اٹھ بیٹھتے ضرور ٹہلنے نکل جاتے - میلوں کا چکر لگا کر واپس آتے - اس وقت عموماً اُن کے پاس ایک میٹر نما آلہ بھی ہوتا

تھا۔ جس سے وہ یہ اندازہ کرتے تھے کہ میں کتنا چلا ہوں۔ عموماً ڈھائی تین میل روز صبح ٹہلنا اُن کی فطرت کا جزو تھا۔

مولوی صاحب نے اپنے کاموں کے اوقات مقرّر کر رکھے تھے۔ اور میں نے اُن کو کبھی اس کی خلاف ورزی کرتے نہیں دیکھا۔ اپنی تمام مصروفیات کے باوجود سب سے زیادہ وقت پڑھنے لکھنے کے لئے نکال لئے تھے اس کے لئے انہوں نے خاص اہتمام کیا تھا۔ مثال کے طور پر اصل کوٹھی کے کمروں کو چھوڑ کر انہوں نے ایک الگ کمرہ بھی بنوایا تھا۔ جس پر چھپّر ڈلوایا تھا۔ یہ مولوی صاحب کی کٹیا تھی۔ جہاں وہ ناشتے کے بعد جاتے تو پھر سہ پہر کو ہی باہر آتے۔ یہاں مولوی صاحب پڑھنے اور لکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے تھے۔ اپنے اس معمول کے لئے انہوں نے چند اصول بھی بنائے تھے۔ مولوی صاحب ملنے والوں سے بہت گھبراتے تھے جن کی وجہ سے مولوی صاحب کا بڑا قیمتی وقت ضائع ہوتا تھا بات یہ تھی کہ مولوی صاحب کے احباب کا اور ملنے والوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ اُن میں سے اکثر اپنے کاموں اور سفارشوں کے سلسلے میں بھی آتے تھے۔ مولوی صاحب اگر سب سے ملتے تو پھر وہ دنیا کا اور کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اُن کی ہم کو سخت ہدایت تھی کہ جب وہ کٹیا میں ہوں تو تمام ملنے والوں سے کہہ دیا جائے کہ وہ موجود نہیں ہیں۔ بعض دفعہ بہت مزہ آتا۔ ہم لوگ کبھی کبھی ایسے دوستوں کے کارڈ بھی روک لیتے جو اُن کے خاص ملنے والے ہوتے تھے اور شام کو اُن کے سامنے تمام کارڈوں کے ساتھ اُن حضرات کے کارڈ بھی پیش کر دیتے تو بہت بھنّاتے اور کہتے کہ ان کو تو میں نے خود بلایا تھا تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔ ہم لوگ کہتے کہ آپ نے ہم کو "نادری حکم" جو دے دیا ہے کہ ہر آدمی کو منع کر دو۔ ہم کو کیا معلوم کہ آپ نے کس کو بلایا ہے کس کو نہیں بلایا ہے۔ مولوی صاحب کے احباب کا جن میں ہندوؤں کی تعداد بھی بہت بڑی تھی۔ کوئی شمار نہیں کر سکتا تھا۔ اس زمانے میں حیدرآباد کا محکمۂ تعلیمات ہندوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کے ملنے والوں میں؛ در قریبی دوستوں میں کئی ہندو حضرات تھے۔ جب مولوی صاحب نے محکمۂ تعلیمات چھوڑا اور کالج کے پرنسپل ہوئے تو اس زمانے میں سر اکبر حیدری حیدرآباد کے وزیر اعظم تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب اورنگ آباد کے تمام اضلاع میں کوئی کالج نہ تھا۔ سب سے پہلے مولوی صاحب نے سر اکبر حیدری کی توجّہ اس طرف دلائی کہ ان مقامات میں کالج ہونا ضروری ہیں۔ جس سے سر حیدری نے اختلاف کیا۔ پہلے تو آپس میں خط و کتابت اور تار بازی ہوتی رہی۔ پھر ٹھن گئی اور مولوی صاحب بھی اپنی فطرت کے مطابق اُن کے سامنے ڈٹ گئے۔ اور وائسرائے کو لکھا کہ یہاں تعلیم کے سلسلے میں یہ لاپروہیاں برتی جا رہی ہیں جس کے جواب میں وائسرائے نے وزیر اعظم حیدرآباد کو ہدایت کی ان اضلاع میں بھی کالج قائم ہونے چاہئیں۔ یہ زمانہ مولوی صاحب کی "فتوحات" کا زمانہ تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مولوی صاحب نے انجمن کو سارے ہندوستان میں مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ وہ انجمن ترقی اُردو کے واحد معمار تھے۔ سیر و سفر کے شوقین تھے ہی سارے

ہندوستان کا دورہ کرتے اور ہر جگہ انجمن کا دفتر قائم کردیئے - ہر مقام پر اس کی شاخیں کھلواتے - لائبریریوں کی بنیاد رکھتے - مدرسے کھلواتے اور اُردو کی مقبولیت کے لئے طرح طرح کے جتن کرتے - سب سے زیادہ تکلیف اور پریشانی انہوں نے مالابار کے علاقے میں اٹھائی - یہاں وہ بارشوں میں بھیگتے - کیچڑ میں دھنستے پیدل چل چل کر اردو کی خدمت کیا کرتے تھے - گاڑی خراب ہوجاتی تو پرواہ نہ کرتے - اس علاقے میں مولوی صاحب نے جس پیمانے پر اور جس محنت اور لگن کے ساتھ کام کیا ہے وہ کسی اور شخص کے بس کی بات ہی نہیں تھی - اس علاقے سے وہ کبھی غافل نہ رہے - حتیٰ کہ برسوں بعد دہلی چلے جانے کے باوجود وہاں کے عملے کی تنخواہیں دہلی سے بھجواتے رہے - مولوی صاحب کے بارے میں عموماً یہ مشہور ہے کہ وہ دہریہ تھے - یہ صحیح ہے کہ انہوں نے کبھی صوم وصلوٰۃ کی پابندی نہیں کی مگر وہ قرآن مجید گھر میں ضرور رکھتے تھے - اور اسلام پر اُن کی نظر بہت گہری تھی - اکثر احباب سے مذہبی بحثیں کرتے اور میں نے بہت سے نامی گرامی لوگوں کو اُن سے مذہبی معاملات میں رائے لیتے بھی دیکھا ہے - اس وقت اس کا تذکرہ میں اس لئے کر رہا ہوں کہ میں نے اپنی اتنی طویل مدت ملازمت میں مولوی صاحب کو مالابار میں ہی مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا ہے - یہ بات دوسری ہے کہ اس کا "کریڈٹ" بھی اردو کو جاتا ہے - قصہ یوں ہوا کہ مولوی صاحب ایک علاقے میں اردو کی تبلیغ اور انجمن کے چندہ کے سلسلے میں گئے - وہاں کے دو چار معقول آدمیوں نے انہیں مشورہ دیا کہ یہاں اس طرح کوئی نہیں سنے گا اور آپ کا وقت بھی ضائع ہوگا اور فایدہ بھی حاصل نہ ہوگا - آپ یہ کریں کہ مسجد میں تشریف لے آویں - وہاں تقریباً تمام مسلمان جمع ہوتے ہیں - آپ نماز بھی سب کے ساتھ پڑھیں اور اس کے بعد تقریر کریں اور چندہ کی اپیل کریں - چنانچہ مولوی صاحب نے اس تجویز کو مان لیا اور اس طرح ایک نماز کی گواہی میرے حصے میں آگئی - یہ تھیں وہ مصروفیات جس سے مولوی صاحب کا جی گھبرا جاتا اور وہ "تنہائی" کو ترسنے لگتے - حتیٰ کہ ایسے لمحات میں اُن کی کٹیا بھی انہیں کوئی سکون اور اطمینان نہیں دے سکتی تھی - جس سے وہ اکثر بیکل ہو جاتے اورنگ آباد کا علاقہ اور ان کی سیلانی فطرت کو آخر کار وہ جگہ مل ہی گئی جس کی انہیں تلاش تھی - موم سالہ اورنگ آباد سے ۱۳ - ۱۴ میل دور پہاڑی علاقہ تھا - نہایت خوبصورت - اس جگہ کو مولوی صاحب نے اپنی تفریح گاہ بنا لیا - جب بھی اُن کا جی تنہائی کو چاہتا وہ موم سالہ چلے جاتے - یہاں ایک تالاب کے کنارے انہوں نے ایک بنگلہ لے لیا تھا اور مختصر تعطیلات یہاں گزارتے - موم سالہ کے معنی تھے ہم لوگوں کی شامت - کیونکہ یہاں کوئی چیز مہیا نہیں ہوسکتی تھی - ہمارا فرض تھا کہ ضروریات کی تمام چیزیں ساتھ لیکر چلیں - اگر کوئی چیز بھول چوک میں رہ گئی تو بس ہماری کم نامت آجاتی - جب مولوی صاحب کی طبیعت مچلتی تو اسی جگہ اپنے دوستوں کو بھی بلا لیتے -

دوستوں کی کیفیت نہ پوچھئے - اسکی فہرست گنوانے کے لئے پوری کتاب معلومات لکھنی پڑے گی - چند اہم احباب کے نام لکھتا ہوں - جو زیادہ تر حیدرآباد میں رہتے تھے - مگر مولوی صاحب کے یہاں کثرت سے آتے جاتے

تھے ۔ اور مولوی صاحب جب حیدر آباد جاتے تھے تو اسٹیشن پر ایک ہجوم ہوتا اور ہر شخص کوشش کرتا کہ مولوی صاحب ہمارے یہاں ٹھہریں ۔ ایسے دوستوں میں نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد ۔ منظور جنگ ، سراج یار جنگ اور سر راس مسعود جیسے حضرات شامل تھے ۔ اورنگ آباد میں مولوی صاحب کے ایک دوست تھے ۔ جن کا نام تھا خواجہ نہال احمد ۔ یہ مولوی صاحب کے کلاس فیلو بھی رہ چکے تھے ۔ اور اورنگ آباد میں ساتھ ہی رہا کرتے تھے ۔ ان کی حیثیت مولوی صاحب کے ایک مصاحب کی تھی ۔ سہارنپور کے رہنے والے تھے ۔ اس لئے باتیں بڑی مزیدار اور لچھے دار کرتے تھے ۔ سہارنپور کی زبان میں ایک خاص لٹک ہوتی ہے ۔ جس سے وہ مولوی صاحب کی محفل کو زعفران زار بنائے رکھتے تھے ۔ مولوی صاحب انہیں بہت چاہتے تھے ۔ وہ بھی ایسے حضرت جب بھی جی چاہتا مولوی صاحب کی فطرت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کسی کے خلاف بھی کچھ کہہ دیتے اور پھر مولوی صاحب کے چٹخنے اور گالیاں دینے کے مزے لیتے ۔ ایک بار انہوں نے مجھے اپنا شکار بنا لیا ۔ اور ایسا واقعہ ہوا کہ میں نوکری ہی چھوڑ بیٹھا ۔ ہوا یوں کہ ایک بار خواجہ نہال احمد صاحب مولوی صاحب کے ساتھ کھانے میں شریک تھے کہ انہوں نے کسی چیز میں کوئی نقص نکال دیا ۔ اور اپنی لچھے دار گفتگو سے خوب بات کا بتنگڑ بنایا ۔ مولوی صاحب کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ انہوں نے باقاعدہ میری شکایت کرنی شروع کر دی " ہر وقت یہ لونڈا کھیل کود میں مصروف رہتا ہے ۔ کام کی طرف دھیان نہیں دیتا ۔ جو چاہتا ہے تم کو کھلا دیتا ہے اور تم بلاچون وچرا کھا لیتے ہو ۔ تم نے لونڈے کو سر پر چڑھا لیا ہے اگر تم اسی طرح اس کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے تو ایک روز ضرور نقصان اٹھاؤ گے " بس پھر کیا تھا مولوی صاحب نے ہنگامہ کر دیا ۔ بڑی گالیاں مجھے دیں ۔ خوب سخت سست کہا ۔ میں نے اسی وقت ارادہ کر لیا کہ اب گھر جا کر مولوی صاحب کے پاس واپس نہیں آؤں گا ۔ چنانچہ جب مولوی صاحب نے چھٹیوں میں گھر جاتے ہوئے حسبِ معمول مجھ سے دریافت کیا کہ تم چلو گے تو میں فوراً تیار ہو گیا ۔ ہاپوڑ پہنچکر مولوی صاحب کا پروگرام اجمیر شریف کا بن گیا ۔ میں نے اُن سے اس بہانے ایک ماہ کی چھٹی لے لی کہ میں اجمیر نہیں جاؤں گا اور یہیں چھٹی گزاروں گا ۔ مولوی صاحب نے کہا اچھا میں تم کو واپسی میں ساتھ لے لوں گا ۔ جب وہ واپس آئے تو میں نے مزید چھٹی اور دہلی جانے کا ارادہ کر لیا ۔ مولوی صاحب کے جانے کے بعد ضیاء الحق صاحب نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تم کیوں واپس نہیں جانا چاہتے میں نے ساری روداد گوش گزار کر دی اس پر وہ کہنے لگے کہ تم نے بڑی غلطی کی اگر تم مجھ سے پہلے بتا دیتے ۔ تو میں اُن سے بات کر لیتا ۔ اب اُن کو تمہارے نہ ہونے کی وجہ سے بہت تکلیف ہو گی ۔ مگر میں دہلی جا کر ایک مِل میں نوکر ہو گیا ۔ ادھر مولوی صاحب مجھے بلانے کے لئے برابر خط لکھتے رہے ۔ ضیاء الحق صاحب نے میری والدہ سے بات کر کے ان کو میری واپسی کے لئے آمادہ کر لیا ۔ جب میں دہلی سے چھٹی پر ہاپوڑ آیا تو میری والدہ نے مجھے حکم دیا کہ میں مولوی صاحب کے پاس چلا جاؤں ۔ ضیاء الحق صاحب نے مولوی صاحب کو میرے نہ آنے کی وجہ پہلے ہی مطول

میں لکھ دی تھی۔ چنانچہ جب میں واپس مولوی صاحب کے پاس آیا اور ان کی خدمت پھر شروع کر دی تو اس کے بعد پھر وہ کبھی اس طرح نہ بگڑے بلکہ میرا خیال بھی کرنے لگے۔

مولوی صاحب کا گھر گھر نہیں تھا بلکہ اس کو ہوٹل کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ان کے خدمت گاروں کی ٹولی اور اُن کے خاندان کے افراد مولوی صاحب کے بھانجے حامد حسن جو اُن کی بڑی مرحومہ بہن کے صاحبزادے تھے اور مولوی صاحب کی ہی سرپرستی میں رہتے تھے۔ پھر ایسے طالب علم یا جاننے والے جن کی مولوی صاحب مستقل مدد کرنا چاہتے تھے۔ اورنگ آباد کے احباب کے علاوہ باہر سے ہمیشہ کوئی نہ کوئی مہمان ضرور قیام پذیر ہوتا تھا اور بعض حضرات مستقل مہمان رہتے تھے۔ خواجہ نہال احمد صاحب کا ذکر کر چکا ہوں۔ ایک صاحب اور تھے عبدالرحیم فینسی یہ خوب آدمی تھے۔ فینسی کا خطاب اُن کو مولوی صاحب کے اسی گھر سے ملا تھا۔ مولوی صاحب کے ایک دوست تھے نیاز محمد خاں۔ ناندیڑ میں پولیس کے محکمے میں تھے۔ اُن کا لڑکا عبدالرحیم سی۔ آئی۔ ڈی کے محکمے میں ملازم تھا۔ لوگوں کی نقل و حرکت پر پابندی رکھنا اس کی ڈیوٹی میں تھا۔ یہ لڑکا اپنے اس کام سے بہت عاجز تھا۔ اکثر مولوی صاحب کے پاس آتا رہتا تھا ایک روز اس نے مولوی صاحب اپنی نوکری سے بیزاری کا اظہار کیا۔ مولوی صاحب نے سنتے ہی اس کی نوکری چھڑا دی اور اپنے یہاں منتظم رکھ لیا۔ اُن کے ذمہ جو کام تھے اُن میں دعوتوں کی نگرانی اور انتظام۔ مہمانوں کی ضروریات کی فراہمی اور مولوی صاحب کے چند نجی کاموں کی انجام دہی شامل تھے۔ ان کو مولوی صاحب نے اپنے اسکول میں کھیلوں کا ماسٹر بھی بنوا دیا تھا۔ اس وقت تک عبدالرحیم اپنے بیوی بچوں سمیت الگ محلے میں رہتے تھے۔ پھر مولوی صاحب کے کہنے پر یہ بھی اپنے گھر والوں سمیت مولوی صاحب کے یہاں منتقل ہو گئے۔ بعد میں اُن کو مولوی صاحب نے مقبرہ کا داروغہ بھی بنا دیا تھا۔ یہ حضرت بڑے قبول صورت تھے۔ اور مزاج میں بڑی نفاست بھی تھی۔ خوش پوشاک اتنے کہ اُن کے ذوق پر حیرت ہوتی تھی۔ ان ہی خصوصیات کی بنا پر اُن کو نہال صاحب نے فینسی کا خطاب دیا۔ جسے مولوی صاحب نے بھی بہت پسند کیا اور اس کے بعد یہ ان کے نام کا جزو بن گیا۔ عبدالرحیم فینسی۔ اسی طرح علی شبّر حاتمی صاحب پہلے حیدرآباد میں کتابوں کی ایک دکان میں ملازم تھے۔ مولوی صاحب کے پاس آنے جانے لگے۔ تو مولوی صاحب نے اُن کو اپنے پاس کل وقتی طور پر رکھ لیا۔ یہ مولوی صاحب کے اُن عاشقوں میں تھے جن کی خوشی مولوی صاحب کی خدمت میں تھی۔ انہوں نے بعض اوقات ایسے حالات میں مولوی صاحب کا ساتھ دیا کہ جب کوئی دوسرا ان کے کام نہ آسکتا تھا اور مولوی ہاشمی فرید آبادی تو مولوی صاحب کے ان احباب میں شمار ہوتے تھے۔ جن سے مولوی صاحب کے تعلقات نصف صدی کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ جن کا احترام مولوی صاحب نے ہمیشہ کیا اور انہوں نے بھی حق دوستی ادا کر دیا۔ یہ پہلے حیدرآباد میں دارالترجمہ میں کام کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے

اُن کو محبت کے باعث انجمن میں ہمیشہ کے لئے گھسیٹ لیا۔

جس زمانے میں مولوی صاحب نے اردو انگلش ڈکشنری کا کام شروع کیا تھا۔ تو مولوی صاحب کا گھر واقعی ہوٹل بن گیا تھا۔ دسیوں آدمی جمع ہو گئے تھے۔ مولوی صاحب کے احباب، کارکن، طالب علم اور مشیر غرض کہ ایک ہجوم تھا۔ جس کا احساس مولوی صاحب کو بھی بہت تھا۔ خوب خوش ہوتے تھے اور اکثر یہ تجویز کرتے تھے کہ سب کو الگ الگ بلانے میں وقت ضائع ہوتا ہے لہذا ایک گھنٹی لاکر پیڑ میں باندھ دو اور کھانے کے وقت اس کو بجایا کرو تاکہ سب لوگ جمع ہو جائیں۔

آدمیوں کی یہ کثرت اس لئے زیادہ نہیں محسوس ہوتی تھی کہ میں یہ بتا چکا ہوں کہ یہ گھر بڑا شاندار اور وسیع تھا۔ دسیوں کمرے، برامدے، صحن اور کوٹھریاں تھیں۔ جہاں رہائش کا مسئلہ کبھی کوئی مسئلہ نہیں بنا۔ مولوی صاحب نے اس کو اپنے شوق باغبانی کا نمونہ بنا رکھا تھا یہ سرسبزی اور شادابی اُس حوض سے اور خوبصورت معلوم ہوتی تھی جو کوٹھی کے وسط میں واقع تھا۔ حوض کے سامنے ایک برآمدہ تھا۔ جہاں مولوی صاحب سوتے تھے۔ اکثر شام کو ایک شیر اس حوض میں پانی پینے آتا تھا۔ جس کو ہم سب نے بارہا دیکھا تھا۔ مولوی صاحب کو سب نے بہت سمجھایا کہ آپ اس برآمدے سے ہٹ جائیں بڑا خطرہ رہتا ہے۔ خدا جانے کس وقت کیا ہو جائے مولوی صاحب ہمیشہ اس بات کو ٹال جاتے اور کہتے کہ وہ بیچارہ پانی پینے آتا ہے چلا جاتا ہے۔ اس سے مجھے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔

مولوی صاحب کی یہ پرانی عادت تھی کہ وہ صرف اپنے مخلص دوستوں سے ملتے تھے اور ہمیشہ افسروں عہدیداروں اور جاگیرداروں سے دور بھاگتے تھے۔ حالانکہ ریاستی نظام میں یہ چیزیں ترقی اور خوشحالی کا ذریعہ بن جاتی تھیں۔ ایک بات تو گویا معراج سمجھی جاتی تھی کہ ہر شخص جو اہم بن جاتا تھا اس کی آخری کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ نظام کی خوشنودی حاصل کرلے۔ مگر مولوی صاحب کو اس سے چڑھ تھی۔ اُن کے بہت سے دوست اُن کو مشورہ دیتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ نظام سے ضرور مل لو۔ مگر اُن کا یہ حال تھا کہ ادھر نظام کی آمد کی خبر سنی اور ادھر انہوں نے اپنا دورہ نکالا۔ جب تک وہ اورنگ آباد رہے انہوں نے اس کا موقع ہی نہیں آنے دیا۔ نظام کی آمد اُن کے دورہ کی تمہید ہوتی تھی اس زمانے میں عموماً پتلون اور شیروانی پہنتے تھے اور ساتھ ترکی ٹوپی بھی پہنا کرتے تھے۔ اس لباس کے معنی تھے مولوی صاحب سفر پر تیار ہیں۔

مولوی صاحب نے اورنگ آباد میں یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر انجمن کی خدمت میں اپنا سارا وقت صرف کر دیں گے اور اپنے اس خیال کو وہ اکثر اپنے احباب کے سامنے بھی دہراتے رہتے تھے حیدرآباد میں اُن کے جتنے دوست تھے اُن کی بھی یہی خواہش تھی کہ مولوی صاحب حیدرآباد آجائیں۔ اور ساتھ ہی

اُن لوگوں کا یہ بھی اصرار تھا کہ مولوی صاحب ملازمت نہ ترک کریں اور انجمن کا کام بھی اس کے ساتھ ساتھ کرتے رہیں۔ مگر مولوی صاحب اپنی زندگی انجمن کے لئے وقف کر دینا چاہتے تھے اور اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ ملازمت ترک کر دیں۔ جب نظام حیدرآباد نے یہ سُنا کہ مولوی صاحب ملازمت ترک کر رہے ہیں تو انہوں نے اُن کو تاعمر تنخواہ دینے کا وعدہ کیا اور کہا کہ وہ انجمن کا کام کر سکتے ہیں۔ مگر مولوی صاحب کو یہ بات کسی صورت سے پسند نہ تھی۔ لیکن پھر اُن کے احباب نے ایک دوسری ترکیب نکال لی اور ان کو مجبور کر دیا کہ وہ حیدرآباد آ جائیں۔ یہ ترکیب یہ تھی کہ مولوی صاحب عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو جائیں اور آخر کار یہی ہوا اور مولوی صاحب حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ اس سے پہلے بھی اُن چند دوستوں میں جن سے مولوی صاحب ہر معاملہ میں مشورہ لینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے علاوہ مولوی ہاشمی صاحب شامل تھے اس لئے اب جو رہنے کے بارے میں مشورہ لیا تو ہاشمی صاحب کے اصرار پر انہیں کے مکان پر رہنے کا فیصلہ ہوا لہٰذا مولوی صاحب مولوی ہاشمی صاحب فرید آبادی کے مکان میں اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ ہاشمی صاحب کا مکان سیدی رسالہ میں واقع تھا۔ مولوی صاحب یہاں اپنے معمولات میں صرف سیر پر قانع تھے۔ یعنی روز صبح چار ساڑھے چار بجے اٹھ کر ٹہلنے نکل جاتے۔ یہاں اورنگ آباد کی طرح پہاڑیاں اور سیرگاہیں تو تھیں نہیں۔ اس لئے مولوی صاحب غیر آباد علاقے کی تلاش میں بنجارہ ہل کی طرف نکل جاتے۔ جو اس وقت بالکل ویران علاقہ تھا۔ آج کل یہ علاقہ حیدرآباد کی بہترین اور اعلیٰ فیشن ایبل سوسائٹی کی رہائش گاہ ہے چونکہ بنجارہ ہل کا علاقہ پہاڑی ہے اس لئے اس کو حیدرآباد کا شملہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ بات شائد حیدرآباد کی تاریخ میں اہمیت کے قابل ہو گی کہ اس جگہ کو رہائش کے قابل بنانے کا سہرا مولوی صاحب کے سر ہے۔ گویا انہوں نے بنجارہ ہل کو دریافت کر کے حیدرآباد کی بہترین سوسائٹی کے لئے جگہ فراہم کی۔ مولوی صاحب وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے اس کو رہائش کے لئے پسند کیا اور سب سے پہلے اپنا مکان بنایا۔ اس کا قصہ بھی سُن لیجئے۔ مولوی صاحب روز ہاشمی صاحب کے یہاں سے جو ٹہلنے نکلتے تو بنجارہ ہل کے علاقے میں جا پہونچتے۔ ایک بار ایسی طرف نکل گئے جہاں سے ایک سیدھی سڑک اوپر پہاڑی کی طرف چڑھ کر ایک امام باڑے کے قریب ختم ہوتی تھی۔ یہ امام باڑہ علی یار جنگ نے بنوایا تھا اور صرف محرم میں آباد ہوتا تھا۔ تو خیر یہ سڑک جب اوپر چڑھتی تو انتہا سے زیادہ خطرناک ہو جاتی۔ کیونکہ اس کے ایک طرف تالاب تھا اور دوسری طرف دھان کے کھیت اگر خدانخواستہ کوئی آدمی وہاں سے پھسل جائے تو سیدھا لڑھکتا ہوا موت کی وادی میں پہنچیگا۔ اوپر جا کر بس ایک کمرہ سا بنا ہوا تھا جو امام باڑہ کے قریب تھا وراس کے چاروں طرف میلوں سنسان اور خاموش میدان اور گھاٹیاں پڑی تھیں۔ مولوی صاحب یہ جگہ دیکھ کر پھڑک گئے اور کہا کیا عمدہ جگہ ہے۔ کتنا سکون اور تنہائی ہے یہ جگہ ہاشمی صاحب کو دکھائی گئی تو انہوں نے اس کی نہایت مخالفت کی اور کہا کہ یہ ویران جگہ ہے۔ آپ کی رہائش کے لئے مناسب نہیں۔ اور مولوی صاحب کو

ویران جگہوں سے بجائے وحشت اور خوف کے انس اور عشق تھا۔ کہتے تھے جہاں ڈر وہاں ہمارا گھر۔ ہاشمی صاحب کا انہوں نے خوب مذاق اڑایا کہ ویران کیا جگہ ہوتی ہے تم میں ذوق سلیم اور احساس تنہائی دونوں کی کمی ہے۔ اس پر ہاشمی صاحب نے ایک اور پینترا بدلا اور کہا مولوی صاحب اگر آپ اپنی کوئی فکر نہیں کرتے تو ذرا ان نوکروں کی تکلیف کا تو خیال کیجئے ۔ ان کو بڑی پریشانی ہو جائے گی ۔ اس پر مولوی صاحب کو جلال آیا تو مجھے مخاطب کر کے کہا دیکھو بشیر! ہم کل شام کا کھانا اسی جگہ کھانا چاہتے ہیں۔ یہاں حکم کی سرتابی کی کس کو مجال تھی۔ اور کس کی ہمت تھی کہ وہ اُن کے کہے کو ٹال سکے ۔ چنانچہ وہ دوڑ بھاگ شروع ہوئی کہ اللہ اکبر۔ سارا سامان ٹرک کے ذریعہ وہاں پہنچا دیا گیا اور اس طرح مولوی صاحب ڈیڑھ دو ماہ ہاشمی صاحب کے یہاں رہنے کے بعد نئی جگہ پہنچ گئے جہاں انہوں نے اپنے قول کے مطابق اسی شام کھانا کھایا۔ ہاشمی صاحب کے یہاں مولوی صاحب سے روزانہ ملاقات کے لئے آنے والوں میں سراج یار جنگ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ یہ صاحب مہتمم باغات تھے اور مولوی صاحب کے شوق باغبانی کو دیکھ کر اُن اُن کے سپرد انہوں نے اورنگ آباد کے باغات کی نگرانی بھی کر دی تھی۔

نیا مکان کیا تھا بس ایک کمرہ تھا۔ اور اس پر ہم چند آدمیوں کا قافلہ مع سازوسامان پہنچ گیا۔ نوکروں میں ہم چار تھے۔ ایک میں دوسرا اوپر کا کام کرنے والا لڑکا تیسرا ڈاک لانے اور لیجانے پر مامور اور چوتھا ڈرائیور غرض کہ مولوی صاحب نے اس جنگل میں منگل منانا شروع کر دیا۔ جب دیگر عمائدین شہر کو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب بنجارہ ہل منتقل ہو گئے ہیں تو سب کی توجہ ادھر ہوئی۔ سب سے پہلے مکان بنانے والے مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم حیدر آباد تھے۔ پھر تو شہر کے سارے رئیس اس طرف متوجہ ہوئے اور جدید سے جدید تر فیشن کے اعلیٰ بنگلے اور کوٹھیاں تیار ہونے لگیں۔ اس طرح حیدر آباد کی سب سے پُرفضا اور اعلیٰ ترین آبادی کا افتتاح مولوی صاحب نے کیا تھا۔ مولوی صاحب نے سب سے پہلے یہاں جس چیز پر توجہ دی وہ یہ تھی کہ اس جگہ کو قابلِ رہائش بنایا جائے۔ ایک کمرہ تو بنا ہوا تھا ہی اس میں انہوں نے دو کمروں کا اور اضافہ کر دیا۔ یہ دونوں کمرے اوپر نیچے بنے ہوئے تھے۔ نیچے کا کمرہ سامان رکھنے اور عام رہائش کے کام آتا تھا اوپر کے کمرے میں مولوی صاحب بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ ایک بڑا گول چبوترہ بنایا تھا جس کے چاروں طرف سبزہ اور طرح طرح کے پودے اُگا دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ جگہ بڑی خوبصورت اور پُرفضا بن گئی تھی۔ اس مکان کا نام مولوی صاحب نے "بھوت بھون" رکھا تھا۔ اور اسی نام سے وہ سارے حیدر آباد میں مشہور تھا۔ اور مولوی صاحب کی ظرافتِ مزاج کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔

یہ تو ہرگز ممکن ہی نہیں تھا کہ مولوی صاحب اپنی عادتیں بدل دیتے چنانچہ دعوتوں اور مہمان نوازیوں کا سلسلہ یہاں بھی شروع ہو گیا اور اورنگ آباد سے کہیں زیادہ زور شور سے شروع ہوا۔ ایک تو یہاں ملنے والوں کی تعداد زیادہ۔ پھر عمائدین شہر کا ساتھ ہر دعوت ایک پُرتکلف اور شاندار تقریب کی صورت اختیار کر جاتی۔ مولوی

صاحب کھلانے کے شوقین اور امرا اور حیدرآباد کے روسا کھانے کے۔ لہذا بڑے بڑے آدمیوں کی دعوتوں کا سلسلہ جاری ہوا تو رکنے میں نہیں آیا۔ ہر ماہ چار چھ دعوتوں کا اہتمام ہمارا معمول ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب کا قول تھا کہ انسان اس لئے پیدا ہوا ہے کہ خوب کھائے اور دوسروں کو بھی کھلائے۔ جب لوگوں کو کھانے پر بلاتے مجھے بلا کر خود ہدایت کرتے اور کھانے کی فہرست تیار کرتے۔ یہ فہرست اتنی طویل ہوتی کہ مولوی ہاشمی صاحب ہمیشہ ٹوک دیتے اور کہتے "کیا پورا مغلیہ دسترخوان تیار کرائیے گا"۔ اس پر مجھ سے پوچھتے "بشیر کل کتنی چیزیں ہوئیں؟" جب میں بتاتا تو مسکرا کر دو چار چیزیں کم کرا دیتے۔ جس جگہ سے کوئی اچھی چیز کھا کر آتے مجھے بھی وہی چیز پکانے کی ہدایت کرتے۔ مجھے بھی دعوتوں کا انتظام کرتے کرتے اور طرح طرح کے کھانے پکانے کی ایسی عادت اور مہارت حاصل ہو گئی تھی کہ ہر قسم کا پکانا میرا مزاج بن گیا تھا۔ جب بھی مہمان میرے کھانے کی تعریف کرتے مولوی صاحب نہال ہو جاتے اور کہتے کہ جی۔ یہ میرے یہاں کا لڑکا ہے۔ اور میری والدہ نے اس کو کھانا پکانا سکھایا ہے۔ یہ میری ساری زندگی کا تجربہ ہے کہ مولوی صاحب نے کبھی روپیہ کی کوئی پروا نہیں کی۔ ان کی ہر خواہش وقت پر اور ان کی مرضی کے مطابق پوری ہونی چاہیے تھی۔ اس میں روپیہ کا ذکر یا اس کا صرفہ کبھی ان کے ذہن میں نہیں آتا تھا یہی حال دعوتوں کا تھا کہ روپیہ مسئلہ کبھی بنا ہی نہیں۔ خواہ کتنی شاندار دعوت کیوں نہ ہو۔

حیدرآباد میں ان کے معمولات میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ پڑھنے لکھنے کے وقت ہمیشہ کی طرح کسی کا دخل برداشت نہیں کرتے تھے۔ فوراً غصہ آجاتا۔ جہاں ہم میں سے ایسے وقت کوئی کسی ضرورت سے ان کی پڑھائی لکھائی میں مخل ہوا۔ فوراً تیوری چڑھ جاتی اور ڈانٹ کر پوچھتے "کیا ہے؟"

مولوی صاحب دنیا دار آدمی نہیں تھے۔ ان کے چند اصول تھے جن کو انہوں نے ساری عمر ترک نہیں کیا۔ ان کے مزاج کی سنجیدگی بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ سوائے اپنے کاموں کے کسی معاملے میں دخل نہ دیں۔ حالانکہ ان کی ساری زندگی لوگوں کے رشک و حسد کے جذبوں اور خود غرض افراد کی ریشہ دوانیوں کی نذر ہو گئی لیکن انہوں نے ذاتی طور پر کبھی خود کو سوائے لکھنے پڑھنے اور انجمن کی خدمات کے اور کسی کام میں مشغول نہیں رکھا۔ ان کے مزاج کی بہترین صفت یہ تھی کہ انہوں نے بے شمار لوگوں کی زندگی کو بنایا۔ ان پر احسانات کئے وہ ہر آدمی کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے کبھی ہندو مسلم کا خیال نہیں رکھا۔ وہ تمام انسانوں کی مدد کرنا چاہتے تھے اور حتی الامکان کرتے تھے۔ لیکن دنیا داری بالکل نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کو انہوں نے بنایا وہی ان کے دشمن ہو گئے۔ ان کے احسانات ہر ملک و ملت کے افراد پر بے شمار ہیں۔ البتہ اپنے ہم وطنوں اور عزیزوں پر ان کی توجہ ذرا کم تھی۔ مجھے یاد ہے ایک بار ہاپوڑ سے ایک لڑکا پریشانیٔ معاش کا شکار ہو کر حیدرآباد پہنچ گیا۔ اس نے یہ سن رکھا تھا کہ مولوی صاحب کے

حیدرآباد میں بڑے وسیع اختیارات ہیں۔ اور عموماً وہ پریشان افراد کی مدد بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ پوچھتا مولوی صاحب کے یہاں پہنچ گیا۔ مجھے اپنی رام کہانی سنائی۔ میں نے مولوی صاحب کو اس کے حالات سے مطلع کیا تو بہت بگڑے اور اس سے مل کر کہا "تم نے یہاں آکر سخت حماقت کی ہے۔ یہ نہایت خراب جگہ ہے اور یہاں تمہاری زندگی برباد ہوجائے گی اور اس کو تاکید کی کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا اور اس سلسلہ میں اس قدر سختی برتی کہ مجھے اس کی واپسی کا کرایہ اسی وقت دے کر کہا کہ اس کو فوراً اسی ٹرین سے واپس کردو۔ غرض کہ مولوی صاحب نے بنجارہ ہل پہنچ کر اپنی کسی عادت میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی تھی۔ ایک بار کا قصّہ ہے کہ مولوی صاحب کے ایک دوست منظور یار جنگ کے لڑکے کی شادی مہاراجہ سرکشن پرشاد کی لڑکی سے ہوئی۔ تو اُس کی خوشی میں مولوی صاحب نے ایک زبردست دعوت کا انتظام کیا۔ جس میں شہر کے تمام معززین شریک ہوئے۔ یہ پرتکلّف دعوت اسی چبوترے پر ہوئی جس کو بنجارہ ہل پر شہرت حاصل تھی۔ اسی دعوت میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس کی وجہ سے بعض افراد مولوی صاحب سے ناراض ہوگئے۔ جن حضرات نے مولوی صاحب کی مخالفت کی اُن میں ہوشؔ بلگرامی بھی شامل تھے۔ بلکہ پیش پیش تھے۔ یہ وہی ہوش صاحب ہیں جن کو دوبارہ حیدرآباد میں داخلے کی اجازت دلوانے والے مولوی صاحب ہی تھے۔ ہوشؔ بلگرامی کو ایک زمانے میں حیدرآباد سے نکالا جاچکا تھا۔ یہاں سے جاکر وہ رامؔپور میں بخشیٔ فوج ہوگئے۔ اورنگ آباد سے مولوی صاحب کو نواب رامپور نے بلایا تو وہ رامؔپور میں ہوشؔ صاحب ہی کے ٹھہرے۔ رسد وغیرہ کا انتظام نواب کی طرف سے کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب نے ہوشؔ صاحب کو ہدایت کی کہ بہترین رکاب دار کو بلانا۔ ہم بھی دیکھیں کہ یہاں کون کون سے کھانے پسند کئے جاتے ہیں اور کتنے مزیدار ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ بشیرؔ تم تمام نئے کھانوں کی ترکیب سیکھ لینا۔ ہوشؔ صاحب نے کہا کہ اگر اس رکاب دار کو ہوا بھی لگ گئی اس بات کی تو وہ کھانا نہیں پکائے گا۔ لہذا یہ طے ہوا کہ میں یہ کسی طرح ظاہر ہی نہیں ہونے دوں گا کہ میں باورچی بھی ہوں۔ تو خیر جناب اس رام پور کے بہترین رکاب دار ... نے اپنے خاص کھانے مثلاً کندن قلیہ اور میانہ پوری کوفتے پکائے۔ جب وہ کھانے دسترخوان پر آئے تو ان کا رنگ اور خوشبو ہی دیکھ کر مولوی صاحب کھٹک گئے۔ چکھ کر دیکھا تو گالیاں دینے لگے لاحول ولاقوۃ یہ کندن قلیہ ہے کہ کیچڑ قلیہ۔ اسی زمانے میں ہوشؔ صاحب نے مولوی صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں حیدرآباد آنا چاہتا ہوں۔ آپ کوشش کریں۔ مولوی صاحب نے عبدالرحیم فینسی کے ذریعہ مہاراجہ سرکشن پرشاد سے کہلوایا اور ہوشؔ صاحب مہاراجہ کے مصاحب خاص کی حیثیت سے واپس آگئے۔ ان ہی ہوش صاحب نے ایک خاص واقع کی وجہ سے مخالفت شروع کی۔ مدتوں مخالفتوں کا یہ عالم رہا کہ اخباروں میں مولوی صاحب۔ ہاشمی صاحب۔ عبدالرحیم فینسی اور

میرے تعلق سے مضامین چھپتے رہے۔ مگر مولوی صاحب نے ان کی ذرہ برابر پروا نہیں کی۔ اسی سلسلے میں علی یار جنگ نے جو مالک مکان تھے مولوی صاحب کو مکان خالی کر دینے کے لئے کہدیا۔ چونکہ اب بنجارہ ہل میں خاصی آبادی ہوگئی تھی۔ لہذا "بھوت بھون" کے قریب ہی ایک جج آکر رہنے لگے تھے جنکا نام ہاشم علی خاں تھا۔ اُن سے مولوی صاحب کے تعلق تو نانڈیڑ سے تھے۔ مگر یہاں آکر زیادہ میل جول بڑھ گیا تھا۔ تقریباً روز ہی مولوی صاحب کے ساتھ ٹہلنے نکلتے۔ اور اسی کے دوران ہمارے یہاں بھی آجاتے۔ ان کو مولوی کے یہاں کا ناشتہ بہت پسند تھا۔ خصوصاً پوری اور آلو کا بھرتہ ان ہی کی فرمائش پر پکایا جاتا۔ علی یار جنگ نے ان ہی کی عدالت میں مکان خالی کرنے کی درخواست دی تھی۔ شروع میں تو انہوں نے خود ہی درخواستیں دبا دیں۔ لیکن جب معاملہ سخت ہو گیا تو آخر کار انہوں نے مولوی صاحب کو بتا دیا کہ آپ کے خلاف اس قسم کی کاروائی کی جا رہی ہے۔ یہ سن کر مولوی صاحب کو بہت طیش آیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے یہاں اپنا روپیہ صرف کیا ہے۔ مجھے یہاں سے نکالنا آسان نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ کس میں یہ ہمت ہے کہ مجھے یہاں سے بے دخل کرے۔ غرض کہ یہ سلسلہ دو ڈھائی سال تک چلتا رہا۔ مگر مولوی صاحب وہاں سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ البتہ جب بنجارہ ہل پر آبادی اس قدر بڑھ گئی کہ ہر طرف مکان ہی مکان ہو گئے تو مولوی صاحب کا جی خود ہی وہاں سے اُچاٹ ہو گیا۔ اور وہ سیف آباد میں 'سلطنت منزل' نامی عمارت میں منتقل ہو گئے۔ بنجارہ ہل میں مولوی صاحب کا قیام پانچ چھ سال تک رہا۔ یہ نئی عمارت دراصل کبھی پوسٹ مارٹم کرنے کی عمارت تھی جو مدتوں سے خالی پڑی تھی۔ اور اس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں کہ یہاں بھوت اور خبیث وغیرہ رہتے ہیں۔ جب ہم نے یہ سنا کہ ہمیں ایسی عمارت میں رہنا ہے تو ہم سب لوگ بہت پریشان ہوئے۔ مولوی صاحب ہمیشہ ایسی جگہ چاہتے تھے جہاں اُن کے نوکروں کو بھی آرام ملے۔ اس مکان میں ایک طرف کوٹھڑیوں کی ایک قطار تھی جس کو دیکھ کر مولوی صاحب بے حد خوش ہوئے۔ مگر ہم لوگوں نے مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے ساتھ بیوی بچے ہیں۔ اور اس جگہ کے بارے میں ایسی ایسی خبریں سُنی گئی ہیں تو مولوی صاحب اس سے بجائے متاثر ہونے کے بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے "اچھا؟ یہاں سچ مچ بھوت ہیں۔ تب تو بڑا مزہ رہے گا" غرضکہ وہ نہ مانے اور اس عمارت میں منتقل ہو گئے اور پانچ چھ سال تک اسی عمارت میں رہے جب تک کہ دہلی جانے کا سلسلہ نہ ہو گیا۔

حیدرآباد آنے کے بعد ہی اس بات کا احساس اصل معنوں میں ہوتا تھا کہ ریاستی نظام کس قسم کا ہوتا ہے۔ اور بادشاہت کسے کہتے ہیں۔ یہاں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ کس نے نظام کی خوشنودی حاصل کی ہے۔ اور مولوی صاحب کے رویّہ میں وہی استقامت تھی ذرا بھی تبدیلی نہ ہوتی تھی یعنی صاحبِ اقتدار طبقے سے کنارہ کش رہنا۔ یہاں ان کے تمام مخلص دوستوں کا مشورہ یہ تھا کہ نظام سے ضرور مولوی صاحب کو ملنا

چاہیئے ورنہ نقصان کا اندیشہ بھی ہے مگر مولوی صاحب ہرگز نہ مانتے تھے۔ مگر رضا نواز جنگ کے مسلسل اصرار سے مولوی صاحب مجبور ہوگئے۔ جب نظام کو مولوی صاحب نے نذر پیش کی تو اس نے مولوی صاحب کو دیکھتے ہی کہا۔ "اچھا یہی ہے وہ اردو مولوی"۔ اس ملاقات کے بعد پھر کبھی مولوی صاحب نے کوئی نجی ملاقات نظام سے نہیں کی۔ البتہ دو ایک بار دارالترجمہ کی کسی کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں ضرور ملاقات ہوئی تھی۔ یہاں بھی مولوی صاحب کی عادتوں میں کسی قسم کا فرق پیدا نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح ہر شخص کی مدد کرتے تھے۔ طالب علموں کی سرپرستی کرتے تھے اور مستحق بچوں کی پرورش کا بار اٹھاتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ذہین اور مستحق طلباء کی حتی الامکان مدد کی۔ اور ایسے طالب علموں کی فرمائشیں بھی پوری کیں جن کو مولوی صاحب کی دعوتوں اور پارٹیوں سے لگاؤ تھا۔ جن اہم طالب علموں کی سرپرستی مولوی صاحب نے حیدرآباد میں کی ان میں عزیز احمد اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بھی شامل ہیں۔ مولوی صاحب کے ذکر میں اچھے برے ہر طرح کے لوگوں کا نام آئے گا، ایک صاحب کا ذکر کرتا ہوں، نام اس لئے نہیں لیتا کہ ان کی بدنامی ہوگی۔ ان صاحب کو "امجد" کے فرضی نام سے یاد کروں گا۔ یہ صاحب حیدرآباد میں مولوی صاحب کے مزاج میں بہت دخیل ہوگئے تھے اور ہر طرح ناجائز فوائد حاصل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ زندگی میں دوسری بار مولوی صاحب کی نوکری چھوڑ دینے کا ارادہ میں نے ان ہی صاحب کی وجہ سے کیا تھا۔ ان سے میرا کسی بات پر جھگڑا ہوگیا۔ انہوں نے میری شکایت مولوی صاحب سے کی اور ان کو میرے خلاف بھڑکا دیا۔ مولوی صاحب نے مجھے ڈانٹا تو میں نے سوچ لیا کہ اب مولوی صاحب کے پاس ٹھہرنا مشکل نظر آتا ہے چنانچہ میں نے امجد صاحب سے کہدیا کہ میں جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولوی صاحب سے کہہ کر جاؤ۔ میں نے اگر کبھی کوئی جرارت بات کرنے کی مولوی صاحب سے کی ہے تو وہ اسی موقع پر کی تھی۔ میں مولوی صاحب کے پاس گیا اور ان سے اجازت چاہی۔ مولوی صاحب نے کہا بشیر تم خوب سوچ سمجھ لو۔ میں نے جواب دیا کہ آپ نے مجھے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ میری ساری عمر آپ کی خدمت میں گزر گئی ہے۔ اور آپ کا یہ حال ہے کہ آپ کسی شخص کے بھی بہکانے سے بغیر کسی صفائی کے اور مجھ سے دریافت کئے ہوئے یک طرفہ فیصلہ کر لیتے ہیں لہذا میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ مولوی صاحب نے کہا میں تمہارے متعلق ہاپوڑ لکھ دوں گا۔ میں نے کہا "مولوی صاحب میں ساری زندگی میں پہلی بار آپ سے گفتگو کی ہمت کی ہے اور یہ ہمت مجھ میں اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ میں نے آپ کی خدمت کی ہے اور آپ نے مجھ پر مہربانیاں۔ اس تعلق کا جو حق ہے وہ آپ کی موجودہ زیادتی پر ضرور بولے گا۔ یہ شکایت ہے۔ گستاخی نہیں"۔ اور میں سب کچھ کہہ سن کر واپس آگیا۔ واقعی مجھے ایسی تکلیف پہنچی تھی جو میں نے اس انداز میں مولوی صاحب سے گفتگو کرلی ورنہ میں ان کے سامنے دو لفظ کہتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ میرے آنے کے بعد مولوی صاحب نے امجد صاحب کی خبر لی۔ اور گالیاں دینے لگے اور کہا "اگر وہ چلا گیا تو میں تجھے گولی مار دوں گا۔ تجھے معلوم ہے کہ میں کھانے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تو کیا جانتا ہے کھانے کے متعلق

میں اسی کے ہاتھ کے کھانے کی وجہ سے زندہ ہوں۔" امجد صاحب نے ڈرائیور کے توسط سے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ ادھر مولوی ہاشمی صاحب اور سراج یار جنگ نے مجھ سے گفتگو کی۔ سراج یار جنگ نے مجھ سے کہا کہ "تم مولوی صاحب سے خفا ہو گئے ہو۔ میں نے کہا کہ میں اُن کا نمک خوار ہوں بچہ ہوں۔ میری کیا مجال ہے کہ اُن سے خفا ہو سکوں مگر مولوی صاحب جب اتنے پرانے آدمیوں سے ہر کسی کے بہکانے کی وجہ سے بدظن ہو جائیں گے تو پھر کس بات پر اعتبار کیا جائے سراج یار جنگ صاحب نے مجھے بہت تسلی دی اور کہا کہ تم میرے پاس آجاؤ۔ میں تم کو لکھنؤ بھیج دوں گا۔" اور پھر ان ہی کے سمجھانے سے میں مولوی صاحب کے پاس واپس آگیا۔ جن کو چھوڑنا سچ پوچھئے تو میرے بس کا خود بھی نہیں تھا یہ تو بس اپنی عزت قائم کرنے اور ذلّت سے بچنے کے ڈھکوسلے تھے۔

طالب علموں کے علاوہ مولوی صاحب بعض بچّوں کی پرورش بھی اپنے ذمہ لے لیتے تھے۔ ایک لڑکا وہ مالابار سے لے آئے تھے، اس کو خود پڑھایا لکھایا اور ہر طرح مدد کی وہ کراچی تک ساتھ رہا۔ اسی طرح عبدالرحیم فیلسی کے لڑکے عبدالسمیع خاں کو بھی مولوی صاحب نے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ احباب نوازیاں تو ان کی زندگی تھیں۔ جب قاضی عبدالغفار صاحب حیدرآباد آئے تو مولوی صاحب نے اُن کو بھی بڑی مدد پہنچائی اور ان کا اخبار "پیام" نکلوانے میں بڑی ٹھوس مدد کی۔ لیکن یہ مولوی صاحب کی بدقسمتی تھی کہ اُن کو ساری زندگی مخالفتوں سے چھٹکارہ نہیں ملا۔ اور اُن کے مخالفوں میں اکثر لوگ وہی ہوتے تھے جن کی مدد مولوی صاحب نے اس طرح کی تھی جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اس مخالفت کے کئی اسباب تھے۔ وہ کسی کی خوشامد نہیں کر سکتے تھے اور نہ اپنا کوئی اصول کسی بھی بڑے مفاد کی خاطر توڑتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک بار عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریز وائس چانسلر آیا تو وہ وقت وغیرہ کا بڑا پابند تھا۔ مولوی صاحب نے اسی شرط پر نوکری کی تھی کہ وہ ہفتے میں دو پیریڈ لیں گے۔ نئے وائس چانسلر نے اپنے نئے قوانین نافذ کر دیئے اور ہر شخص کو مجبور کیا کہ وہ اس پر عمل کرے۔ مولوی صاحب کو جو معلوم ہوا تو بے حد چراغ پا ہوئے اور کہنے لگے کہ میں ایسی نوکری نہیں کروں گا اور استعفیٰ بھی دے دیا۔ جب یہ معلوم ہوا تو پورے شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انگریز وائس چانسلر کو سمجھایا گیا۔ جو اُن کی اہمیت سے پہلے واقف نہ تھا۔ چنانچہ اس نے مولوی صاحب کو اُن نئی پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ میرے کہنے کا مقصد اس مثال سے صرف اتنا ہے کہ مولوی صاحب اپنے اصول کے آگے کسی بات کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور بے حد ضدی آدمی تھے۔ ایک تو عام طور پر لوگ اُن کی اقبال مندی کے حاسد تھے۔ پھر وہ اپنی افتادِ طبع کی بنا پر انجمن ترقی اردو کے معاملات میں کسی کا دخل پسند نہیں کرتے تھے اور اکثر لوگ اس وجہ سے اُن کے مخالف ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر زور اور قاضی عبدالغفار جن کے ساتھ انہوں نے بڑا سلوک کیا تھا اسی بنا پر اُن کے مخالف ہو گئے تھے۔

۱۹۳۸ء میں مولوی صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ انجمن ترقی اردو کو دہلی منتقل کر دیں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں اردو کو سیاسی پلیٹ فارم سے نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اس کی مخالفت میں بڑے بڑے سیاسی رہنما بیانات دے رہے تھے اور ضروری تھا کہ اس کی بقا اور استحکام کے لئے زیادہ تندہی سے کام کیا جائے۔ اور ہندوستان کے چپے چپے میں اس کو پھیلایا جائے اور اس کے لئے لڑا جائے۔ اور یہ کام حیدرآباد میں رہتے ہوئے اچھی طرح انجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس لئے انجمن ترقی اردو کا صدر دفتر دہلی منتقل کر دیا گیا۔ اور اورنگ آباد کا پریس عبداللطیف خاں صاحب کو فروخت کر دیا گیا۔ ابتدا میں دہلی میں انجمن کا دفتر جس جگہ تھا وہ بڑی محدود اور تکلیف دہ جگہ تھی۔ لیکن کچھ ہی دن بعد مولوی صاحب مع انجمن کے دفاتر اور کتب خانے کے ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ اور اسی جگہ ہم سب لوگ مع اہل و عیال مستقل طور پر رہنے لگے۔ یہاں انجمن کے منیجر صلاح الدین صاحب تھے جو بہت نیک اور مخلص آدمی تھے۔ اور مولوی صاحب کی خبرگیری اور انجمن کے انتظامات کے لئے رفیق الدین صاحب مقرر ہوئے۔ رفیق الدین صاحب نہ صرف ایک نہایت شریف النفس آدمی تھے بلکہ محنتی اور مخلص انسان بھی تھے۔ غرض کہ انجمن کا کام دہلی میں روز بروز پھیلتا رہا۔ دہلی میں بڑے بڑے لوگوں کی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ جو مولوی صاحب سے ملنے آتے تھے۔ پھر تقریباً ہندوستان کے ہر حصے سے آئے ہوئے مہمان بھی مولوی صاحب کے پاس ٹھہرتے تھے۔ غرض کہ مہماں نوازی اور دعوتوں کا سلسلہ دہلی میں بھی اسی طرح قائم تھا جیسا حیدرآباد میں تھا بلکہ بعض اعتبارات سے بڑھ گیا تھا۔

یہ دور ہندوستان کی سیاست کا سب سے پیچیدہ اور ہنگامہ خیز دور تھا۔ سیاسی حالات اور تحریکِ آزادی اپنے پورے زوروں پر تھی۔ مولوی صاحب کا گھر اس زمانے میں ایک ایسا مہمان خانہ تھا جہاں اُن کے احباب اور علمی شخصیتیں ہی نہیں بلکہ سیاسی رہنما بھی آکر ٹھہرتے۔ جن میں سے دو نام میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ ایک چودھری خلیق الزماں اور دوسرے خورشید صاحب جو آج کل صدر آزاد کشمیر ہیں۔ مولوی صاحب دن کا کھانا تو کھاتے نہیں تھے مگر دسترخوان پر اِن حضرات کی وجہ سے ضرور موجود رہتے تھے۔ جس کا مقصد ایک طرف تو فرائضِ میزبانی انجام دینا اور دوسری طرف ہمارے انتظامات کی نگرانی کرنا تھا۔

دہلی میں کچھ عرصہ بعد میں جگر بڑھنے کی وجہ سے شدید طور پر بیمار ہو گیا۔ مولوی صاحب نے میرا بڑا علاج کرایا اور ہر طرح کا خیال رکھا مگر میری بیماری کسی طرح کم نہیں ہوئی۔ آخر کار میں نے مجبور ہو کر چھٹی مانگی تاکہ میں آرام بھی کر سکوں اور علاج بھی کرا سکوں۔ مولوی صاحب حالانکہ اس کے لئے تیار نہ تھے مگر انہوں نے میری بیماری کے پیش نظر چھٹی دے دی۔ میں تین ماہ چھٹی پر رہا۔ اور اپنی سسرال میرٹھ میں علاج کراتا رہا۔ (چھٹی کے دوران مجھے تنخواہ برابر ملتی رہی اس زمانے میں میری تنخواہ پچاس روپیہ تھی) لیکن مجھے علاج سے افاقہ نہ ہوا تو میں دہلی

واپس آگیا - مولوی صاحب نے میرا علاج پھر کرانا شروع کیا اور میری مدد کے لئے ایک آدمی اور رکھ دیا جس کا نام رستم تھا۔ جس کو میں نے مولوی صاحب کی مرضی کے مطابق کھانا پکانے کی تربیت دینی شروع کی اس کے علاوہ دو لڑکے اور تھے۔ کرامت اور ظفر وہ میرے ہاتھ کے نیچے کام کرتے تھے۔ جب میں اپنی مسلسل بیماری سے تنگ آگیا تو میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ اب میری بیماری ختم نہیں ہوگی - آپ بھی اس کا علاج کراتے کراتے عاجز آگئے ہیں - لہذا اب مجھے رخصت دے دیجئے - میری جگہ رستم آگیا ہے - میں مستقل طور پر علاج کرانا چاہتا ہوں - اور آپ کے کام میں حرج ہوتا ہے لہذا میں اب یہ خدمت انجام نہیں دے سکوں گا - اس کے ساتھ ہی میں نے گزارش کی کہ میرا حساب صاف کر دیجئے اور مجھے ایک سرٹیفکٹ عنایت کر دیجئے - انہوں نے پہلے تو مجھے سمجھایا مگر میری بیماری اور مسلسل بیماری کی وجہ سے مجبور ہو گئے - اور کہا اچھا تمہارا حساب کرائے دیتے ہیں - مگر سارٹیفکٹ کو برابر ٹالتے رہے - میں نے کئی بار کہا - آخری بار - صبح کے ناشتے کے بعد جب وہ لکھنے کے لئے میز پر بیٹھے تو میں نے پھر کہا - آخر کار مجبور ہو کر سارٹیفکٹ لکھا[۱] - مگر اس کا لکھنا مولوی صاحب پر بہت شاق گزرا اور وہ خلاف معمول فوراً جا کر بستر پر دراز ہو گئے - تھوڑی دیر بعد کرامت میرے پاس آیا اور کہا مولوی صاحب تمہارے جانے کی وجہ سے بہت ملول ہیں - یہ بات مولوی صاحب کے مزاج کے بالکل خلاف تھی - وہ بہت سخت مزاج آدمی تھے اور کسی بڑے سے بڑے صدمے سے متاثر نہ ہوتے تھے - میں بھی بہت غمگین ہوا اور میں نے سوچا کہ اگر آدمی جانور پالتا ہے تو اس سے محبت کرنے لگتا ہے - اور مجھے تو مولوی صاحب نے بچوں کی طرح پالا ہے لہذا اُن پر یہ اثر ہونا خلاف توقع نہیں ہے - لڑکوں نے جا کر رفیق صاحب سے کہا وہ مولوی صاحب کے پاس گئے تو دیکھا بہت خاموش لیٹے ہیں - بہت پوچھا مگر مولوی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کسی بات کو بھی دوسرے پر ظاہر کرنے کے عادی نہیں تھے - رفیق صاحب میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ اس بڑھاپے میں مولوی صاحب کو تمہاری وجہ سے کچھ اگر ہو گیا تو اس کی ذمہ داری ہم سب پر ہوگی - انہوں نے مجھے سمجھایا کہ مولوی صاحب چونکہ تم سے بہت لگاؤ رکھتے ہیں لہذا تم ان ہی کے پاس رہو - میں تمہاری تنخواہ بھی بڑھائے دیتا ہوں اور تمہارے علاج کا انتظام بھی معقول طور پر کرتا ہوں - مجھ پر تو پہلے ہی سے بہت اثر ہو رہا تھا - اُن کا اتنا کہنا تھا کہ میں نے ارادہ تبدیل کر دیا - رفیق صاحب نے بھی اپنے دونوں وعدے پورے کر دیئے اور دس روپیہ میری تنخواہ میں اور بڑھا دیئے - اتفاق سے چند روز بعد مولوی صاحب نے ایک بہت بڑی دعوت کی - میں چونکہ بیمار تھا اس لئے انہوں نے کہا کہ تم ہاشمی صاحب کے باورچی کو اپنی مدد کے لئے بلالو - وہ آگیا اور ادھر میں نے رستم اور اس کی مدد سے دعوت کا انتظام کیا - جب اس باورچی نے میری بیماری کا حال سنا تو کہنے لگا میرے پاس ایسا علاج ہے کہ پھر دوبارہ تم کو زندگی بھر یہ مرض نہیں ہوگا - اور یہ کہہ کر ایک چٹکلہ بتایا جو مجھے ۱۷ روز کرنا تھا - واقعی وہ ایسا مجرب چٹکلہ ثابت ہوا کہ وہ سنگین مرض ہمیشہ کیلئے غائب ہو گیا۔

[۱] یہ سارٹیفکٹ مضمون کے آخر میں ملاحظہ ہو

دریا گنج ہندوؤں کا محلہ تھا اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی کے چاروں طرف ہندو ہی ہندو تھے۔ جب ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے اور دہلی میں حالات مخدوش ہونے لگے تو اس کے اثرات یہاں بھی پڑنے شروع ہوئے۔ مولوی صاحب کا وہ سارا عملہ مع مجھ سمیت جو مع اہل وعیال کوٹھی کے متصل آثار قدیمہ کے چند مکانات میں یا کوٹھریوں میں رہتا تھا بہت پریشان اور ہراساں تھا۔ لیکن سب سے زیادہ ہمیں فکر مولوی صاحب کی تھی جو کوٹھی میں اکیلے رہتے تھے۔ اُن سے ویسے بھی کانگریسی لیڈروں سے بگڑی ہوئی تھی۔ اور عادت کے موافق وہ یہاں بھی بااثر لوگوں سے ملنے سے کتراتے تھے۔ لیکن اس کا کوئی علاج ہمارے پاس نہیں تھا کیونکہ مولوی صاحب کا فلسفہ ان باتوں سے بہت مختلف تھا۔ ایک بار کوٹھی کا مالک راج کشن جس نے ڈاکٹر انصاری سے کوٹھی خریدی تھی اور جو ایک بااثر مہاجن تھا، مولوی صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ آپ کوٹھی خالی کردیں تو مناسب ہوگا، مجھے کوٹھی ٹھیک کرانی ہے۔ مولوی صاحب نے کوٹھی خالی کرنے سے صاف انکار کردیا اور کہا جو کچھ ٹھیک کرانا ہے تم ٹھیک کرالو۔ اور اگر بیچنا چاہو تو مجھے بیچ دو۔ مگر میں کوٹھی نہیں خالی کروں گا۔ راج کشن ناامید ہوکر چلا گیا۔ ہم لوگ روز افواہیں سنتے رہتے تھے کہ آج کوٹھی پر حملہ ہوگا کل ہوگا۔ اور یہ سُن کر ہم بہت خوف زدہ ہو جاتے تھے ہم لوگ اکثر علی شبر حاتمی صاحب کی قیادت میں (جو اُن دنوں حیدرآباد سے آگئے تھے اور مولوی صاحب کی خدمات پر مامور تھے) ساری ساری رات پہرا دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انجمن کے معتمد جناب مولوی ہاشمی فریدآبادی روز فریدآباد سے آتے تو مولوی صاحب کو کوئی نہ کوئی تشویش انگیز اطلاع دے کر مشورہ دیتے کہ آپ یہاں سے کچھ روز کے لئے کہیں چلے جائیں تو بہتر ہوگا۔ مگر مولوی صاحب کو الٹا غصہ آجاتا اور ہم لوگوں سے کہتے کہ تم لوگوں کو اگر جانا ہو تو چلے جاؤ۔ تم لوگ بہت ڈرتے ہو۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ اس زمانے میں مولوی صاحب کا اطمینان اور سکونِ قلب دیکھنے کے قابل تھا۔

۱۹۴۷ء میں ہم لوگ مولوی صاحب کے ساتھ حسب دستور اورنگ آباد تفریح کے لئے گئے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب کو ہمیشہ اس جگہ سے بڑی محبت رہی اور اگر کوئی جگہ پسند کرتے تھے تو وہ یہی تھی اس لئے دہلی سے ہر سال ایک مرتبہ ضرور یہاں آکر رہتے۔ ہم لوگ تو یہاں تھے ادھر دہلی کے حالات بد سے بدتر ہوگئے اور فسادات کا سیلاب امنڈ آیا۔ ہم لوگوں کے اہل وعیال وہیں تھے بس یہ سمجھیے کہ دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ جب انجمن کے دفتر پر حملہ ہوا اور مولوی صاحب کو یہ اطلاع بھی پہنچی۔ تو وہ ہم لوگوں کو لے کر حیدرآباد سے بھوپال آگئے۔ یہاں راستے میں ایک اور واقعہ ہوا جس سے دہشت پھیل گئی ہمارے ساتھ چند طلبا جو علی گڑھ کے تھے اور حیدرآباد سے جارہے تھے۔ ٹرین میں قتل کردیئے گئے۔ غرض کہ ہر جگہ سے لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی خبریں روز پہنچ رہی تھیں۔ مولوی صاحب خود بھی بہت پریشان تھے اور انہیں ہماری پریشانی کا بھی احساس تھا

انہوں نے دہلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر مولوی صاحب کے بھائی اور جناب شعیب قریشی صاحب نے جو اُن دنوں بھوپال میں وزیر تھے کسی صورت سے مولوی صاحب کو جانے نہیں دیا۔ خوب خوب مولوی صاحب سے رسّہ کشی ہوئی مگر اُن لوگوں نے کسی طرح بھی انہیں بھوپال سے باہر نکلنے نہیں دیا۔ اسی دوران میں محمد یعقوب صاحب کا جو انجمن میں کاتب تھے ایک خط آیا۔ جس میں تفصیلی حالات درج تھے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ مولوی صاحب کا سارا سامان تو لٹ گیا مگر انجمن کا کتب خانہ بالکل محفوظ ہے۔ انہوں نے مجھے بھی لکھوایا تھا کہ میرے بیوی بچے بحفاظت مسلم اکثریت کے علاقے میں پہنچا دیئے گئے ہیں۔ اسی زمانے میں مہاراج کشن کا خط بھی آ گیا۔ اس نے لکھا تھا کہ لائبریری محفوظ ہے۔ اور مولوی صاحب کا ٹوٹا پھوٹا باقی سامان بھی لائبریری میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ان اطلاعوں کے بعد پریشانی ختم ہوگئی اور ہم لوگ واپس حیدرآباد آگئے۔ پندرہ روز کے بعد بھوپال پھر واپس آئے۔ مگر اس وقت تک حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر خدانخواستہ مولوی صاحب اس زمانے میں دہلی میں ہوتے تو یقیناً شہید ہو جاتے۔ وہاں کسی کے نہ ہونے پر بھی انجمن کا عملہ اس کا نشانا بنا تھا۔ بیچارہ ایک کاتب اور اس کے بچے قتل کر دیئے گئے تھے۔ مولوی صاحب برابر اصرار کرتے رہے کہ مرنا تو ایک روز ہے۔ اور مجھے کون مارے گا۔ میں دہلی جاؤں گا مگر انہیں کوئی بھی نہ جانے دیتا تھا۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں علی شبّر حاتمی صاحب بھوپال پہنچ گئے اور وہ مولوی صاحب کے ساتھ کراچی روانہ ہوگئے۔ مولوی صاحب مجھے یہ ہدایت کر کے کہ تم گھر جا سکتے ہو کراچی چلے گئے اور میری تنخواہ برابر مجھے بھجواتے رہے۔ میں پہلے تو میرٹھ رہا پھر میرٹھ سے دہلی آ گیا۔ اور محلہ چوڑی والاں میں ایک مکان لے کر رہنے لگا۔ ۱۹۴۸ء میں مولوی صاحب دہلی آئے۔ یہاں آ کر انہوں نے انجمن کا دفتر کھولا۔ کتابیں ساری محفوظ تھیں۔ رفیق الدین صاحب کو اور مجھے ہدایت دے کر بھوپال چلے گئے ادھر میں اور رفیق الدین صاحب بیش قیمت اور نایاب کتابوں اور مخطوطوں کو صندوقوں میں بھر کر بھوپال پہنچاتے رہے۔ باقی کتابیں محمد یعقوب صاحب کی نگرانی میں چھوڑ دی گئیں اور ایک مکان محلہ چوڑی والان میں اسی غرض سے لے لیا گیا۔ کتابیں وہاں منتقل کر دی گئیں۔

مولوی صاحب جب واپس آنے لگے تو مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا۔ میرا یہ حال تھا کہ کئی ماہ کی بیکاری کی وجہ سے لوگوں کا بے حد مقروض ہو چکا تھا۔ ایک تو اخراجات کا سوال تھا دوسرے میں بیوی بچوں کو وہاں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مولوی صاحب نے ان دونوں چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اور کہا کہ اگر تو تنہا چلنا چاہتا ہے تو چل۔ میں تیرے بیوی بچوں کو فی الوقت نہیں لیجا سکتا اور نہ اتنے پیسے فراہم کر سکتا ہوں۔ بعد میں البتہ تیرے خاندان کو بلا لوں گا۔ یہ صورت حال میرے لئے ممکن نہیں تھی۔ اس لئے میں مولوی صاحب کے ساتھ پاکستان نہیں آ سکا۔ مولوی صاحب کے آنے کے بعد میں نے ہمدرد دواخانہ میں نوکری کر لی۔ مولوی صاحب کو کراچی میں کھانے کی بے حد تکلیف

تھی۔ لہٰذا شبّر ہاشمی صاحب نے یعقوب کاتب کو لکھا کہ بشیر کو بھجوا دیا جائے۔ مگر میرے لئے معاملہ بالکل وہی تھا مولوی صاحب نے دو سو روپیہ بھی بھیجے تھے مگر وہ ناکافی تھے لہٰذا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔ مولوی صاحب نے اس زمانے میں مجھے ایک خط بھی لکھا تھا کہ میں ہندوستان آ رہا ہوں اور میرے ساتھ آنے کے لئے تیار رہنا۔ افسوس کہ یہ خط کہیں کھو گیا ہے۔

سنہ ۱۹۴۹ء میں مولوی صاحب، پھر دہلی آئے۔ اور انجمن کے سامان کی دیکھ بھال کے ساتھ وہاں سے اس کو کراچی بھیجنے کا انتظام کیا۔ مگر میرے ساتھ آنے کا مسئلہ پھر بھی طے نہ ہو سکا۔ میں اپنے خاندان کے بغیر آ نہیں سکتا تھا۔ البتہ میں دہلی میں اُن کی خدمت بدستور انجام دیتا رہا۔ مولوی صاحب کراچی واپس آ گئے۔ تھوڑے دنوں بعد پھر علی شبّر ہاشمی صاحب نے مجھے مولوی صاحب کی تکلیفوں اور پریشانیوں کا احوال لکھا اور کہا کہ تم یہاں آ جاؤ تو مولوی صاحب تمہارے سارے اخراجات یہاں ادا کر دیں گے۔ میں نے ارادہ کر لیا تو ادھر قدرت نے بھی میرے جانے کا پورا انتظام کر دیا کہ پھر دہلی میں فسادات ہو گئے اور ہمدرد دواخانے پر حملہ ہو گیا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح وہاں سے تنخواہ حاصل کر کے پاکستان کی راہ لی اور ۷ مئی سنہ ۱۹۵۰ء کو کھوکھراپار کے راستے پاکستان کے لئے روانہ ہو گیا کراچی پہنچا تو مولوی صاحب از حد خوش ہوئے۔ میرے لئے اردو کالج کے برابر میں، جہاں اب کینٹین ہے رہنے کی جگہ مقرر کر دی۔ بعد میں وہ کمرہ مجھے دے دیا جو اب مولوی صاحب کے مزار کے متصل ہے۔ یہاں پہلے دو تین طالب علم رہتے تھے۔ کمرے کے قریب میں نے مولوی صاحب کے لئے باورچی خانہ اور ایک کوٹھری تیار کی اور اپنی خدمات انجام دینے لگا۔

ادھر دہلی میں انجمن کے آخری مہتمم رحم علی ہاشمی نے گورنمنٹ آف انڈیا کو اطلاع دے کر انجمن کا باقی سارا ذخیرۂ کتب اور سامان علی گڑھ پہنچا دیا۔ ادھر کے حالات اس سے بھی زیادہ افسوسناک تھے۔ ہندوستان میں جو سرکاری امداد انجمن کو ملتی تھی وہ بند ہو چکی تھی اور اس کی جگہ کوئی متبادل رقم کا انتظام یہاں نہیں ہو سکا تھا۔ مولوی صاحب اپنے ذاتی روپیہ سے یہاں کا خرچ چلا رہے تھے۔ حالات اتنے بدتر تھے کہ انجمن کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتا تھا۔ میں نے مولوی صاحب کو اس سے زیادہ پریشان زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہر چیز اُن کی امیدوں اور توقع کے خلاف ثابت ہوتی تھی جس کا اثر اُن کے ذہن اور قلب پر بڑا شدید پڑ رہا تھا۔ وہ ان حالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اس زمانے میں اُن کے پاس عبدالرحمٰن صدیقی پیر حسام الدین راشدی اور شعیب قریشی صاحبان آتے جاتے رہتے تھے۔ میں نے اُن کو بتا دیا کہ مولوی صاحب پہلے ہی ایک وقت کا کھانا کھاتے تھے اب انہوں نے وہ بھی چھوڑ دیا ہے۔ جب سے ان صاحبان کو بہت تشویش ہوئی اور مولوی صاحب کو کھانا کھانے پر برابر آمادہ کرتے رہے۔ مولوی صاحب نہ مانے۔ میں ظاہر ہے کہ بیکار ہو گیا

جس کے پیش نظر عبدالرحمن صدیقی صاحب نے مجھے اپنے بھانجے ڈاکٹر صدیقی کے پاس بھیج دیا اور انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے جناح اسپتال میں اپنی تنخواہ پر ملازمت دیدیں گے۔ ادھر میں نے علی شبر حاتمی صاحب سے کہا کہ میں اب بیکار ہوں۔ لہذا آپ مولوی صاحب سے کہکر مجھے رخصت دلا دیجئے۔ انہوں نے مولوی صاحب سے بات کی کہ آپ نے تو کھانا چھوڑ دیا ہے اور بشیر بیکار ہے۔ لہذا اس کو کہیں نہ کہیں نوکری تو کرنی ہے۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے مولوی صاحب سے یہ بھی کہا کہ یہ حالات ہمیشہ ایسے نہیں رہیں گے۔ اور آپ انشاء اللہ بہت جلد مطمئن ہوجائیں گے۔ پھر اس وقت آپ کو کھانا پکانے کے لئے بشیر نہیں مل سکے گا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میں اس کو نہیں جانے دوں گا۔ اور مجھے آفتاب صاحب کے پاس بھیج دیا جو اس زمانے میں اردو کالج کے پرنسپل تھے۔ اور کہدیا کہ اس کو کالج میں چپراسی رکھ لو۔ اور جب مجھے ضرورت ہوگی تو میں اس سے اپنا کام لیا کروں گا۔ یہ زمانہ مولوی صاحب کے لئے اس قدر المناک تھا کہ انہوں نے اپنی ساری عمر کی بعض عادتوں کو ترک کر دیا تھا مہمان نوازی اور دعوتیں تقریباً ترک ہوچکی تھیں اور اس کے ساتھ کھانے کا شوق بھی۔

اس کے بعد کا زمانہ مولوی صاحب کی زندگی کا سبب سے پریشان کن دور تھا۔ اس کو اگر مولوی صاحب کی شاندار زندگی کا الم انگیز زوال کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک طرف وہ مالی دشواریوں اور حکومت کی بے توجہی کا بُری طرح شکار تھے۔ اور دوسری طرف اُن کے مزاج کی کمزوریوں نے اُن کو بالکل بے بس کر دیا تھا۔ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب کی چند کمزوریاں اُن کے لئے بڑی نقصان دہ ثابت ہوئیں وہ کانوں کے نہایت کچّے اور بلا کے ضدّی آدمی تھے اور یہ چیز اُن میں ہمیشہ برقرار رہی ہے۔ وہ جس بات پر اڑ جاتے تھے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح پھر انہیں کوئی اس سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ خواہ انہیں کتنے ہی نقصانات کیوں نہ برداشت کرنے پڑیں۔ ہر شخص اُن کو دوسروں کے خلاف ورغلا سکتا تھا۔ مولوی صاحب کی اس کمزوری سے بعض موقع پرست افراد نے فائدہ اٹھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب اپنے مخلص اور قدیم دوستوں سے چھوٹ گئے۔ اُن کے اردگرد خود غرض، چھوٹے اور معمولی لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ جنہوں نے اُن کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اور اُن کے تعلقات اُن کے سارے اچھے دوستوں سے خراب کرا دیئے۔ مولوی ہاشمی فرید آبادی سے مولوی صاحب کے تعلقات جتنے قدیم تھے وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ وہ اورنگ آباد سے کراچی تک مولوی صاحب کے دم ساز اور ہم راز رہے تھے۔ مگر کراچی میں نئے نئے خود غرضوں کی سیاست نے اُن کو مولوی صاحب سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا اور تعلقات بگڑنے پر وہ لاہور چلے گئے۔ مولوی ہاشمی صاحب کی بیگم صاحبہ نے مجھسے خود ایک بار کہا تھا کہ ہم لوگ مولوی صاحب کی وجہ سے حیدرآباد سے دہلی اور دہلی سے کراچی تک پہنچے۔ کراچی تو ہاشمی صاحب مولوی صاحب کے اصرار ہی سے آئے تھے۔ مگر یہاں اُن کو سوائے پریشانیوں کے

کے اور کچھ نہیں تھا اور اب مولوی صاحب نے ہاشمی صاحب سے قطع تعلق بھی کر لیا " ہاشمی صاحب کا سارا خاندان مولوی صاحب سے بے پناہ انس اور محبت رکھتا تھا۔

مولوی صاحب نے سات آٹھ ماہ تک کھانا نہیں کھایا تھا جس کی وجہ سے اُن کی صحت پر بڑا برا اثر پڑا۔ احباب پہلے سے بھی اُن سے برابر کھانے پر اصرار کر رہے تھے۔ اب تو وہ سب پیچھے پڑ گئے۔ اس وقت تک مالی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ لہٰذا پھر کھانا شروع کر دیا۔ اور میری خدمات پھر اُن کے لئے وقف ہو گئیں۔ لیکن اب وہ پہلی سی بات نہ رہی تھی انہیں اپنے ہر معتبر آدمی کی طرح مجھ پر بھی اعتماد نہیں رہا تھا۔ اس کی وجہ اُن کا نیا حلقہ تھا۔ بعض لوگوں نے اوروں کی طرح میرے متعلق بھی اُن کے کان بھر دیئے تھے۔ چنانچہ ایک واقعہ نے میرے اُن کے درمیان رہے سہے تعلق کو بھی ختم کر دیا۔ میں ہمیشہ کی طرح اُن کی خیریت پوچھنے اور کھانے کے بارے میں ہدایت لینے اوپر گیا (وہ انجمن کی موجودہ بلڈنگ کی سب سے اوپر کی منزل میں رہتے تھے) اور سید بدر عالم صاحب کے پاس بیٹھ گیا یہ مولوی صاحب کے ذاتی اور نجی کام انجام دیتے تھے۔ مولوی صاحب نے سید صاحب کو آواز دے کر پوچھا کیا بشیر چلا گیا۔ سید صاحب نے کہا کہ جی نہیں بیٹھا ہوا ہے۔ اس پر مولوی صاحب نے کہا کہ اس سے کہدو کہ اپنا کام کر چکا ہو تو چلا جائے۔ مجھے اس بات سے بے حد صدمہ ہوا۔ اور میں سید صاحب سے کہہ کر آ گیا کہ اب میں اوپر نہیں آؤں گا۔ کھانے کے بارے میں جو کچھ کہلوانا ہو وہ آپ سے کہلوا دیا کریں۔ اس کے بعد کے آخری سالوں میں مولوی صاحب سے اسی لئے میری ملاقات بند ہو گئی تھی۔ جو کچھ اوپر سے کہلوایا جاتا میں وہ کہہ دیتا۔ البتہ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ اس بڑھاپے کے عالم میں اُن کے لئے اس قدر گرم چیزیں کون پکواتا ہے۔ جس سے اُن کو پیچش بھی ہو گئی تھی اور عموماً طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔

آخری زمانے میں جب وہ بیمار ہو کر علاج کے لئے راولپنڈی چلے گئے تو اعظم خاں کی زبانی جو اس وقت اُن کی دیکھ بھال کر رہا تھا یہ معلوم ہوا کہ جب وہاں کے کھانے سے عاجز آ جاتے تھے تو مجھے یاد کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جب ہم تندرست ہو کر کراچی رہیں گے تو بشیر کو یہاں بلا لیں گے۔

مجھے اس کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ اس ہستی کے آخری دنوں میں جس نے مجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا میں اتنی دور چلا گیا تھا جہاں سے اُن کے لئے پھر واپس نہیں آ سکتا تھا۔ مگر اس میں نہ میرا قصور تھا نہ مولوی صاحب کا۔ یہ تو اُن لوگوں کا کارنامہ تھا کہ جو مولوی صاحب کے قریب اُن کے پرانے خادموں کو آنے ہی نہ دیتے تھے۔

مولوی صاحب اور اپنے تعلق سے جب میں سوچتا ہوں تو مجھے ہمیشہ شعیب قریشی صاحب کی ایک نصیحت یاد آ جاتی ہے۔ انہوں نے بھوپال میں مجھ سے کہا تھا کہ " بشیر! مولوی صاحب کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ بوڑھے ہیں اور مناسب اور اچھی غذا پر اُن کی صحت کا دارومدار ہے۔ اگر تم نے اُن کا خیال نہیں رکھا تو سمجھو وہ جیتے نہیں رہیں گے

اور آج یہ تہیہ کرلو کہ چاہے کچھ ہو جائے تم مولوی صاحب کو نہ چھوڑو گے" میں نے اس کے جواب میں یہی کہا تھا کہ میں مولوی صاحب ہی کا پروردہ ہوں اب میرا اُن سے مرنے کے بعد ہی رشتہ منقطع ہو سکتا ہے مجھے اس کا فخر حاصل ہے کہ میں نے شعیب صاحب کی نصیحت کو کبھی نہیں بھلایا۔ اور مولوی صاحب کے لئے ہر اس پیش کش کو ٹھکرا دیا جس سے میں فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ یا بڑھاپے میں آرام سے گزر کر سکتا تھا۔ حیدرآباد میں مہدی یار جنگ نے جو وزیر کے عہدے پر فائز تھے۔ ڈھائی سو روپیہ ماہوار پر مجھے بلایا تھا۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھر کراچی میں اسپتال کی نوکری بھی اسی لئے چھوڑ دی تھی کہ مولوی صاحب کو میری ضرورت تھی۔ میں نے تیرہ سال کی عمر سے لے کر ۷۰ سال کی عمر تک کبھی مولوی صاحب کا در چھوڑنے کی خواہش کسی فائدے کے لئے نہیں کی۔ البتہ وہ ناراض ہو گئے ہوں یا میں ان سے شکایت لے کر چلا گیا ہوں یہ بات بالکل الگ ہے۔ البتہ اگر کسی بات کا افسوس ہے تو یہ ہے کہ میں آخری وقت میں اُن کی خدمت نہ کر سکا جو میرا حق تھا۔ اور اس کا سبب وہ حضرات ہیں جنہوں نے مولوی صاحب کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا اور انہیں کی وجہ سے انہیں عمر کے آخری زمانے میں سب سے بڑے صدمے اٹھانے پڑے۔

۱۲ ر دسمبر ۱۹۴۲ع بشیر احمد جب سے میرے پاس کام کر رہا ہے
وہ نہایت قابل اعتماد، دیانت دار، نیک چلن
اور وفادار ملازم ہے۔ انگریزی اور ہندوستانی
کھانا ایک اچھا پکاتا ہے کہ اس کے ہاتھ کے پکائے
ہوئے کھانے میرے حلقۂ احباب میں ضرب المثل ہو گئے
تھے۔ جب سے میں دلی آیا وہ بیمار رہنے لگا اور
مسلسل علالت کی وجہ سے مجبور ہو کر ترک ملازمت
کر رہا ہے جس کا مجھے بہت افسوس ہے کیونکہ ایسے
سمجھدار کارآمد اور دیانت دار ملازم کا
آج کل ملنا بہت دشوار ہے۔ عبدالحق
انجمن ترقی اردو

سید بدر عالم

پستہ قد، متحنی جسم، زردی مائل رنگ، کھچڑی بال، چال سے سستی اور تھکاوٹ نمایاں، بجھی بجھی بڑی آنکھیں جن پر ہلکے نیلے شیشے کا چشمہ، آواز میں کرارہ پن، پاجامہ، قمیض میں ملبوس تقریباً ۵۵ سال کے اس کنوارے شخص کو "سید صاحب" کے نام سے لوگ جانتے ہیں پورا نام سید بدر عالم ہے۔ مگر یہ سید صاحب کے نام سے ہی پکارے جاتے ہیں۔ اور اگر ان کو کوئی ۲۷ سال کا جوان کہدے تو چہرے پر واقعی نوجوانوں کی سرخی آجاتی ہے۔ سید صاحب کا شمار مولوی عبدالحق کے ان پرانے اور دیرینہ خادموں میں ہوتا ہے۔ جن کو مولوی صاحب کے مزاج میں دخل تھا۔ اور وہ ایسے بے تکلف اشخاص میں سمجھے جاتے تھے۔ جو مولوی صاحب کو کسی زیادتی پر ٹوک بھی سکتے تھے۔ مگر اپنی خدمت کی نوعیت کے باوصف بھی ان کو مولوی صاحب کے عام نوکروں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ ایک معزز خاندان کے فرد ہیں۔ اور سید احسن مارہروی کے رشتہ داروں میں سے ہیں۔ سید بدر عالم صاحب سید جان عالم مارہروی کے فرزند ہیں۔ جو سادات بلگرام میں شمار ہوتے ہیں۔ سید صاحب ضلع آرہ، شاہ آباد میں قصبہ کواتھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کو اپنا سنہ پیدائش یاد نہیں ہے، سید صاحب اپنے نانا نواب سید محمد اکبر خان رئیس کواتھ کے یہاں پلے بڑھے۔ اور تعلیم کی ابتدا قرآن مجید سے ہوئی۔ جو ان کی والدہ نے پڑھایا تھا۔ قرآن مجید کے بعد انہیں ایک عزیز کے پاس حساب اور اردو پڑھانے کے لئے بٹھا دیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد کواتھ کے ماڈل پرائمری اسکول کی دوسری جماعت میں ان کا داخلہ کرادیا گیا۔ نو سال کی عمر میں والدہ کے ساتھ مارہرہ چلے آئے۔ جہاں مارلیسن اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ یہاں آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ایک سال بعد اِن کے والد اِن دونوں بھائیوں کو اپنے ساتھ پیلی بھیت ضلع بریلی میں لے آئے۔ جہاں وہ ایک رئیس کے پاس ملازم تھے۔ یہاں اسکول کے علاوہ

ایک ماسٹر بھی بچوں کو پڑھانے پر مامور تھا۔ لیکن حاجی ریاض الدین صاحب جوان کے والد کے استاد تھے۔ انہیں اپنے ساتھ کانپور لے گئے۔ جہاں ان کا داخلہ نویں جماعت میں ہوگیا۔ تعلیم کے اخراجات حاجی صاحب نے برداشت کئے تھے۔ نویں جماعت پاس کر کے یہ اپنے خالو کے پاس دھنباد (بہار) چلے گئے۔ اس وقت سیّد صاحب کی عمر تقریباً ۱۴ سال کی ہوگی۔ ان کے خالو ریلوے میں ایک بڑے عہدے پر ملازم تھے۔ اور آئے دن ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ لہٰذا ان کی مزید تعلیم جاری نہ رہ سکی۔ اور جب خالو سیّد رضی بلگرامی کا تبادلہ الہ آباد ہوا تو۔ وہ بھی ان کے ساتھ اسی جگہ آگئے۔ یہاں وہ تقریباً دو سال رہے ہوں گے کہ اورنگ آباد سے ان کے چچا سید حیدر حسن بلگرامی نے ۱۹۲۲ء میں دکن بلالیا۔ اور یہاں پہونچ کر ان کا تقرر بحیثیت کمپوزیٹر اور پروف ریڈر انجمن ترقی اردو میں ہوگیا۔ ان کی تنخواہ بارہ روپیہ ماہوار مقرر ہوئی۔ اس تقرریب کی وجہ یہ تھی کہ سیّد حیدر حسن صاحب بحیثیت کلرک انجمن میں پہلے ہی سے ملازم تھے اور انہوں نے مولوی صاحب سے ذکر کر کے ان کو اسی لئے الہ آباد سے بلالیا تھا۔ انجمن میں تقرّری کے بعد ان کو شیخ چاند کیساتھ کام کرنے کے لئے لگا دیا گیا۔ جہاں یہ انجمن کے رسالوں "اردو اور سائنس" کے پروف پڑھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مولوی عبدالحق صاحب کا قیام حیدرآباد میں تھا۔ جہاں وہ بحیثت پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی میں پڑھایا کرتے تھے۔ اور اکثر اورنگ آباد آتے رہتے تھے۔

جب تعطیلات ہوتیں تو مولوی صاحب اورنگ آباد تشریف لے آتے اور یہاں ہمہ وقت مصروف رہتے ان دنوں انہوں نے مشہور انگریزی اردو ڈکشنری مرتب کرنے کا۔ فیصلہ کیا۔ جس کے مشوروں اور ذمّہ داری کے کاموں میں ڈاکٹر عابد حسین سیّد ہاشمی فرید آبادی اور دیگر حضرات شریک تھے۔ مولوی صاحب وقتاً فوقتاً انجمن کے پریس کا معائنہ بھی کرتے رہتے تھے۔ اور ڈکشنری پر خصوصیت سے نظر رکھتے تھے۔ انہیں اس کام میں کسی پر اعتبار نہ تھا۔ اسی لئے عموماً آخری پروف خود دیکھا کرتے تھے۔ ڈکشنری کا پہلا پروف سیّد صاحب کی نظر سے گزرتا تھا۔ مولوی صاحب جب پریس آتے تو سیّد صاحب سے یہ ضرور کہتے کہ لوگ ڈاک بھیجتے ہوئے ٹکٹ کے پیسے عموماً کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا تم اس کا خیال رکھا کرو۔ مولوی صاحب کی تاکید تھی کہ سالانہ رپورٹ انجمن کے تمام کارکنوں اور ہمدردوں کو بھیجی جایا کرے۔ عملاً یہ رپورٹ بھیجنے کے بجائے اس کو ملک عنبر کے نالے میں صرف کر دیا جاتا تھا۔ اور فرضی ناموں کو رجسٹروں پر چڑھا دیتا تھا۔ اور ٹکٹ کے پیسے ہضم کر جاتا تھا۔ یہ معاملہ انہوں نے مولوی صاحب کے گوش گذار کر دیا۔ جس پر مولوی صاحب کو بے حد غصّہ آیا۔ اور سب کی تنخواہیں روک لیں۔ اس زمانے میں پروفیسر ابراہیم اور شیخ چاند مولوی صاحب سے بہت بے تکلف تھے۔ اور مولوی صاحب ان کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ انُ کے توسّط سے عملے نے معافی کی درخواستیں پیش کیں۔ اور ان حضرات نے سفارش کر کے پھر سے

تنخواہیں جاری کرادیں۔

اسی زمانے میں سید صاحب کو مولوی صاحب کے قریب آنے کا ایک موقعہ حاصل ہوگیا۔ مولوی صاحب کے خاص ملازمین کی تعداد چار تھی۔ جو ان کی خدمت اور ضروریات کی نگرانی اور فراہمی پر مقرر تھے۔ اتفاق سے ان میں سے ایک آدمی کم ہوگیا۔ مولوی صاحب کو کسی آدمی کی تلاش تو تھی ہی۔ شیخ چاند سے تذکرہ آیا تو۔ انہوں نے سید صاحب کا نام پیش کر دیا۔ اور یہ اس دن سے مولوی صاحب کی ذاتی عملے سے منسلک ہو گئے۔ حالانکہ وہ حیثیت جو انہیں انجمن میں حاصل تھی۔ اس کام سے مجروح ہوتی تھی۔ مگر مولوی صاحب کی قربت اور ان کے ساتھ ہر وقت رہنے کی خواہش نے اس جذبے کو دبا دیا تھا۔ جب مولوی صاحب چھٹیوں کے ختم ہونے کے بعد حیدر آباد تشریف لے جاتے تو یہ پھر شیخ چاند سے منسلک ہو جاتے

مولوی صاحب کی اس قربت نے انہیں ان کی عادات و خصائل اور روزمرہ کی زندگی سے آگاہ کر دیا تھا۔ سید صاحب کا کہنا ہے مولوی صاحب کی زندگی گو کہ بظاہر تنہائی کی زندگی نظر آتی ہے۔ مگر وہ ہرگز مردم بیزار نہ تھے۔ اور ان کی محفل ہمہ رنگ آدمیوں سے جگمگاتی رہتی تھی۔ گو کہ ان کے قریب بعض مستحق اور نا قابل امداد عزیز بھی رہتے تھے۔ مگر کسی کو ان کے مزاج میں دخیل ہونے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ وہ ویسے تو اپنے بھانجے اور بھتیجے کی پرورش بھی کرتے تھے۔ مگر ان سے براہ راست واسطہ کم رکھتے تھے۔ لوگوں کی مدد کرنا مولوی صاحب کی ایک ایسی عادت تھی۔ جس کو سید صاحب ہزار نیکیوں سے افضل قرار دیتے ہیں۔ بیواؤں کا خصوصیت سے خیال رکھتے تھے اور کئی بیوائیں ان کے روپوں پر زندگی بسر کر رہی تھیں۔ اپنی بھاوج کا جو بیوہ ہو چکی تھیں بہت خیال رکھتے تھے۔ اور ان کی ہر ممکن مدد کرتے تھے۔ مولوی صاحب ہمیشہ اپنے ساتھ کئے ہوئے دوسروں کے سلوک یاد رہتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی ضیاء الحق صاحب نے چونکہ ان کی پرورش کی تھی۔ لہٰذا ان کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنے فرائض پوری ذمہ داری اور خوبی سے انجام دیئے یہ سلوک صرف خاندان والوں ہی کے ساتھ نہ کرتے تھے۔ بلکہ ہر مستحق شخص کے ساتھ ان کا رویہ یہی ہوتا تھا۔ گو کہ مولوی صاحب کو مذہب سے کوئی ایسا ظاہری شغف نہ تھا۔ مگر ان میں خدا ترسی کی بہترین صفت موجود تھی۔ جس کا ثبوت آپ کو شیخ چاند کے واقعہ سے مل جائے گا۔ شیخ چاند دراصل تعلقہ پٹن کے ایک باغبان کا لڑکا تھا۔ اس کو پڑھنے لکھنے سے بچپن سے شوق تھا۔ اس نے جب میٹرک پاس کر لیا۔ تو مولوی صاحب کی شہرت سن کر کہ وہ مستحق طالب علموں کی بڑی مدد کرتے ہیں۔ ان کے پاس پہنچا۔ اور کہا کہ میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔ مولوی صاحب نے اس کے حالات سن کر اور اس کے شوق علمی کو دیکھ کر اس کو فوراً اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اپنے ہی مکان میں رہنے کے لئے کمرہ دیا۔ اور اس کے کھانے پینے۔ پہننے اوڑھنے اور تعلیم کے سارے اخراجات خود برداشت کیے۔۔ اس طرح اس نے ایم۔ اے۔ کر لیا۔ جب اس کو انجمن کے کاموں سے دلچسپی ہوئی تو مولوی صاحب نے اس کی خداداد ذہانت کو

دیکھتے ہوئے۔ اپنی نگرانی میں کام کرانا شروع کیا۔ بہت جلد اس کا نام پورے ہندوستان میں مشہور ہوگیا۔

مولوی صاحب کی بعض عادات کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحب نے نہایت دلچسپ حالات سنائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب سحر خیزی کے بڑے عادی تھے۔ اور اس وقت اٹھ جاتے تھے۔ جب سب سوتے ہوتے تھے۔ تقریباً پانچ بجے اٹھتے تھے۔ اور اس کا خاص طور سے خیال رکھتے تھے کہ کسی کی نیند میں کوئی خلل نہ پڑے۔ چپکے چپکے اٹھتے اور اپنے جوتے پہن کر ٹہلنے نکل جاتے۔ اور اپنے ایک گہرے دوست پنڈت ہنسی دھر کو ساتھ لے کر ٹہلنے نکل جاتے۔ اور یہ ٹہل عام لوگوں کے طریقے سے مختلف ہوتی تھی۔ خواہ مولوی صاحب جنگل میں ہوں یا پہاڑ پر ہمیشہ دوڑتے رہتے تھے۔ اور میلوں کا چکر لگا کر سات بجے تک واپس آجاتے تھے۔ وقت کے بڑے پابند تھے۔ اور اسی وجہ سے ہاتھ اور جیب دونوں کی گھڑیاں ساتھ رکھتے تھے۔ واپسی میں ملازم ان کے نہانے کا پانی وغیرہ تیار رکھتا تھا۔ اور کپڑے لٹکے رہتے تھے۔ وضع داری کے بڑے پابند تھے۔ انہوں نے کبھی شیروانی اور جوتے اپنے ملازم سے نہیں اتروائے۔ خود ہی اتارتے تھے۔ اور خود ہی پہنتے تھے۔ غسل کر کے پندرہ منٹ کے بعد اخبار کا مطالعہ شروع کر دیتے تھے۔ اور اخبار تمام زبانوں۔ انگریزی۔ اردو اور ہندی کے ہوتے تھے۔ اور جو ہندوستان کے تمام اہم اخبار ان کے پاس آتے تھے۔ جن کا مطالعہ ان کا روزانہ معمول تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے ناشتے کی میز پر بیٹھ جاتے تھے۔ ناشتہ میں عموماً کھچڑی پسند کرتے تھے۔ اور اس کے ساتھ سبزی ان کا من بھاتا کھاجا ہوتی تھی۔ گوشت انہیں زیادہ پسند نہ تھا، کم خور تھے۔ باورچی کو عموماً تین چپاتیوں کا حکم دیتے۔ اور کھاتے دو ہی تھے۔ مولوی صاحب کھانے سے زیادہ کھلانے کے شوقین تھے۔ دسترخوان پر جب تک دس پندرہ آدمی نہ ہوں۔ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اور انتظار کرتے رہتے تھے۔ باورچی کو خود ہی کھانے کے بارے میں احکامات دیتے تھے۔ اور ہر قسم کے کھانے پکواتے تھے۔ مگر خود سبزی اور ماش کی دال ہی کھاتے تھے۔ اورنگ آباد آتے تو مچھلی کھاتے جس کے وہ بے حد شوقین تھے۔ اور بمبئی سے منگوایا کرتے تھے۔ کسی دن اگر ناشتے میں ذائقہ بدلنا ہوا تو توس اور انڈا تیار کرا لیتے تھے۔ سردیوں میں نہاری ضرور پکواتے تھے۔ اور کئی کئی مہمانوں کو بلا لیتے تھے۔ باورچی نہایت اہتمام سے تمام رات نہاری تیار کرتا۔ اور وہ تندور کی گرم گرم روٹیوں کے ساتھ نوش فرماتے۔ چائے سے فارغ ہو کر مولوی صاحب اپنے دفتر میں آ بیٹھتے۔ ان کے پاس ڈاک بہت آتی تھی۔ اور تقریباً چالیس پچاس خطوط روز کا اوسط ہوتا تھا۔ سب سے پہلے ڈاک دیکھتے۔ اور پھر اخبار اور رسالوں کا مطالعہ کرتے۔ لکھنؤ کا صدق اور ماہنامہ نگار بہت دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ ہندی اخباروں میں پرتاپ اور تیج کا مطالعہ کرتے تھے۔ ہندی بھی خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ اور ناگری پڑھ سکتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کے اخبار منادی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اور اس کو دیکھتے ہی اٹھا کر پھینک دیتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی

سے کبھی خوش نہیں رہے۔ خطوط کا فوری جواب لکھتے اور سید صاحب کے ہاتھ ہی بھجواتے۔ خطوط کا جواب دینے کے بعد وہ کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ عموماً مضمون لکھنے اور ایک ہی نشست میں مکمل کر دیتے تھے۔ کے علاوہ کتابوں اور رسالوں پر تبصرے کرتے۔ اور اگر فرصت مل گئی تو کوئی کتاب یا رسالہ اٹھا لیتے۔ اور اتنی محویت سے اس کا مطالعہ کرتے کہ ایسا معلوم ہوتا کہ مولوی صاحب موجود ہی نہیں ہیں۔ اس محویت میں اگر کوئی غل ہوتا تو ایک دم چونک سے پڑتے۔ اور جھنجھلا کر پوچھتے۔ کیا بات ہے؟ کوئی ملاقاتی آتا تو بتا دیا جاتا کہ فلاں صاحب آئے ہیں تو کہتے کہ ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ اور کہدو کہ ابھی آتا ہوں۔ اس وقت انہیں ملاقاتی کی آمد سخت ناگوار گزرتی۔ مگر مروّت میں کچھ نہ کہتے۔ دوران ملاقات میں ان کا ذہن اسی کام میں مصروف رہتا۔ جسکو وہ چھوڑ کر آئے تھے۔ ملاقاتیوں کی دو قسمیں ہوتی تھیں۔ ایک وہ جو صرف وقت ضائع کرنے آتے تھے۔ مولوی صاحب ان سے بات نہ کرتے تھے۔ اور چپ بیٹھے رہتے تھے۔ ان کا موڈ خراب ہو جاتا تھا اور اس ملاقات کا نقشہ عموماً یہ ہوتا تھا کہ ایک طرف ملاقاتی چپ بیٹھا ہے۔ دوسری طرف مولوی صاحب ہونٹ سیئے بیٹھے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ضرورت مند یا طالب علم کسی اہم مسئلہ پر مشورہ لینے آتا تو اس سے خوب باتیں کرتے۔ اور ہر ممکن امداد کا وعدہ کرتے۔ دوستوں سے ملاقات خوش گپیوں کی تمہید ہوتی۔ خوب ٹھٹھے مار کر ہنستے۔ ان کے خاص دوستوں میں معشوق یار جنگ اور سید ہاشمی فریدآبادی تھے۔ اور ان سے خوب بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے۔ ملاقاتی کے چلے جانے کے بعد مولوی صاحب اس قدر بیقراری کے عالم میں واپس آکر میز پر بیٹھتے کہ بس بھاگنے کی کسر رہ جاتی اور آتے ہی کام شروع کر دیتے۔ یا اگر موضوع ذہن سے نکل گیا ہوتا تو ایک بار پھر مسودہ شروع سے پڑھتے اور لکھنا شروع کر دیتے۔ مولوی صاحب کا رعب اس قدر تھا کہ ایسے وقت کوئی شخص اُن کے کمرے میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ کام کرتے کرتے کھانے کا وقت ہو جاتا تھا اور ملازم آکر اطلاع دیتا تھا۔ آکر کھانے کی میز پر بیٹھ جاتے اور فارغ ہو کر پھر کتابیں یا رسالے پڑھنے لگتے۔ دن میں سوتے نہیں تھے زیادہ تر وقت پڑھنے میں ہی گزرتا۔ سہ پہر کی چائے پانچ بجے پی کر پھر دفتر میں آجاتے۔ شام کی چائے ذرا اہتمام سے پیتے تھے۔ باورچی کچھ نمکین چیزیں تیار کرتا۔ مگر چٹ پٹے کے ساتھ چینے ضرور کھاتے اور پھلوں کے بے حد شوقین تھے۔ لہٰذا انواع و اقسام کے پھل چائے کے ساتھ موجود رہتے تھے۔ مہمان چائے پر بھی ضرور ہوتے۔ شام کے چھ بجے پھر ٹہلنے کا وقت ہو جاتا۔ پنڈت بنسی دھر پھر آموجود ہوتے یا کبھی کبھی پروفیسر ابراہیم سیر میں شامل ہو جاتے۔ اگر کبھی اجنتا یا دولت آباد کے قلعے کی سیر کا پروگرام بنتا تو پروفیسر ابراہیم۔ پروفیسر طیب پرنسپل عثمانیہ کالج بھگتل صاحب وغیرہ خاص طور سے بلائے جاتے۔ اُن کے ساتھ ایسے موقعوں پر عبدالرحیم فینسی ضرور ہوتا جو پکنک کا سارا سامان مہیا کرتا۔ اگر خلاف مزاج کوئی بات ہو جاتی تو بڑی طرح ڈانٹتے کہ سننے والا شرمندہ ہو جاتا اور خوش ہوتے تو انعام و اکرام سے بھی نوازتے۔ سفر کے دوران یہ

نازک مزاجی کوئی اور شکل بھی اختیار کر جاتی۔ وہاں اُن کے خلافِ مرضی کام کے معنی کھٹے پٹائی۔ غصہ اس شدت سے آتا کہ اگر اس وقت کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے تو وہ بھی پھینک مارتے جو عموماً کھڑکی سے باہر نکل جاتی ہمیشہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ سفر میلوں کرنے کے شوقین تھے۔ ٹرین میں مسافر اُن کے غصے سے خوب لطف اٹھاتے تھے۔ مہمان نوازی اور وضع داری کا یہ عالم تھا کہ سفر میں بھی کھانے اور ناشتہ میں سارے مسافروں کو شریک کر لیتے ڈائننگ کار سے کھانا منگواتے۔ سفری ناشتے میں گاجر کا حلوہ ضرور شامل ہوتا۔ کھانے کا شوق انھیں ہمیشہ سے تھا اور اس کے لئے انھوں نے اپنے باورچی کو مختلف شاہی مرکزوں مثلاً رام پور۔ دہلی اور لکھنؤ کے رکابداروں کے پاس بھیجا تھا تاکہ ہر قسم کے کھانے سیکھ آئے۔ ان کا باورچی بشیر احمد تھا جو گیارہ سال کی عمر سے ان کے پاس تھا۔ مولوی صاحب نے اس کو کسی قدر پڑھایا لکھایا بھی تھا اور اس کی شادی بھی کرادی تھی۔ ایک بار باورچی کسی وجہ سے گھبرا کر اپنے وطن چلا گیا۔ جس کے بعد مولوی صاحب کو کھانے کی بڑی تکلیف ہوئی دوسرا کوئی باورچی ان کے مزاج کا کھانا تیار نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا مولوی صاحب نے اپنے بڑے بھائی صاحب کو ہاپوڑ لکھا اور انھوں نے باورچی کو پھر واپس بھیج دیا۔

مولوی صاحب کے علاوہ انجمن کے رابعہ دورانی کے مقبرے کے بھی مہتمم تھے۔ ان کے احکامات کے بغیر وہاں بھی کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ یہ کام مولوی صاحب بڑی ذمہ داری سے انجام دیتے تھے۔

مولوی صاحب کو باغ لگوانے کا بے حد شوق تھا عموماً خود ہی نگہداشت کرتے تھے۔ اور آموں اور امرودں کے بے حد شوقین تھے۔ آموں کی فصل میں آموں کے تحفے اپنے دوستوں کو روانہ کرتے تھے۔ مولوی صاحب اپنے دوستوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی سادہ طبیعت تھی۔ دل نہایت وسیع اور رحم سے پُر تھا کسی کو بھی دُکھ میں دیکھ کر بے چین ہو جاتے۔ نادار طلباء کا بے حد خیال رکھتے اور اُن کی تعلیم میں ہر قسم کی مدد کرتے تھے۔ وظائف دیتے تھے اور کتابیں مہیا کرتے تھے۔ ایسے طلباء میں بعض دفعہ مطلب پرست افراد بھی ہوتے تھے جن کی وجہ سے مولوی صاحب کو نقصان بھی برداشت کرنے پڑتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب (جو مشہور ادیب ہیں) تلاش معاش میں مولوی صاحب کے پاس پہنچے تھے۔ انھوں نے مولوی صاحب کو اپنی تیزی اور فطانت سے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ مولوی صاحب کی یہ کمزوری تھی کہ وہ کسی معاملے کی تحقیق نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جو کچھ اُن کا منہ چڑھا مصاحب کہہ دیتا تھا اس پر یقین کر کے دوسروں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے لگتے تھے۔ مذکورہ صاحب نے یہاں دوسروں کے خلاف فضا پیدا کر دی تھی جس سے مولوی صاحب کے تعلقات متاثر ہونے لگے تھے اور اس بات کا ان کے تمام مخلص دوستوں کو بڑا رنج تھا۔ شیخ چاند بھی اگرچہ مولوی صاحب سے مزاج میں دخیل تھا، لیکن اُس نے کبھی کسی کے خلاف ان سے کچھ نہ کہا شیخ چاند ایک سچا طالب علم تھا اور علم سے بڑا لگاؤ رکھتا تھا مولوی

صاحب نے اس کو بیٹوں کی طرح عزیز رکھا اور اس کی تمام ضرورتیں پوری کیں۔ اس نے کبھی مولوی صاحب اور اُن کے دوستوں کے معاملات سے سروکار نہیں رکھا۔ مولوی صاحب تعلیم کے سلسلے میں کسی کی کو روا نہیں رکھتے تھے۔ وُہ عموماً دعوتوں اور کانفرنسوں سے گریز کرتے تھے مگر کسی تعلیمی ادارے یا تحریک کے سلسلہ سے کوئی اگر اُن کو ذرا بھی دعوت دیتا تھا تو وہ لمبے لمبے سفر بھی کرنے کے لئے بخوشی تیار ہو جاتے تھے اور اکثر کرایہ وغیرہ خود صرف کرتے تھے۔ پھر ایک وقت وہ آیا جب مولوی صاحب نے حیدرآباد چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اورنگ آباد کا پریس بھی عبداللطیف خاں کو بیچ دیا اور دہلی جانے کا ارادہ کرلیا۔ جہاں ان کے خیال میں اردو کی خدمت اور علمی کاموں کو پھیلانے کے وسیع تر امکانات موجود تھے۔ اس فیصلے کے بعد انھوں نے عملے کو الگ کردیا جس میں سید صاحب بھی شامل تھے۔ مگر وہ مولوی صاحب کی دہلی آمد سے قبل ہی دہلی آگئے تھے اور اپنے ایک عزیز کے یہاں رہ رہے تھے۔ جب مولوی صاحب دہلی آئے اور انہوں نے ازسرِ نو انجمن کا دفتر قائم کیا اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی کرایہ پر لے لی تو مولوی ہاشمی صاحب نے سید صاحب کی سفارش مولوی صاحب سے کردی۔ جنھوں نے پہلے ان کو انجمن میں رکھا اور پھر پہلے کی طرح اپنی خدمت میں لے لیا۔ اس دوران کی دو ماہ کی تنخواہ بھی مولوی صاحب نے اپنے پاس سے ان کو دیدی۔

ان دوستوں میں جن سے مولوی صاحب کے حیدرآباد میں بڑے گہرے تعلقات تھے ہندو مسلم سب ہی تھے جن میں نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولوی ہاشمی فرید آبادی، پنڈت بنسی دھر، پروفیسر ابراہیم وغیرہ شامل تھے۔ یہ صرف دوست ہی نہیں تھے بلکہ مولوی صاحب اُن کی عزت اور احترام بھی کرتے تھے اور ہر چیز میں اُن سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ دہلی میں آکر پنڈت بنسی دھر اور پروفیسر ابراہیم کا تعلق تو تقریباً ختم ہوگیا مگر باقی سب حضرات اسی طرح مولوی صاحب کے پاس آتے رہے اور مولوی صاحب کے تعلقات اسی طرح قائم رہے۔ اِن کے علاوہ جو حضرات حیدرآباد سے مولوی صاحب کے یہاں آکر مہمان رہتے تھے ان میں سید تقی الدین صاحب۔ نواب منظور جنگ اور آفتاب حسن صاحب شامل تھے۔ اکثر کانفرنسوں کے سلسلے میں ہندوستان کے ہر خطے کے مشاہیر دہلی آتے تو مولوی صاحب کے پاس ہی ٹھہرتے تھے۔ دہلی میں جو احباب تھے وہ بھی ان کے پاس آتے رہتے تھے۔ اِن سب مشاہیر میں نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، شعیب قریشی، ڈاکٹر عابد حسین اور صالحہ عابد حسین، حافظ محمد شیرانی، اختر شیرانی، عبدالرحمٰن صدیقی، نواب صدیق علی خاں، عبدالستار صدیقی، سر عبدالقادر، پیر حسام الدین راشدی، پیر علی محمد راشدی، آل احمد سرور اور پنڈت سندر لال جیسے لوگ شامل تھے۔ مولوی صاحب حسبِ دستور یہاں بھی دعوتوں اور ضیافتوں میں مشغول رہتے تھے۔ دعوت کے سلسلے میں مجھے ہمیشہ یہ بات یاد رہی کہ مولوی صاحب نے ایک بار قائداعظم محمد علی جناح کو بھی دعوت دی تھی۔ اور قائداعظم اور قائد ملت لیاقت علی خاں دونوں کھانے پر تشریف لائے تھے۔ حالانکہ مولوی صاحب کو کبھی کسی سیاسی جماعت سے کوئی عملی تعلق نہیں رہا تھا۔ وہ صرف

اُردو کی بھلائی چاہتے تھے اور اردو کے بہی خواہوں کو دوست رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں اُن کی گاندھی جی سے ایک بار بہت بحث بھی چلی تھی۔ مگر انہوں نے دوستوں میں یا مستحق امداد حضرات میں کبھی ہندو مسلم کی تمیز نہیں کی تھی۔ جن لوگوں کی مولوی صاحب نے کسی قسم کی مدد کی تھی یا ان کی سفارشیں کی تھیں اُن میں ہندوؤں کی کثیر تعداد شامل تھی۔ ان کے ذہن میں کبھی ہندو مسلم سوال نہیں اٹھا۔ بس اردو ہی اُن کا اصل مذہب تھی اور وہی دوستی اور دشمنی کی بنا تھی۔

جب وہ شروع شروع میں دہلی آئے تو انجمن کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ حیدرآباد سے صرف مولوی صاحب کی پنشن آتی تھی۔ سر مرزا اسمٰعیل نے حیدرآباد کا وزیر اعظم ہوتے ہی وہاں کی گرانٹ بند کرادی تھی۔ مولوی صاحب کو بہت سے لوگوں نے مجبور کیا کہ وہ نظام سے رجوع کریں مگر مولوی صاحب نے اس تجویز کو کبھی قبول نہیں کیا۔ یہ زمانہ مولوی صاحب پر بڑا سخت گزر رہا تھا۔ انھوں نے اس زمانے میں انجمن کے عملے کی تنخواہیں اپنی جیب سے ادا کی تھیں۔ آخر کار انھوں نے اردو کے لئے چندہ کی اپیل سارے ہندوستان سے کی جس میں صرف عوام ہی نے دل کھول کر چندہ نہیں دیا بلکہ کئی رؤسا اور ریاستوں کی جانب سے بھی گرانٹ منظور ہو گئی اور حالات معمول پر آگئے۔ اسی طرح مختلف اوقات میں جب بھی اس کی ضرورت پڑتی مولوی صاحب انجمن ترقی اردو کی بہبود اور اس کی ترقی پر اپنے پاس سے روپیہ صرف کرتے تھے۔

ہندوستان کی سیاسی صورت حال ۱۹۴۶ء سے بد سے بدتر ہونے لگی۔ چاروں طرف ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ ہر طرف فسادات ہو رہے تھے۔ اور اس کا اثر دہلی پر بھی پڑ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا کہ یہاں بھی کسی لمحے کچھ نہ کچھ ہو جائیگا۔ مولوی صاحب حسب عادت اورنگ آباد سیر کے لئے گئے ہوئے تھے۔ افواہوں کا بڑا زور تھا۔ جس سے انجمن کا عملہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ جب حالات مخدوش ہونے شروع ہوئے تو بیشتر لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ یہاں تک کہ انجمن میں صرف سید صاحب۔ ایک کاتب مع اہل و عیال اور ایک چوکیدار رہ گیا جو افیون بہت کھاتا تھا۔ سید صاحب سودا سلف لینے بازار جایا کرتے تھے تو اکثر شرپسند عناصر انھیں کانا پھوسی کرتے دکھائی دیتے مگر ویسے حالات غیر معمولی نہیں تھے۔ اکثر مالک مکان مہاراج کشن بھی آیا کرتا تھا سید صاحب نے اندازہ کرنے کے لئے اس سے پوچھا کہ کبھی کوٹھی پر حملہ ہونے کا تو خطرہ نہیں ہے۔ اس نے جواب میں کہا کہ اس مکان پر کون حملہ کر سکتا ہے۔ یہ میرا مکان ہے۔ سید صاحب نے مزید تسکین کے لئے پوچھا کہ ہم لوگ تو محفوظ رہینگے؟۔ مہاراج کشن نے نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کیا اور کہدیا کہ "میں نے مکان کے بارے میں کہا ہے آپ کی ذمہ داری میں لینے کو تیار نہیں۔ آپ چاہیں تو اپنی مرضی سے رہیں چاہے تو چلے جائیں" سید صاحب انجمن کو چھوڑ کر کیسے چلے جاتے لہذا خود کو بہلاتے رہے لیکن ایک بار چوکیدار اور سید صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ انہوں نے سامنے کے پھاٹک سے دو ہندوؤں کو کودتے دیکھا اور فوراً چوکنا ہو گئے پھر انھیں کچھ اور سر فصیل پر نظر آئے۔

سید صاحب نے چوکیدار کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ اگر جان کی خیر چاہتے ہو تو فوراً بھاگ چلو۔ اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ یہ بوڑھے کاتب کو کوئی اطلاع کرتے چنانچہ فوراً پچھلی دیوار سے کود کر بھاگے۔ راستے میں چار سکھ بکریاں چرا رہے تھے۔ انہوں نے جو انھیں بھاگتے دیکھا تو بلند آواز سے کہا کہ مسلمنٹے جا رہے ہیں انھیں مارلو۔ یہ سن کران کی جان نکل گئی کہ اب خیر نہیں مگر سکھوں نے ان کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ لوگ بچتے بچاتے تھانے تک پہونچ گئے۔ اور تھانیدار کو اطلاع دی کہ انجمن پر حملہ ہو گیا ہے لہٰذا آپ فوراً اس کی فکر کریں ورنہ سارا کتب خانہ غارت ہو جائیگا۔ مگر تھانیدار نے کہا کہ یہی بہت ہے کہ تم جانیں بچا کر نکل آئے۔ انجمن کی فکر نہ کرو۔ اور کہا کہ ہم لوگ تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتے لہٰذا تم خود کو کسی محفوظ جگہ پہونچانے کی کوشش کرو۔ آخر کار یہ لوگ بڑی مشکل سے بچتے بچاتے وہاں سے نکلے۔ سید صاحب کوچہ چیلاں میں اپنے عزیز کے یہاں آگئے۔ بعد میں کوٹھی پر حملے کی تفصیل معلوم ہوئی۔ حملہ آوروں نے ساری کوٹھی میں لوٹ مار مچا دی تھی اور آگ لگانی چاہی۔ مگر مہاراج کشن نے ان سے کہا بھائیو یہ کوٹھی میری خریدی ہوئی ہے اگر تم نے اس کو آگ لگائی تو یہ میرا نقصان ہوگا۔ لہٰذا تم جو کچھ لوٹنا چاہو لوٹ لو مگر کوٹھی کو آگ نہ لگاؤ۔ چنانچہ مولوی صاحب کے کمرے کا تمام قیمتی سامان فرنیچر۔ صوفے۔ قالین۔ برتن۔ کپڑے اور دیگر آرائشی سامان سب لوٹ لیا گیا عملہ کا بچا کھچا سامان بھی اس کی نذر ہو گیا۔ لیکن حملہ آور جب لائبریری کی طرف بڑھنے لگے تو مہاراج کشن پھر ایک بار ان کی راہ میں آگیا اور کہا کہ ادھر تمہارے کام کی کوئی چیز نہیں۔ کتابیں اور تم کتابوں کو آگ نہیں لگاسکتے ورنہ میری کوٹھی نہیں بچ سکیگی اس طرح اس نے سمجھا بجھا کر انھیں ادھر جانے سے روک دیا۔ مگر بچارے کاتب صاحب ان کے ہاتھ پڑ گئے جن کو ظالموں نے فوراً قتل کر دیا ان کا بڑا لڑکا اپنی ماں کو لے کر کسی طرح وہاں سے نکل گیا مگر چھوٹا لڑکا کوٹھری سے نکل کر ان کے سامنے آگیا اس کو بھی انھوں نے ختم کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ سب کچھ ہوا مگر کتب خانہ محفوظ رہا جس کو خدا ہی کی مہربانی کہی جاسکتی ہے۔

جس زمانے میں دہلی میں فسادات ہو رہے تھے مولوی صاحب حیدرآباد سے بھوپال آچکے تھے۔ انہوں نے جب انجمن پر حملہ کی خبر سنی تو بیقرار ہو گئے۔ اور فوراً دہلی آنے کے لئے تیار بھی ہو گئے۔ مگر شعیب قریشی صاحب نے ان کو نہ آنے دیا۔ مولوی صاحب کا بیان تھا کہ ایک بار میں ٹکٹ خرید کر ڈبہ میں بیٹھ بھی گیا تھا مگر شعیب قریشی صاحب نے جب کوئی بس چلتے نہ دیکھا تو وہ ڈبہ ہی کٹوا دیا۔ بڑی خیر گزری ورنہ خدا جانے مولوی صاحب پر وہاں کیا گزرتی۔ اس معاملے میں وہ بہت بے خوف اور نڈر آدمی تھے کبھی جان کی پروا نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایک روز تو مرنا ہی ہے پھر ڈرنے کی کیا بات ہے۔ جب فسادات ختم ہوئے تو مولوی صاحب دہلی آئے جہاں وہ زاہد حسن صاحب سابق گورنر اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے یہاں ٹھہرے۔ ہم لوگ سب وہیں ان کی خدمت میں پہونچ گئے۔ سارے حالات ہم سے دریافت کئے اور کتب خانے کے بارے میں سن کر بہت

خوش ہوئے۔ پھر ہم لوگوں کو ساتھ لے کر ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر پہونچے۔ وہاں مہاراج کشن بھی آگیا اور اپنے کارنامے خوب بڑھا چڑھا کے سنائے اور ساری چیزوں کا سہرا اپنے سر باندھ لیا۔ مولوی صاحب بار بار اس کے احسان مند ہوتے اور شکریہ ادا کرتے کہتے کہ تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے اگر کتابیں ضائع ہو جاتیں تو میں برباد ہو جاتا۔ انھیں اپنے سامان تباہ ہونے اور لٹنے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ انھوں نے ایک لفظ بھی اپنے ذاتی نقصان پر نہیں کہا بلکہ مہاراج کشن کو تین سو روپیہ مزید اس لئے دیئے کہ اس نے کہا تھا کہ بھینس جب بلوائی لے گئے تو میں نے اس کی پڑیا کی دیکھ بھال کی تھی اور اپنے پاس سے اس کو چارہ وغیرہ کھلایا تھا۔ مولوی صاحب نے وہ پڑیا بھی اس کو دیدی جبکہ بھینس بھی بلوائی نہیں لے گئے تھے بلکہ مہاراج کشن کے پاس تھی۔

مولوی صاحب تقریبًا روز ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پہ آجاتے اور کوئی رسالہ یا کتاب پڑھتے رہتے اور رشید صاحب وغیرہ کتابیں پیک کرتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کے کہنے پر زاہد حسن صاحب نے ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان کو جو جالندھر میں رہتے تھے۔ کتابیں پاکستان بحفاظت پہنچانے کے بارے میں ایک خاص ہدایت کی۔ بیشتر کتابیں رفیق الدین صاحب لے کر آئے اور چھ صندوق سید صاحب کے سپرد کئے گئے۔ جن کو ایک ٹرک میں لے کر وہ پاکستان آگئے۔ لاہور میں مولوی صاحب نے عبدالمجید خاں صاحب کو جو مدرستہ البنات کے بانی تھے۔ پہلے ہی اطلاع کردی تھی اور سید صاحب کو وہاں کا پتہ دیا تھا۔ چنانچہ سید صاحب سیدھے عبدالمجید خاں صاحب کے یہاں لاہور پہونچ گئے۔ عبدالمجید خاں صاحب نہایت شریف اور نیک آدمی تھے۔ انھوں نے سید صاحب کو بڑی بڑی محبت سے اپنے پاس رکھا۔ اور ان کی ہر ضرورت کا خیال خود رکھا۔ اس وقت تک سید صاحب کے پاس روپیہ بالکل ختم ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھے۔ آخر انہوں نے عبدالمجید خاں صاحب سے ذکر کیا۔ انہوں نے سید صاحب کو بڑی تسلی دی اور کہا کہ تم بالکل فکر نہ کرو۔ سب چیزوں کا انتظام ہوجائیگا۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف سامان بک کرایا بلکہ سید صاحب کا ٹکٹ دلا کر انھیں مزید کچھ روپیہ دیئے۔ عبدالمجید خاں صاحب سے مولوی صاحب کو بڑا تعلق خاطر تھا۔

سید صاحب لاہور سے کراچی پہونچے تو سیدھے موجودہ انجمن کے دفتر آئے جو پہلے نثار دا مندر کہلاتا تھا۔ اس زمانے میں مولوی صاحب پیر الٰہی بخش صاحب کی کوٹھی پر قیام پذیر تھے۔ اور موجودہ بلڈنگ میں انجمن کا دفتر اور کتب خانہ تھا نیز انجمن کا عملہ بھی یہیں رہتا تھا۔ انھوں نے مولوی صاحب سے مل کر اپنی ساری روداد کہہ سنائی مولوی صاحب نے ہدایت کی کہ عبدالمجید خاں صاحب کو فورًا بذریعہ منی آڈر روپیہ بھیج دیا جائے۔

انجمن کی موجودہ عمارت پیر الٰہی بخش صاحب کے زمانے میں الاٹ ہوئی تھی اور اس کے لئے علی شبر حاتمی نے بڑی کوششیں کی تھیں۔ بعد میں جب بلڈنگ کا اصل مالک آیا تو سیدھا ہاشم رضا صاحب نے جو اس وقت کراچی

میں کمشنر تھے اس کو مولوی صاحب سے ملایا۔ اس شخص نے راضی خوشی یہ بلڈنگ مولوی صاحب کی تحویل میں دیدی اور خواہش ظاہر کی اس کا چھوڑا ہوا ایک لڑکا اسی جگہ رہیگا۔ جس کو مولوی صاحب نے بہت خوشی سے منظور کیا۔ چنانچہ وہ لڑکا جواب بال بچے دار ہے (پونجا موتی) آج بھی انجمن میں ملازم ہے اور اپنا خاصا اعتبار رکھتا ہے۔ مولوی صاحب پونجا کو بہت عزیز رکھتے تھے اور اس کی خوبیوں کے تہ دل سے معترف تھے۔

مولوی صاحب کچھ عرصہ بعد موجودہ بلڈنگ میں منتقل ہوگئے اور انجمن کے دفاتر کی اوپر کی منزل میں رہنے لگے۔ حالات اب بدل چکے تھے۔ انجمن ترقی اردو کی وہ تمام امداد جو اس کو ہندوستان میں ملتی تھی یہاں بند تھی۔ اور اس کا متبادل انتظام شروع میں کوئی بھی نہ ہوسکا تھا۔ جس کی وجہ سے مولوی صاحب بہت پریشان اور افسردہ خاطر رہتے تھے۔ نئے حالات نے سارے ملک کا حلیہ بدل دیا تھا۔ ایک تاریخی انقلاب آچکا تھا۔ اور یہ ناممکن تھا کہ مولوی صاحب اس سے متاثر نہ ہوتے۔ ان کی زندگی میں بڑے بڑے انقلاب آئے مگر یہ افسوس البتہ سید صاحب کو ہے کہ ان کی آخری عمر کی نئی تبدیلیوں نے بڑے صدمے پہنچائے۔ جن کو انھوں نے بڑی پامردی سے برداشت کیا۔ مولوی صاحب کی عادات وہی تھیں مگر چند مجبوریوں نے اُن کے بعض طور طریقوں کو بدل دیا تھا مہمان نوازی کی روایت ختم ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ کھلانے کا وہ شوق بھی نہیں رہا۔ البتہ صبح کی سیر یہاں بھی نہیں چھوٹی اور آخری دنوں کو چھوڑ کر وہ اکثر صبح سویرے رکشے میں بیٹھ کر برنس گارڈن یا فریر ہال چلے جاتے اور کچھ دیر چہل قدمی کرکے واپس آجاتے۔ لیکن اُن تبدیلیوں کا اثر جو حالات سے پیدا ہوئی تھیں مولوی صاحب کی عام زندگی پر پڑنا بہت ضروری تھا۔ چنانچہ یہاں وہ نیا حلقہ ان کے اطراف جمع ہوا جو سوائے مولوی صاحب کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کے اور کوئی مقصد نہ رکھتا تھا۔ ان کیلئے محبت، خلوص، قربانی اور خدمت سب چیزیں اضافی تھیں اور مفاد، خود غرضی اور لوٹ کھسوٹ بنیادی —— مولوی صاحب اپنی عادت کے موافق ان ہستیوں کا شکار ہونا شروع ہوگئے اور اُن کے مزاج میں جو سختی تھی اس کا اقتضا یہ تھا کہ وہ جس سے خفا ہوجائیں پھر خفا ہی رہتے تھے۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ اپنے تمام قدیم اور معتبر دوستوں سے بدگمان کر دیئے گئے۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ بھی آیا جب مولوی صاحب کے قدیم اور جدید ملنے والوں میں کوئی شخص بھی ایسا نہ رہا جو ان کے پاس دو گھڑی بیٹھ جاتا۔ اگر ابن انشا صاحب ان کے پاس نہ آتے رہتے تو شاید پھر کبھی اُن کی محفل آباد نہ ہوتی۔ مولوی صاحب کی طبیعت کے بارے میں سید صاحب نے جو کچھ بتایا ہے اس سے انھیں یہ احساس ہوا کہ اس تصویر سے مولوی صاحب بہت خشک آدمی نظر آرہے ہیں جبکہ اُن کا خیال ہے کہ مولوی صاحب نہایت پُر مذاق آدمی تھے۔ اس کے ثبوت کے لئے انھوں نے تین واقعات سنائے ہیں جو آپ بھی سنیئے۔

مولوی صاحب جب خفا ہوتے تو گالیاں بہت دیتے تھے اور آخری زمانے میں غصہ بھی بہت آنے لگا تھا۔ جب ان گالیوں کا نشانہ سید صاحب بنتے تو یہ اس وقت تو سن لیتے۔ مگر اگلے لمحہ اُن سے جاکر کہتے کہ اگر ہم کو مارنا پیٹنا ہے

تو بیشک مارپیٹ لیجئے مگر یہ گالیاں ہم نہیں سنیںگے۔ یہ بات مولوی صاحب کی سمجھ میں آجاتی اور وہ اس کی تلافی اس طرح کرتے کہ تھوڑی دیر بعد انھیں بلا کر کسی چیز کے بہانے باتیں کرنے لگتے اور مسکرا مسکرا کر دو ایک مزیدار فقرے کہدیتے جس سے سید صاحب ہنسنے لگتے اور گالیوں کا مزہ میٹھا ہو جاتا۔ ایک بار کا قصہ سید صاحب نے اور سنایا کہ پشاور میں اردو کانفرنس ہوتی تو مولوی صاحب اس کا افتتاح کرنے پشاور پہونچے۔ کانفرنس کی صدارت عبدالرحمٰن صدیقی سابق گورنر مشرقی پاکستان کرنے والے تھے۔اسٹیشن پر کوئی بدمزگی ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب عبدالرحمٰن صدیقی نے اپنا خطبۂ صدارت مولوی صاحب کو دکھایا تو انہوں نے پھاڑ کر پھینک دیا۔ اور کہا تو اردو کیا جانے اور صدارت کرنے چلا ہے" جس شام کو اجلاس ہونے والا تھا۔اس شام صدیقی صاحب نے بہترین سگریٹ مولوی صاحب کو پلائے حالانکہ وہ سگریٹ بہت کم پیتے تھے۔ سگریٹ بہت اچھے تھے اور کبھی مولوی صاحب نے کسی خاص جگہ پیئے بھی تھے۔ اس لئے خوش ہوگئے اور کہا لا قلم دوات اور اسی وقت دوسرا خطبہ صدارت لکھوا دیا۔

ایک صاحب جو انجمن میں نوکر ہوئے تھے ایک کمرے میں رہا کرتے تھے۔ لیکن رات کو گرمی کی وجہ سے کمرے کے باہر سویا کرتے تھے۔ مولوی صاحب صبح ٹہلنے کے لئے جاتے تو ان کے جوتے چپکے سے ان ہی کے بستر میں چھپا دیتے وہ بہت حیران ہوتے کہ ایسا کون کرتا ہے۔ مولوی صاحب کی یہ حرکت برابر جاری رہی تو انہوں نے پریشان ہو کر کمرے کے باہر سونا چھوڑ دیا۔

سید صاحب کہتے ہیں۔ مولوی عبدالحق ہماری ہر سانس میں زندہ ہیں۔ ہمارے پاس بیٹھئے ہم آپ کو ایک ایک گھڑی کا حساب بتائے دیتے ہیں۔ نگر دیم واپسیں بر سر راہ ہے۔ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے۔

ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ سید صاحب خود کو ستائیس سال کا جوان کیسے سمجھ لیتے ہیں۔ جبکہ اُن کا ہمدم دیرینہ اس عالم رنگ و بو سے کہیں اور چلا گیا ہے اور سید صاحب ان کے ساتھ نصف عمر گذار چکے ہیں۔ وہ تھکن جو سید صاحب کی چال ڈھال سے نمایاں ہے۔ اس کا جواب دیتی ہے مگر سید صاحب واقعی جوان ہیں۔ کیونکہ وہ اس قدر جوش و خروش سے ماضی کی خوشگوار یادوں کا دم بھرتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ از سر نو زندہ ہوگئے ہوں۔

زبان دان اور اہل زبان

زبان ذات پات، قومیت، وطنیت سے بری ہے، جو اسے بولتا ہے اسی کی زبان ہے جو زیادہ صحت اور فصاحت کے ساتھ لکھتا بولتا ہے وہی زیادہ تر زبان دان اور اہل زبان کہلانے کا مستحق ہے۔ اس میں نہ کسی صوبے کی تخصیص ہے اور نہ کسی قوم اور نسل کی۔ (خطبات ص ۲۵)

صوفی عبدالرشید

"مولوی صاحب کی تمام توجہات کا مرکز انجمن ترقی اردو تھی۔ وہ کسی قیمت پر یہ برداشت ہی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی شخص انجمن کو نقصان پہنچائے۔ خواہ وہ شخص ان کا عزیز ترین دوست ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لئے وہ اپنی ذاتی عزت اور ذلت کا کبھی کوئی خیال نہیں کرتے تھے۔ انجمن کی عزت ہی ان کی اپنی عزت تھی۔ ان کی اسی کمزوری سے لوگوں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے۔ ہر ایسا شخص مولوی صاحب کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا تھا کہ دوسرا انجمن ترقی اردو کو نقصان پہنچا رہا ہے اور کسی کے بارے میں اس قدر کہہ دینا مولوی صاحب کو اس کے خلاف کر دینے کے لئے کافی تھا۔"

"مولوی صاحب ہمیشہ ہم لوگوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ اگر تم لوگ مجھ سے محبت کرتے ہو تو تم کو انجمن سے محبت کرنا چاہئے اور اگر تم انجمن کی خدمت کرو گے تو گویا میری خدمت کرو گے۔ انھوں نے انتقال سے ذرا پہلے کہا تھا۔ جبتک میں زندہ ہوں انجمن باقی ہے اور تم اس وقت تک یہیں رہو گے۔ لیکن اب وہ نہیں ہیں۔ مگر میں جبتک زندہ ہوں انجمن کی خدمت کرتا رہوں گا۔ کیوں کہ انجمن کی خدمت میرے محسن اور آقا مولوی عبدالحق کی خدمت ہے۔" یہ ہیں وہ الفاظ جو عبدالرشید نے ابتدا میں مجھ سے کہے تھے اور جو خود کو شاید اپنی داڑھی کی وجہ سے، صوفی عبدالرشید کہنے میں زیادہ مسرت محسوس کرتا ہے۔ جبکہ اس کی عمر کوئی زیادہ نہیں ہے۔ صوفی عبدالرشید نے مولوی صاحب کے بارے میں اور اپنی سرگزشت کے سلسلے میں جو بیانات دیتے ہیں ان کا ایک حصہ سنی سنائی پر مبنی ہے اور دوسرا ان کے ذاتی حالات پر۔ لہٰذا پہلے سنی سنائی سن لیجئے۔

"میرا سارا خاندان مولوی صاحب کے خاندان کے احسانات کے بوجھ سے ہمیشہ دبا رہا ہے۔ میں تو ساری عمر ان کے احسانات سے سر نہ اٹھا سکوں گا۔ جیسا زندگی بھر ان کا غلام رہا آج بھی ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ میرا اور مولوی صاحب کا تعلق میرے پردادا کے وقت کا تھا۔ میرے دادا ان کے پرانے ملازم تھے اور اس طرح میری تین پشتیں مولوی صاحب کے خاندان کی خدمت میں گزر گئیں ہیں۔ میری پیدائش بھی مولوی صاحب کے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق کے گھر میں ہوئی تھی۔ اور میرے والد عبداللطیف بھی اسی طرح

اس خاندان کے دعا گو اور احسان مند رہے ہیں۔ مولوی صاحب کا خاندان بڑا غریب پرور خاندان تھا۔ اور اچھا خاصا کھاتا پیتا خاندان سمجھا جاتا تھا۔ اس خاندان میں ایک خصوصیت ہمیشہ رہی تھی کہ وہ خدا ترسی اور حق گوئی کے معاملہ میں بہت مشہور تھا۔ ضیاء الحق صاحب سیاسی آدمی تھے۔ مولوی صاحب سمیت تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ بھائیوں میں بڑے بھائی ضیاء الحق صاحب ہاپوڑ میں رہتے تھے۔ منجھلے بھائی عبدالحق صاحب تھے اور چھوٹے احمد حسن جو بھوپال میں انجینئر تھے۔ مولوی صاحب کی بڑی بہن منشی اخلاق حسین محرّر اور زمیندار کو بیاہی گئی تھیں جو ہاپوڑ میں ہی رہتے تھے اور باقی دو چھوٹی بہنیں بھی ہاپوڑ کے ہی زمیندار گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں۔

مولوی عبدالحق صاحب کی پیدائش ہاپوڑ میں نہیں بلکہ سرادے میں ہوئی تھی جو ہاپوڑ سے ۱۵۔ بیس میل دور ایک جگہ تھی۔ بچپن سے ہی مولوی عبدالحق کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور اکثر چراغوں کی روشنی میں رات گئے تک پڑھا کرتے تھے۔ یہ بات مشہور تھی کہ مولوی صاحب کی فطرت میں عام بچوں کی طرح کھیل کود اور شرارت کا عنصر نہیں تھا بلکہ وہ شروع ہی سے سنجیدہ تھے اور پڑھائی کی طرف مائل تھے۔ اسی وجہ سے ان کا تعلیمی شوق روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ علی گڑھ چلے گئے جہاں انھوں نے سرسید کے زیر نگرانی تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور اسی فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا کہ وہ سرسید احمد خاں اور مولانا حالی کے رنگ میں ہمیشہ کے لئے رنگ گئے۔ یہ وہی رنگ تھا جو ساری عمر ان پر سے نہ اترا۔ علمی، تعلیمی اور قومی کاموں میں ہر وقت مصروف رہنا اور زندگی کی کسی بھی بڑی سے بڑی رنگینی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا، ان کا خاص جوہر تھا۔ اسی لئے وہ اپنے خاندان اور گھرانے کے افراد سے بہت بیگانہ رہتے تھے اور کبھی ان کو خاندان کے معاملہ میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا گیا حتیٰ کہ مولوی صاحب نے اپنی شادی بھی اسی خوئے بیگانگی کی نذر کر دی۔ جب ان کی چھوٹی بہن کی شادی "چھوٹے محل" میں ہونے لگی جو ہاپوڑ کا ایک زمیندار گھرانا تھا تو مولوی صاحب کی شادی بھی اسی گھر کی ایک لڑکی سے طے کر دی گئی۔ مولوی صاحب کی بیوی کا نام جعفری تھا۔ یہ شادی مولوی صاحب نے زبردستی والدہ کے اصرار پر کی تھی مگر ان سے یہ زبردستی زیادہ برداشت نہیں ہوئی اور بیوی سے بالکل تعلق ہی نہیں رکھا اور علی گڑھ چلے گئے۔ تھوڑے عرصہ بعد مولوی صاحب نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور ان کی شادی کسی دوسری جگہ ہو گئی۔ مگر مولوی صاحب نے پھر ساری عمر شادی نہیں کی۔"

صوفی عبدالرشید نے اپنی سنی سنائی میں ساری روایات اپنی والدہ سے منسوب کی ہیں ـــ چونکہ میرے سوالات کا بیشتر حصہ اس کے شعور سے پہلے کے حالات سے متعلق تھا۔ اس لئے وہ مزید خاندانی حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکا۔ اسکے بعد سے عبدالرشید کی آپ بیتی کا حصہ شروع ہوتا ہے۔

"مجھے جب مولوی صاحب نے اپنی خدمت کے لئے طلب کیا تو میری عمر دس سال کی تھی۔ مولوی صاحب کو اورنگ آباد میں ایک ملازم کی ضرورت تھی اس لئے مجھے ان کے پاس بھیجدیا گیا اس وقت وہ اورنگ آباد کالج کے پرنسپل تھے ـــ انھوں نے میرے ساتھ اورنگ آباد پہنچنے کے بعد اولاد کی طرح سلوک کیا اور ہر وقت مجھے اپنے ساتھ رکھا۔ کبھی کبھی جب خفا ہو جاتے تھے تو اس کی تلافی بھی فوراً کر دیتے تھے۔ میں ان کی ذاتی خدمت پر مامور تھا۔ چیزوں کا لانا لیجانا ان کے احکامات کی پابندی کرنا میرے

فرائض میں شامل تھا۔ گویا میرا وہ کام تھا جو اوپر کے ملازمین کرتے ہیں۔ حیدر آباد دکن میں مولوی صاحب کے ساتھ میں آٹھ نو سال مسلسل رہا۔ مولوی صاحب کو شروع میں میری تعلیم سے بہت دلچسپی تھی۔ مگر میں بیمار اس قدر رہتا تھا کہ مولوی صاحب کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکی۔ میری سنیے تو میں دراصل اپنی ذہنی کمزوری کی بنا پر نہیں بڑھ سکا۔۔ مولوی صاحب کے بڑے بھائی ضیاء الحق صاحب کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا اور یہ وہ واحد واقعہ تھا جس پر میں نے مولوی صاحب کو بہت متاثر دیکھا۔۔ ان کو اپنے بڑے بھائی سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی لئے ان کے بعد ان کی اولاد کو خوب پڑھایا اور گھر کے تمام اخراجات اور تعلیم کا خرچ بھی خود دیتے تھے۔ ان کی صاحبزادی کی شادی بھی مولوی صاحب نے خود کی۔ ضیاء الحق کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد سے مولوی صاحب کو کبھی زیادہ شغف نہیں رہا۔ جب تک ضیاء الحق صاحب زندہ رہے مولوی صاحب ہاپوڑ پابندی سے آتے رہے۔ لیکن انکے انتقال کے بعد صرف بھتیجے کی شادی پر ہاپوڑ آئے تھے اور اس کے بعد پھر کبھی نہیں آئے۔

۱۹۳۸ء میں جب مولوی صاحب دہلی آئے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ دہلی میں مولوی صاحب دریا گنج میں رہتے تھے یہاں مولوی صاحب کی ذاتی خدمت کے علاوہ میرے سپرد دفتری کام بھی تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب حالات بہت مخدوش ہو گئے اور فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا تو مولوی صاحب نے مجھ کو کہدیا کہ تم بھوپال چلے جاؤ۔ چنانچہ مولوی صاحب خود تو حیدر آباد چلے گئے اور مجھے احمد حسن کے پاس روانہ کر دیا۔ دہلی سے بھوپال جاتے ہوئے فرید آباد کے مقام پر ٹرین پر حملہ ہوا۔ جس میں میں شدید زخمی ہوا۔ وہ زمانہ جس سنگین صورتِ حال سے دوچار تھا اس کا اندازہ آج اچھی طرح نہیں کیا جا سکتا۔ بھوپال پہنچتے پہنچتے دو تین روز لگ گئے۔ احمد حسن صاحب کو ٹرین پر حملہ کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ وہ اسٹیشن پر منتظر تھے مجھے لے گئے اور میرا علاج کرایا۔ جب مولوی صاحب حیدر آباد سے بھوپال آئے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم فوراً کراچی چلے جاؤ۔ میں کراچی ہی آ رہا ہوں۔ بھوپال سے مولوی صاحب دہلی گئے اور وہاں مولانا ابوالکلام آزاد سے مل کر انجمن کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کی اور کراچی آ گئے۔ میں بمبئی کے راستے بحری جہاز سے کراچی پہنچا۔ مولوی صاحب نے میری والدہ کو اپنے بھتیجے کے ساتھ ہوائی جہاز سے یہاں پہلے ہی بلوا لیا تھا۔ اور وہ انھیں کے ساتھ رہی تھیں۔ میں جب یہاں پر آیا تو کیپٹن روڈ پر ان کے بھتیجے ممتاز حسین کے پاس رہا۔ اور مولوی صاحب کی خدمت بدستور شروع کر دی

مولوی صاحب کی رحلت تقریباً چھ سات سال قبل انجمن میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مجھے مولوی صاحب کی خدمت سے الگ کر کے دفتری کام میں لگا دیا گیا تھا۔ مگر میری تنخواہ مولوی صاحب ہی دیتے رہے اور اکثر میرے مانگنے پر الگ سے روپیہ بھی مجھے دیتے تھے میری شادی بھی انھوں نے ۱۹۵۳ء میں کمائی اور سارے اخراجات خود برداشت کئے۔

مولوی صاحب میں اتنی خوبیاں تھیں جن کو گنوانے کے لئے ایک عمر چاہئے۔ مگر ایک خرابی ضرور ان میں تھی کہ وہ جس آدمی پر ایک بار اعتبار کر لیتے پھر اس پر اندھا اعتبار کرتے تھے اور اس کے ہاتھوں میں کھیلنے لگتے تھے وہ جس شخص کے خلاف کچھ کہہ دیتا اس کو صفائی کا موقع دیئے بغیر الگ کر دیتے اور بدگمان ہو جاتے۔ اس خرابی کی وجہ سے بعض بڑے

مخلص افراد کو بڑا نقصان پہنچا۔ لیکن میرا پھر بھی اصرار ہے کہ اس میں محض انجمن کی محبت کام کر رہی تھی۔

افسوس ہے کہ صوفی عبدالرشید کو کچھ "ذہنی کمزوریوں" کے باعث جنکا انھیں خود اعتراف ہے، زیادہ باتیں یاد نہیں رہیں۔ ورنہ ایک تاریخی دستاویز ضرور مرتب ہوسکتی تھی۔ عبدالرشید کا آخری جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔

"میں ۳۶ء سے تاحال انجمن کا ملازم ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ میں مولوی صاحب کا بھی ملازم ہوں۔ مرحوم نے ساری زندگی انجمن کی نذر کر دی اور اسی خلوص کی روشنی آجتک ہم سب کے لئے مشعلِ راہ ہے۔"

بڑے آدمی

دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ادب ہم ان اولوالعزم اور عالی حوصلہ مدبروں اور وطن پرستوں اور باکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں جن کی حیرت انگیز جد و جہد، قربانیوں اور عظیم الشان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم و کلام نے عالم کو فیض پہنچایا اور روشن سورج کی طرح تاریکی کو مٹایا۔ محبت ہم ان سے کرتے ہیں جن کی پاک سیرت، خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے جو چودھویں رات کی چاندنی۔ ان کے پاس سے جو اٹھا کچھ لے کر اٹھا اور ان کے پاس جو گیا کچھ بن کر آیا۔

(ادبی تبصرے ص ۶۳)

بڑے آدمیوں کے وعدے

بڑے آدمیوں کے وعدے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے وعدے کے ایفا کو بھی اتنی ہی دیر لگتی ہے۔ (چند ہمعصر ص ۱۴۲)

بڑے لوگوں کی صحبت

بڑے لوگوں کی صحبت بھی اکسیر کی خاصیت رکھتی ہے۔ جو ان سے چھوا کندن بن گیا۔ (چند ہمعصر ص ۲۰۷)

اعظم خاں سواتی

قبلۂ محترم

اعظم خان سواتی نے مولوی صاحب مرحوم کے آخری دنوں میں ان کی بڑی خدمت کی تھی جسے صدر پاکستان نے بھی سراہا تھا اور سواتی صاحب کو تعلیمی وظیفہ عطا فرمایا تھا۔ ذیل کا مضمون سواتی صاحب نے مولوی صاحب کی وفات کے چند روز بعد لکھا تھا۔

۵ جون ۱۹۶۱ء بروز سہ شنبہ صبح کے ۸ بجے اپنے ایک استاد کے ساتھ جناح سنٹرل ہسپتال میں بابائے اردو کی عیادت کو گیا۔ بابائے اردو اسپیشل وارڈ میں مقیم تھے۔ میں نے پاس جا کر سلام کیا میرے ماسٹر صاحب نے بابائے اردو سے میرا تعارف کرایا کہ یہ تبی باغ بوائز سکول میں میٹرک کا طالب علم ہوں اور میں نے اردو لے رکھی ہے۔ پھر بابائے اردو نے مجھ سے مخاطب ہو کر دریافت فرمایا کہاں رہتے ہو؟ میں نے عرض کیا ایک صاحب کی خدمت کرتا ہوں اور وہیں پڑا رہتا ہوں۔ یہ سن کر فرمایا اب تم میرے پاس آ جاؤ ہم تمہیں پڑھائیں گے۔ میں نے اس کرم فرمائی کا شکریہ ادا کیا اور دل ہی دل میں اپنے مقدر کی رسائی پر خوش ہونے لگا کہ مجھے بھی ایک قومی ہیرو کی خدمت کا موقع مل رہا ہے۔ چنانچہ میں دوسرے دن جناب موصوف کے پاس ہسپتال میں چلا گیا۔ جب میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولوی صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ مجھے بیٹھنے کا ارشاد کیا۔ پھر مجھ سے نام پوچھا۔ میں نے کہا حضور میرا نام محمد بارس خان ہے۔ یہ سن کر مولوی صاحب ہنس پڑے۔ کہنے لگے آج کل بچوں کے نام بھی عجیب ہوتے ہیں۔ میں آج سے تم کو اعظم خان پکارا کروں گا۔ میں تھوڑے ہی دنوں میں مولوی صاحب کی عادت سے واقف ہو گیا۔ جناح ہسپتال میں مولوی صاحب کا قیام ۲۲ جون تک رہا۔ ہسپتال میں ڈاکٹر اے۔ ایم۔ قاسم کے زیر علاج رہے۔ ہر ممکن علاج کے باوجود کمزوری بڑھتی رہی تھی۔ ایک روز کارپوریشن کے شریک ناظم جناب عبدالستار صدیقی صاحب

تشریف لائے اور انھوں نے تبدیلی آب و ہوا کے لئے سوئزرلینڈ جانے کا مشورہ دیا۔ مولوی صاحب کو یہ رائے بہت پسند آئی۔ چنانچہ سوئزرلینڈ جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اتفاق سے تین چار روز کے لئے ڈاکٹر قاسم صاحب ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے واپسی پر جب ان کو مولوی صاحب کا عزم معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ آپ کوہ مری جائیں۔ ڈاکٹر قاسم کی بات مان لی گئی۔ اسی شام کو کراچی کارپوریشن کے وائس چیرمین خان بہادر حبیب اللہ خان صاحب عیادت کو تشریف لائے آپ نے ۲ ٹکٹ ہوائی جہاز کے خرید کر مولوی صاحب کو دیئے مگر ہوائی جہاز کا سفر منسوخ کرنا پڑا۔

کراچی کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوگئی کہ مولوی صاحب علاج کے لئے کوہ مری جارہے ہیں۔ ایک دن شام کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب کی طرف سے ان کے پرائیویٹ سکریٹری جناب قدرت اللہ شہاب کا تار مولوی صاحب کو ملا کہ وہ مری میں صدر پاکستان کے ذاتی مہمان ہونگے اور ان کے طبیب خاص بریگیڈیر محمد سرور خان کی نگرانی میں کوہ مری کے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں ان کے علاج کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ صدر پاکستان کی اس دعوت کو مولوی صاحب نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا اور ۲۲ جون کو بذریعہ تیز گام کوہ مری روانہ ہوگئے۔ کراچی سٹی اسٹیشن پر انجمن ترقی اردو کے جوائنٹ سکریٹری جناب مشفق خواجہ صاحب نے اور اردو کالج کے پرنسپل جناب عطاء الرحیم صاحب وغیرہ نے مولوی صاحب کو الوداع کہا۔ میں نے گاڑی میں ایک ننھے سے بچے کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک فاؤنٹین پین اور ایک ڈائری تھی۔ اس ننھے سے بچے کی شیروانی چمک رہی تھی مولوی صاحب نے اس کو پاس بلا کر اس کو آٹوگراف دیا۔ معلوم ہوا یہ نونہال اردو کالج کے پرنسپل کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ پونے چار بجے گاڑی روانہ ہوگئی۔ مولوی صاحب کو گئے ہوئے ابھی سات دن ہی گزرے تھے کہ وہاں سے مولوی صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری حکیم اسرار احمد کریوی نے ٹیلیگرام بھیجا کہ اعظم خان سواتی کو کوہ مری بھیجدیں چنانچہ ۷ جولائی کو میں کوہ مری روانہ ہوگیا۔ ۹ جولائی کی صبح کو میں ۱۰ بجے کے قریب ہسپتال پہنچ گیا۔ جب مولوی صاحب کے کمرے میں داخل ہوا اس وقت مولوی صاحب غنودگی کے عالم میں تھے سامنے ایک فوجی جوان مستعد بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ حکیم صاحب نہا رہے ہیں۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب کو ہوش آیا مجھ کو دیکھ کر کہا کب آگئے۔ میں نے سلام کیا۔ اتنے میں حکیم صاحب بھی نہا کر آگئے اور پھر مجھ کو ملٹری ہسپتال کے قاعدے قانون بتلائے۔ شروع شروع میں مولوی صاحب خود اٹھ کر غسل خانے میں چلے جاتے تھے پھر میں سہارا دے کر لے جاتا تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد بالکل طاقت نہ رہی چارپائی پر ہی ضرورت سے فارغ ہو لیتے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ کسی طریقے بھی مولوی صاحب کو تکلیف نہ ہو۔ ایک دفعہ بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ میں مولوی صاحب کو غسل خانے میں پیشاب کرانے لے گیا ہوا تھا۔ اور حکیم صاحب سوئے ہوئے تھے سردی سخت تھی صبح چھ بجے کا وقت تھا۔ حکیم صاحب صرف تہبند اور بنیان پہنے ہوئے تھے اور تین کمبل اوڑھے ہوئے بڑی گہری نیند سو رہے تھے کہ علی الصبح دو ڈاکٹر اور چار فوجی جوان راولپنڈی سے مولوی صاحب کو دیکھنے کے واسطے آئے انھوں نے سمجھا یہ جو سوئے ہوئے ہیں یہی مولوی صاحب ہیں۔ چنانچہ ایک فوجی ڈاکٹر نے بے دھڑک کمبل کھینچ کر ایک طرف کر دیا اور حکیم صاحب کی

پسلی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اندر کو ہاتھ دباتے ہوئے کہا کہ بابا زور سے سانس لیجئے دوسرا ڈاکٹر حکیم صاحب کا ہاتھ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ نبض دیکھے۔ اس وقت میرا ہنسی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ حکیم صاحب لاحول ولاقوۃ پڑھتے ہوئے اُٹھ بیٹھے، اور مجھ کو ڈانٹنے لگے۔ مزہ یہ کہ حکیم صاحب جلدی میں قمیض پہننا بھی بھول گئے اور خالی شیروانی پہن لی مجھے منع کر دیا کہ نام کسی کے آگے مت لینا حکیم صاحب رات کو دو یا تین بجے تک تاش کھیلتے رہتے تھے۔ لہٰذا وہ تو میرے جانے کے بعد آزاد ہو گئے۔ میں خود مولوی صاحب کو نہلاتا، کھانا کھلاتا، داڑھی میں کنگھی کرتا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ مولوی صاحب کھانا کسی سے نہیں کھاتے تھے مولوی صاحب ذرا سے سو لیتے تو میں جگا کر کہتا مولوی صاحب آج تو آپ دن بھر سوئے کھانا بھی نہیں کھایا۔ تب کہتے اچھا لے آؤ۔ مگر شرط یہ ہے کہ تین یا چار چمچ کھاؤں گا۔ کوہ مری میں جنرل برکی بیمار پرسی کو تشریف لائے تو حکیم صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ مولوی صاحب جنرل صاحب کہہ رہے ہیں کہ مولوی صاحب اب اچھے ہو رہے ہیں ان کی صحت اچھی ہو جائے گی۔ مولوی صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ میرے لئے نہیں تمہارے لئے کہہ رہے ہیں کہ خوب کھاتا پیتا ہے صحت اچھی ہے۔ اس پر جنرل برکی صاحب اور دوسرے ڈاکٹر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ کوہ مری میں صدر پاکستان کے بھانجے خان محمد اشرف خان صاحب، ان کے بھتیجے اور بھائی خان بہادر خان صاحب اور ان کے لڑکے کیپٹن گوہر ایوب اور طاہر ایوب صاحب بھی بیمار پرسی کے لئے تشریف لائے اشرف خان صاحب نے مولوی صاحب کے واسطے اپنے وطن ہری پور ریحانہ سے پانی منگوانے کا انتظام فرمایا کیونکہ وہاں کا پانی صحت بخش ہوتا ہے کوہ مری میں پاکستان کے بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ خان صاحب اور ان کے صاحبزادے اور بھانجے بھی مولوی صاحب کی بیمار پرسی کو تشریف لائے۔ مغربی پاکستان کے چیف جسٹس خان عبدالرحمن خان صاحب بھی تشریف لائے۔ کوہ مری میں کرنل عبدالمنان اور کرنل عطاء الحق صاحب کی انتھک کوششوں کے باوجود بھی مولوی صاحب کی حالت نہ بدلی۔ مولوی صاحب نے راولپنڈی جانے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ صدر پاکستان کے حکم سے راولپنڈی کی سی۔ ایم۔ ایچ میں انتظام کر دیا گیا۔ جب مولوی صاحب راولپنڈی پہنچے تو بریگیڈیر محمد سرور خان صاحب اور کرنل رحمت زمان صاحب نے ان کا استقبال کیا۔ ملٹری قانون کے تحت مریض کے پاس صرف ایک آدمی ہی رہ سکتا ہے۔ چنانچہ راولپنڈی میں حکیم صاحب نے ۱۸ روپیہ یومیہ پر ہوٹل ڈان میں قیام کیا اور میں مولوی صاحب کے پاس دن رات رہنے لگا۔ میری عادت تھی جمعہ کو مولوی صاحب کی لاٹھی لے کر نماز پڑھنے جاتا تھا۔ ایک دن مولوی صاحب فرمانے لگے دیکھو میرا قلم اور لاٹھی تم اپنے پاس رکھنا گمانا نہیں یہ میری نشانیاں تمہارے پاس رہیں گی۔ مولوی صاحب دن کو سو جاتے تھے اور رات بھر جاگتے تھے میں دن کو تین بجے سے لے کر ۷ بجے تک سوتا رہتا تھا۔ رات بھر مولوی صاحب کے ساتھ باتیں کرتا اور ان کو کولا کی بوتلیں پلاتا رہتا تھا۔ ایک دن راولپنڈی میں ایرکنڈیشن کی مشین خراب ہو گئی گرمی بڑھ گئی تو مولوی صاحب کہنے لگے مجھے لان میں لے چلو۔ ہمارا کمرہ بھی دوسری منزل پر تھا میں نے دل میں سوچا اگر انکار کرتا ہوں تو ان کو تکلیف ہوگی۔ چنانچہ مولوی صاحب کو اٹھا کر صوفے پر بٹھایا اور چارپائی کے بستر جو رڑکا تھا اٹھا کر کھڑکی سے نیچے باغ میں پھینکا اور مولوی صاحب کو ہاتھوں پر

اٹھ کر گارڈن میں لے گیا خدا کی شان اس دن میں اور مولوی صاحب ایک ہی بستر پر لیٹے رہے۔ مولوی صاحب بڑے خوش تھے۔ سسٹر (SISTER) مسز لودھی کہنے لگیں کہ اگر کرنل صاحب آگئے تو مجھے نوکری سے ڈسچارج کر دیں گے میں نے ان سے کہا کہ آپ بے فکر رہیں آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ ۲۸ر جولائی کو پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تاج محمد خیالؔ تشریف لائے۔ میں نے مولوی صاحب سے عرض کیا کہ خیالؔ صاحب تشریف لائے ہیں ان کا حلیہ کچھ ایسا تھا کہ مولوی صاحب کہنے لگے یہ مرد ہیں یا عورت۔ خیالؔ صاحب نے ایک کاغذ پر لکھ کر مولوی صاحب کو دیا کہ مجھے ایک ادیب فاضل کی ضرورت ہے اگر آپ کی نظر میں ہو تو آپ ضرور بتائیں۔ اُسی روز شام کو کشمیر کے ممتاز لیڈر چودھری غلام عباس صاحب تشریف لائے۔ ان کے ساتھ بڑے اچھے موڈ میں باتیں کیں۔ ایک دفعہ حکیم صاحب نے مولوی صاحب سے کہا کرنل صاحب تشریف لائے ہیں۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کبھی یہاں تو چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب کرنل ہی کرنل ہیں نام تو لو۔ ایک دن راولپنڈی میں مجھ سے جھڑپ ہو گئی اسی دن بارش بھی زوروں پر تھی اور حکیم صاحب ہوٹل میں نہ جا سکے۔ میں تو کھانا کھا چکا تھا حکیم صاحب کی انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں سسٹر لودھی نے چائے اور گرم گرم سموسے بھیجے اس وقت حکیم صاحب کی ذرا سی آنکھ لگ گئی تھی میں نے سموسے چٹ کر کے چائے بھی پی لی تھوڑی دیر بعد جب حکیم صاحب اٹھے تو کہنے لگے ابھی تک کچھ نہیں آیا میں نے مذاق میں کہہ دیا کہ آج آپ روزہ رکھ لیں۔

راولپنڈی میں مولوی صاحب کی زبان بند ہو گئی تھی۔ میں نے مولوی صاحب کے ہاتھ میں چائے کا چمچ دینا شروع کر دیا تھا کہ جیسے آپ مجھے آواز دینا چاہیں چمچ گرا دیں تاکہ میں اٹھ جاؤں۔ ایک دن میں نے چمچ لے کر مولوی صاحب کے حلق میں ڈالا تو ایک سرخ سا لوتھڑا نکلا۔ میں ڈر گیا کہ یہ کیا نکل آیا میں نے ڈاکٹر صاحب کو بلا کر دکھایا وہ کہنے لگے یہ بلغم ہے جو جم گیا تھا۔ مولوی صاحب نے اس کے بعد کھل کر مجھ کو آواز دی اور کہا تم روزانہ میرے گلے کو صاف کر دیا کرو۔ راولپنڈی میں بھی مولوی صاحب کی طبیعت نہ سنبھل سکی چنانچہ مولوی صاحب کی خواہش پر ان کو کراچی کی پی۔ این۔ ایچ میں منتقل کر دیا گیا۔ کراچی سے جناب جمیل الدین عالیؔ جو مولوی صاحب کے دستِ راست تھے اور اردو کالج کے پرنسپل جناب کرنل عطأ الرحیم صاحب بذریعہ طیارہ راولپنڈی ان حضرات نے کراچی آنے کی تیاری مکمل کی۔ صدرِ پاکستان نے اپنے ایک خاص ڈاکٹر کو کراچی تک ساتھ کیا۔ راولپنڈی اسٹیشن پر مولوی صاحب کو سکریٹری صدرِ پاکستان قدرت اللہ شہاب صاحب نے الوداع کیا۔

جب بابائے اردو کراچی کینٹ اسٹیشن پر پہنچے تو بہت بڑے ہجوم نے مولوی صاحب کا استقبال کیا۔ ان میں قابلِ ذکر ہستیاں اردو کالج کے پرنسپل، خان بہادر حبیب اللہ خاں صاحب، مولوی صاحب کے بھائی۔ انجمن خواتین کی صدر بیگم شریف موجود تھیں۔ نیول ہسپتال کی ایمبولینس تیار تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں مولوی صاحب کو نیول ہسپتال پہنچا دیا گیا اس ہسپتال میں ڈاکٹر سید صاحب نے خلوص دل کے ساتھ مولوی صاحب کا علاج کیا۔

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تین چار دن تک طبیعت بڑی اچھی رہی۔ ۱۵ر اگست کی شام کو مجھ کو آواز دی پاس بلا کر پوچھا تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے میں نے کہا مولوی صاحب مجھ کو ۴۰ روپے اور کھانا ملتا ہے کہا مگر آج سے تم کو ساٹھ روپے

تنخواہ اور کھانا ملے گا۔ منگل کے دن مولوی صاحب کی زبان اچانک بند ہوگئی رات بھر حالت خراب رہی۔ میں نے سرہانے بیٹھ کر یٰسین پڑھنی شروع کی آخر کار بدھ کی صبح کو ۸ بجکر ۴۴ منٹ کے اوپر یہ محسن قوم بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

وفات کی خبر یک دم پورے ملک میں پھیل گئی۔ وفات کی خبر پاکر کراچی کے کمشنر مسٹر جی لے مدنی صاحب فوراً نیول ہسپتال پہنچے اور تمام انتظام خود کرایا۔ ان کی اپیل پر کراچی شہر میں مکمل ہڑتال رہی۔ تمام تعلیمی ادارے بند ہو گئے لوگ جوق در جوق اردو کالج کی طرف آنے لگے۔ مولوی صاحب کی میت کو جلوس کی شکل میں اردو کالج لایا گیا۔ مولوی صاحب کی میت کو میں نے خود نہلایا اور کفن پہنایا اس کے بعد جنازے کو کے، ایم، سی کے ہال میں لے گئے۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں بابائے اردو کا آخری دیدار کرتے آرہے تھے نماز جنازہ میں تقریباً ۱۰ ہزار افراد نے شرکت کی۔ میرے خیال میں آجتک کسی بادشاہ کا بھی اتنا بڑا جلوس نہیں نکلا جتنا کہ بابائے اردو کا تھا۔ شام کو ۶ بجے اردو کے بابا کو ان کی خواہش کے مطابق اردو کالج میں دفنایا گیا۔

میں اس موقع پر صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان صاحب کو صد مبارکباد پیش کرتا ہوں جنھوں نے اس اہل علم کی قدردانی کرکے خلیفہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کی عہد کی یاد تازہ کردی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے خان کو اپنے نیک مقصدوں میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

سیرت

علم محنت اور کوشش سے حاصل ہوتا ہے۔ عقل زندگی کے تجربوں سے آتی ہے۔ علم بغیر عقل کے کارآمد نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات نقصان رساں ہوتا ہے۔ سعدی نے سچ کہا ہے کہ "یک من علم رادہ من عقل می باید" اور عقل بغیر علم کے اکثر غلط راستے پر لے جاتی ہے علم اور عقل دونوں کے تعاون پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے لیکن ایک چیز اور ہے جو ان سے بھی برتر اور افضل ہے۔ وہ انسان کی سیرت (یعنی کیرکٹر) ہے اس میں کچھ فطرت کا عطیہ ہوتا ہے جو پیدائشی ہے کچھ ماحول اور تعلیم و تربیت کا اثر۔ جہاں یہ نہیں وہاں علم و عقل دونوں بیکار ہیں۔ (بابائے اردو)

نظامی کہن ہار جس یار ہوئے
سُنن ہار سُن نغز گفتار ہوتے

اُردو کی پہلی منظوم تصنیف جو ابتک غیر مطبوعہ تھی

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

مصنفہ

فخر الدین نظامی دکنی

اس مثنوی کا دنیا بھر میں صرف ایک نسخہ ہے جو انجمن
میں محفوظ ہے۔ اسی نسخہ کو فوٹو بلاک کے ذریعے
شائع کیا جا رہا ہے

اس مثنوی کی اشاعت سے اردو زبان وادب کی
تحقیق میں نئی راہیں کھل جائیں گی۔

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو ـــــ کراچی

مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان

قاموس الکتب :- کتابوں سے متعلق یہ کتاب انجمن کا عظیم الشان علمی کارنامہ ہے جو کئی جلدوں میں مکمل ہوگی۔
بابائے اردو
پہلی جلد شائع ہو چکی ہے جو مذہبی کتابوں سے متعلق ہے۔ اسلام اور دیگر مذاہب کے بارے میں جتنی بھی کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں، ان کی یہ مکمل فہرست ہے۔ تقریباً بارہ ہزار کتابوں کے متعلق تفصیلی معلومات دی گئی ہیں جو $\frac{20 \times 30}{8}$ سائز کے چودہ سو صفحات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ ۱۶۶ عنوانات کے تحت کتابوں کو تقسیم کیا گیا ہے اور آخر میں ۲۰۰ صفحات کا اشاریہ ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔ قیمت :- ۴۰ روپے

قدیم اُردو :- یہ کتاب بابائے اردو کے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو کے قدیم مصنفین اور کتب سے
بابائے اُردو
متعلق ہیں قدیم اردو کی ادبی اور لسانی خصوصیات کا اندازہ کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ پانچ روپے ۵۰ پیسے۔

مرحوم دہلی کالج :- مرحوم دہلی کالج کا شمار ہندو پاکستان کے اُن علمی اداروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے اس برصغیر میں
بابائے اردو
اشاعت علم کی خدمت صحیح معنوں میں انجام دی۔ دہلی کالج کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور تمام علوم و فنون کی تدریس اردو کے ذریعے ہوتی تھی۔ بابائے اردو نے اس کالج کی مکمل تاریخ اس کتاب میں بیان کی ہے قیمت ۴ روپے

نصرتی :- یہ کتاب ملک الشعرائے بیجاپور ملا نصرتی کے حالات زندگی اور جائزہ کلام پر مشتمل ہے۔
بابائے اُردو
اس میں بابائے اردو نے بڑی تحقیق و جستجو سے نصرتی کے حالات جمع کئے ہیں نیز نصرتی کے غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب مع شرح و حواشی شامل کیا ہے قیمت پانچ روپے

اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام :- اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام نے جو
بابائے اردو
قابل قدر حصہ لیا اور اسے اس قابل بنایا کہ آگے چل کر وہ ایک مہذب زبان کی حیثیت حاصل کرسکی، اس موضوع پر یہ ایک معلومات افزا مقالہ ہے جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنے خاص تحقیقی انداز میں سپرد قلم فرمایا ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۸۷ پیسے۔

سید احمد خاں ـ حالات و افکار :- ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی نشاۃ ثانیہ کے اولین معمار
بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم
سید احمد خاںؒ کی شخصیت اور علمی کارناموں کا جائزہ جس میں

بابائے اردو نے سرسید کے حالات اور افکار کے بعض پہلوؤں پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کو مولانا حالی کی "حیات جاوید" کا ضمیمہ سمجھنا چاہئیے۔ قیمت چار روپے۔

غالب فکر و فن:۔ مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری درجۂ استناد رکھتے ہیں
ڈاکٹر شوکت سبزواری
انہوں نے غالب کی شخصیت، اس کے ماحول اور فن کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو مقالات لکھے ہیں انہیں اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے قیمت ۵ روپے

تلخیص الاردو:۔ یہ انجمن کے مشہور علمی جریدے سہ ماہی "اردو" کے سی سالہ پرچوں کے بہترین مضامین کا انتخاب ہے۔ اس میں مشاہیر اہل قلم کے لکھے ہوئے گیارہ علمی و ادبی مقالات شامل ہیں۔

قیمت پانچ روپے پچاس پیسے۔

مقالات و خطبات گارساں دتاسی:۔ گارساں دتاسی نے اردو زبان کے مراکز سے بہت دور رہ کر ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو اردو کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ گارساں دتاسی کے مقالات و خطبات میں اردو زبان و ادب کے ایک خاص دور کی مکمل تاریخ ملتی ہے نئے ایڈیشن مشہور عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی نظر ثانی کے بعد شائع کئے گئے ہیں

قیمت	مقالات	حصہ اول دس روپے	حصہ دوم	زیر طبع
	خطبات	حصہ اول دس روپے	حصہ دوم	دس روپے

اردو تھیٹر:۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی (پرنسپل اورنٹیل کالج بمبئی) نے اردو ڈرامے کی مکمل تاریخ
ڈاکٹر عبدالعلیم نامی
مرتب کی ہے جس میں ڈراموں، ڈرامہ نگاروں، اداکاروں اور ڈرامہ کمپنیوں وغیرہ کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں یہ کتاب دراصل اردو ڈرامے کا ان سائیکلوپیڈیا ہے۔ تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ قیمت فی جلد سات روپے۔

سعادت یار خان رنگین:۔ یہ کتاب سعادت یار خان رنگین کے حالات زندگی اور جائزہ تصانیف
ڈاکٹر صابر علی خاں:۔
پر مشتمل ہے۔ فاضل مصنف کو اس تحقیقی کارنامے پر پنجاب یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کی تھی۔ قیمت پانچ روپے پچھتر پیسے

محمد حسین آزاد:۔ یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر مصنف کو کراچی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا
ڈاکٹر اسلم فرخی
کی ہے۔ فاضل مصنف نے اس میں مولانا آزاد کے حالات زندگی اور ان کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع کی گئی ہے قیمت جلد اول جلد دوم

جلال لکھنوی:۔ مصنف نے جلال لکھنوی کے سوانح حیات لکھے ہیں، ان کے کلام کی خصوصیات پر بحث کی ہے اور
ڈاکٹر محمد حسن

ان کے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ جلال لکھنوی داغ اور امیر مینائی کے ہم عصر تھے لکھنؤ کے بہت مقبول اور مشہور شعراء میں سے تھے۔ ان کے بارے میں یہ پہلی محققانہ کاوش ہے قیمت تین روپے

سرشار کی ناول نگاری :-
ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

رتن ناتھ سرشار اردو کے عظیم ناول نگار ہیں۔ ان کی حیات اور کارناموں پر گنتی کے چند مضامین لکھے گئے ہیں اور وہ بھی نہایت تشنہ۔ ڈاکٹر ادیب نے بڑی محنت سے اس کتاب میں سرشار کے حالات زندگی اور تصانیف پر روشنی ڈالی ہے اس تحقیقی مقالے پر مصنف کو الہ آباد یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند عطا کی تھی۔ قیمت چھ روپے پچاس پیسے۔

سودا :-
شیخ چاند مرحوم

اردو تنقید و تحقیق میں شیخ چاند کی ذات شعلۂ مستعجل کی حیثیت رکھتی ہے مرحوم نے بہت کم عرصے میں بعض ایسی تحریریں ہمارے ادب کو دیں جو علمی و ادبی اعتبار سے بہت بلند پایہ ہیں یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں مرزا رفیع السودا کے حالات زندگی اور کلام پر تفصیل سے لکھا گیا ہے یہ کتاب ایک عرصے سے نایاب تھی اب دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ قیمت چھ روپے

نیا ادب :-
پنڈت کشن پرشاد کول

آں جہانی پنڈت کول نے ۱۹۳۵ء کے بعد کے اردو ادب کے بارے میں جو مضامین وقتاً فوقتاً لکھے تھے، انہیں اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے فاضل مصنف نے جدید ادب کی نمایاں خصوصیات اور جدید ادیبوں کے ذہنی رجحانات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ قیمت چار روپے پچاس پیسے

آرٹ ان اردو پوئیٹری (انگریزی) :-
شہاب الدین رحمت اللہ

اس میں اردو زبان کی تاریخ اور شاعری کا ارتقاء اور شعراء کے منتخب اشعار کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ مولف مصور بھی ہیں اور انہوں نے بعض اشعار کو تصاویر کی صورت میں بھی ڈھالا ہے۔ کتاب بڑے سائز پر نہایت نفاست سے طبع کی گئی ہے

قیمت چھ روپے پچھتر پیسے۔

فن شاعری (بوطیقا) :-
ارسطو - عزیز احمد

ارسطو کے مشہور رسالے "بوطیقا" کا مستند ترجمہ مع حواشی شروع میں مترجم نے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں ارسطو کے نظریۂ شاعری پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

قیمت دو روپے پچاس پیسے

کاروان صحافت :-
ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

اس میں مصنف نے اردو صحافت کی تاریخ کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جس پر اب تک بہت کم لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختلف مقالات کا مجموعہ ہے، لیکن موضوع کی یکسانیت نے مستقل تصنیف کا درجہ عطا کرتی ہے۔ قیمت چار روپے

مقالات حالی (حصہ اول) :-
مولانا الطاف حسین حالی

مولانا الطاف حسین حالی مرحوم کے علمی، ادبی اور دینی مضامین جو مختلف اخباروں اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے تھے ایک

جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔ قیمت تین روپے

تذکرۂ گلِ رعنا:- لچھمی نرائن شفیق "چمنستان شعراء" کے مولف کی حیثیت سے دنیائے ادب میں بلند مقام
لچھمی نرائن شفیق
رکھتے ہیں "گلِ رعنا" ان کا دوسرا تذکرۂ شعراء ہے جس میں انہوں نے ہندو شعراء کے حالات زندگی اور انتخاب کلام جمع کر دیا ہے۔ قیمت دو روپے

غزل و مطالعہ غزل:- اس میں صنفِ غزل کی خصوصیات کا جائزہ اور اس کے فنی و تاریخی ارتقاء کی تفصیل
ڈاکٹر عبادت بریلوی
دی گئی ہے۔ قیمت دس روپے

اردو تنقید کا ارتقاء:- یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر لکھنؤ یونی ورسٹی نے فاضل مصنف کو پی ایچ ڈی
ڈاکٹر عبادت بریلوی
کی سند عطا کی تھی۔ اس میں اردو تنقید کے عہد بہ عہد ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے اور تمام اردو نقادوں کے ذہنی رجحانات پر بحث کی گئی ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا عالمانہ مقدمہ ہے جو بجائے خود علمی تنقید کی عمدہ مثال ہے۔ قیمت سات روپے، پچاس پیسے

روایت کی اہمیت:- یہ کتاب اردو ادب کی عظیم روایات کی آئینہ دار ہے اس میں ایسے پر مغز اور خیال افروز
ڈاکٹر عبادت بریلوی
مقالات شامل ہیں جن سے اردو ادب کے تاریخی مدوجزر کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے۔
قیمت سات روپے پچاس پیسے

خطبات عبدالحق:- یہ بابائے اردو کی صدارتی تقریروں اور لیکچروں کا مکمل مجموعہ ہے جن میں اردو
بابائے اردو
زبان و ادب کے مختلف مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا پیش لفظ ہے۔ قیمت دس روپے

سب رس:- یہ کتاب سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی
مُلّا وجہی
کی تصنیف ہے۔ اردو نثر کی یہ نایاب اور قدیم کتاب بہت تلاش اور جستجو کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا محققانہ مقدمہ اور آخر میں فرہنگ الفاظ بھی شامل ہے۔ قیمت چھ روپے

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی:- یہ ایک دلچسپ کہانی ہے جسے انشاء اللہ خاں نے
میر انشاء اللہ خاں انشاء دہلوی
ایک خاص پیرائے میں اس طرح لکھا ہے کہ عربی اور فارسی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا۔ بابائے اردو نے اسے مرتب کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

مضامین سلیم:- مولانا سلیم کے وہ تمام علمی ادبی اور مذہبی مضامین جو مختلف علمی و ادبی جرائد میں
مولوی وحید الدین سلیم
شائع ہوئے تھے اور اب تک کتابی شکل میں منظر عام پر نہیں آئے تھے، انہیں مولوی

محمد اسمٰعیل پانی پتی نے تین جلدوں میں مرتب کر دیا ہے۔ مکمل سیٹ کی قیمت بارہ روپے پچاس پیسے۔

مضامین محفوظ علی :- اردو کے مشہور مزاح نگار سید محفوظ علی بدایونی مرحوم کے مضامین جو ہمدرد... (دہلی) الناظر وغیرہ میں شائع ہوئے تھے۔ انہیں پہلی بار کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ مصنف کی شخصیت اور فن کے بارے میں بابائے اردو کا مفصل مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت
سید محفوظ علی

خیالاتِ عزیز :- یہ مولوی عزیز مرزا مرحوم (سابق معتمد انجمن ترقی اردو ہند) کے علمی، ادبی، لسانی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ایک عرصے سے نایاب تھی۔ انجمن نے اب اسے نہایت آب و تاب سے شائع کیا ہے قیمت چار روپے پچاس پیسے
عزیز مرزا

رومیو جولیٹ :- شیکسپیئر کے اس شہرۂ آفاق ڈرامے کو اردو کے بلند پایہ نقاد، ناول نگار اور مترجم عزیز احمد نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ منظوم ہے۔ ابتدا میں ۷۰ صفحات کا دیباچہ ہے جس میں مترجم نے شیکسپیئر کے حالات زندگی، اس کی ڈرامہ نگاری اور رومیو جولیٹ کی ادبی و فنی خصوصیات پر مفصل بحث کی ہے۔ قیمت پانچ روپے
شیکسپیئر۔ عزیز احمد

فاؤسٹ :- "فاؤسٹ" کو عالمی ادب میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ محتاج تعارف نہیں — اس سے پہلے انجمن اس کا منثور ترجمہ شائع کر چکی ہے باقیؔ مرحوم نے منظوم ترجمہ کیا ہے اور اصل کی فنی و ادبی خوبیوں کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے قیمت چار روپے پچاس پیسے
گوئٹے۔ عبد القیوم باقی

نصاب اردو (نثر) اردو کے نثری سرمائے کے اس انتخاب میں ایسی تحریروں کو ایک جا کر دیا گیا ہے جو ہمارے ادب میں مستقل مقام رکھتی ہیں قیمت تین روپے

مثنوی قطب و مشتری :- یہ مثنوی ۱۰۱۸ھ م ۱۶۱۹ء کی تصنیف ہے اور قدیم دکنی اردو کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا محققانہ مقدمہ آخر میں ضمیمہ اور فرہنگ الفاظ بھی شامل ہے۔ قیمت تین روپے ۷۵ پیسے
ملا وجہی

مثنوی گلشن عشق :- ملک الشعرائے بیجاپور ملا نصرتی کی اس معرکہ آرا مثنوی کو بابائے اردو مرحوم نے مرتب کیا ہے۔ شروع میں مقدمہ اور آخر میں فرہنگ الفاظ بھی شامل ہے۔ قیمت چار روپے پچاس پیسے
ملا نصرتی

مثنوی من لگن :- یہ قاضی محمود بحری کی مشہور دکنی مثنوی ہے جسے سخاوت مرزا صاحب نے مرتب کیا ہے۔ مع مقدمہ و فرہنگ۔ تین روپے
قاضی محمود بحری

مثنوی پھول بن :- یہ ایک عشقیہ دکنی مثنوی ہے جو ابن نشاطی جیسے عظیم شاعر کی جودت طبع کا نتیجہ ہے
ابن نشاطی

شیخ چاند ابن حسین نے اسے مرتب کیا ہے مع مقدمہ و فرہنگ ۔ قیمت چار روپے ۔

انتخابِ جدید :۔ اس مجموعہ میں عہد حاضر کے پچاس سے زائد شعرا کے کلام کا انتخاب شامل ہے
عزیز احمد ۔ آل احمد سرور
اردو شاعری کے جدید ترین رجحانات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے ۔ قیمت تین روپے ، پچاس پیسے

نصابِ اردو نظم اردو کے شعری سرمائے کے اس انتخاب میں ایسی منظومات کو یک جا کر دیا گیا ہے جو ہمارے ادب میں مستقل مقام رکھتی ہیں ۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

دیوانِ وصف :۔ ایک گمنام مگر نغز گو شاعر کا دیوان ہے ۔ سوز و گداز اور انداز بیان کے اعتبار
مولوی عبد الحی وصف
سے وصف کا کلام ممتاز مقام رکھتا ہے ۔ قیمت ایک روپیہ ، پچاس پیسے

اسٹنڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری :۔ یہ ڈکشنری جو کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری کا
بابائے اردو
ترجمہ ہے آج سے ستائیس سال پہلے بابائے اردو نے متحدہ ہندوستان کے منتخب اہل علم کی ایک جماعت کے تعاون سے مرتب کی تھی اس سے بہتر انگریزی اردو ڈکشنری ہماری زبان میں موجود نہیں ہے ۔ اب انجمن اسے دوبارہ شائع کر رہی ہے ۔ دوسرے ایڈیشن کی نظر ثانی کا کام ہو رہا ہے ، اس کی طباعت کے لئے اعلیٰ درجے کا بائیبل پیپر منگوایا گیا ہے ۔

اسٹوڈنٹس انگریزی اردو ڈکشنری :۔ یہ ڈکشنری اسٹینڈرڈ ڈکشنری کا خلاصہ ہے ،
بابائے اردو
اس میں سے وہ الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں ، جو مخصوص علوم و فنون سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے عام لوگوں کو واسطہ نہیں پڑتا ۔

قیمت عام ایڈیشن ۔ کرنافلی سفید کاغذ ۱۵ روپے قیمت خاص ایڈیشن ۔ بائیسبل پیپر ۲۱ روپے

پاپولر انگریزی اردو ڈکشنری :۔ کالج اور مدارس کے عام طالب علموں نیز عام پڑھنے والوں کے لئے
بابائے اردو
خاص طور پر یہ ڈکشنری تیار کی گئی ہے جو مذکورہ دونوں ڈکشنریوں سے مختصر بھی ہے اور کم قیمت بھی ۔ قیمت پانچ روپے ، پچاس پیسے

داستانِ زبانِ اردو :۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کے لسانی مسائل پر کئی گراں قدر مقالے
ڈاکٹر شوکت سبزواری
اور کتابیں لکھ چکے ہیں "داستان زبان اردو" ان کا تازہ ترین علمی کارنامہ ہے جس میں انہوں نے اردو زبان کے لسانی سرمائے ، مختلف نظریوں ، مولد و منشاء ، صرفی نحوی نشو و نما ، مزاج و منہاج اور ارتقاء کے مدارج پر سیر حاصل بحث کی ہے ۔ اردو زبان کے بارے میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے ۔ قیمت پانچ روپے

اشاریۂ عبدالحق

مرتبہ

ابن حسن قیصر

زاہدہ خاتون

انجمن ترقی اردو (پاکستان)
اردو روڈ کراچی

بابائے اردو کی تصنیفی زندگی کم و بیش پچھتر برس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس عرصے میں انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ ان کی تصنیفات، مرتبات اور تالیفات اور تراجم کی فہرست بہت طویل ہے۔ نیز اُن کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اس کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ زیرِ نظر اشاریئے کی ترتیب کے لئے ایک تو وقت کم ملا نیز بہت سے رسائل تک رسائی نہ ہوسکی بہر حال جس حد تک اس کام کی تکمیل ہوسکی اسے شائع کیا جا رہا ہے یہ کام ابھی جاری ہے اور توقع ہے کہ اس فہرست کی دوسری اشاعت ہر اعتبار سے مکمل ہوگی۔ جناب ابن حسن قیصر اور محترمہ زاہدہ خاتون ہمارے خاص شکریئے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بہت کم وقت میں اس کام کو انجام دیا۔ اشرف علی صاحب اور اقبال صاحب نے بھی اس فہرست کی تیاری میں مدد کی ہے۔ اس کے لئے ادارہ ان دونوں حضرات کا ممنون ہے۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اگر ان کو کسی کتاب یا مضمون کا حوالہ اس فہرست میں نہ ملے تو براہ کرم اس سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کو شامل کرلیا جائے۔

تصانیف بابائے اُردو -

قواعدِ اُردو بارِ سوم اورنگ آباد دکن انجمن ترقی اردو، سنہ ۱۹۳۶ء ص ۳۲۴

اردو صرف و نحو - میٹریکولیشن کی جماعتوں کے لئے اورنگ آباد دکن انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۳۴ء ص ۱۴۸

اُردو زبان میں اصطلاحات کا مسئلہ - کراچی انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۴۹ء ص ۵۵

اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ - طبع سوم کراچی انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۵۳ء ص ۸۴

قدیم اُردو - کراچی، انجمن ترقی اردو، سنہ ۱۹۶۱ء ص ۲۵۵

سر آغا خاں کی اردو نوازی - کراچی انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۵۱ء ص ۲۰

نصرتی، ملک الشعرائے بیجاپور کے حالات اور کلام پر تبصرہ نئی دہلی، انجمن ترقی اردو - سنہ ۱۹۴۴ء ص ۳۳۷

مرحوم دہلی کالج - دوسرا ایڈیشن - دہلی، انجمن ترقی اُردو سنہ ۱۹۴۵ء ص ۱۷۴

مرحوم دہلی کالج - اشاعت سوم کراچی، انجمن ترقی اُردو سنہ ۱۹۶۲ء ص ۱۸۲

سرسید احمد خاں حالات و افکار - کراچی، انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۵۹ء ص ۱۹۶۔

تنقیدات عبدالحق - دہلی انجمن ترقی اُردو سنہ ۱۹۳۹ء ص ۸۰

باز، محمد تراب علی خاں (جامع)

تنقیداتِ عبدالحق لاہور، ایسٹرن بک اسٹال، لاہور سنہ ۱۹۴۵ء ص ۱۵۲

مندرجات :-

دیوانِ ولی	ص ۵ - ۸
مکاتیب نواب محسن الملک و وقار الملک	ص ۹ - ۱۱
سرگزشتِ الفاظ	ص ۱۲ - ۱۵
شرح دیوان غالب	ص ۱۶ - ۲۰
تذکرہ اعجاز سخن	ص ۲۱ - ۳۵
تلخیص عروض و قافیہ	ص ۳۶ - ۴۰
زبان اردو پر سرسری نظر	ص ۴۱ - ۴۶
خطوط سرسید	ص ۴۶ - ۵۰
بانگ درا	ص ۵۰ - ۶۹
مکاتیب امیر مینائی	ص ۶۹ - ۷۴
شعر الہند	ص ۷۴ - ۸۴
روح تنقید	ص ۸۴ - ۸۷
اصلاحِ سخن	ص ۸۸ - ۹۲
اردو شہ پارے	ص ۹۲ - ۹۷
گنجینۂ تحقیق	ص ۹۷ - ۱۰۱

ارباب نثر اردو ص ۱۰۱ – ۱۰۳
اکبر الٰہ آبادی ص ۱۰۳ – ۱۰۷
پنجاب میں اردو ص ۱۰۷ – ۱۱۵
فیضان شوق ص ۱۱۵ – ۱۳۱
اردو لٹریچر ص ۱۳۱ – ۱۴۰
نور اللغات ص ۱۴۰ – ۱۴۴
جامع اللغات اردو ص ۱۴۴ – ۱۴۷
مجموعہ نغز ص ۱۴۷ – ۱۵۲

ادبی تبصرے – لکھنؤ، دانش محل ۱۹۴۷ء ص ۸۸

مندرجات :-

روح ادب، شبیر حسن خاں جوش کے نثر و نظم کا مجموعہ ص ۱-۳
مرہٹی دناں کوش یعنی مرہٹی انسائیکلوپیڈیا ص ۴-۱۷
رسائل عماد الملک (سید حسین بلگرامی) ص ۱۸-۲۶
روح سیاست مترجمہ محمد عمر و نور الٰہی (ڈراما) ص ۲۷-۳۲
حزن اختر، واجد علی شاہ کی مثنوی ص ۳۳-۳۵
جواہرات حالی - حالی کا وہ کلام جو کبھی کسی اخبار
یا رسالے میں چھپا اور پھر شائع نہیں ہوا ص ۳۶-۴۰
افادات مہدی ص ۴۱-۴۲
انجام زندگی، مصنفہ ضیا بانو (افسانہ) ص ۴۳-۴۷
دیوان جان صاحب ص ۴۸-۵۰
ناٹک ساگر یعنی دنیائے ڈراما کی تاریخ
مرتبہ نور الٰہی و محمد عمر ص ۵۱-۵۳
ہند عہد اورنگ زیب میں - از مرزا یار جنگ بہادر
(مرزا سمیع اللہ بیگ) ص ۵۴-۶۲
مکتوبات حالی مرتبہ خواجہ سجاد حسین ص ۶۳-۷۷

الناظر کا انعامی مضمون ص ۷۸-۸۳
ماورا مجموعہ نظم ن، م، راشد ص ۸۴-۸۷
آیات و نغمات جوش کا مجموعہ نظم ص ۸۸

مقدمات عبدالحق حصہ اول مرتبہ مرزا محمد بیگ حیدر آباد (دکن):
مکتبہ ابراہیمیہ - ۱۹۳۱ء ص ۴۰۹

مندرجات :-

مقدمہ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام ص ۱۷-۳۶
مقدمہ تحقیق الجہاد ص ۳۷-۴۵
مقدمہ معراج العاشقین ص ۴۶-۵۲
مقدمہ معرکۂ مذہب و سائنس ص ۵۳-۱۵۶
مقدمہ مبادی سائنس ص ۱۵۷-۱۶۲
مقدمہ مشاہیر یونان و روما ص ۱۶۳-۱۷۲
مقدمہ جنگ روس و جاپان ص ۱۷۳-۱۹۲
مقدمہ حیات النذیر ص ۱۹۳-۲۱۰
مقدمہ تذکرہ گلشن ہند ص ۲۱۱-۲۴۸
مقدمہ مآثر الکرام ص ۲۴۹-۲۶۶
مقدمہ تذکرہ مخزن نکات ص ۲۶۷-۲۹۶
مقدمہ تذکرہ چمنستان شعراء ص ۲۹۷-۳۲۰
مقدمہ ذکر میر ص ۳۲۱-۳۴۶
مقدمہ تمدن ہند ص ۳۴۷-۴۰۹

مقدمات عبدالحق حصہ دوم، مرتبہ محمد بیگ
حیدر آباد دکن، انجمن ترقی اردو۔
۱۹۳۱ء ص ۲۱۲

مندرجات:۔

مقدمہ انتخاب کلام میر — ص ۱ - ۴۸
مقدمہ مسدس حالی — ص ۴۹ - ۶۲
مقدمہ دیوان اثر — ص ۶۳ - ۶۸
مقدمہ مثنوی خواب و خیال — ص ۶۹ - ۹۰
مقدمہ سی پارۂ دل — ص ۹۱ - ۹۶
مقدمہ خطوط عطیہ بیگم — ص ۹۷ - ۱۱۶
مقدمہ باغ و بہار — ص ۱۱۷ - ۱۴۱
مقدمہ بر قواعد اردو — ص ۱۴۲ - ۱۶۷
مقدمہ دریائے لطافت — ص ۱۶۸ - ۱۷۹
مقدمہ فرہنگ اصطلاحات علمیہ — ص ۱۸۰ - ۱۹۴
مقدمہ تجرد و ازدواج — ص ۱۹۵ - ۲۰۰
مقدمہ مطبوعات دارالترجمہ عثمانیہ — ص ۲۰۱ - ۲۱۲

خطبات عبدالحق دو جلد دہلی انجمن ترقی اردو ۱۹۳۹ء ۱۹۴۴ء

ص ۱۷۲ + ۱۹۰

مندرجات جلد اول:۔

خطبہ صدارت انڈین اورنٹیل کانفرنس بڑودہ دسمبر ۱۹۳۳ء
ص ۱ - ۲۷
خطبۂ صدارت شعبۂ اردو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۲ر جنوری ۱۹۳۶ء
ص ۲۸ - ۴۲
اردو کا حال اور مستقبل۔ خطبۂ صدارت جو انجمن حمایت اسلام کے اکیاونویں سالانہ اجلاس میں بحیثیت صدر شعبہ اردو۔ ۱۲ر اپریل ۱۹۳۶ء کو پڑھ کر سنایا گیا۔
ص ۴۳ - ۶۰
خطبۂ صدارت انجمن ترقی پسند مصنفین ہند لکھنؤ۔ اپریل ۱۹۳۶ء
ص ۶۱ - ۷۲
(ترقی پسند ادیبوں کا پہلا جلسہ ماہ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں ہوا تھا۔ شعبۂ اردو کی صدارت کے لئے انھوں نے مولانا عبدالحق صاحب کو طلب کیا تھا۔ مولانا جانے کے لئے تیار تھے لیکن عین وقت پر ایک ناگزیر وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ یہ خطبہ مولانا نے اس جلسے کے لئے تحریر کیا تھا)
خطبۂ صدارت بہار اردو کانفرنس ۱۹۳۶ء ص ۷۳ - ۸۸
خطبۂ صدارت آل انڈیا اردو کانفرنس علی گڑھ ۲۸ر اپریل ۱۹۳۶ء
ص ۸۹ - ۱۲۱
خطبۂ صدارت سندھ پراونشل اردو کانفرنس۔ کراچی۔
۳۱ر دسمبر ۱۹۳۷ء ص ۱۲۲ - ۱۳۹
تقریر صدارت اردو کانفرنس صوبۂ متوسط ناگپور ۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۸ء
ص ۱۴۰ - ۱۴۸
تقریر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ دسمبر ۱۹۳۸ء ص ۱۴۱ - ۱۶۴
ہندوستانی کیا ہے؟ تقریر جو ۲۱ر فروری ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر کی گئی ص ۱۶۴ - ۱۷۲

مندرجات حصۂ دوم:۔

خطبۂ صدارت اردو کانفرنس ناگ پور ۔۴ر مارچ ۱۹۴۰ء ص ۱ - ۲۰
خطبۂ صدارت شعبۂ صحافت اورنٹل کانفرنس ترپتی (جنوبی ہند)
۲۴ر مارچ ۱۹۴۰ء ص ۲۱ - ۵۰
خطبۂ صدارت اردو کانفرنس لاہور ۸ر دسمبر ۱۹۴۰ء ص ۵۱ - ۶۳
خطبۂ صدارت اردو کانفرنس گوالیار ۲۷ر جنوری ۱۹۴۱ء ص ۶۴ - ۷۳
خطبۂ صدارت کل پنجاب اردو کانفرنس لائل پور ۲۳ر فروری ۱۹۴۱ء
ص ۷۴ - ۸۱

خطبۂ صدارت (یوم اردو) انجمن حمایت اسلام لاہور
۲ راپریل ۱۹۴۱ء ص ۸۲-۹۵
خطبۂ صدارت شعبۂ اردو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
علی گڑھ ۴ رفروری ۱۹۴۳ء ص ۹۶-۱۲۴
خطبہ صدارت شمالی بنگال اردو کانفرنس دیناج پور
۷ رمارچ ۱۹۴۳ء ص ۱۳۴-۱۴۴
خطبۂ صدارت اردو کانفرنس کالی کٹ (ملیبار) ۷ رنومبر ۱۹۴۳ء
ص ۱۴۵-۱۵۸
مخلوط زبان مقالہ جو انجمن روح ادب الہ آباد کے اجلاس منعقدہ
۱۲ ردسمبر ۱۹۴۲ء میں پڑھا گیا۔ ص ۱۵۹-۱۷۰
ہندی اردو جھگڑا۔ یہ مضمون ایڈیٹر دشال بھارت کی فرمائش
پر لکھا گیا۔ مطبوعہ ہماری زبان ۱۶ رجولائی ۱۹۴۱ء
ص ۱۷۱-۱۷۹
حامیانِ اردو ص ۱۸۰-۱۸۵
تقریر سندھ پراونشل اردو کانفرنس منعقدہ ۱۰ راپریل ۱۹۴۴ء
کی افتتاحی تقریر ص ۱۸۶-۱۹۰

خطبۂ صدارت سالانہ جلسہ بلوچستان ٹیچرز ایسوسی ایشن
۲۶ رجولائی ۱۹۴۶ء ص ۳۸۵-۴۰۳
خطبۂ صدارت مجلس ادب لاہور ۱۹۴۹ء ص ۴۰۴-۴۲۱
خطبۂ صدارت خیرپور اردو کانفرنس ۴ رفروری ۱۹۵۱ء
ص ۴۲۲-۴۳۲
خطبۂ صدارت کانفرنس انجمن ترقی پسند مصنفین
۱۲ رجولائی ۱۹۵۲ء ص ۴۳۳-۴۳۹
تقریر سندھ پراونشل اردو کانفرنس منعقدہ ۱۸ راپریل ۱۹۴۴ء
ص ۴۹۳-۴۹۷
تقریر اردو کانفرنس کراچی مئی ۱۹۵۱ء ص ۴۹۸-۵۲۲
آسان اردو تقریر نشر گاہ حیدرآباد دکن ۱۹۴۶ء
ص ۵۲۳-۵۳۱
ملک کے لئے نئے دور میں اردو کا مقام۔ تقریر نشر گاہ
اورنگ آباد (دکن) ۱۹۴۷ء ص ۵۳۲-۵۳۹
حالی اور انسانیت۔ مضمون جو یوم حالی منعقدہ انجمن
ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۱ء میں پڑھا گیا۔ ص ۵۴۰-۵۵۳

خطبات عبدالحق مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ کراچی انجمن
ترقی اردو ۱۹۵۲ء ص ۵۵۳

اضافہ:-

خطبۂ صدارت اردو کانفرنس بمبئی ۱۹۴۵ء ص ۳۱۷-۳۳۳
خطبۂ صدارت پنجاب یونی ورسٹی اردو کانفرنس لاہور۔
۲۶-۲۷ رمارچ ۱۹۴۷ء ص ۳۳۴-۳۶۰
خطبۂ صدارت کل گجرات اردو کانفرنس احمد آباد۔
۳ راپریل ۱۹۴۹ء ص ۳۶۱-۳۸۴

امامی، محمد امام (مرتب)
مکتوبات بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق بنام حکیم
محمد امام امامی۔ کراچی۔ اردو اکیڈمی سندھ۔ ۱۹۶۰ء
ص ۲۰۸

عبدالحق جوبلی کمیٹی، کراچی
اردو دے مصفی۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق بابائے اردو
مدظلہم کے خطوط کا مجموعہ لاہور سید ابو تمیم فریدآبادی
۱۹۶۱ء ص ۶۴۴

جلیل قدوائی (مرتب)

مکتوبات عبدالحق - بابائے اردو کے ادبی و علمی خطوط کا مجموعہ
کراچی، مکتبۂ اسلوب، سنہ ۱۹۶۳ء ص ۴۷۸

اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم سائنس کراچی، انجمن ترقی اردو
سنہ ۱۹۵۹ء ص ۷۴

پاکستان میں اردو کا المیہ - کراچی، انجمن ترقی اردو،
سنہ ۱۹۵ ص ۸۶

کل پاکستان انجمن ترقی اردو کا المیہ - کراچی - انجمن ترقی اردو
سنہ ۱۹۵۹ء ص ۸۶

اردو یونی ورسٹی، وقت کا اہم تقاضا - کراچی - انجمن ترقی اردو
سنہ ۱۹۶۰ء ص ۳۲

بچوں کے خطوط دو جلدوں میں حیدرآباد (دکن)
عبدالحق اکیڈمی سنہ ۱۹۴۴ء جلد اول ص ۴۴
جلد دوم ص ۷۰

مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر - اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو
سنہ ۱۹۳۳ء ص ۱۲۳

چند ہم عصر طبع سوم - کراچی - انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۵۲ء ص ۲۸۳
" " طبع چہارم سنہ ۱۹۵۳ء ص ۳۱۷

اضافے :-

ڈاکٹر محمد اقبال
مولانا حسرت موہانی
عبدالرحمن صدیقی
درویش پروفیسر - ری ہٹ سک
عبدالرحمن بجنوری

چند ہم عصر طبع پنجم کراچی انجمن ترقی اردو سنہ ص ۳۵۲

اضافہ

نواب عماد الملک

Memorandum on Scientific terminology in Urdu Karachi Anjuman Taraqqie Urdu 19.. Page: 24

مندرجہ ذیل کتابیں بابائے اردو نے مرتب کیں

انشاء، انشاء اللہ خاں

دریائے لطافت مترجمہ برجموہن دتاتریہ کیفی
اورنگ آباد، دکن انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۳۵ء ص ۳۹۵

تمنا اورنگ آبادی، اسد علی

گل عجائب یعنی تذکرۂ شاعران - اورنگ آباد،
انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۳۶ء ص ۱۱۶

شفیق اورنگ آبادی، لچھمی نرائن

چمنستان شعرا (یعنی اردو شعرا کا تذکرہ) اورنگ آباد
انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۲۸ء ص ۵۶۵

فائق، نورالدین حسین خاں رضوی

مخزن شعرا یعنی تذکرۂ شعرائے گجرات - اورنگ آباد
انجمن ترقی اردو، سنہ ۱۹۳۳ء ص ۱۲۰

فتح علی حسینی گردیزی - سید

تذکرۂ ریختہ گویاں اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو
سنہ ۱۹۳۳ء ص ۱۶۸

قائم چاندپوری، محمد قیام الدین -

مخزن نکات یعنی تذکرۂ شعرائے اردو - اورنگ آباد،
انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۲۹ء ص ۷۹

مصحفی، غلام ہمدانی
تذکرۂ ہندی۔ اورنگ آباد انجمن ترقی اردو ۱۹۳۳ء ص ۲۸۳

مصحفی، غلام ہمدانی
ریاض الفصحا (تذکرہ ہندی گویاں) اورنگ آباد۔ انجمن ترقی
اردو ۱۹۳۴ء ص ۳۷۸

مصحفی، غلام ہمدانی
عقد ثریا (تذکرہ فارسی گویاں) اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو
۱۹۳۴ء ص ۶۴

میر، میر تقی
نکات الشعرا طبع ثانی اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو۔
۱۹۳۵ء ص ۱۸۹

ملا وجہی
قطب مشتری طبع ثانی۔ کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۵۳ء
ص ۹۶ + ۲۲

نصرتی
گلشن عشق کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۵۲ء ص ۲۲۳

تاباں دہلوی، عبدالحئی
دیوان تاباں اورنگ آباد۔ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۵ء ص ۲۷۶

میر، میر تقی
انتخاب کلام میر چھٹا ایڈیشن کراچی، انجمن ترقی اردو۔
۱۹۵۰ء ص ۲۵۸

اثر، محمد میر
خواب و خیال بار دوم کراچی انجمن ترقی اردو ۱۹۵۰ء
ص ۱۶۷

داغ۔ نواب مرزا خاں
انتخاب داغ۔ دہلی انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۶ء ص ۱۲۶

انشاء، انشاء اللہ خاں
کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی طبع ثانی کراچی
انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء ص ۶۵

ملا وجہی
سب رس یعنی قصہ حسن و دل طبع دوم کراچی۔ انجمن ترقی
اردو ۱۹۵۲ء ص ۲۷۶

میر امن دہلوی
باغ و بہار یعنی قصہ چہار درویش دوسرا ایڈیشن دہلی
انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۴ء ص ۲۲۷

نصاب اردو امتحان انٹرمیڈیٹ مدراس یونی ورسٹی کے لئے
دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۰ء ص ۳۲۲

میر، میر تقی
ذکر میر (یعنی حضرت میر تقی میر کی خود نوشت سوانح عمری)
اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو۔ ۱۹۲۸ء۔ ص ۱۵۲

POPULAR ENGLISH URDU DICTIONARY.
KARACHI. Anjuman Taraqqie
Urdu. 1957 P. 663.

Standard English Urdu
Dictionary. Anjuman Taraqqie
Urdu 1937. P. 1513+13+12

Students Standard English
Urdu Dictionary. Karachi

اردو زبان کی فضیلت۔ چند بنگالی اکابر کی نظر میں۔ کراچی۔ انجمن
ترقی اردو ۱۹۵ء ص ۱۲۶

مضامین بابائے اردو :-

— حامیانِ اردو
زبانیں کہاں سے آئیں اور کیسے بنیں ،
ہماری زبان - دہلی - ص ۲-۷
۱۴ - اپریل ۱۹۴۴ء

— اردو کیا ہے؟
ہماری زبان - ص - ۷ - ۸ - ۱۶ اپریل ۱۹۳۹ء

اردو میں دخیل الفاظ
اردو - کراچی - ص - ۵ - ۲۷ - جولائی ۱۹۴۹ء

اردو میں دخیل الفاظ
ص ۲۷۶ - ۳۰۵

ہاشمی فرید آبادی — تلخیص الاردو - کراچی انجمن ترقی اردو ۱۹۵۳ء

رسم الخط کا مسئلہ
قومی زبان - یکم مارچ تا یکم جون ۱۹۶۱ء
ص - ۳ - ۶

— جدید اردو لغت
اردو - کراچی - ص - ۱ - ۴۲ - جنوری اپریل ۱۹۵۹ء

اردو لغات اور لغت نویسی
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
ص - ۱ - ۲۲ - جنوری ۱۹۳۱ء

— سرسید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ اردو کی لغات کا نمونہ .
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص - ۶۲۵ - ۶۳۸ - اکتوبر ۱۹۳۵ء

— اردو میں علمی اصطلاحات
اردو - دہلی - ص - ۱ - ۲۸ - جنوری ۱۹۴۵ء

— اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ
قومی زبان - کراچی
ص - ۹ - ۱۳ - ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۹ء
ص - ۷ - ۹ - یکم نومبر ۱۹۴۹ء

— موجودہ سیاست اور اردو زبان
ہندی اردو جھگڑے کی ابتدا
ہماری زبان دہلی - ص - ۷ - ۱۰
یکم جون ۱۹۳۹ء

— جائزہ زبان اردو
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص - ۱۴۰ - ۱۵۱ - جنوری ۱۹۲۹ء

— ۱۹۴۰ء کی مردم شماری اور اردو
ہماری زبان دہلی - ص - ۸
۱۶ اگست ۱۹۳۹ء

— ہندوستان میں اردو کی حیثیت
ہماری زبان دہلی - ص - ۷ - ۱۰
۱۶ جون ۱۹۳۹ء

— جنوبی ہند میں اردو کی اشاعت
ہماری زبان دہلی - ص - ۹ - ۱۰
۱۶ اگست ۱۹۴۰ء

— کشمیر کے مدارس میں آسان اردو
ہماری زبان دہلی - ص - ۳ - ۴
۱۶ جون ۱۹۴۴ء

— اردو پاکستان کی تو کیا بین الاقوامی زبان

ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے ......
ہز ہائی نس سر آغا خاں کو بابائے اردو کا جواب
قومی زبان کراچی۔ ص ۲-۶ ۔ یکم مارچ ۱۹۵۱ء

— اُردو (عوامی زبان کی حیثیت سے)
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۵۔ ۶-۱۶ اپریل ۱۹۵۲ء
عورتوں کی زبان
اردو کراچی۔ ص ۵-۱۷۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء

— اہل یورپ نے اردو زبان کی کیا خدمت کی نمبر ۱
اردو۔ اورنگ آباد۔ ص۔ ۱-۱۷
جنوری ۱۹۲۴ء

— اہل یورپ نے اردو زبان کی کیا خدمت کی؟ نمبر ۲
انگریزوں کی سعی (فورٹ ولیم کالج کلکتہ
اردو۔ اورنگ آباد۔ ص۔ ۴۸۵-۵۰۰
جولائی ۱۹۲۴ء

— ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزی راج میں اردو
برگ گل ایوب نمبر۔ ص۔ ۱۰۲۹-۱۰۴۹
۱۹۶۰ء

— اردو ہماری تہذیب کی ایسی یادگار ہے
جسے زمانہ کبھی نہیں بھلا سکتا۔
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۷-۹
۱۶ فروری ۱۹۵۱ء

— غیر زبانوں کی قدیم و جدید اعلیٰ ادبی
تصانیف کے ترجمے
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن)
ص۔ ۲۹۵-۳۰۷۔ جولائی ۱۹۳۶ء

— ۱۲۶۱ھ کے مشاعرے کی تصویر
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن)
ص۔ ۱۔ جنوری ۱۹۲۸ء

— سر سید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۳۔ ۲۵۔ جنوری ۱۹۳۶ء

— سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۵۴۴-۵۵۸۔ جولائی ۱۹۳۵ء

— مرحوم دہلی کالج
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۱-۲۷۔ جنوری ۱۹۳۳ء

— مرحوم دہلی کالج
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۲۴۳-۲۸۵۔ اپریل ۱۹۳۳ء

— مرحوم دہلی کالج
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۴۶۱-۴۸۶۔ جولائی ۱۹۳۳ء

— مرحوم دہلی کالج
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۶۱۳-۶۴۱۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء

— کلکتہ یونیورسٹی کمیشن اور دیسی زبانوں کی تعلیم۔
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۲۶۷-۲۸۸۔ اپریل ۱۹۲۳ء

کلکتہ یونیورسٹی کمیشن اور دیسی زبانوں کی تعلیم
اردو ۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۴۲۱ ۔ ۴۵۴ ۔ جولائی سنہ ۱۹۲۲ء

— قدیم اردو — بیجاپور کے اولیا اللہ کا ایک شاعر خاندان —
حضرت میران جی شمس العشاق اور انکی تصانیف
اردو ۔ اورنگ آباد ۔ (دکن)
ص ۔ ۱۷۱ ۔ ۱۹۰ ۔ اپریل سنہ ۱۹۲۷ء

— قدیم اردو — بیجاپور کے اولیا اللہ کا ایک شاعر خاندان (۲) — حضرت شاہ برہان الدین جانم
اردو ۔ اورنگ آباد ۔ (دکن)
ص ۔ ۵۱۹ ۔ ۵۴۴ ۔ جولائی سنہ ۱۹۲۷ء

— شیخ ملا نصرتی ملک الشعراء بیجاپور (گلشن عشق)
اردو ۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۱ ۔ ۵۲ ۔ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء

— شیخ ملا نصرتی ملک الشعراء بیجاپور (۲) (علی نامہ)
اردو ۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۳۷۹ ۔ ۴۱۱

— شیخ ملا نصرتی ملک الشعراء بیجاپور (تاریخ سکندری) (۳)
اردو ۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۵۹۸ ۔ ۶۳۰ ۔ جولائی سنہ ۱۹۲۷ء

— شیخ ملا نصرتی ملک الشعراء بیجاپور (۴)
قصائد و غزلیات اور کلام پر عام رائے۔
اردو ۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۸۵۵ ۔ ۹۳۶ ۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء

— نصرتی اور مثنوی گلشن عشق
قومی زبان کراچی ۔ ص ۔ ۳ ۔ ۵ ۔ ۱۶ جنوری ۱۹۵۳ء

— قدیم اردو ۔ (حضرت شاہ معین الدین اعلیٰ اور ان کی تصانیف)
اردو ۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۱ ۔ ۱۰ ۔ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

— قدیم اردو ۔ گجری (گجراتی) زبان — شاہ علی محمد جیو گام دھنی اور ان کا دیوان ۔
اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۴۵۰ — ۴۵۹ ۔ جولائی سنہ ۱۹۲۸ء

— قدیم اردو ۔ گجری (گجراتی زبان) میاں شیخ خوب محمد چشتی۔
اردو، اورنگ آباد ۔ (دکن)
ص ۔ ۱۲۴ ۔ ۱۲۶ ۔ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء

— قدیم اردو — حسن شوقی (ایک عادل شاہی شاعر)
اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۵۴۰ ۔ ۵۵۹ ۔ جولائی سنہ ۱۹۲۹ء

— قدیم اردو — گجرات کا ایک قدیم شاعر (قاضی محمود دریائی قدس سرہ۔
اردو، دہلی ۔ ص ۔ ۳۸۵ ۔ ۳۸۸ ۔ جولائی ۴۲ء

— قدیم اردو ۔ حیدرآباد کا ایک شاعر خاندان ملا عشرتی، سید احمد ہنر اور سید محمد

اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص - ۵۳۳ - ۵۵۱ - جولائی ۱۹۳۱ء

— کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ
اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص - ۱۳ - ۳۶ - جنوری ۱۹۲۲ء

— ولی کے سن وفات کی تحقیق
ص - ۴۰۶ — ۴۰۸

ہاشمی فرید آبادی — تلخیص الاردو - کراچی انجمن ترقی اردو ۱۹۵۳ء
پرانی اردو میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں۔
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص - ۱ - ۴۹ - جنوری ۱۹۲۷ء

— دکنی اردو میں شاہنامے کی داستانیں
اردو کراچی - ص - ۵ - ۱۰ - اکتوبر ۱۹۴۹ء

— شمالی ہند کی سب سے قدیم مثنوی - وفات نامہ
حضرت فاطمہ از اسمٰعیل امروہی
اردو کراچی - ص - ۵ - ۸ - اپریل ۱۹۵۱ء
اردو زبان کے کتبے
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص - ۲۷۶ - ۲۸۱ - اپریل ۱۹۲۸ء
پرانی اردو میں کتبے - ص - ۴۰۹ - ۴۱۴

ہاشمی فرید آبادی — تلخیص الاردو ، کراچی انجمن ترقی اردو ۱۹۵۳ء
مثل خالق باری
اردو، کراچی - ص - ۵ - ۱۴ - جنوری ۱۹۵۲ء

بادہ کہن — اس سلسلہ میں مولوی صاحب نے مختلف اوقات میں، ۱۷ شعرا کے کلام کا انتخاب شائع کیا۔

خواجہ سید محمد میر اثر — مثنوی خواب وخیال
اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص - ۲۱۷ - ۳۱۸ - اپریل ۱۹۲۶ء

عبدالکریم سوز — نمونہ کلام
اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص - ۵۳۳ - ۵۳۵ - جولائی ۱۹۲۹ء

گلاب سنگھ آشفتہ — نمونہ کلام
اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص - ۵۳۵ - ۵۳۸ - جولائی ۱۹۲۶ء

خواجہ سید محمد میر اثر — نمونہ کلام (غزلیات)
اردو - اورنگ آباد (دکن) جولائی ۱۹۲۶ء
ص - ۵۳۸ -

میر حسن — غزلیات
اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص - ۶۸۱ - ۶۸۴ - اکتوبر ۱۹۲۶ء

لالہ ٹیک چند بہار — نمونہ کلام
اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص - ۱۵۳ - ۱۵۴ - جنوری ۱۹۲۷ء

مرزا جان جاناں مظہر — نمونہ کلام
اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص - ۱۵۱ - ۱۵۴ - جنوری ۱۹۲۶ء

شیخ ولی اللہ محب — نمونہ کلام

اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۲۶۱ - ۲۶۵ ۔ اپریل سنہ ۱۹۲۶ء

لچھمی نرائن شفیق — نمونۂ کلام
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۵۴۷ - ۵۵۳ ۔ جولائی سنہ ۱۹۲۷ء

نمونۂ کلام
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۱۲۵ - ۱۲۹ ۔ جنوری سنہ ۱۹۲۸ء

شاہ مبارک آبرو — مثنوی آبرو
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۱۳۵ ۔ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء

غواصی — مرثیہ
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۳۶۲ - ۳۶۵ ۔ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

غلام ہمدانی مصحفی — گلزار شباب (عشقیہ مثنوی)
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۳۳۳ ۔ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء

مرزا علی نقی ایجاد — غزلیات
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۱۵۲ - ۱۵۶ ۔ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء

سعادت یار خاں رنگین — گلدستۂ رنگیں
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۱۲۵ - ۱۲۸ ۔ جنوری سنہ ۱۹۳۶ء

سب رس — اردو نثر کی ایک قدیم کتاب۔
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)

شہاب — شمع پروانہ
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۴۰۸ - ۴۱۷ ۔ جولائی سنہ ۱۹۳۶ء
ص ۔ ۱ - ۲۶ ۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء

غضنفر حسین — جنگ نامہ سید عالم علی (منظوم)
اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو۔ دیباچہ
ص ۔ ۱ - ۷

انشاء اللہ خاں انشا — داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی۔
مرتبہ:۔ مولوی عبدالحق
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۲۶۷ - ۲۹۸ ۔ اپریل سنہ ۱۹۲۶ء

— ذکر میر
اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۱۹۹ - ۲۶۲ ۔ اپریل سنہ ۱۹۲۶ء

— مثنوی خواب و خیال
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۶۶۶ - ۶۶۹ ۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

— باغ و بہار، قصۂ چہار درویش
اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۳۹۲ - ۴۱۵ ۔ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

— دیوان رنگین (ریختی)
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۶۲۳ - ۶۴۲ ۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ء

— مرزا نوشہ غالب کا آخری خط

اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص - ۱۷۷ - ۱۷۹ - اپریل ۱۹۲۶ء

— مرزا غالب کی خود نوشتہ سوانح عمری کا ورق
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص - ۳۲۷ - ۳۲۹ - جولائی ۱۹۲۸ء

— سر سید احمد خاں
اردو - کراچی - ص - ۵ - ۸۰ - اپریل ۱۹۵۰ء

— سر سید کے چند غیر مطبوعہ خطوط
اردو کراچی - ص - ۱۲۵ - ۱۲۷ - اپریل، جولائی ۵۷ء

— مولانا حالی مرحوم
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
ص - ۱ - ۱۷ - جنوری ۱۹۳۵ء

— یاد حالی - مولوی عبدالحق کی زبانی
ہماری زبان دہلی - ص - ۵ - ۶
یکم اپریل ۱۹۴۵ء

— حالی اور انسانیت
اردو - کراچی - ص - ۵ - ۱۴ - اپریل ۱۹۵۲ء

— ایک ہندی دوہے اور دو شعر پر مولانا حالی کا محاکمہ -
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص - ۹۱ - ۹۵ - جنوری ۱۹۳۶ء

— خواجہ الطاف حسین حالی
قومی زبان - کراچی - ص - ۲ - ۷
جون ۱۹۴۹ء

میرن صاحب

اردو - اورنگ آباد - دکن -
ص - ۲۷۰ - ۲۸۴ - جولائی ۱۹۳۶ء

— سر سید راس مسعود
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص - ۸۲۹ - ۸۴۷ - اکتوبر ۱۹۳۷ء

— نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی
اردو - کراچی - ص - ۱ - ۳۱ - جنوری ۵۸ء

میر محفوظ علی بدایونی
قومی زبان کراچی - ص - ۴ - ۸
۱۶ جولائی ۵۹ء

— حضرت احسن مارہروی مرحوم
قومی زبان کراچی - ص - ۹ - یکم اگست ۵۶ء

ڈاکٹر محمد اقبال — (علامہ اقبال سے اپنے تعلقات کے بارے میں ذکر کیا ہے)
قومی زبان کراچی - ص - ۴ - ۵ - یکم جولائی ۵۲ء

مولوی عبدالحق — ڈاکٹر محمد داؤد رہبر
اصغر مینائی مرحوم
قومی زبان - کراچی - ص - ۳ - ۴
یکم جون ۵۶ء

— قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی
(وفات پر تعزیتی پیغام)
قومی زبان کراچی - ص - ۱۷ - ۱۶ اگست و یکم ستمبر ۵۵ء

— آہ عبدالرحمٰن صدیقی
قومی زبان کراچی - ص - ۲ - ۴ - یکم جون ۵۳ء

— خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

— مولانا الیاس برنی
قومی زبان کراچی ۔ ص ۔ ۳ ۔ ۱۶ فروری سنہ ۵۹ء

— پنڈت دتّشی دھر
قومی زبان ۔ کراچی ۔ ص ۔ ۴ ۔ ۵ ۔
۱۶ جون سنہ ۶۱ء

— ڈاکٹر دنیش چندر سین (تعارف)
اردو ۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۳۲۹ ۔ ۳۴۲ ۔ جولائی سنہ ۱۹۲۲ء

— جان کر منجملہ خاصان مے خانہ مجھے
(جگر مراد آبادی کی وفات پر تعزیتی نوٹ)
قومی زبان کراچی ۔ سرورق ۔ ۱۶ ستمبر سنہ ۶۰ء

— آنریبل خواجہ ناظم الدین سے ملاقات
قومی ۔ زبان ۔ کراچی ۔ ص ۔ ۳ ۔ ۸ جون سنہ ۱۹۴۹ء

— مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر
اردو ۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۱ ۔ ۷۲ ۔ اپریل سنہ ۱۹۲۳ء

— کمیونزم کے سیلاب کو صرف اسلام ہی
روک سکتا ہے ۔
قومی زبان کراچی ۔ ص ۔ ۱۸ ۔ ۲۱
۱۶ جون سنہ ۱۹۶۱ء

— طبیعات اور اہل اسلام موسیو سیدیو
ذالنیسی کی کتاب تاریخ عرب سے
معارف علی گڑھ ۔ ص ۔ ۲۴ ۔ ۳۱ ۔ جولائی سنہ ۱۹۰۰ء

— جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق
اردو ۔ اورنگ آباد ۔ دکن ۔
ص ۔ ۵۰۸ ۔ ۵۱۳ ۔ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء

— آئی ۔ سی ۔ ایس ۔ انڈین سول سروس ۔
قومی زبان ۔ کراچی ۔ ص ۔ ۱۱ ۔ ۱۹
یکم و ۱۶ جنوری سنہ ۱۹۶۱ء

— قاہرہ کی مسجد عمرو
حسن حیدر آباد ۔ ص ۔ ۱ ۔ ۲۹ ۔ جون سنہ ۱۸۹۶ء

— آغاز ۔ (رسالہ اردو کا افتتاحیہ)
اردو ۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۱ ۔ ۷ ۔ جنوری سنہ ۱۹۲۱ء

— وقت کا اہم تقاضا
اردو یونیورسٹی، محبان وطن کی خدمت
میں ایک ضروری اپیل
ہماری زبان دہلی ۔ ص ۔ ۲ ۔ ۵
۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۴۴ء

— اردو یونیورسٹی
قومی زبان ۔ کراچی ۔ ص ۔ ۳ ۔ ۴ ۔ یکم فروری سنہ ۵۶ء

— اردو یونی ورسٹی وقت کا ایک اہم تقاضا
قومی زبان کراچی ۔ سرورق ۔ یکم اپریل سنہ ۶۰ء

— اردو یونیورسٹی وقت کا ایک اہم تقاضا
قومی زبان کراچی ۔ سرورق ۔ یکم مئی سنہ ۶۰ء

— وقت کا اہم تقاضا
قومی زبان کراچی ۔ ص ۔ ۱۶ ۔ ۱۸ ۔
۱۶ جون سنہ ۶۰ء

— اردو یونیورسٹی ۔ وقت کا ایک اہم تقاضا ۔
قومی زبان کراچی ۔ ورق آخر ۔ یکم جون سنہ ۶۰ء

— اردو یونیورسٹی ایک علمی و تہذیبی مرکز
قومی زبان۔کراچی۔ص۔۶۔یکم اگست ۱۹۶۲ء

— اردو یونی ورسٹی کی تجویز
قومی زبان۔کراچی۔ص۔ ۳، ۱۲
۱۶ر اکتوبر ۱۹۶۱ء

— قائداعظم اور اردو
قومی زبان کراچی۔ص۔۳۔۵۔مئی ۱۹۴۹ء
قائداعظم اور اردو، قائداعظم کی پہلی اردو تقریر۔
قومی زبان کراچی۔ص۔۵۔۱۲۔یکم جنوری ۱۹۶۲ء

— پاکستان میں اردو کا المیہ
قومی زبان۔کراچی۔ص۔۵۔۸
۱۶ر جولائی ۱۹۵۶ء

— پاکستان میں اردو کا المیہ قسط ۲
قومی زبان۔کراچی۔ص۔۱۰۔۱۱
یکم اگست ۱۹۵۶ء

— پاکستان میں اردو کا المیہ قسط ۳
قومی زبان۔کراچی۔ص۔۱۵۔۸، ۱۳
۱۶ر اگست ۱۹۵۶ء

— پاکستان میں اردو کا المیہ، قائداعظم کے بعد قسط ۴
قومی زبان۔کراچی۔ص۔۶۔۸۔۱۶ر اگست ۱۹۵۶ء

— پاکستان میں اردو کا المیہ قسط ۵
قومی زبان کراچی۔ص۔۶۔۸، ۱۲
۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۶ء

— پاکستان میں اردو کا المیہ قسط ۶
قومی زبان کراچی۔ص۔۹۔۱۳
۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۶ء

— پاکستان میں اردو کا المیہ قسط ۷
قومی زبان کراچی۔ص۔۱۱۔۱۴
یکم نومبر ۱۹۵۶ء

— پاکستان میں اردو کا المیہ قسط ۸
قومی زبان کراچی۔ص۔۱۱۔۱۴
۱۶ر نومبر ۱۹۵۶ء

— پاکستان میں اردو کا المیہ قسط ۹
قومی زبان کراچی۔ص۔۱۲۔یکم دسمبر ۱۹۵۶ء

— اسلامی جمہوریہ پاکستان نے غلامی جائز کردی ہے۔
قومی زبان کراچی۔ص۔۱ ۱۶ر مارچ ۱۹۵۶ء

— یہ نفاق ہے یا افتراق؟
قومی زبان کراچی۔ص۔۳۔۴۔یکم جنوری ۱۹۵۳ء

— پاکستان کی قومی و سرکاری زبان کا مسئلہ
قومی زبان کراچی۔۵۔۱۳۔یکم اپریل ۱۹۵۲ء

— دو زبانوں کا نفاذ اتحاد کے حق میں مضر ہوگا
صرف اردو ہی میں یہ صلاحیت ہے کہ اسے پاکستان کی واحد سرکاری زبان بنایا جائے
قومی زبان کراچی۔ص۔۵۔یکم مئی ۱۹۵۳ء

— زبان کو انتخاب کی بنیاد قرار دینا ملک میں افتراق پیدا کرنا ہے۔
قومی زبان کراچی۔ص۔۱۲۔یکم دسمبر ۱۹۵۲ء

— دستور اور مسئلہ زبان
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۵۔ یکم فروری سنہ ۵۶ء

— پنجاب یونیورسٹی اور اردو
ہماری زبان۔ ص۔ ۱۔ ۲۔ ۱۶ نومبر سنہ ۱۹۴۵ء

— پنجاب یونیورسٹی اور مشرقی علوم و السنہ
کی بے وقری
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۱۔ ۳۔ یکم جون ۵۵ء

— ہمارے قومی احساس کا تقاضا ہے کہ ہم اردو
زبان کی عظمت اپنے عمل سے ثابت کر دکھائیں۔
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۴۔ ۱۶ اکتوبر سنہ ۶۰ء

— موجودہ ہنگامی حالات میں رات کی تعلیم
کا انتظام برقرار رکھا جائے۔
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۳۔ ۵۔ یکم جولائی سنہ ۵۱ء

— چودہ اگست (کس طرح ہم غیر قوموں سے
آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے؟
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۳۔ ۴ ۔ ۱۶ اگست سنہ ۱۹۶۰ء

— ضرورت ہے — ایک سید احمد خاں کی
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۴۰۔ ۴۳
یکم جنوری تا ۱۶ مارچ سنہ ۶۲ء

— نیا دور (نئی کابینہ بدلنے پر تاثرات)
قومی زبان کراچی۔ ص ۳۔ ۴
۱۶ ستمبر سنہ ۵۶ء

عبد الحق — مرکز کا میزانیہ
قومی زبان کراچی۔ ص ۲۔ ۳
۱۶ اپریل سنہ ۵۵ء

— اک نئے دور کا آغاز ہوا (مارشل لا کا آغاز)
قومی زبان کراچی۔ ص ۳۔ ۵
۱۶ اپریل سنہ ۵۹ء

— اک نئے دور کا آغاز (مارشل لا کے
نفاذ کے فوراً بعد)
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۲۹۔ ۲۲
یکم جنوری تا ۱۶ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء

— بنیادی جمہوریت
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۳۳۔ ۳۹
یکم جنوری تا ۱۶ مارچ ۱۹۶۲ء
۱۴ اگست سنہ ۱۹۵۹ء — ۱۴ اگست سنہ ۱۹۶۰ء
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۵۱۔ ۵۴
یکم جنوری تا ۱۶ مارچ سنہ ۶۲ء

— ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھا۔ دور غلامی کی کیفیت
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۷۔ ۸
۱۶ اگست و یکم ستمبر سنہ ۵۵ء

— میرا بمبئی، گجرات اور خاندیس کا دورہ۔
ہماری زبان۔ دہلی۔ ص۔ ۹۔ ۱۳۔ ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۲۹ء

— بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت۔
(ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن)
اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص۔ ۲۱۵۔ ۲۲۹۔ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء

— اشارات:
(۱) اردو یا ہندوستانی (۲) رسم الخط
(۳) معارف کی تنقید (۴) اصطلاحات علمیہ
اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص۔ ۴۶۹، ۴۸۳
جولائی سنہ ۱۹۲۱ء

افکار و واقعات۔
(۱) غلط فہمیوں کے جالے۔
(۲) منشی پریم چند صاحب کا عذر تقصیر اور ہندی اردو کی چھیڑ
(۳) ہندی زبان دا یم خط پر ورما صاحب کا مضمون
— (۴) اردو۔ ہندی اور ہندوستانی۔
اردو، اورنگ آباد۔ دکن۔ ص۔ ۴۳۵-۴۳۶، جولائی ۱۹۳۶ء

— افکار و واقعات
اردو، اورنگ آباد (دکن) ص ۱۷۷-۲۰۱، جنوری ۱۹۳۸ء

— افکار و واقعات
اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص۔ ۶۷۹-۷۰۰، جولائی ۱۹۳۸ء

— افکار و واقعات
اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص۔ ۴۷۵-۴۸۰، اپریل ۱۹۳۶ء

افکار و واقعات
۱۔ بہار کمیٹی کی روداد
۲۔ مسٹر شکلا وزیر اعظم صوبہ متوسط سے گفتگو
۳۔ گاندھی جی اور اردو ہندی
۴۔ بابو پرشوتم داس ٹنڈن اور ہندی اردو
۵۔ پروفیسر جھا اور اردو ہندی
۶۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مسئلہ زبان
اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص۔ ۶۵۲-۶۸۳، جولائی ۱۹۳۹ء

افکار و خیالات — ۱۔ دو محسن
اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص: ۸۹۵-۹۰۶، اکتوبر ۱۹۳۶ء

چند سچی حکایتیں — سلام کا جواب
قومی زبان کراچی۔ ص ۱۳۱-۱۴۰، یکم دسمبر ۱۹۵۱ء

ایک ضروری بات۔
ہماری زبان۔ دہلی۔ ص۔ ۱۱، یکم اگست ۱۹۴۶ء

— چند سچی حکایتیں، میری انگریزی کمزور ہو جائیگی۔
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۴-۶ ۔ ۱۶ جولائی ۱۹۵۳ء

— چند سچی حکایتیں۔ قائد اعظم کی پہلی اردو تقریر
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۷-۸ ۱۶ اگست ۱۹۵۳ء

— چند سچی حکایتیں (اردو پر مشکل ادوار)
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۲-۷ ۱۶ ستمبر ۱۹۵۳ء

— چند سچی حکایتیں (علمیت کا اظہار)
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۶ ۲۲ جون ۱۹۴۸ء

— چند سچی حکایتیں (زعفران)
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۴۔ یکم جون ۱۹۴۸ء

— چند سچی حکایتیں (عقیدت مندی)
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۲-۳۔ ۱۰ جون ۱۹۴۹ء

— یہ عورتیں۔
قومی زبان کراچی ص۔ ۲-۳ نومبر ۱۹۴۸ء

— مجلس ہفت گانی (بہادری اور سخت جانی)
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۴-۵ اکتوبر ۱۹۴۸ء

— مجلس ہفت گانی (عید کی نمازیں)
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۸ ۱۵ نومبر ۱۹۴۸ء

— یادوں کے چراغ
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۵-۸ ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء

— یادوں کے چراغ قسط ۲
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۴-۶ یکم ستمبر ۱۹۶۱ء

— یادوں کے چراغ قسط ۳
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۵-۷ ۱۶ ستمبر ۱۹۶۱ء

مقدمات جو بابائے اردو نے مختلف کتابوں پر لکھے

معشوق حسین خاں (مترجم) مبادی سائنس
حیدرآباد (دکن)، انجمن ترقی اردو
۱۹۱۰ء مقدمہ ص ۱-۹

امداد علی "دباغ" معدنی دباغت یعنی کرومی دباغت
بحیثیت ایک دیہی حرفہ کے
دہلی، انجمن ترقی اردو ۱۹۴۷ء
پیش لفظ ص ا-ج

عبادت بریلوی اردو تنقید کا ارتقا کراچی
انجمن ترقی اردو ۱۹۵۱ء
مقدمہ ص ز-م

STANDARD ENGLISH-URDU DICTIONARY.
ANJUMAN TARAQQI-E-URDU.
دیباچہ ص ا-۶ AURANGABAD.DN 1937.

STUDENTS STANDARD ENGLISH
URDU DICTIONARY 2nd Ed. KARACHI
ANJUMAN TARAQQI-E-URDU 1952
دیباچہ طبع اول ص ا

پاکستان اسٹیٹ بینک مجلس اصطلاحات فرہنگ اصطلاحات
بنکاری کراچی، انجمن ترقی اردو
۱۹۵۱ء مقدمہ ص ۵-۱۴

پاکستان انجمن ترقی اردو فرہنگ اصطلاحات کیمیا
کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۵۰ء
مقدمہ ص ا-۷

ظفر الرحمن دہلوی فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں
دہلی، انجمن ترقی اردو ۱۹۳۹ء
تعارف ص ا-۲

انشا، انشاء اللہ خاں دریائے لطافت مترجمہ برجموہن
دتاتریہ کیفی اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء
مقدمہ ص ا-ث

قواعد اردو بار سوم اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو
۱۹۳۶ء مقدمہ ص ۱-۲۳

ہندوستانی انجمن ترقی اردو جائزہ زبان اردو دہلی
انجمن ترقی اردو ۱۹۴۰ء
مقدمہ ص ا-۶

دتاسی، گارساں خطبات گارساں دتاسی (اردو ترجمہ)
اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو
۱۹۵۳ء ص ۸۱۳
مقدمہ ص ا-ی

تمنا اورنگ آبادی، اسد علی گل عجائب اورنگ آباد انجمن
ترقی اردو، ۱۹۳۶ء ص ۱۴۴
مقدمہ ص ا-ط

شفیق اورنگ آبادی چمنستان شعرا (یعنی اردو شعرا
لچھمی نرائن - کا تذکرہ - اورنگ آباد
انجمن ترقی اردو ۱۹۲۸ء ص ۵۶۵
مقدمہ ص ا-۴۷

چمنستان شعرا - مقدمہ اردو - اورنگ آباد - (دکن)
جولائی ۱۹۲۹ء ص ۵۱۹-۵۳۷

لطف، میرزا علی گلشن ہند مشہور شعرائے اردو کا ایک
تذکرہ تصحیح و تحشیہ مولوی شبلی

حیدرآباد دکن، عبداللہ خاں سنہ ۱۹۱۶ء

مقدمہ ص ۱ـ ۳۰

فائق، نورالدین حسین خاں مخزن شعرا یعنی تذکرہ شعرائے گجرات

رضوی ـ اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو

سنہ ۱۹۳۳ مقدمہ ص ۱ـ ۸

فتح علی حسینی گردیزی سید تذکرہ ریختہ گویاں اورنگ آباد

انجمن ترقی اردو، سنہ ۱۹۳۳ء ص ۱۶۸

مقدمہ ص ۱ــ ۱۷

قائم چاندپوری، مخزن نکات اورنگ آباد،

محمد قیام الدین۔ انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۲۹ء

مقدمہ ص ۱ـ ۲۵

مصحفی غلام ہمدانی تذکرہ ہندی اورنگ آباد

انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۳۳ء ص ۲۸۲

مقدمہ ص ا ـ ن

مصحفی غلام ہمدانی ریاض الفصحا اورنگ آباد،

انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۳۴ء ص ۳۷۵

مقدمہ ص ا ـ ن

مصحفی غلام ہمدانی عقد ثریا اورنگ آباد،

انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۳۴ء

ص ۶۴ مقدمہ ص ا ـ ن

میر، میر تقی نکات الشعرا طبع ثانی اورنگ آباد

انجمن ترقی اردو، سنہ ۱۹۳۵ء

مقدمہ ص ا ـ ح

ولی کلیات ولی مرتبہ علی احسن احسن مارہروی

معہ ضمیمہ جات ۔ اورنگ آباد

انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۲۷ء

التماس ص الف ـ ل

نصرتی گلشن عشق کراچی، انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۵۲ء

مقدمہ ص ۱ـ ۱۲

ملا وجہی قطب مشتری طبع ثانی کراچی،

انجمن ترقی اردو، سنہ ۱۹۵۳ء

مقدمہ ص ۱ـ ۱۷

میر، میر تقی انتخاب کلام میر چھٹا ایڈیشن

کراچی انجمن ترقی اردو، سنہ ۱۹۵۰ء

مقدمہ ص ۱ـ ۵۲

شیخ چاند سودا اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو

سنہ ۱۹۳۶ء ص ۳۹۷

مقدمہ ص ح ـ م

اثر، محمد میر خواب و خیال بار دوم کراچی،

انجمن ترقی اردو، سنہ ۱۹۵۰ء

مقدمہ ص ا ـ ص

تاباں دہلوی، دیوان تاباں اورنگ آباد،

عبدالحق انجمن ترقی اردو، سنہ ۱۹۳۵

مقدمہ ص ۱ ــ ۵

داغ، نواب مرزا خاں انتخاب داغ دہلی،

ترقی اردو، سنہ ۱۹۴۶ء

مقدمہ ص ا ـ د

ملا وجہی سب رس طبع دوم کراچی،

انجمن ترقی اردو، سنہ ۱۹۵۲ء

مقدمہ ص ۱ ــ ۵۱

انشاء، انشاء اللہ خاں کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے
بھان کی کراچی،
انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء
دیباچہ ص ا-ج

میر امن دہلوی باغ و بہار یعنی قصہ چہار درویش
دوسرا ایڈیشن دہلی،
انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۷ء
مقدمہ ص ۳-۲۶

حالی، الطاف حسین مقالات حالی حصہ اول مرتبہ
محمد اسمٰعیل بار سوم، کراچی
انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء
دیباچہ ص ا-ح

محفوظ علی مضامین محفوظ علی۔ کراچی، انجمن ترقی اردو،
۱۹۵۶ء مقدمہ ص ا-ط

براؤن، براؤن تاریخ ادبیات ایران مترجم
سید سجاد حسین اورنگ آباد،
انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۲ء
ص ۷۵۶ دیباچہ ص ا-ز

پلوٹارک مشاہیر یونان و روما مترجمہ
سید ہاشمی فرید آبادی طبع دوم
دہلی، انجمن ترقی اردو
۴ جلد
دیباچہ ص ۷-۱۶

بدر الدین چینی چین و عرب کے تعلقات اور ان کے
نتائج۔ کراچی انجمن ترقی اردو ۱۹۴۹ء

دیباچہ ص ا-ک

مقدمہ مسافر حجاز (آغا بدر عالم درانی کی تصنیف
بزبان سندھی مسافر حجاز)
قومی زبان کراچی یکم مئی تا یکم جون۔
۱۹۶۲ء ص ۱۶-۱۸

جرمانس، جولیس ترکوں کی اسلامی خدمات اور ان کی
زبان و ادبیات پر تین لکچر مترجمہ
وہاج الدین اورنگ آباد،
انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۲ء
دیباچہ ص ا-۲

میر، میر تقی ذکر میر اورنگ آباد،
انجمن ترقی اردو ۱۹۲۸ء
ص ۱۵۲ مقدمہ ص ا-ر

خطبات۔ تقاریر۔ بیانات اور پیغامات:-

خطبۂ عبدالحق (جو مدیر اردو تھے ہندوستانی
اکیڈمی الہ آباد کی منعقدہ اردو
کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے
۱۲ جنوری ۱۹۳۶ء کو پڑھ کر سنایا)
اردو اورنگ آباد دکن،
جنوری ۱۹۳۶ء ص ۱۰۰-۱۱۵

خطبۂ صدارت (ترقی پسند ادیبوں کا پہلا جلسہ
ماہ اپریل ۱۹۳۶ء لکھنؤ میں ہوا تھا
شعبۂ اردو کی صدارت کے لئے انہوں
نے مولوی عبدالحق کو بلایا تھا۔ مولوی

صاحب جانے کے لئے تیار تھے لیکن عین
وقت پر ایک ناگزیر وجہ سے شریک
نہ ہوسکے یہ خطبہ اس جلسہ کے لئے
لکھا گیا تھا)
اردو اورنگ آباد دکن
اپریل ۱۹۳۶ء ص ۳۳۲-۳۴۴

خطبۂ صدارت (صوبۂ بہار کی اردو کانفرنس منعقدہ
پٹنہ میں پڑھ کر سنایا گیا)
اردو اورنگ آباد (دکن) اکتوبر
۱۹۳۶ء ص ۶۲۴-۶۴۰

خطبۂ صدارت (ترقی پسند ادیبوں کا پہلا جلسہ
ماہ اپریل ۱۹۳۶ء حال لکھنؤ میں ہوا تھا
اس کا خطبۂ صدارت ہے،
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۶ء ص ۲۳۲-۲۴۴

خطبۂ صدارت اردو کانفرنس میں جو آل انڈیا مسلم
ایجوکیشنل کانفرنس کے ضمن میں
علی گڑھ میں منعقد ہوئی تھی پڑھا گیا۔
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۳۷ء ص ۳۵۹-۳۹۳

خطبۂ صدارت جو سندھ پراونشیل اردو کانفرنس
کراچی منعقدہ ۱۹۳۷ء میں پڑھا گیا
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری ۱۹۳۸ء ص ۱۴۷-۱۶۲

خطبۂ صدارت اردو کانفرنس ناگپور
ہماری زبان یکم اپریل ۱۹۴۰ء
۱۶ اپریل ۱۹۴۰ء
ص ۶-۸ باقی جاری ص ۸-۹

خطبۂ صدارت دوسری کل پنجاب اردو کانفرنس؛
لائل پور منعقدہ ۲۳، ۲۴ فروری
۱۹۴۱ء
ہماری زبان دہلی ۱۶ مارچ ۱۹۴۱ء
ص ۱۱-۱۳

خطبۂ صدارت یوم اردو سالانہ جلسہ انجمن حمایت اسلام
لاہور ۱۲ اپریل ۱۹۴۱ء
ہماری زبان دہلی یکم مئی ۱۹۴۱ء
ص ۹-۱۲

خطبۂ صدارت شعبۂ اردو آل انڈیا مسلم
ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ علی گڑھ
اردو دہلی اپریل ۱۹۴۳ء
ص ۲۲۴-۲۴۰

خطبۂ صدارت اردو کانفرنس کالی کٹ (ملیبار)
۱۹۴۳ء
اردو دہلی اکتوبر ۱۹۴۳ء
ص ۴۰۹-۴۱۹

خطبۂ صدارت اردو کانفرنس کالی کٹ ملیبار

۶ ، ۷ ر نومبر ۱۹۴۳ء
ہماری زبان دہلی پہلی دسمبر ۱۹۴۳ء
ص ۲ - ۵

سندھ پراونشل اردو کانفرنس کی افتتاحیہ تقریر
ہماری زبان یکم مئی ۱۹۴۴ء
ص ۱ - ۳

خطبۂ صدارت — یادِ حالی
اردو دہلی جولائی ۱۹۴۵ء
ص ۲۲۰ - ۲۳۹

زبان اور قومیت — خطبۂ بنگلور
ہماری زبان دہلی ۱۶ جون ۱۹۴۷ء
ص ۱ - ۳

خطبۂ صدارت — یونیورسٹی اردو کانفرنس منعقدہ لاہور
۲۶ - ۲۷ مارچ ۴۸ء
قومی زبان کراچی ۸ جون ۴۸ء
ص ۶ - ۱۰

خطبۂ صدارت — کل گجرات اردو کانفرنس احمد آباد
قومی زبان کراچی ۲۲ رجولائی ۴۸ء
ص ۳ - ۵

خطبۂ صدارت — سالانہ جلسہ بلوچستان ٹیچرز ایسوسی ایشن
قومی زبان کراچی اگست ۴۸ء
ص ۲ - ۵

افتتاحی تقریر — بہ تقریب افتتاح اردو کانفرنس سلہٹ
۲ رمارچ ۱۹۴۹ء
قومی زبان کراچی مارچ ۱۹۴۹ء ص ۳۱

خطبۂ صدارت — سالانہ اجلاس مجلس ادب لاہور
قومی زبان کراچی ۱۶ راکتوبر ۴۹ء
ص ۳ - ۵ ، ۸

یادش بخیر حالی — بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی ریڈیائی تقریر
قومی زبان کراچی ۱۶ رمئی ۱۹۵۰ء
ص ۴ - ۶

خطبۂ صدارت — جو ۱۲ جولائی ۱۹۵۲ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں دیا گیا۔
قومی زبان کراچی ۱۶ رجولائی ۵۲ء
ص ۳ - ۵

بیان بہ مجلس اقبال — قومی زبان کراچی
یکم مئی ۵۳ء ص ۶

اجلاس خواتین — ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۳ء - افتتاحی وغیر افتتاحی تقریریں۔ قومی زبان کراچی
۱۶ نومبر ۵۳ء ص ۴۹ - ۵۰
ص ۴۰ - ۴۳

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتے ہیں۔
ایک ریڈیائی تقریر
قومی زبان کراچی یکم اپریل ۵۵ء
ص ۳ - ۵

خطبۂ صدارت — پاکستان رائٹرس کنونشن کے اجلاس منعقدہ ۳۱ رجنوری ۵۹ء میں پڑھا گیا۔ قومی زبان کراچی
۱۶ فروری ۵۹ء ص ۴

خطبۂ صدارت مغربی پاکستان اردو کانفرنس
اردو اور ذریعۂ تعلیم
قومی زبان کراچی ۱۶ مارچ ۵۹ء
ص ۴ — ۸

بزم فروغ اردو اسلامیہ کالج لاہور
سپاسنامہ بخدمت جناب مولوی
عبدالحق صاحب اور اس کا جواب
قومی زبان کراچی ۱۶ مارچ ۵۹ء
ص ۱۹ — ۲۲

بابائے اردو لاہور میں اورنٹیل کالج میں، انجمن ترقیٔ اردو
خواتین شاخ لاہور کے جلسہ میں تقریر
قومی زبان کراچی ۱۶ مارچ ۵۹ء
ص ۲۳ — ۲۴

بابائے اردو لاہور میں تقریر اسلامیہ کالج برائے خواتین
کے جلسے میں۔ قومی زبان کراچی
۱۶ مارچ ۵۹ء ص ۲۳

خطبۂ صدارت مغربی پاکستان اردو کانفرنس
(منعقدہ لاہور ۲۲-۲۳ فروری
۵۹ء) اردو یونیورسٹی
قومی زبان کراچی ۱۶ اپریل ۵۹ء
ص ۶ — ۸

انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کے جلسے میں تقریر۔
عثمانیہ یونیورسٹی اور اردو
قومی زبان کراچی ۱۶ مئی ۵۹ء
ص ۴ — ۵

وضاحت اسلامیہ کالج لاہور کی بزم فروغ
اردو کے سپاسنامے کے جواب میں
قومی زبان کراچی ص ۲۲

خطبۂ صدارت جو مرکز علم و ادب (وادیٔ مہران)
کے کنونشن میرپور خاص میں بتاریخ ۹ دسمبر
۵۹ء پڑھا گیا۔
قومی زبان کراچی یکم جنوری ۶۰ء
ص ۵ — ۸

جگر مراد آبادی نے اردو غزل کو زندہ کر دیا، نو ادبی انجمنوں
کی طرف سے اردو کالج میں یوم جگر منانے
کے موقع پر تقریر۔
قومی زبان کراچی ۱۶ اکتوبر ۶۰ء
ص ۷

مجوزہ اردو یونیورسٹی ملک میں صحیح ادبی ذوق کو پروان
چڑھائیگی، رسالہ افکار کی تقریب
سال گرہ میں بابائے اردو کی تقریر
قومی زبان کراچی ۱۶ اگست ۶۰ء
ص ۱۲

گجرات میں اردو (گجراتی رسالہ "محراب" کا افتتاح
کرتے ہوئے تقریر فرمائی)
قومی زبان کراچی ۱۶ فروری ۶۰ء
ص ۵ — ۷

بابائے اردو کی ایک تقریر (اسلامیہ کالج کراچی کے سالانہ
جلسہ منعقدہ ۲۱ مارچ ۵۸ء
میں صدارتی تقریر۔)

قومی زبان کراچی یکم اپریل تا ۱۶ اپریل
۱۹۶۲ء ص ۱۶ - ۱۹

اردو یونی ورسٹی کے ذریعہ اردو کو وسعت دے کر بین الاقوامی
زبان بنایا جاسکیگا۔ بزم امروز کے جلسۂ
عام سے بابائے اردو کا خطاب۔
قومی زبان کراچی ۱۶ جون ۶۰ء
ص - ۱۰

اردو کو حقارت سے دیکھنے والے اپنی ماں کو حقارت سے
دیکھتے ہیں (تقریر استقبالیہ کمیٹی میں
جو انجمن ترقی خواتین نے میٹروپول میں
منعقد کی تھی۔
قومی زبان کراچی یکم اگست ۶۰ء
ص ۳۳

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا تہنیتی بیان۔
(شری راج گوپال اچاریہ کی ایک تقریر
پر جو ہندی کے خلاف تھی۔)
ہماری زبان پہلی نومبر ۱۹۴۵ء
ص ۱-۲

مولوی عبدالحق کا بیان اور مولانا آزاد منقولہ ہفتہ وار
ریاست دہلی۔
قومی زبان کراچی ۱۶ اپریل ۵۹ء
ص ۱۸، ۱۱

بابائے اردو کا پیغام (بسلسلہ جشن صد سالہ بی - ڈی
ایس پارسی اسکول کراچی)
قومی زبان کراچی یکم جون ۵۹ء ص ۱۲، ۷

بابائے اردو نے اردو کی خدمت کے صلے میں ملا ہوا دس ہزار روپیہ
یونیورسٹی فنڈ میں دیدیا۔ قوم کی ضروریات
میری ضرورتوں سے زیادہ اہم ہیں —
مولوی صاحب کا بیان۔ منقولہ روزنامہ
جنگ ۵ نومبر ۵۹ء۔ لیل ونہار۔
ہفت روزہ قندیل وغیرہ۔
قومی زبان کراچی ۱۶ نومبر ۵۹ء
ص ۱۱

انجمن اسلامیہ کی سلور جوبلی، بابائے اردو کا پیغام
قومی زبان کراچی ۱۶ دسمبر ۵۹ء
ص ۱۱

جمہوریت — ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب سے پہلے۔ یوم جمہوریت
کے موقعہ پر روزنامہ امروز اور روزنامہ
انجام کے نام پیغام۔
قومی زبان کراچی یکم جنوری تا ۱۶ مارچ
۱۹۶۲ء ص ۴۴ - ۴۷

سپاسنامہ (پرنس آغا خاں کی خدمت میں
اردو یونیورسٹی کمیٹی کے ارکان کی
طرف سے۔
قومی زبان کراچی ۱۶ اکتوبر ۶۰ء
ص ۵ - ۶

اردو میں ذریعہ تعلیم بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے
پچاس ہزار سائنسی اصطلاحات کا اردو
میں ترجمہ کیا جاچکا ہے۔ ماہر تعلیم کے
کنونشن میں اردو یونی ورسٹی کا لائحہ عمل

تیار کیا جائے گا۔
منقولہ امروز کراچی ۲۱ اپریل ۱۹۶۰ء
قومی زبان کراچی ۱۶ اپریل ۱۹۶۰ء
ص ۱۶-۱۷

بابائے اردو کے خطوط۔

رفیق الدین — ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور سر ہنری گڈنی کی مراسلت۔
اینگلو انڈین اسکولوں کے نصاب میں اردو کو لازمی قرار دینے کے لیے۔
ہماری زبان ۱۶ مئی ۱۹۴۱ء ص ۷-۹

عبدالحق — خط بنام آنریبل سر مرزا محمد اسمٰعیل صاحب دیوان ریاست جے پور
ہماری زبان دہلی ۶ مئی ۱۹۴۳ء
ص ۵

عبدالحق — خط بنام اڈیٹر "قومی آواز" لکھنؤ
ہماری زبان دہلی ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء
ص ۲-۴

حاشیے — حکومت پنجاب کے نام (وزیر اعلیٰ پنجاب جناب فیروز خان نون کے نام)
قومی زبان کراچی ۶ جولائی ۱۹۵۳ء
ص ۵

بابائے اردو کا خط گاندھی جی کے نام
قومی زبان کراچی ۲۱ ستمبر ۱۹۵۶ء
ص ۲-۷

بابائے اردو کا مکتوب صدر مملکت کے نام
(۲۱ اپریل ۱۹۵۹ء کو صدر ایوب کے نام کل پاکستان انجمن ترقی اردو کے حالات کے بارے میں)
قومی زبان کراچی ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۹ء
ص ۴

مخالفت بھی باعثِ رحمت ہے۔ مراسلہ طالب علموں کے نام
قومی زبان کراچی ۱۶ نومبر ۱۹۶۰ء
ص ۳-۵

کویت میں اردو اسکول کا قیام خط بنام رحیم صاحب
قومی زبان کراچی ۱۶ نومبر ۱۹۶۰ء
ص ۵-۶

بابائے اردو کا مراسلہ پاکستان کے طالب علموں کے نام
قومی زبان کراچی ۱۶ نومبر ۱۹۶۰ء
ص ۱۱-۱۲

صدر پاکستان کے نام بابائے اردو کا مکتوب
قومی زبان
یکم و ۱۶ جولائی ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۱ء
ص ۱-۲

ایک اہم مسئلہ بابائے اردو کا مکتوب صدر مملکت کے نام
قومی زبان کراچی یکم جنوری تا ۱۶ مارچ ۱۹۶۲ء
ص ۴۸-۵۰

بابائے اُردو نے حسب ذیل کتب پر تبصرے کیے: فلسفہ :-

معلومات عامہ۔ کتب خانے اور صیغہ عام کی دوسری کتابیں :-

عبدالحمید — خزینۂ معلومات
اردو۔ اورنگ آباد۔ دکن۔ ص۔ ۲۷۳
اپریل ۱۹۲۷ء

خزینۂ معلومات۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس
اُردو۔ اورنگ آباد (دکن)، اپریل ۱۹۳۴ء

جیمس کونٹ — جدید علم اور عصر حاضر کا انسان
ترجمہ محمد سعید
اردو۔ کراچی۔ ص۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ جولائی ۱۹۵۶ء

ب — جیبی فہرست کتب، اردو گشتی کتب خانہ۔ مرتبہ فضل اللہ
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۷۸۲ اکتوبر ۱۹۲۶ء

غلام رسول — فہرست (۱) میں انٹرمیڈیٹ سٹی کالج حیدرآباد کے کتب خانے کی موجودہ کتابوں کی فہرست)
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۱۹۷ جولائی ۱۹۳۸ء

خواجہ حسن نظامی صاحب کی جدید تالیفات۔
اردو۔ اورنگ آباد۔ دکن۔ ص۔ ۱۳۲۰ اکتوبر ۱۹۲۴ء

تصانیف جناب منشی محمد ولایت علی خاں صاحب صفی پوری (فارسی) اردو۔ اورنگ آباد
ص۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲ جنوری ۱۹۲۹ء

سجاد حسین — لائبریری سدھار
اردو۔ دہلی ص۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ جولائی ۱۹۴۳ء

امریکہ میں ایک اردو اخبار۔
اردو۔ اورنگ آباد ص ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ جنوری ۱۹۲۴ء

عبدالماجد — مبادی فلسفہ حصہ اوّل
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ اپریل ۲۲ء

عبدالماجد — فلسفیانہ مضامین۔
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱ جولائی ۱۹۲۶ء

حبیب الرحمٰن — رس یعنی فلسفۂ انبساط
اردو۔ اورنگ آباد۔ دکن۔
ص۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء

ایچ۔ اے۔ اوور اسٹریٹ — عقل سلیم۔ مترجم محمود رضوی
اردو کراچی۔ ص۔ ۱۲۲۔ جنوری ۵۰ء

اسپرانگر — نفسیات عنفوان شباب مترجم سید محمد حسین
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸ جولائی ۳۲ء

عبدالماجد — ہم آپ (یہ کتاب نفسیات کے مبادی پر لکھی گئی ہے)
اردو۔ کراچی۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

لین یوتانگ — مختار صدیقی (جینے کی اہمیت)
اردو کراچی۔ ص۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰ اکتوبر ۱۹۵۶ء

محمد بلوچستانی — نفسیات عادات انسانی
اردو۔ کراچی۔ ص۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ جنوری ۱۹۵۵ء

جلیل احمد — نفسیاتی آئینے۔

اردو۔ کراچی۔ ص۔ ۱۵۲ اپریل ۱۹۵۱ء

وہاج الدین احمد — نفسیات ترغیب
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۳۱۹۔ اپریل ۱۹۲۷ء

محمد عثمان — نفسیات تعلیمی
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۵۶۵۔ ۵۶۷۔ جولائی ۱۹۳۱ء

امین جیمس — دماغی تربیت۔ مترجمہ محمد ذکی
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۳۲۶۔ اپریل ۱۹۲۳ء

عبدالرحمن تیس — بچوں کا دستور العمل یا سیرت و کردار۔
(بچوں کی ابتدائی تربیت و اصلاح کیلئے کتابیں)
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ جولائی ۱۹۲۹ء

عبدالحی علوی — ذہنی صحت
اردو۔ کراچی۔ ص۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء

ابوسعید عبدالقدوس — اساس منطق۔
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۳۴۶۔ اپریل ۱۹۳۳ء

عنایت اللہ — ہدایۃ المنطق رسالہ زبدۃ المیزان
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۳۱۸۔ اپریل ۱۹۲۵ء

حفظ الرحمٰن — اخلاق اور فلسفہ اخلاق
اردو۔ دہلی۔ ص۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ اپریل ۱۹۴۱ء

مخدوم عالم مارہروی — اتالیق۔
اردو، اورنگ آباد دکن، ص ۱۲۵ جنوری ۱۹۲۶ء

احمد سعید — پاک زندگی
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص۔ ۵۰۳۔ جولائی ۱۹۲۶ء

محمد عزیز حسن — مضامین حکمیہ۔ اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۳۱۶۔ اپریل ۱۹۲۷ء

محمد حسین محوی صدیقی — درس عمل۔
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص۔ ۴۵۱ جولائی ۱۹۳۲ء

عماد پوری — کلید مراد
اردو۔ اورنگ آباد۔ ص۔ ۳۱۹۔ اپریل ۱۹۲۲ء

منظر علی — اعظم الاخلاق
اردو۔ اورنگ آباد۔ ص۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ اپریل ۱۹۲۳ء

نرمل چندر — سرور ہستی
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص۔ ۲۲۹۔ جنوری ۱۹۲۶ء

ہربرٹ این کیسن — کامیاب زندگی۔ مترجمہ محمد اقبال
اردو۔ دہلی۔ ص۔ ۳۹۸ جولائی ۱۹۲۳ء

محمد اشرف — اخلاق الاشرف موسوم بہ فروغ بزم
اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص۔ ۳۰ جنوری ۱۹۲۱ء

محمد سعید — مراۃ الاخلاق، مخزن ادب
اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۸۶۷۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء

جے۔ اے چندراورکر — ہندو اخلاقیات
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۸۷، اکتوبر ۱۹۳۴ء

نٹشے — مترجمہ۔ مظفر الدین
اردو۔ اورنگ آباد دکن جنوری ۱۹۲۸ء ص۔ ۱۴۹

محمد اقبال — فلسفہ عجم۔ مترجمہ۔ میر حسن۔
اردو۔ اورنگ آباد دکن، ص۔ ۲۳۰۔ ۲۳۳ جنوری ۱۹۳۷ء

—— تاریخ فلسفہ اسلام۔ مترجمہ حامد حسین
اردو، اورنگ آباد۔ دکن، ص ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ جولائی ۱۹۲۶ء

مذہب :-

محمد فاروق — مطالبہ فطرت، قیل وقال یعنی اتحاد مذہب و فلسفہ،
اردو۔ اورنگ آباد ص۔ ۲۵۷-۲۵۸
اپریل ۱۹۲۶ء

عسکری علی خاں حجازی — تجدید عمل مذہب کی ایک نئی تفسیری
اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص - ۸۷۵-۸۷۶
اکتوبر ۱۹۳۳ء

عسکری علی خاں حجازی — تجدید عمل
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص - ۶۱۰ - ۶۱۱ - جولائی ۱۹۳۳ء

— ہندو مذہب کی معلومات
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص - ۱۲۲ - ۱۳۴ - اکتوبر ۱۹۲۴ء

مولوی عبدالحق — ویدوں کی بہشت

— اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص - ۳۸۳
جولائی ۱۹۲۸ء
یجروید کا اردو ترجمہ، مترجمہ مولوی عبدالحق
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص - ۴۸۳ - ۴۸۴ - جولائی ۱۹۲۸ء

منور بشیشور پرشاد — بھگوت گیتا منظوم موسوم بہ نسیم عرفان
اردو۔ دہلی۔ ص۔ ۱۵۲۔ جنوری ۱۹۳۰ء

دینا ناتھ مدن — پیہم سالک (یعنی اشٹاوکر کی گیتا کا منظوم ترجمہ ہے)
اردو، اورنگ آباد (دکن)
ص - ۶۸۰ - ۶۸۱ - جولائی ۱۹۳۷ء

— بھگوت گیتا (بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ) مترجمہ یوگی راج نظر سرہالوی
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص ۱۵۶ - جنوری ۱۹۳۶ء

منظور علی رضوی — اوتاروں کے قصے (اسمیں رام چندر جی کرشن جی اور مہابھارت کی لڑائی کے حالات ہیں)
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص - ۵۶۵ - جولائی ۱۹۲۹ء

نرمل چندر — نور ہستی
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
ص - ۲۲۹ - ۲۳۰ - جنوری ۱۹۳۷ء

رائے بہادر شیو نرائن شمیم — برہمو اور اس کا مت
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص - ۷۰۱ - ۷۰۲ - اکتوبر ۱۹۳۳ء

غلام الحسنین — سوامی دیانند اور ان کی تعلیم
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص - ۴۳۹ - ۴۴۱ - اپریل ۱۹۳۲ء

سلیمان ندوی — خطبات مدراس
(وہ خطبے جو سلیمان ندوی نے گذشتہ سال مدراس کے انگریزی مدرسوں کے طلبہ کے سامنے دیئے)
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص - ۷۰۳ - اکتوبر ۱۹۲۶ء

آسی، ممتاز علی — یاد اسلام۔
اردو، اورنگ آباد دکن، ص ۸۲۴، جولائی ۱۹۳۳ء

محمود بریلوی — فیضان اسلام
اردو۔ کراچی۔ ص۔ ۴۰۹-۴۱۰
جولائی، اکتوبر ۱۹۵۶ء

کمال الدین — اسلام میں کوئی فرقہ نہیں
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص – ۴۵۷ – ۴۵۸ – جولائی ۱۹۲۳ء

کفیل احمد — احکام اسلام
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص – ۵۰۳ – جولائی ۱۹۳۶ء

محمد مرزا خاں — بہشتی جھومر
اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۵۴۶ جولائی ۲۶ء

خواجہ اختر — خورشید صداقت
اُردو، اورنگ آباد (دکن) ص۔۷۰۳۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء

حافظ علی خاں — اعتماد محمود
اردو، اورنگ آباد (دکن) ص ۵۰۱ جولائی ۱۹۳۲ء

ریاض علی — ، الکرار و شہید اعظم وغیرہ

اسلام اور اس کے شارع مقدس
کی بعض خصوصیات
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص – ۳۸۷ – ۳۸۸ – اپریل ۱۹۲۴ء

— انجمن اسلامیہ حیدرآباد۔ دکن۔
مجموعہ مضامین (پہلا حصہ)
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص۔ ۷۳۱ – ۷۳۲۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء

— اسلامی انسائکلوپیڈیا

مترجمہ: محمد عبد المقیت
اردو۔ دہلی۔ ص۔ ۶۶۰۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء

— اسلامی لغت۔ جلد اول
مترجمہ: سید حامد حسین
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص – ۴۷۸ – ۴۷۹ – جولائی ۱۹۲۸ء

مسعود عالم — ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔
اردو۔ دہلی۔ ص ۱۲۶۔ جنوری ۱۹۴۰ء

— روئداد ادارۂ معارف اسلامیہ اجلاس
دوم منعقدہ لاہور۔ اپریل ۱۹۳۶ء
اردو۔ دہلی۔ ص ۳۶۹-۳۷۰۔ اپریل ۱۹۳۹ء

— حکومت الٰہیہ اور علما و مفکرین
(اس کتاب میں بیس بائیس حضرات کے
مختلف مضمون یا ان کے اقتباسات اخبارات
و رسائل سے لیکر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔
اردو۔ دہلی۔ ص ۵۲۵-۵۲۶، اکتوبر ۱۹۴۶ء

سلیمان ندوی — حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت
اردو۔ دہلی۔ ص۔ ۱۳۸۔ جنوری ۱۹۴۷ء

امیر حسن — خلافت و سلطنت۔ مترجمہ، سبطین احمد
اردو۔ دہلی۔ ص ۶۵۸، ۶۵۹۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء

— اسلام نظام تعلیم
مترجم: درانی فضل کریم خاں
اردو – اورنگ آباد (دکن)
ص – ۳۴۳ – ۳۴۴ – اپریل ۳۲ء

— درسیہ عثمانیہ

اردو۔ اورنگ آباد۔ دکن۔
ص ۔ ۵۱۱ ۔ ۵۱۲ ۔ جولائی ۱۹۳۰ء

عبدالباری ندوی — تجدید تعلیم و تبلیغ
اردو۔ کراچی۔ ص ۱۵۳۔۱۵۵۔ اپریل ۱۹۵۱ء

عمادالدین نضامی — سلسلۂ گلدستۂ تعلیم اسلام
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۲۲۳ ۔ ۲۲۴ ۔ جنوری ۱۹۳۶ء

عابد حسین — مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۳۱۵ ۔ ۳۱۶ ۔ اپریل ۱۹۲۸ء

قمر علی — نصاب مرغوب موسوم بہ جدید الاسلوب
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۵۱۲ ۔ ۵۱۴ ۔ جولائی ۱۹۳۰ء

— تحریک سیرت انجمن
مسلمانوں کی دینی تعلیم
اردو۔ دہلی۔ ص ۲۵۰، ۲۵۱۔ اپریل ۱۹۴۳ء

غلام دستگیر — اسلامی تقاریب
(اس کتاب میں دستگیر نے نظام کالج کے
بعض مشہور اہل قلم کے مقالے جمع کئے ہیں)
اردو۔ دہلی۔ ص ۳۸۵۔ جولائی ۱۹۴۶ء

عبداللہ رشید — قریش اور اسلام
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۳۸۹ ۔ اپریل ۱۹۲۴ء

یعقوب حسن — کتاب الٰہی حصہ اول
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)

ص ۔ ۳۱۹ ۔ ۳۲۰ ۔ اپریل ۱۹۲۶ء

واجدہ خانم — (۱) اساس القرآن
(۲) قوت القرآن
اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۵۵ جنوری ۱۹۳۶ء

— مکتبہ نشاۃ ثانیہ۔ حیدرآباد (دکن)
(۱) مقاصد قرآن
(۲) علم اور اسلام
(۳) نظام نو
اردو۔ دہلی۔ ص ۱۲۹۔ جنوری ۱۹۴۷ء

عبدالعلیم — عقیدہ، اعجاز قرآن کی تاریخ
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۴۹۷ ۔ اپریل ۱۹۳۶ء
قرآن اور سیرت سازی ۔
ادارہ اشاعت اسلامیات ۔
اردو۔ دہلی۔ ص ۔ ۲۵۶۔ اپریل ۱۹۴۶ء

محب الحق عظیم آبادی — شریعۃ الحق
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۴۳۶ ۔ ۴۳۸ ۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء

خلیل احمد — کلید قرأت ۔ یعنی تجوید کی پہلی کتاب ۔
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۔ ۲۲۵ ۔ جنوری ۱۹۲۴ء

سعید احمد — فہم قرآن ۔
اردو۔ دہلی۔ ص ۳۲۳۔ اپریل ۱۹۴۷ء

— رہنمائے قرآن ۔ مترجمہ : ولی الدین
اردو۔ دہلی۔ ۳۸۴۔۳۸۵۔ جولائی ۱۹۴۶ء

عبدالحی فاروقی	برھان اردو۔ اورنگ آباد۔ دکن۔ ص ۔ ۷۸۷ ۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء	محب الحق	بلاغ الحق اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ جنوری ۱۹۳۷ء
غلام احمد پرویز	معارف القرآن جلد اول: ۲ فقہ اردو۔ دہلی۔ ص ۲۴۶۔ ۲۵۰۔ اپریل ۱۹۴۳ء	محمد اسمٰعیل	الکتاب التوحید اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۱۶،۷ جولائی ۱۹۳۱ء
—	ادارہ دارالاسلام (تفسیر پارہ الم) اردو۔ دہلی۔ ص ۲۵۰۔ اپریل ۱۹۴۳ء	شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی	کتاب التوحید اردو۔ کراچی۔ ص ۱۲۱۔ جنوری ۱۹۵۷ء
حمیدالدین	تفسیر سورہ لہب اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ اپریل ۱۹۳۷ء	محمد رشید رضا	وحی محمدی اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ اپریل ۱۹۳۵ء
—	تعلیم القرآن۔ ادارہ اشاعت اسلامیات اردو۔ دہلی۔ ص ۲۵۶۔ اپریل ۱۹۳۶ء	حفیظ اللہ پھلواری	اسلامی مساوات اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ جولائی ۱۹۳۳ء
ولی الدین	قرآن اور تصوف اردو۔ دہلی۔ ص۔ ۵۲۵۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء	حفیظ اللہ پھلواری	اسلام اور غیر مسلم۔ اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۵۸۲ جولائی ۱۹۲۹ء
مرتضیٰ احمد	الہامی افسانے اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص۔ ۱۳۴۔ جنوری ۱۹۲۸ء	حفیظ اللہ پھلواری	اسلام اور غلامی اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۴۸۲ جولائی ۱۹۳۸ء
—	تدوین حدیث۔ (مناظر احسن گیلانی نے احادیث قلم بند کی ہیں اردو۔ دہلی۔ ص ۱۲۸، ۱۲۹۔ جنوری ۱۹۴۷ء	سعید احمد	الرق فی الاسلام یعنی اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اردو۔ دہلی۔ ص ۲۷۹، ۲۸۲۔ اپریل ۱۹۴۰ء
عبدالصمد سیوہاری	تاریخ الحدیث اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص۔ ۴۹۵۔ ۴۹۷۔ جولائی ۱۹۳۶ء	محمد حمید اللہ	رومی اور اسلامی ادارہ غلامی اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۱۹۲۔ جنوری ۱۹۲۱ء
		محمد مقتدی علی خان	الایمان اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۱۴۷ جنوری ۱۹۲۸ء
عنایت اللہ	اربعین حدیثاً (عربی) اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۶۹۳۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء	سلیمان ندوی	فلسفۂ ایمان اردو۔ دہلی۔ ص ۱۲۸۔ جنوری ۱۹۴۷ء

سلیمان ندوی	علم معاش و معاد اردو۔ دہلی۔ ص ۱۲۸۔ جنوری ۱۹۲۷ء
بشیر الدین محمود	اسلام اور ملکیت زمین۔ اردو۔ کراچی۔ ص ۱۵۲-۱۵۴۔ جنوری ۱۹۵۱ء
محمد علی شاہ	نغمہ اور اسلام اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۷۹۷۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء
—	مخزن نجات۔ مترجمہ شرف الدین اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۷۸۳۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء
—	الفضل (عبادت اور اسکی غایت) اردو۔ اورنگ آباد۔ دکن۔ ص ۱۹۵۔ جنوری ۱۹۳۱ء
حسن نظامی	تاکید نماز اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۱۳۳۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء
منصور علی	حقیقت حج اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۱۷۴-۱۷۵۔ جنوری ۱۹۳۵ء
حبیب الرحمن رئیس	کتاب الحجاب اردو، اورنگ آباد (دکن) ص ۷۸۲، ۷۸۳، اکتوبر ۱۹۲۶ء
عقیل محمد	ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ اردو۔ دہلی۔ ص ۳۷۸، ۳۷۹۔ اپریل ۱۹۴۰ء
محمد طیب	تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام اردو۔ دہلی۔ ص ۲۴۷، ۲۴۸۔ اپریل ۱۹۴۰ء

میر حسن	رموز العارفین مرتبہ احمد اللہ اردو اورنگ آباد (دکن) ص ۴۸۱ اپریل ۱۹۳۲ء
اعجاز حسین	آئینۂ معرفت اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۴۹۳-۴۹۵۔ جولائی ۱۹۳۲ء
شیخ غلام محمد احمد	صبغت اللہ اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۴۹۱-۴۹۲۔ جولائی ۱۹۳۲ء
عبدالباری ندوی	تجدید تصوف و سلوک اردو۔ کراچی۔ ص ۱۵۳۔ اپریل ۱۹۵۱ء
احمد جنگ	المبسوط اردو۔ کراچی۔ ص ۱۴۰۔ جنوری ۱۹۵۵ء
عبدالباری ندوی	جامع المجددین اردو۔ کراچی۔ ص ۱۵۳۔ اپریل ۱۹۵۱ء
عبدالحلیم شرر (مرحوم)	معتزلہ اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۱۶۸۔ جنوری ۱۹۲۷ء
امتیاز علی	سراج منیر اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۳۵۵۔ اپریل ۱۹۲۶ء
بشیر الدین محمد احمد	دنیا کا محسن اردو۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۶۹۲-۶۹۳۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء
توفیق الحکم مصری	محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ مترجمہ: ملیح آبادی۔ اردو۔ دہلی۔ ص ۴۰۱۔ جولائی ۱۹۴۳ء

حبیب الرحمن شروانی — ذکر جمیل ۔ ذکر حبیب
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۱۴۷، جنوری ۱۹۲۸ء

خواجہ عبدالحی — ہمارے رسول
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۶۹۵۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء

حسن نظامی — اسلامی رسول
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۱۳۲-۱۳۳۔ اکتوبر ۲۴ء

خواجہ حسن نظامی — داعی اسلام
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۱۳۴۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء

سلطان شاہ بانو بیگم — ذکر مبارک
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۱۴۷، جنوری ۱۹۲۶ء

سعید احمد — تقریر سیرت
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۴۹۸۔ جولائی ۳۶ء

عباس شوستری — خاتم النبیین و آموزش اسلام (جلد اول)
اردو۔ دہلی۔ ص ۶۶۰-۶۶۱ اکتوبر ۱۹۲۷ء

عبدالحی فاروقی — ذکری
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۳۶۱-۳۶۲۔ اپریل ۱۹۲۹ء

عبدالحی فاروقی — ہمارے رسول
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۲۴۹۔ اپریل ۱۹۳۰ء

عبدالعلیم — سیرت نبوی و مستشرقین
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۱۷۱-۲۰۰۔ اکتوبر ۳۱ء

کمال الدین — نبوت کا ظہور اتم المعروف نبی کامل
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۸۲-۸۷۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء

محمد حامد — شاہ و گدا
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۳۱۲۔ اپریل ۱۹۲۶ء

محمد عبدالغفار — میلاد النبی پروجکٹ
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۷، جنوری ۳۲ء

نواب علی — ہمارے نبی
اردو۔ اورنگ آباد۔ ص ۶۹۴-۶۹۵۔ اکتوبر ۲۸ء

عبدالجلیل نعمانی — فرمان نبوت (آنحضرت کے نامہ جات)
اردو۔ اورنگ آباد۔ ص ۱۴۰۔ جنوری ۱۹۲۳ء

بدرالدین سیوہاروی — احسن القصص نمبر ۱
اردو۔ اورنگ آباد۔ ص ۱۴۹۔ جنوری ۱۹۲۳ء

احید الدین بدایونی — حالات انبیاء
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۱۹۵ جنوری ۱۹۳۱ء

شرف الدین احمد — کلمات طیبات (اقوال امیر علیہ السلام)
اردو۔ اورنگ آباد۔ ص ۲۲۳-۲۲۴۔ اپریل ۱۹۲۲ء

جلال الدین — سیرت شہید کربلا۔ جلد دوم۔ مترجمہ محمد ایوب
اردو۔ دہلی۔ ص ۲۰۱-۲۰۲۔ جولائی ۱۹۲۳ء

علی شبیر — مزارات حرمین
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۵۸۴-۵۸۵۔ جولائی ۱۹۲۹ء

بدرالسلام — اسلامی کہانی
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۱۲۵۔ جنوری ۱۹۲۸ء

اختر جونا گڑھی — اسلام کا اثر یورپ پر
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۷۴۰۔ جولائی ۱۹۲۳ء

زاہدی۔ ایم۔ ایچ — EURODE DEBT TO ISLAM
(یعنی اسلام کا احسان یورپ پر)
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۳۴۷-۳۴۸۔ اپریل ۳۲ء

کمال الدین — تمدن اسلام حصہ اول
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)، ص ۷۷۳-۷۷۴۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء

عمرانیات

فاطمہ شجاعت   ابتدائی سماجی انسانیت
اردو۔ کراچی   جنوری ۱۹۵۷ء
ص ۱۲۰۔۱۲۱

عبدالشکور   آہِ بے کساں المعروف بہ نالۂ بنگال
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن)
جنوری ۱۹۲۸ء   ص ۱۴۸

فائق کامران   ایک تہذیبی وحدت
اردو کراچی   اکتوبر ۱۹۵۵ء
ص ۵۷۳۔۵۷۴

شہر، شہری اور شہریت۔
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر ۱۹۲۷ء   ص ۷۸۵

ذاکر حسین مترجم   ریاست
اردو اورنگ آباد دکن
جولائی ۱۹۲۲ء   ص ۴۹۵۔۴۹۷

اجمل خان   سیاسیات
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر ۱۹۲۴ء   ص ۱۴۳۔۱۴۴

ہارون خان شروانی   مبادی سیاسیات
اردو دہلی اپریل ۱۹۴۱ء
ص ۳۲۵

محمد اشرف   مبادی علم المعیشت
اردو اورنگ آباد دکن اپریل ۱۹۳۳ء
ص ۴۵۲

کینن   مبادی معاشیات
دالی منٹری پولیٹیکل اکونومی
مترجمہ ذاکر حسین
اردو اورنگ آباد۔ جنوری ۱۹۲۳ء
ص ۱۵۰۔۱۵۱

شیدا محمد مترجم   کسب معیشت
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر ۱۹۳۲ء   ص ۷۵۸۔۷۵۹

شاہد حسین   مشرق بعید
اردو دہلی۔ اپریل ۱۹۴۴ء
ص ۳۰۰۔۳۰۱

زین العابدین احمد   ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض معاشی اور مالی پہلو۔
اردو۔ دہلی   اپریل ۱۹۳۹ء
ص ۳۷۰۔۳۷۱

کماریا   مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب۔ مترجمہ۔ محمد حسین۔
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر ۱۹۳۲ء
ص ۷۵۱۔۷۶۰

منظور الحسن   پارلیمانی طرز حکومت
اردو۔ دہلی   اپریل ۱۹۴۴ء
ص ۲۹۹۔۳۰۰

محمود شیر   یورپ کا دستور حکومت حصہ اول
دستوری ترقی جرمنی، فرانسیسی، اٹلی، روسی

اردو۔اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۲۹ء
ص ۳۶۲

دستور پاکستان مترجمہ عطاء اللہ
اردو کراچی اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء
ص ۵۴۰-۵۴۱

رچرڈ پال پیام امن مترجمہ عبدالماجد
اردو اورنگ آباد جنوری سنہ ۱۹۲۴ء
ص ۱۶۱-۱۶۲

ولیم ورشبرک مرقع ہند بابت سنہ ۱۹۱۹ء مترجمہ
واجد حسین (رپورٹ جسے حکومت
ہند کے لئے پارلیمنٹ میں پیش کرنے
کی غرض سے مرتب کیا گیا تھا)
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۱ء ص ۴۷۵-۴۷۷

سلیمان ندوی عربوں کی جہاز رانی،
(یہ ان چار خطبوں کا مجموعہ ہے جو انہوں
نے انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی میں دیئے
تھے۔)
اردو اورنگ آباد (دکن) جولائی سنہ ۱۹۳۸ء
ص ۷۱۶-۷۱۹

معلومات ناظر۔ محمد غالب
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۶ء ص ۵۴۵

فیض محمد خان فن تعلیم وطریقہ تعلیم کی کتاب

اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۶ء
ص ۵۴۶-۵۴۸

عبدالحی علوی تعلیمی نفسیات
اردو کراچی جولائی سنہ ۱۹۵۰ء
ص ۱۴۵-۱۴۶

محمد ظفرالدین عافیہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۲۷ء ص ۳۷۲

شاہ ولی تعلیم بالغاں
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۳۷ء
ص ۶۹۹-۷۰۲

مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ۔ علی گڑھ
جاپان اور اس کا تعلیمی نظم ونسق
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۴ء
ص ۵۰۸-۵۱۲

انوار احمد زبیری خطبات عالیہ۔ (۳ حصے)
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء
ص ۶۹۶-۶۹۷

شبانہ لکچر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
اردو اورنگ آباد۔ (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۴ء ص ۵۰۱-۵۰۴

رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بابت سنہ ۱۹۲۵ء
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء
ص ۷۱۴

رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ منعقدہ
دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء
ص ۸۰۷

خطبات صدارت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
علی گڈھ
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۳۸ء
ص ۷۰۶ - ۷۰۷

بمبئی پریسیڈنسی مسلم لیڈیز ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ
پونہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء ص ۷۱۳ - ۷۱۴

محمد امین زبیری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی مختصر تاریخ
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء
ص ۸۷۶

جشن جوبلی علی گڈھ کالج اور اس کی علمی و ادبی کانفرنسیں
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۶ء ص ۳۲۱ - ۳۲۷

جامعہ ملیہ اسلامیہ - دہلی دستور العمل
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء ص ۷۶۵ - ۷۶۶

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نصاب تعلیم ابتدائی
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء
ص ۷۶۵

جامعہ ملیہ اسلامیہ (علی گڈھ) کا نصاب تعلیم
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء ص ۶۴۱ - ۶۵۰

نصیر الدین ہاشمی تذکرۂ دارالعلوم
اردو دہلی اپریل سنہ ۱۹۴۴ء
ص ۳۰۵ - ۳۰۶

حسن نظامی تجارت کی پہلی کتاب
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء ص ۶۳۹ - ۶۴۰

ظہور احمد چشتی تجارت کی دوسری، تیسری اور چوتھی
کتاب - (چوتھی کتاب صغیر علی)
اردو اورنگ آباد جنوری سنہ ۱۹۲۳ء
ص ۱۵۶ - ۱۵۷

آل انڈیا ڈی میسنز کانفرنس
اردو دہلی جنوری سنہ ۱۹۴۷ء
ص ۱۳۰

موتی - مرتبہ سید یوسف
(یہ حکیمانہ اور شاعرانہ اقوال کا مجموعہ ہے)

اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۴ء ص ۴۸۱-۴۸۲

محمد حسین خاں پانصد درتا در یا بزرگوں کی باتیں
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۳ء ص ۶۰۹

حامد اللہ افسر ہزار داستان
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۲۹ء ص ۵۶۶

حامد اللہ افسر علی بابا اور چالیس چور
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۲۹ء ص- ۵۶۶

لسانیات:-

صدیق الحسن جدید انگلش ٹیچر
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۲۹ء ص ۳۶۴

عبدالقدر سروری زبان اور علم زبان
اردو کراچی جنوری ۱۹۵۷ء
ص ۱۱۷-۱۱۸

شوکت سبزواری- اردو زبان کا ارتقا۔
اردو کراچی اکتوبر ۱۹۵۶ء
ص ۵۳۴-۵۳۹

اے-برانی-کوف اردو زبان میں فارسی عنصر
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری ۱۹۳۰ء ص ۱۶۹-۱۷۰

ترویج زبان اردو تالیف فرید الدین
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۲۶ء ص ۵۴۴

محمد عثمان گہوارہ اُردو۔
(اس کتاب کے دو حصے ہیں)
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری ۱۹۲۸ء ص ۱۴۴

محمد زین العابدین، آئین اُردو
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری ۱۹۲۷ء
ص ۱۶۰-۱۶۵

زبان اردو پر سرسری نظر (یہ ان شبانہ لکچروں میں سے ہے جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے گزشتہ اجلاس میں پڑھے گئے۔)
اردو اورنگ آباد جولائی ۱۹۲۴ء
ص ۵۰۱-۵۰۴

حفظ الرحمٰن حفظ العلوم یعنی اردو کی انسائیکلوپیڈیا
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۲۸ء
ص ۳۱۷-۳۱۸

زیر ترتیب لغات اردو اورنگ آباد د
اکتوبر ۱۹۲۳ء ص ۶۲۲-۶۲۳

عبدالرؤف عشرت لکھنوی لغات اردو (جلد اول و دوم)
اردو اورنگ جولائی سنہ ۱۹۲۳ء
ص ۴۵۴-۴۵۶

عبدالمجید جامع اللغات اردو والسنہ متعلقہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۳ء ص ۴۰۷-۴۰۹

فیض محمد مبادی اللغات
اردو دہلی - جنوری سنہ ۱۹۴۰ء
ص ۱۴۵

محمد سعید لغات سعیدی - مرتبہ عبدالعزیز
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۰ء ص ۳۳۳

محمد منیر لکھنوی سعیدی ڈکشنری
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری سنہ ۱۹۳۶ء ص ۱۴۷-۱۴۸

محمد اسمعیل اردو محاورات و ضرب الامثال
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء ص ۷۹۴

مرتبہ اندرجیت شرما محاورات اردو
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۲۹ء ص ۳۵۷-۳۵۸

محمود علی خان علم الحروف
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۵ء ص ۴۱۰-۴۱۱

مؤلف احمد دین سرگذشت الفاظ
اردو اورنگ آباد اپریل سنہ ۱۹۲۴ء
ص ۳۵۵-۳۵۷

محمد سلیم سلیقہ تحریر
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۰ء ص ۳۴۶

مینوئل خط شکستہ اردو
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۳۷ء ص ۶۹۵-۶۹۹

اردو کی آسان گرامر (دو حصے)
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء ص ۷۸۶

علی احمد نظام قواعد
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری سنہ ۱۹۲۷ء ص ۱۶۹

اسد علی خاں یکتا لکھنوی دستور الفصاحت
اردو دہلی جنوری سنہ ۱۹۴۴ء
ص ۱۳۹-۱۴۱

رشید احمد علم بدیع
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۷ء

الطاف حسین کاظم گلزار عروض
اردو اورنگ آباد
اپریل سنہ ۱۹۲۴ء
ص ۳۸۱-۳۸۳

بزمی انصاری امیر العروض
اردو دہلی جنوری سنہ ۱۹۴۰ء
ص ۱۵۲-۱۵۴

رشید احمد اسباق العروض
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۷ء ص ۴۷۷

علی حیدر تلخیص عروض وقافیہ
اردو اورنگ آباد اپریل سنہ ۱۹۲۴ء
ص ۳۸۳-۳۸۷

عبدالرؤف عشرت لکھنوی شاعری کی تیسری کتاب
اردو اورنگ آباد جنوری سنہ ۱۹۲۳ء
ص ۱۵۵-۱۵۶

محی الدین تقویم العروض القافیہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۴ء ص ۴۸۰

سیماب اکبرآبادی دستور الاصلاح
اردو دہلی اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء
ص ۶۴۹-۶۵۰

مرتبہ حسرت موہانی متروکات سخن
اردو اورنگ آباد - (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء ص ۶۸۱-۶۸۲

مترجمہ سبط حسین النجمتہ اساتذہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء ص ۷۹۶

غلام الدین ضروریات الادب اردو
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۴ء
ص ۴۸۹

اکبر علی اردو انقلابی قاعدہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۳۰ء ص ۵۰۹

شبیر احمد اتحادی قاعدہ
اردو دہلی جنوری سنہ ۱۹۴۰ء
ص ۱۴۴

نصیر ہمایوں اردو کی پہلی- دوسری- تیسری کتاب
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء ص ۷۷۸-۷۷۹

لطیف احمد اردو کی پانچویں- چھٹی- ساتویں
آٹھویں- کتاب
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۷ء ص ۴۷۲-۴۷۳

اردو پرائمری مدارس صوبۂ متوسط و برار کا درسی سلسلہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۳۵ء ص ۶۱۹

ابراہیم علی وعبدالرشید سہل اردو آموز کا پہلا قاعدہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری سنہ ۱۹۳۵ء ص ۱۶۳

منازل الترجمہ (انگریزی اردو ترجمے کی کتاب)
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء ص ۷۸۶

اخلاق دہلوی — مضمون نگاری
اردو دہلی جنوری ۱۹۴۷ء
ص ۱۴۴

رمضان علی — گلدستۂ مضامین انشاپردازی
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری ۱۹۳۸ء ص ۲۱۶-۲۱۷

لطیف احمد — نصاب اردو
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۳۷ء ص ۴۷۳

لطیف احمد — انتخاب اردو
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۳۷ء ص ۴۷۳

وقار عظیم — انشاء کی تعلیم
اردو، دہلی جولائی ۱۹۴۶ء
ص ۳۸۶

محمد علی خان — انشائے جدید
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۸ء ص ۴۸۴-۴۸۵

ہندی اردو لغت — راجہ اصغر
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۸ء ص ۷۱۵

میرزا خاں ابن فخرالدین محمد — قواعد کلیۂ بھاکھا مرتبہ
ایم ضیاالدین
اردو اورنگ آباد دکن
جنوری ۱۹۳۶ء ص ۱۴۵-۱۴۷

مخزن فارسی (فارسی قواعد) اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر ۱۹۲۷ء ص ۷۸۶

فضل الدین فیاض — فارسی مصادر
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری ۱۹۳۷ء ص ۱۶۸

عبدالغفور — میٹریکولیشن پرشین گرامر اینڈ کمپوزیشن
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۰ء ص ۵۰۶

فضل الدین فیاض — ترجمہ انٹرمیڈیٹ پرشین کورس
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۰ء ص ۵۱۰

تلمیحات واشارات درادب فارسی (انگریزی)
مرتبہ زال ایس آر-ایرانی
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری ۱۹۳۸ء ص ۲۲۴

نعیم الرحمٰن — اساس عربی
اردو کراچی جنوری ۱۹۵۷ء
ص ۱۲۱ — ۱۲۲

مرتبہ محمد یحییٰ — تسہیل العربیہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۸ء ص ۷۱۳-۷۱۵

زین العابدین — مفتاح العربیہ
اردو دہلی اکتوبر ۱۹۴۰ء
ص ۶۵۹-۶۶۰

عبدالرب کوکب — معیار الاخلاق عربی

(عربی پڑھنے والوں کے لئے)
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۲۹ء ص ۵۸۳

مرتبہ مسعود عالم: الترجمہ العربیہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری ۱۹۳۱ء
ص ۲۰۰

شمس الدین احمد عربی پر ایک لکچر
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر ۱۹۲۶ء ص ۷۱۲

سائنس :-

محمد عبدالحق عجائبات سائنس
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۳۷ء ص ۴۷۴

محمد عمر حسنی مشاہدات سائنس
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری ۱۹۳۳ء ص ۲۳۶-۲۳۷

منہاج الدین نظریۂ اضافیت
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر ۱۹۲۶ء ص ۷۰۶-۷۱۰

ینگ کی بڑی ہیئت جدید ترجمہ
اردو- اورنگ آباد دکن
اکتوبر ۱۹۲۴ء ص ۱۴۲-۱۴۳

راحت حسین نیرنگ ارض

اردو اورنگ آباد
اپریل ۱۹۲۳ء ص ۳۱۴-۳۱۵

سراوریل آسٹائن سفرنامہ- سیاحت ہوا۔
مترجمہ محمود اعظم فہمی۔
اردو اورنگ آباد جولائی ۱۹۲۳ء
ص ۴۵۴

فیروز الدین مراد بادل کے بچے
اردو- اورنگ آباد -
اپریل ۱۹۲۳ء ص ۳۱۴

سلیم بیگ چند پرند
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۲۷ء ص ۲۷۴-۲۷۵

علوم مفیدہ :-

محمد حفیظ اللہ مسلمانوں کی ایجادیں۔
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر ۱۹۲۸ء ص ۶۸۸

اشرف الحق دوران افرازیات
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۳۴ء ص ۵۱۷

عبدالجلیل علم الصحتہ
اردو- اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۲۷ء ص ۵۲۲

عبدالجلیل علم الصحت
(اس کتاب میں فعل کی دیکھ بھال کے

بارے میں بتایا ہے)
اردو۔اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۱ء
ص ۵۶۴-۵۶۵

ای۔مارسڈن صحت کی کہانی مترجمہ عابد جبین
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۲۷ء ص ۳۷۳

مہاتما گاندھی رہنمائے صحت مترجمہ محمد اعظم
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۰ء ص ۵۲۴-۵۲۵

اشرف الحق اعادۂ شباب کا ایک سہل طریقہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۳۴ء ص ۵۱۷

محمد اشرف الحق اعادۂ شباب و درازئ عمر
اردو اورنگ آباد دکن
جنوری ۱۹۳۲ء ص ۱۷۴-۱۷۵

اشرف الحق اعادۂ شباب و درازی عمر
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۳۴ء ص ۵۱۷

اشرف الحق تجدید شباب کے چند مغربی طریقے
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۳۴ء ص ۵۱۷

اشرف الحق بڑھاپے سے مقابلہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۳۴ء ص ۵۱۷

محمد اشرف الحق جوانی کا تحفظ اور بڑھاپے کی روک تھام
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۴ء ص ۶۷۸-۶۷۹

اشرف الحق عمر گھٹنے کے اسباب
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۳۴ء ص ۵۱۷-۵۱۸

موہن لال سیٹھی نباتات اور نباتاتی خوراک
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۲۸ء ص ۲۱۷

اشرف الحق قوائے جسمانی پر غذا کا اثر
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۳۴ء ص ۵۱۸

اشرف الحق وٹامائنس۔
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۳۴ء ص ۵۱۸-۵۱۹

الکحل اور زندگی مترجمہ حامد حسن
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل ۱۹۲۷ء ص ۳۷۴

—— نواکہات اورنگ آباد
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر ۱۹۲۳ء ص ۷۳۴

اکبر علی زیدالہبری دیسی فارماکوپیا موسوم بہ علاج بالمرکبات
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۸ء ص ۷۱۰

کبیر الدین — کلیات ادویہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۸ء ص ۷۰۹-۷۱۰

محمد یحییٰ — طب اسلامی
اردو کراچی اپریل سنہ ۱۹۵۱ء
ص ۱۵۲-۱۵۳

ایڈورڈ۔جی۔ براؤن طب العرب حصہ اول یا تصویر
مترجمہ علی احمد نیر
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۷ء ص ۴۷۵-۴۷۶

اشرف الحق — نفسیاتی علاج
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۴ء ص ۵۱۸

اشرف الحق — غدود کے جوہر اور علاج مرض
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء ص ۹۵۵

رام سروپ — امراض نوجوانان۔ حصہ اول و دوم
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری سنہ ۱۹۲۸ء ص ۱۴۸

عبد الحکیم — ہندوستانی گھروں میں تیمارداری
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری سنہ ۱۹۲۲ء ص ۱۷۸

بودھراج چوپڑہ — ماں اور بچہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۳۲ء ص ۵۲۵-۵۲۶

نفیس حسن انصاری — زراعت علی (حصہ اول)
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء ص ۷۱۱-۷۱۲

نور الٰہی و محمد عمر — ریگولیشن دادرسی اشخاص زراعت پیشہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۲۷ء ص ۳۷۵-۳۷۶

نصیر ہمایوں — گائے بیل
(اس میں گائے بیل کی بیماریاں خوراک دیکھ بھال کے بارے میں لکھا ہے)
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۹ء ص ۵۸۴

نفیس حسن انصاری — فن پولیٹری فارمنگ یا پرندوں سے نفع اور آسائش۔
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء ص ۷۱۲

ہادی حسین رضوی — ماڈرن بک کیپنگ اردو
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۰ء ص ۳۵۰

نظام الدین — صنعت و حرفت (صوبہ اورنگ آباد)
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری سنہ ۱۹۲۲ء ص ۱۷۶-۱۷۷

حسن نظامی — پنواڑی کی دکان
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء ص ۱۳۳

عبدالغفور سونے کی چڑیا
اردو - دہلی جولائی ۱۹۴۴ء
ص ۴۵۹-۴۶۰

فنونِ لطیفہ

سدرشن، دنیا کے عجائبات (عمارت و آثار کا ذکر)
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر ۱۹۲۷ء ص ۷۸۴

سعادت علی خان نغمۂ سعادت
اردو اورنگ آباد دکن
اکتوبر ۱۹۲۲ء ص ۷۳۱

محمد شجاع فوٹو گرافی
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری ۱۹۳۱ء ص ۱۹۶-۱۹۸

محمد علی نقادی کے نکتے
اردو اورنگ آباد-
اپریل ۱۹۲۶ء ص ۳۳۰

اکبر علی پیراک (یہ فن شناوری پر ہے)
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی ۱۹۳۴ء ص ۶۸۳

ابراہیم عادل شاہ ثانی کتاب نورس
(عادل شاہی حکومت دکن)
اردو کراچی اکتوبر ۱۹۵۵ء
ص ۵۶۲-۵۶۴

نواب قطب یار جنگ بہادر شکار
اردو اورنگ آباد دکن
جنوری ۱۹۳۶ء ص ۱۵۶-۱۵۷

فارغ بخاری پشتو لوک گیت
اردو کراچی جنوری ۱۹۵۲ء
ص ۱۱۷-۱۱۸

عبدالسلام خورشید پاکستان کے لوک ناچ
اردو-کراچی - اکتوبر ۱۹۵۰ء
ص ۱۴۵-۱۴۷

ادبیات

واشنگٹن ارونگ خیالات ارونگ مترجمہ - محمد یحییٰ
اردو اورنگ آباد دکن ص ۴۳-۴۷، ۵۴
جولائی ۱۹۲۸ء

میر حسن ورڈزورتھ اور اس کی شاعری
اردو اورنگ آباد دکن ص ۲۲۴-۲۲۵
جنوری ۱۹۳۳ء

شیکسپیر جولیس سیزر مترجم تفضل حسین
اردو اورنگ آباد ص ۳۸۰-۳۸۱
اپریل ۱۹۲۴ء

شیکسپیر پسند خاطر مترجمہ ولایت حسین
اردو اورنگ آباد دکن ص ۶۸۵
اکتوبر ۱۹۲۸ء

لیول، آر، ایچ مصنوعی بیوی مترجمہ عباس حسین
اردو اورنگ آباد دکن ص ۱۳۵
جنوری ۱۹۲۸ء

—	جزیروں کے گیت مترجمہ سید ضمیر اردو کراچی ص ۵۷۶ - ۵۷۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء
گوئٹے	فاؤسٹ مترجمہ عابد حسین اردو اورنگ آباد دکن ص ۴۸۵۲ - ۴۸۶ جولائی ۱۹۳۲ء
شلر	قزاقی - مترجمہ و مولفہ محمد عمر و نور الٰہی اردو اورنگ آباد دکن ص ۴۴۷ - ۴۵۱ جولائی ۱۹۲۳ء
وکٹر ہیوگو	عروس غربت - مولفہ ایم اسلم اردو اورنگ آباد دکن ص ۷۸۱ - ۷۸۲ اکتوبر ۱۹۲۷ء
تمرلنک	ظفر کی موت مترجمہ و مولفہ نور الٰہی و محمد عمر اردو اورنگ آباد دکن ص ۱۵۵ - ۱۵۶ جنوری ۱۹۲۴ء
ماترلنک	مونا وانا مترجمہ جلیل احمد قدوائی اردو اورنگ آباد دکن ص ۵۹۷ جولائی ۱۹۳۳ء
ونگے، ایس، اے	موت کے غار اردو دہلی ص ۵۴۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء
آل حسین	شیطان سبھا - پیراڈائس لوسٹ کا منظوم ترجمہ اردو اورنگ آباد دکن ص ۳۲۵ - ۳۲۶ اپریل ۱۹۳۳ء
صفدر علی	شاہزادہ یوذاسف و حکیم بلوہر اردو اورنگ آباد دکن ص ۱۵۶ جنوری ۱۹۲۳ء
—	بیلی یاس اور میلی ساند - مترجمہ تمنائی اردو اورنگ آباد دکن ص ۲۲۴ جنوری ۱۹۳۷ء
ٹالسٹائی	اسرار کائنات مترجمہ خورشید جیلانی اردو دہلی ص ۳۹۹ - ۴۰۰ جولائی ۱۹۴۳ء
سید نور الحسن	ادب کا مقصد (مجموعہ مضامین سید نور الحسن) اردو کراچی ص ۱۱۸ - ۱۱۹ جنوری ۱۹۵۶ء
رام بابو سکسینہ	اردو ادب کی تاریخ (انگریزی) اردو اورنگ آباد دکن ص ۱۳۸ - ۱۴۰ جنوری ۱۹۲۸ء
بیلی، گریہم	اردو لٹریچر (بزبان انگریزی) اردو اورنگ آباد دکن ص ۵۸۳ - ۵۹۱ جولائی ۱۹۳۳ء
رام بابو سکسینہ	تاریخ اردو ادب مترجمہ مرزا محمد عسکری اردو اورنگ آباد دکن ص ۷۹۲ - ۷۹۳ اکتوبر ۱۹۲۹ء
اعجاز، اعجاز حسین	مختصر تاریخ ادب اردو اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۹۰ - ۲۹۲ اپریل ۱۹۳۶ء
—	اردو زبان اور اردو ادب مرتبہ ضامن علی

مصنف	مضمون / رسالہ	مصنف	مضمون / رسالہ
	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۴۳ اپریل ۱۹۳۰ء		شجاع منعمی اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۶۹۹ اکتوبر ۱۹۲۸ء
شمس اللہ قادری	اردوئے قدیم اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۱۴-۵۴۴ جولائی ۱۹۲۶ء	—	اردو زبان اور ادب۔ مرتبہ و مؤلفہ ضامن علی (یعنی اردو کی سروے کمیٹی کی رپورٹ) اردو اورنگ آباد دکن ص ۲۰۴-۲۰۱ جنوری ۱۹۳۴ء
محمود شیرانی	پنجاب میں اردو اردو اورنگ آباد دکن ص ۶۹۴-۶۹۷ جولائی ۱۹۲۵ء		
سید اقبال	مشرقی بنگال میں اردو اردو کراچی ص ۱۵۳-۱۵۶ اکتوبر ۱۹۵۴	—	آل انڈیا مشاعرہ۔ مرتبہ احسن مارہروی اردو اورنگ آباد دکن ص ۷۹۶-۷۹۷ اکتوبر ۱۹۲۹ء
نصیر الدین ہاشمی	دکھنی ہند اور اردو اردو کراچی ص ۱۵۴ جولائی اکتوبر ۱۹۵۵ء	بدر منیر	تذکرہ میر حسن دہلوی اردو اورنگ آباد دکن ص ۱۶۱ جنوری ۱۹۲۳ء
محمد حسن	اردو ادب میں رومانوی تحریک اردو کراچی ص ۱۴۵ اکتوبر ۱۹۵۹ء	شیر علی	تذکرہ اعجاز سخن
سجاد ظہیر	روشنائی (اس کتاب میں سجاد ظہیر نے اپنی انجمن کی کارگزاریوں کے بارے میں تذکرہ کیا ہے) اردو کراچی ص ۴۱۵-۴۱۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء		اردو اورنگ آباد دکن ص ۳۶۳-۳۶۷ اپریل ۱۹۲۴ء
		قاسم، قدرت اللہ	مجموعہ نغز مرتبہ محمود شیرانی اردو اورنگ آباد دکن ص ۸۵۱-۸۵۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء
—	انجمن ترقی اردو کا ذکر اردو اورنگ آباد دکن ص ۶۲۱-۶۲۲ اکتوبر ۱۹۲۳ء	عبدالسلام	شعر الہند اردو اورنگ آباد دکن ص ۱۸۳-۱۹۰ جنوری ۱۹۲۶ء
—	رپورٹ سالانہ انجمن علم و ادب شملہ بابت ۱۹۲۶ء۔ مرتبہ	سری رام	خمخانۂ جاوید جلد پنجم اردو دہلی ص ۱۵۰ جنوری ۱۹۴۲ء

بے خبر، برج کشن کول	بہارگلشن کشمیر جلد اول	اردو اورنگ آباد دکن ص ۳۲۹ - ۳۳۰ اپریل جنوری ۱۹۳۲ء
بے خبر، برج کشن کول اور شوق، جگ موہن ناتھ رینہ	بہارگلشن کشمیر جلد ثانی (تذکرہ شعرائے کشمیری پنڈتان)	اردو اورنگ آباد دکن ص ۵۹۱ - ۵۹۲ جولائی ۱۹۳۳ء
—	مرقع سخن جلد اول و دوم مرتبہ محی الدین	اردو اورنگ آباد دکن ص ۴۹۰ - ۴۹۱ جولائی ۱۹۳۷ء
محمد سردار علی	شعرائے اورنگ آباد	اردو۔ اورنگ آباد، دکن ص ۵۶۲ جولائی ۱۹۲۷ء
رام بابو سکسینہ	اردو، فارسی کے یورپین اور انڈو یورپین شاعر	اردو دہلی ص ۵۶۰ - ۵۶۳ اکتوبر ۱۹۴۴ء
محمد سردار علی	یورپین شعرائے اردو	اردو، اورنگ آباد دکن ص ۱۶۰ جنوری ۱۹۲۷ء
قاسم علی	اردو کے ہندی ادیب	اردو دہلی ص ۲۹۳، ۲۹۴ اپریل ۱۹۴۴ء
محمود فاروقی	میر حسن اور ان کے خاندان کے شعراء	اردو کراچی ص ۱۵۴ - ۱۵۵ اپریل ۱۹۵۱ء
امیر احمد علوی	مثنویات	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۹۳ - ۲۹۴ اپریل ۱۹۳۶ء
تمکین کاظمی	تذکرۂ ریختی	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۲ جولائی ۱۹۳۰ء
عبد العلی شوق سندیلوی	اصلاح سخن	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۹۵ - ۴۹۷ اکتوبر ۱۹۲۶ء
ابو العلا حکیم ناطق	نظم اردو	اردو دہلی ص ۳۱۷ - ۳۲۳ اپریل ۱۹۴۱ء
اعجاز حسین	نئے ادبی رجحانات	اردو۔ دہلی ص ۴۱۷ - ۴۲۰ جولائی ۱۹۴۲ء
افسر، حامد اللہ	نقد الادب	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۹۹ - ۲۰۰ جنوری ۱۹۳۴ء
آل احمد سرور	تنقیدی اشارے	اردو۔ دہلی ص ۵۴۲۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء
آمنہ خاتون	تحقیقی نوادر	اردو۔ کراچی ص ۱۴۲ - ۱۴۵ جولائی ۱۹۵۰ء

بیخود موہانی	گنجینۂ تحقیق اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۹۹-۵۰۲ جولائی ۱۹۳۰ء
جلیل قدوائی	تنقیدیں اور خاکے (یہ جلیل قدوائی کے مضامین کا مجموعہ ہے) اردو کراچی ص ۱۳۱ - ۱۳۲ اپریل ۱۹۵۴ء
جعفر علی اثر لکھنوی	چھان بین (یہ جعفر علی کے پندرہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے) اردو۔ کراچی ص ۱۴۷ - ۱۴۸ جولائی ۱۹۵۰ء
حامد حسین	نقد و نظر اردو دہلی ص ۵۴۲ - ۵۴۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء
حیدر عباس حیدر	روح ادب اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۰۱-۲۰۲ جنوری ۱۹۳۴ء
کلیم الدین	اردو شاعری پر ایک نظر اردو۔ دہلی ص ۶۰۰ - ۶۰۴ اکتوبر ۱۹۴۱ء
کلیم الدین	اردو تنقید پر ایک نظر اردو۔ دہلی ص ۴۱۵ - ۴۱۶ جولائی ۱۹۴۲ء
محی الدین قادری	روح تنقید اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۹۹-۴۰۳

	اپریل ۱۹۲۶ء
—	تہذیب و تحریر اردو۔ کراچی ص ۱۹۲۔ ۱۹۳ جولائی۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء
ولی۔ دکھنی	دیوان ولی۔ مرتبہ ابراہیم سلیمانی اردو اورنگ آباد دکن ص ۱۵۷-۱۶۱ جنوری ۱۹۲۴ء
سراج الدین	سراج سخن (مجموعہ کلام سراج الدین) اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۵۹-۴۶۰ اپریل ۱۹۲۶ء
شاہ حاتم	دیوان شاہ حاتم مرتبہ حسرت موہانی اردو اورنگ آباد دکن ص ۶۸۱ اکتوبر ۱۹۲۸ء
شاہ عالم بادشاہ	نادرات شاہی۔ مرتبہ امتیاز علی عرشی (یہ شاہ عالم بادشاہ کے اردو، فارسی ہندی اور پنجابی اشعار کا مجموعہ ہے) اردو دہلی ص ۵۷۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء
میر، میر تقی	انتخاب میر اردو۔ اورنگ آباد۔ دکن ص ۵۰۷ جولائی ۱۹۲۴ء
انتخاب میر	(یہ انتخابات نور الرحمن صاحب نے کئے ہیں) اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۷ جولائی ۱۹۲۴ء
احمد فاروقی	میر تقی میر۔ حیات اور شاعری

	اردو - کراچی ص ۲۷۶ - ۲۷۷ اپریل ۱۹۵۵ء
محمد فاضل	تمیر کے بہتر نشتر اردو - دہلی ص ۹۴۴ - ۹۴۵ اکتوبر ۱۹۴۰ء
——	انتخاب کلیات سودا - مرتبہ طالب حسین اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۳۳ جنوری ۱۹۲۵ء
اثر سید محمد	دیوان اثر اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۱۰ - ۵۱۱ جولائی ۱۹۳۰ء
مصحفی	انتخاب دیوان مصحفی مرتبہ حسرت موہانی اردو - اورنگ آباد دکن ص ۶۸۱ اکتوبر ۱۹۲۸ء
مصحفی	بحر المحبت (یہ اردو کے پختہ کار شاعر مصحفی مرحوم کی مثنوی ہے) اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۱۳ - ۳۱۴ اپریل ۱۹۲۳ء
مصحفی	مثنوی بحر المحبت مرتبہ عبد الماجد دریابادی اردو - اورنگ آباد دکن ص ۸۰۴ جولائی ۱۹۲۸ء
میر حسن	مثنوی میر حسن - مقدمہ تحریر کیا - حامد اللہ اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۰۸ اپریل ۱۹۲۸ء

——	مثنوی گلزار نسیم - تشریح منظور علی اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۰۸ اپریل ۱۹۲۸ء
میر انیس	گنج پنہاں (یہ میر انیس کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ ہے) اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۶۴ جولائی ۱۹۳۴ء
حیدر یار جنگ	مراثی انیس جلد سوم اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۸۳ - ۱۸۴ جنوری ۱۹۳۱ء
محمد احسن	انیس کی مرثیہ نگاری اردو - کراچی ص ۱۵۱ - ۱۵۲ اپریل ۱۹۵۱ء
مرزا دبیر	سبع مثانی - مرتبہ سرفراز حسین اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۷۹ - ۲۸۰ اپریل ۱۹۳۱ء
اختر واجد علی شاہ	حزن اختر اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۶۸ - ۴۷۰ جولائی ۱۹۲۲ء
خواجہ احمد فاروقی	مرزا شوق لکھنوی (اس نام سے فاروقی نے شوق کی زہر عشق اور بہار عشق پر ایک تبصرہ لکھا ہے) اردو - کراچی ص ۱۴۸ - ۱۴۹ جولائی ۱۹۵۰ء
جان صاحب	دیوان جان صاحب

	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۷۸-۲۸۰ اپریل ۱۹۲۷ء
غالب	دیوان غالب اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۴۳-۴۱۵ اپریل ۱۹۲۵ء
غالب	انتخاب غالب مرتبہ امتیاز علی عرشی اردو۔ دہلی ص ۵۵۸ - ۵۵۹ اکتوبر ۱۹۴۲ء
غالب	دیوان غالب اردو مرتبہ امتیاز علی عرشی اردو۔ کراچی ص ۲۲۵ - جنوری۔ اپریل ۱۹۵۹ء
عبدالباری	مکمل شرح دیوان غالب اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۹-۳۶۳ اپریل ۱۹۲۴ء
احمدالدین مارہروی	غالب اور اس کی شاعری اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۸۱-۵۸۲ جولائی ۱۹۲۹ء
نظام الدین حسین نظامی	نکات غالب اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۶۳۹ اکتوبر ۱۹۲۱ء
غلام رسول مہر	غالب اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۰۱-۷۰۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء
مالک رام	ذکر غالب اردو۔ کراچی ص ۲۰۷
	جولائی ۱۹۵۵ء
عبداللطیف	غالب مترجمہ معین الدین چشتی اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۲۸-۲۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء
—	روداد مقدمہ مرزا غالب اردو دہلی ص ۱۴۲ - ۱۶۰ اپریل ۱۹۴۳ء
ذوق	ذوق کے سو شعر منتخب: عبداللہ اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۵۴ اپریل ۱۹۳۷ء
محمد رفیق خاور	خاقانی ہند (یہ ذوق کی شاعری پر مفصل تنقید ہے) اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۰۲-۲۰۴ جنوری ۱۹۳۴ء
ضیا، احمد ضیا	دیوان مومن مع شرح اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۵۹-۱۶۰ جنوری ۱۹۳۵ء
مومن	مجموعۂ قصائد مومن (ضیا احمد نے کلیات مومن کے مختلف نسخے جمع کرکے اس کی تصحیح کی ہے) اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۴۳ جولائی ۱۹۲۶ء
حالی، الطاف حسین	مسدس حالی اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۶۷-۱۶۸ جنوری ۱۹۳۰ء

حالی، الطاف حسین	جواہرات حالی اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۴۳ - ۱۴۷ جنوری ۱۹۳۳ء
حالی، الطاف حسین	کلیات نظم حالی جلد اول ۔ مرتبہ محمد اسمٰعیل اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۷۲-۲۷۷ اکتوبر ۱۹۳۰ء
طاہر جمیل	حالی کی شاعری اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۰۷-۷۰۹ جولائی ۱۹۳۸ء
حالی، الطاف حسین	رباعیات حالی مترجمہ ٹیوٹ بزبان انگریزی اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۰۳ جنوری ۱۹۳۳ء
نوراللہ محمد نوری	داغ (اس کتاب میں نواب مرزا داغ کے سوانح حیات ہیں۔ اور کلام پر تبصرہ ہے) اردو اورنگ آباد (دکن) ص ۲۲۲-۲۳۲ جنوری ۱۹۳۳ء
—	منتخب داغ ۔ مرتبہ احسن مارہروی اردو۔ دہلی ص ۶۱۵-۶۲۰ اکتوبر ۱۹۴۱ء
طالب الہ آبادی	اکبر الہ آبادی اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۶۹-۷۸۲ اکتوبر ۱۹۳۰ء

اکبر الہ آبادی	گلدستۂ اکبر ۔ مرتبہ عبداللہ اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۵۴ اپریل ۱۹۳۷ء
برج نرائن چکبست لکھنوی مرحوم	صبح وطن اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۶۹۳ اکتوبر ۱۹۲۶ء
آنند نرائن ملا	یاد چکبست اردو۔ دہلی ص ۱۵۲ جنوری ۱۹۴۰ء
عبدالرزاق	کلیات اقبال اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۹۰-۱۹۲ جنوری ۱۹۲۶ء
محمد اقبال	بانگ درا اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۰۷-۱۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء
محمد اقبال	بال جبریل اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۵۴-۴۹۴ اپریل ۱۹۳۵ء
محمد اقبال	ضرب کلیم اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۰۵-۷۰۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء
شیخ عبدالرحمٰن	ترجمان اسرار اردو ۔ کراچی ص ۱۶۱ - ۱۶۲ جولائی ۱۹۵۲ء
تصدق حسین خالد	اقبال اور اس کا پیغام اردو۔ دہلی ص ۳۶۸ ۔ اپریل ۱۹۳۹ء

اکبر علی	اقبال۔ اس کی شاعری اور پیغام اردو۔ دہلی ص ۱۷۵۔ جنوری ۱۹۴۷ء
ـــــ	مقالات یوم اقبال اردو۔ دہلی ص ۱۲۵۔ جنوری ۱۹۴۷ء
احمد دین	اقبال اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۶۹۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء
محب الحق	جواب شکوہ اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۴-۴۸۵ اکتوبر ۱۹۲۸ء
علامہ اقبال	خضر راہ (انگریزی میں ترجمہ) مترجمہ اے۔ کیو۔ نیاز (یہ علامہ اقبال کی ایک مشہور نظم کا انگریزی میں ترجمہ ہے) اردو۔ کراچی ص ۱۴۱۔ جنوری ۱۹۵۵ء
یوسف سلیم چشتی	شرح بانگِ درا اردو کراچی ص ۱۲۲۔ جولائی ۱۹۵۷ء
یوسف سلیم چشتی	شرح بال جبریل اردو۔ کراچی ص ۱۶۲-۱۶۳ جولائی ۱۹۵۷ء
یوسف سلیم چشتی	شرح ضرب کلیم اردو۔ کراچی ص ۱۶۳۔ جولائی ۱۹۵۷ء
احمد میاں اختر	اقبالیات کا تنقیدی جائزہ اردو۔ کراچی ص ۴۳۰-۴۳۴ جولائی ۱۹۵۵ء
ظفر علی خاں	نگارستان (مجموعہ نظم ظفر علی)

	اردو۔ دہلی ص ۵۵۹-۵۶۰ اکتوبر ۱۹۴۴ء
صفدر مرزاپوری	مرقع ادب اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۵۸ جولائی ۱۹۲۶ء
اصغر گونڈوی	نشاط روح اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۴۷-۴۴۸ اپریل ۱۹۲۶ء
حسرت موہانی	دیوان حسرت (حصہ پنجم۔ ششم۔ ہفتم۔ ہشتم۔ نہم) اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۲۱-۱۲۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء
عبدالشکور	اصغر (اس کتاب میں مرحوم اصغر گونڈوی کے حالات اور شاعری پر کئی صاحبوں نے اچھے مقالے لکھے ہیں) اردو۔ دہلی ص ۱۳۲-۱۳۳ جنوری ۱۹۴۶ء
ـــــ	انتخاب سخن مرتبہ حسرت موہانی اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۶۸۱ اکتوبر ۱۹۲۸ء
اصغر گونڈوی	سرود زندگی اردو اورنگ آباد دکن ص ۴۱۱-۴۱۴ اپریل ۱۹۳۵ء
اصغر گونڈوی	اصغر کے سو شعر اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۶۴

جولائی ۱۹۳۴ء

عبدالشکور — حسرت موہانی (حسرت کے حالات اور کلام کا انتخاب کتاب میں شامل ہے)
اردو- دہلی ص ۱۳۱ - ۱۳۲
جنوری ۱۹۴۶ء

ابوالاعظم احمد حسین — خرقۂ امجد
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۳۴۰
اپریل ۱۹۲۶ء

جوش ملیح آبادی — روحِ ادب
شبیر حسن خاں — اردو- اورنگ آباد دکن ص ۴۷۷ - ۴۸۴
جولائی ۱۹۲۱ء

جوش ملیح آبادی — آوازۂ حق
شبیر حسن — اردو- اورنگ آباد دکن ص ۲۷۵ - ۲۷۶
اپریل ۱۹۲۲ء

جگر مرادآبادی — داغِ جگر
علی سکندر — اردو- اورنگ آباد دکن ص ۱۵۳ - ۱۵۵
جنوری ۱۹۲۳ء

جوش ملیح آبادی — ۱- مقالات زرّیں
شبیر حسن خاں — ۲- جذبات فطرت
۳- اوراق سحر
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۱۷۳ - ۱۷۶
جنوری ۱۹۲۲ء

جوش ملیح آبادی — شاعر کی راتیں
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۴۸۶ - ۴۸۷
جولائی ۱۹۳۲ء

جوش — آیات و نغمات (جوش کا نیا مجموعۂ نظم)
اردو- دہلی ص ۲۹۶ اپریل ۱۹۴۲ء

ابوظفر یحییٰ — دردِ دل
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۳۰۵
اپریل ۱۹۲۸ء

احسان احمد احسان — پیام کیف
اردو- دہلی ص ۶۵۰ - ۶۵۱
اکتوبر ۱۹۴۰ء

احسان احمد — شریک اخلاص (یہ نظم محمد علی مرحوم کا مرثیہ ہے)
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۴۸۰ - ۴۸۱
اپریل ۱۹۳۴ء

احسان بن دانش — حدیث ادب
اردو اورنگ آباد دکن ص ۵۹۵ - ۵۹۶
جولائی ۱۹۳۳ء

احمد حسین امجد — ارمغان امجد - مرتبہ حمیدالدین شاہد
اردو کراچی ص ۱۲۲ جنوری ۱۹۵۵ء

احمد مجتبیٰ واثق — جرس
اردو- کراچی ص ۱۴۷ - ۱۴۸ -
اکتوبر ۱۹۵۰ء

اختر احمد میاں — لمحات اختر
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۲۰۷
اپریل ۱۹۲۸ء

اختر انصاری — نغمہ روح
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۹۴۰-۹۴۴
اکتوبر ۱۹۳۴ء

اختر شیرانی — صبح بہار
اردو دہلی ص ۲۹۸ اپریل ۱۹۴۲ء

اخگر مرادآبادی — رباعیات اخگر
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۹۳۹-۹۴۰
اکتوبر ۱۹۳۴ء

اخگر، محمد اکرم — زخم اولین مرتبہ محمد عبداللہ منتظر و
فدا محمد فدا (مجموعہ کلام)
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۹۴-۵۹۵
جولائی ۱۹۳۳ء

اسمٰعیل — کلیات اسمٰعیل مرتبہ محمد اسلم سیفی
اردو۔ دہلی ص ۱۴۱-۱۴۴
جنوری ۱۹۴۰ء

اعجاز حسین علوی — یادِ وطن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۱
جولائی ۱۹۲۸ء

افسر صدیقی امروہوی — تابش خیال (یہ امروہوی کا وہ مجموعہ
کلام ہے جو ۱۹۲۴ء میں مرتب کیا گیا۔
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۷۰-۱۷۱
جنوری ۱۹۳۰ء

اقبال ورما — (شینت وشکنتلا، المعروف بہ
مثنوی سحر)
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۵۷-۱۵۸

جنوری ۱۹۲۶ء

اکبر حیدری — روح جذبات
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۵۷-۵۵۸
جولائی ۱۹۳۱ء

امامی بنگلوری — خشت وخون
اردو۔ کراچی ص ۱۰۴-۱۱۴
جولائی۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء

امرناتھ ساحر — دیوان ساحر موسوم بہ کفر عشق
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۱۳، ۲۱۵
جنوری ۱۹۳۵ء

آرزو اکبرآبادی — محراب حرم
اردو۔ دہلی ص ۳۰۸ جولائی ۱۹۴۹ء

باسط بسوانی — شاہد معنی، مرتبہ ظہیرالدین ظہیر بسوانی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۸۱
اکتوبر ۱۹۲۷ء

باقر علی — دیوان باقر مرتبہ عطا حسین
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۲۶-۲۲۷
جنوری ۱۹۲۷ء

برکت علی — پیغام درا
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۰۳-۳۰۴
اپریل ۱۹۲۸ء

تاجور عثمانیہ زیب — متاع حرم
اردو۔ دہلی ص ۷۷۴ جولائی ۱۹۴۱ء

تبسم، محمد رمضان — حیات تبسم
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۹۰

جنوری ۱۹۲۰ء

جآن، یار علی — مسدس بے نظیر (یہ مسدس جآن نے جشن بے نظیر کی تہنیت میں لکھا تھا)
اردو۔ کراچی ص ۱۳۵ - ۱۳۶
جنوری ۱۹۵۱ء

جعفر حسین — "نذر دکن" تنقید کی آگ میں۔
اردو۔ دہلی ص ۱۲۹ - ۱۳۱
جنوری ۱۹۴۵ء

جلیل احمد قدوائی — نقش و نگار
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۵
جولائی ۱۹۳۰ء

جلیل احمد قدوائی — نوائے سینہ تاب
اردو۔ کراچی ص ۱۳۰ - ۱۳۱
اپریل ۱۹۵۴ء

جوہر، محمد علی — مجموعہ کلام جوہر (محمد علی کے اردو کلام کا یہ مجموعہ جامعہ ملیہ علی گڑھ نے چھپوایا)
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۱۱ - ۳۱۲
اپریل ۱۹۲۳ء

حامد اللہ افسر — پیام روح
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۵
اپریل ۱۹۲۹ء

حکیم آزاد انصاری — معارف جمیل (مجموعہ کلام حکیم آزاد انصاری)
اردو دہلی ص ۱۴۸ - ۱۴۹
جنوری ۱۹۴۰ء

جلال الدین اکبر — نقش ارژنگ
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۴۲ - ۵۴۳
جولائی ۱۹۲۶ء

حمید، حمید الدین — پرواز خیالی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۴۳ - ۵۴۴
جولائی ۱۹۲۹ء

حمید، حمید الدین — حمید کے سو شعر
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۲۵ - ۲۲۶
جنوری ۱۹۳۷ء

دینا ناتھ مدن — گلزار معانی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۴۴
جولائی ۱۹۳۴ء

راز یزدانی رام پوری — حرب و ضرب
اردو۔ دہلی ص ۲۹۶ - ۲۹۸
اپریل ۱۹۴۴ء

رونق پیارے لال — کلام رونق (انتخاب نظم)
اردو۔ دہلی ص ۱۴۹ - ۱۵۰
جنوری ۱۹۴۰ء

ریاست ٹونک — خیابان خلیل (اس میں فرمانروائے ریاست ٹونک کے کلام کا وہ حصہ ہے جس میں خاص طور پر ضرب الامثال کا استعمال کیا گیا ہے)
اردو اورنگ آباد دکن ص ۱۳۶
جنوری ۱۹۲۸ء

سید اولاد حسین	سبد گل اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۷۰ اپریل ۱۹۲۷ء
سید آل رضا	نوائے رضا اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۷۱ جنوری ۱۹۳۰ء
سید علی شبیر	نظام شبیر اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۷۱ اپریل ۱۹۳۵ء
سلیم، وحید الدین	افکار سلیم (مجموعہ کلام منظوم) اردو۔ دہلی ص ۱۴۷ - ۱۴۸ جنوری ۱۹۴۰ء
شاطر حکیمی	موت و حیات اردو۔ دہلی ص ۱۲۹ - ۱۳۰ جنوری ۱۹۴۲ء
شاد خان	جوئے شیریں اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۱۴ جولائی ۱۹۲۳ء
شاد عظیم آبادی	میخانۂ الہام ۔ مرتبہ ۔ حمید عظیم اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۰۶ جولائی ۱۹۳۸ء
شبنم رومانی	مثنوی شہر کراچی اردو۔ کراچی ص ۲۲۳ - ۲۲۴ جنوری، اپریل ۱۹۵۹ء
شنکر لال شنکر	دیر و حرم اردو۔ کراچی ص ۲۶۶ - ۲۶۷ اپریل ۱۹۵۵ء
شوق، احمد علی	فیضان شوق اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۷۹ - ۵۸۱ جولائی ۱۹۲۹ء
ضیا، محمد صادق	عصر نو اردو۔ دہلی ص ۱۵۵ - ۱۵۶ جنوری ۱۹۴۰ء
ضیا احمد	تذکار سلف (یہ ضیا کے ۹۰۱ اسلامی و تاریخی قطعات کا مجموعہ ہے) اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۱ جولائی ۱۹۲۸ء
طفیل احمد، مترجم	یادگار شعر اردو۔ دہلی ص ۲۹۷ - ۲۹۸ جولائی ۱۹۴۳ء
صادق بخاری	نمرود و خلیل اردو۔ کراچی ص ۴۰۳ - ۴۰۹ جولائی اکتوبر ۱۹۵۸ء
صدر قصوری۔ صدر الدین	دیوان صدر (اردو) اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۷۸ اپریل ۱۹۲۴ء
صدر قصوری، صدر الدین	مثنوی مشہور عالم سلطانہ رضیہ بیگم اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۵۷ جنوری ۱۹۲۳ء
صائب عاصمی	سرود جاوداں اردو کراچی ص ۴۱۳ - ۴۱۴ جولائی اکتوبر ۱۹۵۸ء
عاصمی، محمد صادق	چراغ لالہ

	اردو۔ دہلی ص ۴۰۰ جولائی ۱۹۴۲ء
عاصی لال دہلوی	کلام عاصی اردو۔ دہلی ص ۳۵۷ - ۳۵۹ اپریل ۱۹۴۰ء
عبدالسمیع اثر صہبائی	جام صہبائی اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۰ جولائی ۱۹۲۸ء
عبدالرب کوکب	فلسفۂ تاریخ و راحت اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۸۳ جولائی ۱۹۲۹ء
عبدالغفور	انتخاب کلام مظہر۔ مرتبہ احسن الغفور اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۸۴ جولائی ۱۹۳۶ء
عبدالہادی وفا	کلیات وفا (یہ وفا کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے) اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۸ اپریل ۱۹۲۹ء
عشرت، احمد علی	شمیم عشرت۔ مرتبہ حسن امام اردو دہلی ص ۲۴۲ اپریل ۱۹۴۳ء
عشرت گیاوی	عشرت گیاوی کے سو شعر اردو۔ دہلی ص ۴۷۷ جولائی ۱۹۴۱ء
عطا محمد درد درانی	فغان درد اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۹۵ اکتوبر ۱۹۲۹ء
فکری صیانت الزماں	چراغ ایمن اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۶۶۵ جولائی ۱۹۳۴ء
قادر بادشاہ	واقعات عالم (یہ قادر بادشاہ کے قطعات تاریخی کا مجموعہ ہے) اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۹ اپریل ۱۹۲۹ء
قمر احمد۔ مترجم	سیلاب حوادث اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۰۵ - ۳۰۶ اپریل ۱۹۲۸ء
کامل، غلام علی	رباعیات کامل حصہ دوم اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۸۳ اپریل ۱۹۳۱ء
کامل، غلام علی	مثنوی کامل حصہ اول اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۸۳ اپریل ۱۹۳۱ء
کامل، غلام علی	مجموعہ رباعیات کامل اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۸۳ اپریل ۱۹۳۱ء
کیفی، برج موہن دتاتریہ	واردات اردو دہلی ص ۱۴۹ جنوری ۱۹۴۲ء
کیفی، رضی حسن	تصویر افکار، مرتبہ سردار علی اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۰۴ اپریل ۱۹۲۸ء
گوبند سنگھ	نغمۂ عندلیب اردو۔ دہلی ص ۱۴۵ - ۱۴۷ جنوری ۱۹۴۰ء
مجازی لکھنوی	محشر خیال اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۷۷ اکتوبر ۱۹۳۰ء

محروم تلوک چند — رباعیات محروم (رباعی کے شرائط وضوابط)
اردو۔ کراچی ص ۲۶۵ - ۲۶۶
اپریل ۱۹۵۵ء

محروم، تلوک چند — گنج معانی (کلیات)
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۹۲-۵۹۴
جولائی ۱۹۳۳ء

محمد احمد خاں — بہارستان عثمانی (نظم مسدس کے طرز میں نظام خلد اللہ کی مدح میں لکھی ہے)
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۷۴-۷۷۷
اکتوبر ۱۹۳۰ء

محمد امیر — ملن کی بانسری
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۴
جولائی ۱۹۳۱ء

محمد بہادر خیر آبادی — جذبات یاور
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۷۵-۴۷۶
جولائی ۱۹۲۸ء

محمد شمس الدین — بیوہ کی کہانی بیوہ کی زبانی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۷۲
اپریل ۱۹۲۷ء

محمد ہاشم — مجموعہ تاریخ معروف بہ آئینہ جمال مرتبہ مجتبیٰ حسین
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۸۴۷-۸۵۰
اکتوبر ۱۹۳۳ء

محمود عالم وفا — نکہتِ گل
اردو۔ دہلی ص ۲۰۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء

مشتاق بہاری لال — کلام مشتاق (انتخاب کلام)
اردو۔ دہلی ص ۱۵۰ - ۱۵۱
جنوری ۱۹۴۰ء

معروف الٰہی بخش خاں — دیوان معروف (مرتبہ عبدالحامد قادری)
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۳۷-۷۳۹
اکتوبر ۱۹۳۵ء

مولا بخش ہمدرد — خمخانۂ عشق
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۷۱
اپریل ۱۹۲۷ء

میر محمدی بیدار — دیوان بیدار مرتبہ محمد حسین محوی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۰۴-۷۰۵
جولائی ۱۹۳۵ء

ن۔م راشد — ماورا
اردو۔ دہلی ص ۲۹۳ - ۲۹۶
اپریل ۱۹۴۲ء

ناصر نذیر فراق — حسین بیتی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۰۶
اپریل ۱۹۲۸ء

ناصر نذیر فراق — میخانۂ درد (یہ کتاب یادگار خواجہ درد ہے۔ اس میں خواجہ درد، ان کے بزرگوں، ان کی اولادوں اور شاگردوں کے حالات لکھے ہیں۔)
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۱۲-۲۱۳

	اپریل ۱۹۲۵ء
ناظر کاکوروی	ہندو ادیب
	اردو - دہلی ص ۳۶۰ - ۳۶۲
	اپریل ۱۹۴۰ء
نجی الحسن	عالم حیات
	اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۰۴
	جولائی ۱۹۳۰ء
ناظم الدین انصاری	دبستان
	اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۹۱
	اپریل ۱۹۳۱ء
نصیر نصیر الدین	حقیقی علمی شاعری (نظم)
	اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۲۶
	جنوری ۱۹۳۳ء
نظام الدین نظامی	تجلیات سخن مرتبہ احمد فرشوری
	اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۰۲ - ۵۰۳
	جولائی ۱۹۳۰ء
نظیر اکبر آبادی	روح نظیر
	اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۴۷ - ۱۴۸
	جنوری ۱۹۲۳ء
نکہت شاہجہانپوری	چمن زار
	اردو - دہلی ص ۳۸۲ جولائی ۱۹۴۶ء
نور احمد	گل چیں
	اردو دہلی ص ۳۸۲ - ۳۸۳
	جولائی ۱۹۴۶ء
شرف الدین یاس	تسخیر یاس
	اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۲۴ - ۲۲۵
	جنوری ۱۹۳۷ء
محمد احسن و نور الحسن	ناول کیا ہے؟
	اردو - کراچی ص ۱۵۰ اپریل ۱۹۵۱ء
کلیم الدین احمد	فن داستان گوئی
	اردو - دہلی ص ۵۵۷ - ۵۵۸
	اکتوبر ۱۹۴۴ء
اولیس احمد ادیب	اردو کا پہلا ناول نگار
	اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۲۱
	جنوری ۱۹۳۵ء
عبد القادر سروری	کردار اور افسانہ
	اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۴۸
	جنوری ۱۹۳۰ء
عبد القادر سروری	دنیائے افسانہ
	اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۴۴ - ۵۴۵
	جولائی ۱۹۲۹ء
ابو تمیم فرید آبادی	فلم الیکٹرلس نرغے میں (مزاحیہ)
	اردو اورنگ آباد دکن ص ۸۵۹
	اکتوبر ۱۹۳۳ء
احمد شجاع	زردار
	اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۸۶
	اکتوبر ۱۹۲۷ء
احمد قدوائی	سیر گل
	اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۳۳ - ۱۳۴
	جنوری ۱۹۲۸ء

اختر انصاری	اندھی دنیا اردو۔ دہلی ص ۱۵۳ جنوری ۱۹۴۰ء
اختر حسین	محبت اور نفرت اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۱۵ - ۲۱۶ جنوری ۱۹۳۵ء
اختر قریشی	روح حیات اردو۔ دہلی ص ۳۸۲ جولائی ۱۹۴۶ء
اسعد گیلانی	جہنم کے دروازوں پر اردو۔ کراچی ص ۱۴۱ - ۱۴۳ اکتوبر ۱۹۵۰ء
ایس۔ آر کے	نیرنگ اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۵۵ اکتوبر ۱۹۲۳ء
ایم سلیم	غزال اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۵۸ جنوری ۱۹۲۷ء
ایم اسلم	پیغام سروش اردو اورنگ آباد دکن ص ۶۸۴ اکتوبر ۱۹۲۰ء
ایم اسلم	چار سہیلیاں اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۴۱ - ۲۷۲ اپریل ۱۹۲۷ء
برج بھوکن لالی	رنگ زمانہ اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۸۲ - ۷۸۳ اکتوبر ۱۹۲۶ء
برجموہن دتاتریہ کیفی	ننھا رانا اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۵۵ - ۵۶۰ جولائی ۱۹۳۱ء
بیگم طیب حسین مترجم	افسانہ زریں مترجمہ بیگم طیب حسین اردو۔ دہلی ص ۱۲۸ - ۱۲۹ جنوری ۱۹۴۶ء
بھارت چند کھنہ	مسکراتے آنسو اردو دہلی ص ۳۰۰ جولائی ۱۹۴۵ء
حجاب اسمٰعیل	میری ناتمام محبت اور دوسرے رومان اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۱۴ اپریل ۱۹۳۴ء
حجاب اسمٰعیل	لاش اور دوسرے ہیبت ناک قصے اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۱ - ۴۸۲ اپریل ۱۹۳۴ء
لطافت حسین (مترجم)	دختر فرعون جلد اول اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۵۷ جولائی ۱۹۳۱ء
لطافت حسین مترجم	دختر فرعون جلد دوم اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۷ - ۴۸۸ جولائی ۱۹۳۲ء
حامد اللہ	ڈالی کا جوگ اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۹۳ اپریل ۱۹۲۹ء
حامد علی۔ مترجم	افسانہائے عشق اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۸۰۲

اپریل ۱۹۳۴ء

اتون اکرم — پیکر وفا
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۶۶-۷۷۴
جولائی ۱۹۲۸ء

سجاد حیدر۔ مترجم — حکایات و احتساسات
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۵۷-۵۵۸
جولائی ۱۹۲۷ء

سدرشن — چندن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۳۵
جنوری ۱۹۲۸ء

سدرشن — کنج عافیت
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۸
اپریل ۱۹۲۴ء

سید حسین بلگرامی — حشمت النسار
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۶۵-۷۷۰
اکتوبر ۱۹۲۲ء

عابد — حجاب زندگی اور دیگر افسانے
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۸۵
اکتوبر ۱۹۲۶ء

عباس حسینی — آئی۔ سی۔ ایس
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۰۵-۷۰۶
جولائی ۱۹۳۵ء

عباس حسینی — ہمارا گاؤں اور دوسرے افسانے
اردو کراچی ص ۱۲۰
جنوری ۱۹۵۷ء

عشرت رحمانی — مرزا نوشہ
اردو۔ کراچی ص ۴۱۴-۴۱۵
جولائی ۱۹۵۸ء

علی عباس حسینی — رفیق تنہائی اور دیگر افسانے
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۷
جولائی ۱۹۳۲ء

علی عباس حسینی — ہمارا گاؤں اور دوسرے افسانے
اردو کراچی ص ۱۲۰ جنوری ۱۹۵۷ء

ضیا بانو — انجام زندگی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۷۴-۳۷۸
اپریل ۱۹۲۴ء

فیاض علی — انور
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۹۱۱
اکتوبر ۱۹۳۷ء

فیاض علی — شمیم
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۴۱-۳۴۲
اپریل ۱۹۲۶ء

فیاض علی — شمیم
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۵۳-۷۵۴
اکتوبر ۱۹۲۳ء

کشن پرشاد کول — سادھو اور بیسوا
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۶۲
جولائی ۱۹۲۹ء

کشن پرشاد کول — شاما
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۲۴-۱۲۵

جنوری ۱۹۲۵ء

کشن پرشاد کول — نشا "یعنی ایک دکھیاری کی زندگی کا تماشہ"
اردو ۔ دہلی ص ۶۵۲ - ۶۵۴
اکتوبر ۱۹۴۰ء

محشر عابدی — محشرستان
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۹۷
جولائی ۱۹۳۳ء

محمد حسین مترجم — طفل اشک
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۰۷
اپریل ۱۹۲۸ء

محمود خان محمد — حیدر علی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۱۱ - ۲۱۲
جنوری ۱۹۳۵ء

فیروز الدین مترجم — ۱- خونابۂ عشق
۲- حکایات شرلک ہومز
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۲۲ - ۳۲۳
اپریل ۱۹۲۲ء

میرامّن — باغ و بہار، مرتبہ ممتاز حسین
اردو، کراچی ص ۲۲۶
جنوری - اپریل ۱۹۵۹ء

ناصر نذیر فراق — سنجوگ
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۰۶
اپریل ۱۹۲۸ء

نظیر حسین فاروقی — عقوبت گناہ
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۴۹
اکتوبر ۱۹۲۶ء

— — اندر سبھا - مرتبہ نور الٰہی و محمد عمر
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۷۷
جولائی ۱۹۲۸ء

پنڈت کشن پرشاد کول — قربانی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۶۲
جنوری ۱۹۲۵ء

پیارے موہن دتاتریہ — پھول کماری
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۸۵۷ - ۸۵۸
اکتوبر ۱۹۳۳ء

— — جان ظرافت مترجمہ نور الٰہی و محمد عمر
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۷۲
اکتوبر ۱۹۲۲ء

سدرشن — چندن (یہ چودہ افسانے اور ایک ڈرامہ ہے)
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۱۳
اپریل ۱۹۲۳ء

سدرشن — محبت کا انتقام مترجم نور الٰہی و محمد عمر
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۵۸ - ۲۵۹
اپریل ۱۹۲۴ء

سدرشن — آنریری مجسٹریٹ
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۲۹
اکتوبر ۱۹۲۲ء

عابد حسین — پردۂ غفلت

		اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۷۰-۲۷۷ اپریل ۱۹۲۶ء
عبدالغفار	قوم پرست طالب علم	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۶۳ اپریل ۱۹۲۹ء
محمد عمر و نورالٰہی (مترجم)	روح سیاست	اردو اورنگ آباد دکن ص ۳۲۷-۳۱۸ اپریل ۱۹۲۷ء
محمد عمر نورالٰہی	ناٹک کتھا	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۶۳ جولائی ۱۹۲۹ء
منٹو، سعادت حسن	کروٹ (تازہ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ)	اردو۔ دہلی ص ۱۲۹ جنوری ۱۹۴۶ء
سید محمد	ارباب نثر اردو	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۲-۴۸۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء
محمد یحیٰی تنہا	سیر المصنفین۔ جلد دوم (اس جلد میں سرسید، چراغ علی۔ محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی، نذیر احمد، الطاف حسین، شبلی، نولکشور، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر کے حالات اور ان کی تالیف و تصنیف کا ذکر ہے)	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۱۹
		اکتوبر ۱۹۲۹ء
احمد عارف	بزم اردو	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۷۰-۳۷۴ اپریل ۱۹۲۷ء
امۃ الرؤف بیگم	ہدیہ نسواں	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۵۸ جولائی ۱۹۳۱ء
ایم۔ اسلم	نغمہ حیات (مضامین)	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۸۵۹-۸۶۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء
بشیر احمد	طلسم زندگی	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۹۷ جولائی ۱۹۳۳ء
حامد اللہ	نورس (مختلف مضامین)	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۶۹۰ جولائی ۱۹۳۶ء
حسرت موہانی	اردوئے معلی (ادبی مضامین)	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۶۵-۵۶۶ جولائی ۱۹۲۹ء
حمید، ایم۔ اے (مرتب)	کائنات ادب	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۴۵ اپریل ۱۹۳۰ء
خاتون اکرم مرحومہ	جمال ہمنشیں	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۳۶ جنوری ۱۹۲۸ء

رشید احمد صدیقی — مضامین رشید
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۸۲ - ۴۸۳
اپریل ۱۹۳۵ء

سجاد علی انصاری — محشر خیال
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۵۹
جنوری ۱۹۲۷ء

سید حسین بلگرامی — رسائل عماد الملک
اردو اورنگ آباد دکن ص ۲۱۱ - ۲۱۷ اپریل ۱۹۲۲ء

عبدالحلیم شرر — مضامین شرر (جلد ششم و ہفتم)
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۶۷ - ۲۶۸
اپریل ۱۹۲۷ء

عبدالعزیز — مضامین فلک پیما
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۷۳ - ۴۷۴
جولائی ۱۹۳۶ء

عزیز، عبدالعزیز — خزینۂ اخلاق
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۶۶
جولائی ۱۹۲۶ء

عظمت اللہ — مضامین عظمت
اردو - دہلی ص ۱۴۲ - اپریل ۱۹۴۳ء

فارغ بخاری — ادبیات سرحد
اردو - کراچی ص ۴۰۷ - ۴۱۰
جولائی ۱۹۵۵ء

فارغ بخاری اور رضا ہمدانی — اٹک کے اس پار
اردو - کراچی ص ۱۱۶ - ۱۱۷
جنوری ۱۹۵۲ء

فرحت اللہ بیگ — پھول والوں کی سیر
اردو - دہلی ص ۵۶۲ - جولائی ۱۹۳۹ء

فرحت اللہ بیگ — مضامین فرحت
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۰۲ - ۳۰۳
اپریل ۱۹۲۸ء

فرحت اللہ بیگ — مضامین فرحت حصہ دوئم
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۰۷
جولائی ۱۹۳۰ء

کیفی، برجموہن دتاتریہ — منشورات
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۰۹ - ۴۱۰
اپریل ۱۹۳۵ء

مہدی حسن — افاداتِ مہدی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۶۳ - ۱۶۴
جنوری ۱۹۲۴ء

نیرّ محمد یوسف — القابلہ
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۶۳
اپریل ۱۹۲۹ء

سلیم اللہ — مشرق (یہ سلیم اللہ کی بارہ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے)
اردو - کراچی ص ۱۳۹ - ۱۴۰
جنوری ۱۹۵۵ء

عبدالرحمٰن — نثری تقاریر
اردو - دہلی ص ۳۸۵ - ۳۸۶
جولائی ۱۹۴۶ء

مہیش پرشاد — مشاہیر اردو کے خطوط

	اردو- اورنگ آباد دکن ص ۲۲۳-۲۲۴ جنوری ۱۹۳۳ء
غالب اسداللہ	اردوئے معلیٰ اردو- اورنگ آباد دکن ص ۱۴۸-۱۴۹ جنوری ۱۹۲۳ء
غالب اسداللہ	ادبی خطوط غالب مرتبہ محمد عسکری اردو- اورنگ آباد دکن ص ۷۹۳-۷۹۴ اکتوبر ۱۹۲۹ء
غالب اسداللہ	نادر خطوط غالب اردو- دہلی ص ۱۵۸-۱۶۰ جنوری ۱۹۴۰ء
احسن مارہروی	منتخبات عود ہندی اردو- اورنگ آباد دکن ص ۷۹۳ اکتوبر ۱۹۲۹ء
—	خطوط سرسید اردو- اورنگ آباد دکن ص ۵۰۴-۵۰۷ جولائی ۱۹۲۴ء
—	خطوط سرسید (راس مسعود المخاطب بہ نواب یار جنگ بہادر نے جمع کرکے چھاپے ہیں) اردو- اورنگ آباد دکن ص ۵۰۴-۵۰۷ جولائی ۱۹۲۴ء
امین زبیری مارہروی	مکاتیب (نواب محسن الملک مرحوم و نواب وقار الملک مرحوم اردو- اورنگ آباد دکن ص ۲۵۳-۲۵۵
	اپریل ۱۹۲۴ء
امیر مینائی	مکاتیب امیر مینائی اردو- اورنگ آباد دکن ص ۱۲۸-۱۳۷ اکتوبر ۱۹۲۴ء
اکبر حسین اکبر آبادی	مکاتیب اکبر (یہ اکبر حسین مرحوم کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مرحوم نے گزشتہ ۱۲ سال کی مدت میں محمد ہادی عزیز لکھنوی کے نام بھیجے تھے) اردو- اورنگ آباد دکن ص ۲۱۲-۲۱۳ اپریل ۱۹۲۳ء
—	رقعات اکبر، مرتبہ، نصیر ہمایوں اردو- اورنگ آباد دکن ص ۷۸۰-۷۸۱ اکتوبر ۱۹۲۷ء
—	خطوط محب، مرتبہ افضل النساء اردو- اورنگ آباد دکن ص ۵۵۹ جولائی ۱۹۲۶ء
ابو تمیم فرید آبادی	بارہ پھلجھڑیاں اردو- اورنگ آباد دکن ص ۸۵۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء
ابو تمیم فرید آبادی	ہنسانے فسانے اردو- اورنگ آباد دکن ص ۷۶۶-۷۶۷ اکتوبر ۱۹۳۱ء
بخاری- اے- ایس	پطرس کے مضامین اردو- اورنگ آباد دکن ص ۱۸۵ جنوری ۱۹۳۱ء

مصنف	کتاب	حوالہ
شوکت تھانوی	شیش محل	اردو۔ دہلی ص ۵۴۳ - ۵۴۴ اکتوبر ۱۹۴۳ء
غلام احمد فرقت	صید و ہدف (یہ غلام احمد کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے)	اردو۔ کراچی ص ۱۱۹ - ۱۲۰ جنوری ۱۹۵۷ء
مانپوری	طنزیات مانپوری (مانپوری کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ)	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۴۵ اپریل ۱۹۳۷ء
محمد اسمٰعیل (مترجم)	گدھے کی سرگزشت	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۸۵ اکتوبر ۱۹۲۷ء
محمد عسکری	نوادر	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۰۰ جنوری ۱۹۳۴ء
محمود فاروقی	شیطانی قہقہے	اردو دہلی ص ۱۲۴ - ۱۲۵ جنوری ۱۹۴۷ء
—	بچوں کے پڑھنے کی کتابیں	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۸۳ اکتوبر ۱۹۲۷ء
الیاس برنی	محرومہ (حصہ اوّل۔ دوئم) مجموعہ نظموں اور نعتیہ غزلوں کا)	
		اردو۔ دہلی ص ۱۳۰۱۔ جنوری ۱۹۴۷ء
شفیع الدین نیرؔ	بچوں کا تحفہ (حصہ اوّل دوئم)	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۶۲ - ۱۶۳ جنوری ۱۹۳۵ء
گذار شرما	پنچھی	اردو۔ دہلی ص ۶۵۴ - ۶۵۶ اکتوبر ۱۹۴۰ء
محمد اسمٰعیل	بچوں کے گیت	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۸۵ اکتوبر ۱۹۲۷ء
محمد یوسف	سلیس نظمیں	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۳ جولائی ۱۹۳۰ء
ناظم انصاری	بچوں کے کام	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۹۱ اپریل ۱۹۳۱ء
ناظم انصاری	بچیوں کے کام	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۹۱ اپریل ۱۹۳۱ء
محمد اسمٰعیل	پھولوں کی ڈالی	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۴۵ جنوری ۱۹۲۸ء
وجاہت حسین وجاہتؔ	سنہری گیت	اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۸۵ اکتوبر ۱۹۲۷ء

—	بچوں کی نظمیں۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۶۶۳ جولائی ۱۹۳۴ء	
ادیتہ پرشاد	ظرائف معلم جلد اول و دوئم اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۸۴ جولائی ۱۹۲۹ء	
اشرف صبوحی	تھوڑی تارا ماتھے چاند اردو۔ دہلی ص ۵۶۲ جولائی ۱۹۳۹ء	
اشرف صبوحی	صبر بادشاہ زادہ اردو۔ دہلی ص ۵۶۲ جولائی ۱۹۳۹ء	
اشرف صبوحی	لعل شہزادہ اردو۔ دہلی ص ۵۶۲ جولائی ۱۹۳۹ء	
الیاس احمد مجیبی	حرکت میں برکت (بچوں کے لئے) اردو۔ دہلی ص ۵۸۴ جولائی ۱۹۴۴ء	
الیاس احمد مجیبی	گل نار بیگم اردو۔ دہلی ص ۴۵۸۔ ۴۵۹ جولائی ۱۹۴۴ء	
چمن، محمد رحیم	پنکھڑیاں اردو۔ دہلی ص ۵۷۴ جولائی ۱۹۴۴ء	
سدرشن	امرت اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء	
سدرشن	بچوں کے لئے رامائن اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء	
سدرشن	بچوں کے لئے مہابھارت اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء	
سدرشن	پارس (لڑکوں کے لئے دلچسپ کہانیاں) اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء	
سدرشن	پھول دتی اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء	
سدرشن	رستم و سہراب اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء	
سدرشن	سدا بہار پھول اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء	
سدرشن	صبح وطن اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء	
عبدالشکور	دھوپ چھاؤں اردو۔ دہلی ص ۵۷۴ جولائی ۱۹۴۴ء	
محمد اسمٰعیل	موتیوں کی مالا اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۵ اکتوبر ۱۹۲۷ء	

محمد اسمٰعیل — نعیم پچیسی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۸۵۔
اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء

محی الدین — دورنگی تحفہ
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۹۲۲-۹۲۳
اپریل سنہ ۱۹۳۱ء

امتیاز علی — پیاری کتاب
اردو اورنگ آباد دکن ص ۸۳۳-۸۳۴
اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء

امتیاز علی — دلاری کتاب
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۸۳۳
اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء

امتیاز علی — منی کتاب
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۸۳۳
اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء

امتیاز علی — ننھی کتاب
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۸۳۳
اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء

ہندی، بنگالی اور ادبیات

محمد حسن — ہندی ادب کی تاریخ
اردو۔ کراچی ص ۵۴۱-۵۴۲
اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء

—— منتخبات کلام ہندی۔ مرتبہ۔
جعفر حسن۔

اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۱۸۴
جنوری سنہ ۱۹۳۱ء

بنسی دھر — میرے پھول (ہندی)
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن)
ص ۱۳۶-۱۳۸
جنوری سنہ ۱۹۲۸ء

جگناتھ پرشاد — روپ اختر
اردو۔ دہلی ص ۶۶۳۔
اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

نگیندر — ساگیت "ایک مطالعہ"
اردو۔ دہلی ص ۶۶۲-۶۶۳۔
اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

نگیندر — سمترا نندن پنت۔
اردو۔ دہلی ص ۶۶۲
اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

ہری ہر — ہندی اردو مالا
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۳۳۵
اپریل سنہ ۱۹۳۲ء

بنکم چندر چٹرجی — آنند مٹھ
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۳۵۶۔
اپریل سنہ ۱۹۲۹ء

بنکم چندر چٹرجی۔ — تہذیب کے تازیانے

اردو - اورنگ آباد - (دکن)
۴ - ۲۹ ے - ۳۰ ے
اکتوبر ۱۹۲۲ء

کیشرو و چندر چٹرجی - اُما
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
۴ - ۸۵ ے -
اکتوبر ۱۹۲۷ء

دویجندر لال رائے - قوم پرست مترجم - سدرشن
اردو - اورنگ آباد - ۴ - ۳۵۷ -
- ۳۵۸ -
اپریل ۱۹۲۴ء

دھرونکٹیش کیتکر - مرہٹی دنان کوش (یعنی مرہٹی
انِ سائیکلوپیڈیا) جلد اوّل
اردو - اورنگ آباد - ۴ - ۶۲۵
- ۶۲۶ - اکتوبر ۱۹۲۱ء

فارسی، ترکی اور عربی ادبیات

براؤن - تاریخ ادبیات ایران - مترجمہ
سجاد حسین
اردو - اورنگ آباد (دکن)
س - ۴۸۶ -
جولائی ۲۳ء

عبدالوہاب افتخار - تذکرہ بے نظیر
(یہ ان فارسی شعرا کا تذکرہ ہے
جو بارہویں صدی کے پہلے ۲۷ سال
میں ہندوستان یا ایران میں گزرے)
اردو - دہلی ۴ - ۱۶۶
جنوری ۱۹۴۱ء

محمد اسحاق - سخنوران ایران در عصر حاضر -
جلد دوئم
اردو - اورنگ آباد (دکن)
۴ - ۲۰۲ ے - ۱۵ ے
جولائی ۱۹۳۷ء

محمد علی - خط لاتین برائے فارسی -
اردو - اورنگ آباد (دکن)
۴ - ۵۶۷ - ۵۶۹ -
جولائی ۱۹۲۹ء

مسعود علی - عناصر اربعۂ رباعی (فارسی)
اردو - اورنگ آباد (دکن)
۴ - ۵۸۱ -
جولائی ۱۹۲۹ء

—— - اردو گلستان - مترجمہ - خلیل الرحمٰن
(سعدی کی گلستان کا اردو
میں ترجمہ)
اردو - اورنگ آباد (دکن)
۴ - ۶۷ ے
اکتوبر ۱۹۳۱ء

عبدالسلام ندوی - ابن یمین -

اردو - اورنگ آباد - (دکن)
م - ۶۷۴ -
جولائی سنہ ۱۹۸۲ء

علی لشبیر — محاکمۂ قطعات ابن یمین وسعدی
مع سوانح ابن یمین -
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
م - ۶۹۳ - ۶۹۴ -
اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

امیر خسرو — شیریں و خسرو (فارسی)
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
م - ۱۴۰ -
جنوری سنہ ۱۹۲۸ء

امیر خسرو (رح) — مطلع الانوار -
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
م - ۵۴۹ -
جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

ہاشمی — تغلق نامہ امیر خسرو
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
م - ۲۰۶ - ۲۰۷ -

علی شبیر — محاکمۂ قطعات ابن یمین وسعدی
مع سوانح ابن یمین
اردو - اورنگ آباد - ص - ۶۹۳ - ۶۹۴
اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

نقی شادماں — شرح شادمانی بر قصائد حسان

العجم خاقانی -
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
م - ۱۴۱ -
جنوری سنہ ۱۹۲۸ء

محمد حسن — حکیم قاآنی
(اس میں نامور شاعر کے حالات
اور اس کی شاعری کی خصوصیات بیان
کی گئی ہیں -)
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
م - ۲۰۹ -
اپریل سنہ ۱۹۲۸ء

عبدالمالک آروی مرتب - انتخاب دیوان شمس تبریز
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
م - ۴۹۲ - ۴۹۳ -
جولائی سنہ ۳۲ء

مرزا کامران ابن بابر - دیوان مرزا کامران - مرتبہ -
باذشاہ - محفوظ الحق -
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
م - ۵۰۶ -
جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

——— رباعیات عمر خیام - تالیف و ترجمہ
جلال الدین -
اردو - اورنگ آباد - م - ۱۶۴
جنوری سنہ ۱۹۲۳ء

آغا شاعر	خمکدۂ خیام اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن) ص۔ ٧٧٥۔ ٧٧٨ اکتوبر سنہ ١٩٢٧ء
ابوسعید ابوالخیر	۔ رباعیات ابوسعید ابوالخیر مترجمہ۔ ڈی۔ سی۔ دتا (انگریزی میں) اردو۔ دہلی۔ ص۔ ٤٥٦۔ ٤٥٧۔ جولائی سنہ ١٩٤٤ء
صولت لکھنوی	جواہر منظوم، ترجمہ اردو۔ رباعیات سرمد۔ اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن) ص۔ ٤٧١۔ ٤٧٣۔ جولائی سنہ ١٩٢٢ء
——	رباعیات باباطاہر۔ مترجمہ۔ ڈی۔ سی۔ دتا۔ انگریزی اردو۔ ص۔ ١٢٤۔ جنوری سنہ ١٩٢٧ء
نیر، محمد اکبر۔	ماہ نو (نیر کی فارسی نظموں اور فکر لطیف کا مجموعہ ہے) اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن) ص۔ ٣٥٧۔ اپریل سنہ ١٩٢٩ء
فانی، عبدالقوی	۔ گلزار عثمانی (نو فارسی قصائد کا مجموعہ) اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن) ص۔ ٤٨٨۔ جولائی سنہ ١٩٣٢ء
برق مہاراج بہادر	مطلع انوار اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن) ص۔ ٧٥٤۔ ٧٥٥ اکتوبر سنہ ١٩٣٢ء
گرامی، غلام قادر	دیوان گرامی اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن) ص۔ ٢٢٦۔ ٢٨٨ جنوری سنہ ١٩٣٣ء
——	مثنوی گرامی بطرز مثنوی مولانا روم۔ افسر حیدر آباد۔ (دکن) ص۔ ٤٨٩۔ ٤٩١۔ نومبر سنہ ١٩٠٠ء
——	سرگزشت وزیر خاں لنکران مرتبہ عبدالقوی فانی۔ اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن) ص۔ ١٩٩۔ ٢٠٠۔ جنوری سنہ ١٩٣١ء
——	مجلس مخطوطات فارسی۔ حیدرآباد

برھان مآثر
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن)
م - ۹۱۲ - ۹۱۴ -
اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء

محمد رضا طباطبائی۔ بزم ایران
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن)
م - ۱۶۷ - ۱۶۸ -
جنوری سنہ ۱۹۲۳ء

مرزا یحیٰی دولت آبادی۔ شرکت حیات طہران
اردو۔ اورنگ آباد۔ م۔ ۳۸۹ - ۳۹۲ -
اپریل سنہ ۱۹۲۴ء

ریاست علی ندوی۔ سرگزشت ادب ترکی۔
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن)
م۔ ۴ - ۵۹
جولائی سنہ ۱۹۳۳ء

طنطاوی جوہری جواہر العلوم۔ مترجمہ۔ عبدالرحیم
اردو۔ دہلی۔ م۔ ۳۹۸ - ۳۹۹
جولائی سنہ ۱۹۴۳ء

ریاض الدین بریلوی۔ التحفۃ الحجازیہ۔
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن)
م۔ ۳۵۵ - ۳۵۶ -
اپریل سنہ ۱۹۲۶ء

خلیل الرحمٰن ابو الطیب
(مشہور عربی شاعر ابو الطیب کی زندگی اور شاعری پر تالیف کی ہے)
اردو۔ کراچی۔ م۔ ۱۵۹ - ۱۶۷ -
جولائی سنہ ۱۹۵۹ء

حفیظ نعیمی مرثیہ اندلس حصہ اول
(یہ نوجوان شاعر کا کارنامہ ہے۔)
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن)
م۔ ۴۷۶ - ۴۷۷ -
جولائی سنہ ۱۹۳۶ء

محمد امام گل دستہ یتیمہ (اس میں یتیمہ پر اکثر مشاہیر شعرا کی نظمیں درج کر دی گئی ہیں۔)
اردو۔ دہلی۔ م۔ ۱۲۶ -
جنوری سنہ ۱۹۴۷ء

محمد مصطفیٰ الغنیمۃ الکبریٰ (شرح قصیدہ تائیہ شیخ ابن الفارض
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن)
م۔ ۵۵۹ -
جولائی سنہ ۱۹۲۷ء

غلام احمد فوائد رضیہ
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن)
م۔ ۱۹۱ -
جنوری سنہ ۱۹۲۹ء

رسائل اوراخبارات

— (ہفتہ وار) اسلامی دنیا۔مصر
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۰۵ ۔ ۲۰۶
جنوری ۱۹۳۱ء

— (ہفتہ وار) پریم (بچوں کے لئے) لاہور
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۶۲
اپریل ۱۹۲۶ء

— (ہفتہ وار) دستور دہلی — اڈیٹر
آزاد دہلوی
اردو اورنگ آباد دکن اپریل ۱۹۳۳ء

— (ہفتہ وار) شباب۔بمبئی۔سرپرستی
محمد علی خاں
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۶۸
اکتوبر ۱۹۳۵ء

— (ہفتہ وار) مطالعہ۔لدھیانہ —
زیر ادارت۔حسن لطیفی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۴ ۔ ۵۰۶
جولائی ۱۹۳۲ء

— (ہفتہ وار) متقلن۔حیدرآباد دکن
اڈیٹر۔احمد حسن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۴۷ ۔ ۳۴۸
اپریل ۱۹۲۹ء

— (ہفتہ وار) ہدایت (بچوں کے لئے)
لاہور اڈیٹر۔رشید کشمیری
اردو۔ دہلی ص ۱۷۹ جنوری ۱۹۳۹ء

— (ہفتہ وار) ہفتہ وار ہند۔ اڈیٹر
عبدالرزاق
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۹۵۹ ۔ ۹۶۰
اکتوبر ۱۹۳۴ء

— (ہفتہ وار) ہونہار (بچوں کے لئے)
اردو۔اورنگ آباد دکن ص ۵۲۹
جولائی ۱۹۳۰ء

— (پندرہ روزہ) آج کل۔ مدیر
محمد یعقوب
اردو۔ دہلی ص ۴۰۲ ۔ جولائی ۱۹۴۳ء

— (پندرہ روزہ) الہام "عید نمبر"
دہلی۔ زیر ادارت۔ ابوالکلام
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۱
اپریل ۱۹۳۲ء

— (پندرہ روزہ) الفلاح۔ جالندھر
ایڈیٹر۔ غازی رحمت اللہ
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۵۸ ۔ ۴۵۹
جولائی ۱۹۲۳ء

— (پندرہ روزہ) پیام تعلیم دہلی
اردو۔اورنگ آباد دکن ص ۵۵۴
جولائی ۱۹۲۶ء

— (پندرہ روزہ) پیام تعلیم دہلی
اردو۔اورنگ آباد دکن ص ۵۸۹
جولائی ۱۹۲۹ء

— (پندرہ روزہ) تربیت - مدیر
مسعود عالم
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۸۳، ۷۸۴
اکتوبر ۱۹۳۱ء

— (پندرہ روزہ) ثریا لاہور - اڈیٹر
رضیہ ناصرہ
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۰۱
اکتوبر ۱۹۲۸ء

— (پندرہ روزہ) ہزار داستان
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۷۳
اکتوبر ۱۹۲۷ء

— (پندرہ روزہ) حسن کار حیدر آباد (دکن)
محمد اکبر وفا قانی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۵۹
اپریل ۱۹۳۳ء

— (پندرہ روزہ) روح تعلیم کلکتہ
اڈیٹر سجاد علی خاں اختر
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۸۷۸-۸۷۹
اکتوبر ۱۹۳۳ء

— (پندرہ روزہ) شاہجہاں دہلی
اڈیٹر - ولایت حسین دہلوی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۸۷۹
اکتوبر ۱۹۳۳ء

— (پندرہ روزہ) شاہجہاں - دہلی
اڈیٹر ولایت حسین

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۳۱، ۲۳۲
جنوری ۱۹۳۴ء

— (پندرہ روزہ) عزیز (بچوں کے لئے)
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۳۳
اکتوبر ۱۹۲۷ء

— (پندرہ روزہ) مستورات (عورتوں کے لئے) کانپور مدیر - حبیب بلقیس
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۶۹۲-۶۹۴
جولائی ۱۹۳۴ء

— (پندرہ روزہ) ندائے اسلام - دہلی
اڈیٹر مظہر الدین
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۱۴
جولائی ۱۹۲۴ء

— (ماہنامہ) ادب - لکھنؤ
اڈیٹر اعظم حسین
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۲۶
جولائی ۱۹۳۰ء

— (ماہنامہ) ادبی دنیا - لاہور -
اڈیٹر - تاجور نجیب آبادی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۸۸-۵۸۹
جولائی ۱۹۲۹ء

— (ماہنامہ) ادیب - پشاور -
اڈیٹر - اشرف بیگ
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۸۸-۷۸۹
اکتوبر ۱۹۳۰ء

(ماہنامہ) اختر۔ لاہور۔ مرتب
اختر شیرانی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۹۶۰۔۹۶۱
اکتوبر ۱۹۳۴ء

— (ماہنامہ) ارمغان ادب۔ میسور
اردو۔ دہلی ص ۳۸۷ جولائی ۱۹۴۶ء

— (ماہنامہ) استانی۔ بٹالہ (پنجاب)
ایڈیٹر۔ احمد وجودی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۶۷۔۱۶۸
جنوری ۱۹۲۴ء

— (ماہنامہ) اعجاز۔ بارہ بنکی۔ اڈیٹر
انیس احمد
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۰۔۳۵۱
اپریل ۱۹۳۰ء

— (ماہنامہ) اعجاز۔ جالندھر۔ اڈیٹر
ابوالاثر حفیظ
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۳۷
اکتوبر ۱۹۲۲ء

— (ماہنامہ) اعجاز علی گڑھ۔ اڈیٹر
ہیرالال پوسٹ
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۸۱
اپریل ۱۹۲۷ء

— (ماہنامہ) المائدہ۔ لاہور۔ اڈیٹر
ایم۔ کے۔ خاں
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۴۸۔۳۴۹
اپریل ۱۹۳۲ء

— (ماہنامہ) الفیض محمد سلیمان
اردو۔ اورنگ آباد ص ۵۱۴
جولائی ۱۹۲۴ء

— (ماہنامہ) الفیض۔ امرتسر۔ اڈیٹر
محمد سلیمان
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۱۴
جولائی ۱۹۲۴ء

— (ماہنامہ) المعلم۔ حیدرآباد دکن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۴۵۔۱۴۶
اکتوبر ۱۹۲۲ء

— (ماہنامہ) الضیاء۔ لکھنؤ۔ زیر ادارت
مسعود عالم
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۳۔۵۰۴
جولائی ۱۹۳۲ء

— (ماہنامہ) الضیاء (عربی میں)۔
اڈیٹر۔ مسعود عالم
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۸۰
جنوری ۱۹۳۵ء

— (ماہنامہ) امداد باہمی۔ اڈیٹر
محمود احمد عرفانی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۹۱
جولائی ۱۹۲۹ء

— (ماہنامہ) انبالہ۔ اڈیٹر۔ ایم۔ جے
خاں رہبر پانی پتی

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۶۳
اپریل ۱۹۲۶ء

— (ماہنامہ) انوار القدس - بمبئی - اڈیٹر
شریف احمد راز لکھنوی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۴۳-۳۴۶
اپریل ۱۹۲۶ء

— (ماہنامہ) انکشاف - لکھنؤ - اڈیٹر
سید محمد نسیم انہونوی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۸۹
جولائی ۱۹۲۹ء

— (ماہنامہ) انیس - ایلچپور - برار -
اڈیٹر - شرار
اردو - اورنگ آباد دکن ۶۲۰۳
جولائی ۱۹۲۵ء

— (ماہنامہ) الاصلاح - برلن - اڈیٹر
برکت اللہ
اورنگ آباد - اردو دکن ص ۵۵۵
جولائی ۱۹۲۶ء

— (ماہنامہ) الاصلاح - سوائمیر - اعظم گڑھ
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۰۴-۵۰۶
جولائی ۱۹۳۶ء

— (ماہنامہ) الامین - صوبہ بہار - اڈیٹر
محمد شفیع فردوسی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۷۹
اپریل ۱۹۲۷ء

— (ماہنامہ) ایوان - گورکھپور -
مجنوں گورکھپوری
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۹۸
اپریل ۱۹۳۱ء

— (ماہنامہ) ایوان - گورکھپور - ایڈیٹر
مجنوں گورکھپوری
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۸۹-۴۹۹
اپریل ۱۹۳۱ء

— (ماہنامہ) ایشور بھگتی - منٹگمری
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۲۳
اپریل ۱۹۲۵ء

— (ماہنامہ) ایشیا - میرٹھ - مدیر
ساغر نظامی
اردو - اورنگ آباد دکن
اکتوبر ۱۹۳۵ء

— (ماہنامہ) ایشیا - لاہور
اردو - دہلی - جنوری ۱۹۳۹ء

— (ماہنامہ) الہادی (مذہبی) - دہلی
مدیر - محمد عثمان
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۵۴
جولائی ۱۹۳۶ء

— (ماہنامہ) الحافظ
اردو - دہلی ص ۳۸۷ جولائی ۱۹۳۶ء

— (ماہنامہ) القاضی لاہور - اڈیٹر
جمیل الدین احمد شیدا بلگرامی

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۸۸۱
اکتوبر ۱۹۳۳ء

— (ماہنامہ) ایجوکیشنل گزٹ۔ جالندھر
ایڈیٹر۔ محمد جان
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۹۱
جولائی ۱۹۲۹ء

— (ماہنامہ) آفتاب۔ کلکتہ — اڈیٹر
چراغ حسن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۱۵
اکتوبر ۱۹۲۶ء

— (ماہنامہ) آئینۂ ادب۔ حیدرآباد دکن
اڈیٹر۔ یونس احمد
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۲۲
اکتوبر ۱۹۳۶ء

— (ماہنامہ) آئینہ کلکتہ۔ اڈیٹر محمد اسحاق
اردو۔ اورنگ آباد دکن
جنوری ۱۹۳۳ء

— (ماہنامہ) آئینہ کلکتہ۔ اڈیٹر۔ محمد
اسحاق امرتسری
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۷۴
اپریل ۱۹۳۳ء

— (ماہنامہ) باغبان۔ لاہور۔ اڈیٹر
ایس۔ ڈی۔ اوپل
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۶
جولائی ۱۹۳۷ء

— (ماہنامہ) بہارستان۔ پٹنہ۔ اڈیٹر
عبدالجبار
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۷۲۔۵۷۳
جولائی ۱۹۳۱ء

— (ماہنامہ) برہان۔ دہلی۔ مرتب
سعید احمد
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۲۰
جولائی ۱۹۳۸ء

— (ماہنامہ) برہان دہلی
اردو۔ دہلی ص ۱۷۷ جنوری ۱۹۴۴ء

— (ماہنامہ) بشریٰ مدراس۔ اڈیٹر
ابوالجلال ندوی و عبدالرزاق دیوبندی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۸۴
اپریل ۱۹۳۳ء

— (ماہنامہ) پاسبان گورداسپور۔
اڈیٹر لطیف انور
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۴۴
جنوری ۱۹۳۳ء

— (ماہنامہ) پرچم۔ ایڈیٹر۔ ہشام
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۸۰
اپریل ۱۹۲۷ء

— (ماہنامہ) پریم۔ جموں۔ مدیر گلزار احمد
اردو۔ دہلی ص ۱۴۴ جنوری ۱۹۴۶ء

— (ماہنامہ) پیام ادب۔ حیدرآباد دکن
اردو۔ دہلی ص ۵۵۸ اکتوبر ۱۹۴۳ء

— (ماہنامہ) پیام ادب۔ حیدرآباد دکن
اردو۔ دہلی ص ۱۲۹ جنوری ۱۹۴۴ء

— (ماہنامہ) پیکر خیال۔ بنگلور۔ ایڈیٹر عبدالباسط برق
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۶۸ جنوری ۱۹۴۴ء

— (ماہنامہ) تاج۔ حیدرآباد دکن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۴۸ اکتوبر ۱۹۲۴ء

— (ماہنامہ) تبصرہ لاہور۔ اڈیٹر یعسوب حسن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۷۹ جنوری ۱۹۳۵ء

— (ماہنامہ) تجلی۔ کلکتہ۔ اڈیٹر عظیم آبادی
اردو۔ دہلی ص ۳۸۶ جولائی ۱۹۴۶ء

— (ماہنامہ) تحفہ۔ حیدرآباد دکن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۴۸ اکتوبر ۱۹۲۲ء

— (ماہنامہ) تخلیق۔ کراچی۔ مرتبہ مشفق خواجہ
اردو۔ کراچی ص ۵۴۲ - ۵۴۳ اکتوبر ۱۹۵۶ء

— (ماہنامہ) ترجمان القرآن حیدرآباد دکن مرتب ابوالاعلیٰ مودودی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۶۱۱-۶۱۲ جولائی ۱۹۳۳ء

— (ماہنامہ) ترجمان سرائے صالح ضلع ہزارہ مدیر غلام ربانی لودھی
اردو اورنگ آباد دکن ص ۶۱۱ جولائی ۱۹۳۳ء

— (ماہنامہ) تسنیم۔ آگرہ۔ مدیر۔ فانی بدایونی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۹۹ اپریل ۱۹۳۱ء

— (ماہنامہ) تصویر وفا۔ لودیانہ (پنجاب) ایڈیٹر د
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۲۴ اپریل ۱۹۲۳ء

— (ماہنامہ) تفریح۔ اڈیٹر۔ آغا رفیق
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۵۱ جنوری ۱۹۲۸ء

— (ماہنامہ) تنویر۔ بمبئی۔ اڈیٹر۔ سحر
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۲۹ جنوری ۱۹۳۵ء

— (ماہنامہ) ثقافت۔ اڈیٹر خلیفہ عبدالحکیم
اردو کراچی ص ۲۷۸-۲۷۹ اپریل ۱۹۵۵ء

— (ماہنامہ) جام جہاں نما۔ لکھنؤ۔ اڈیٹر۔ افقر موہانی وارثی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۶۷ اپریل ۱۹۲۹ء

— (ماہنامہ) جدید اردو ۔ کلکتہ ۔ اڈیٹر
پرویز شاہدی
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۲۰ ۔ ۷۲۱
جولائی ۱۹۳۸ء

— (ماہنامہ) جامعہ ۔ علی گڑھ ۔ اڈیٹر
(یہ جامعہ ملیہ علی گڑھ کا ماہانہ علمی
رسالہ ہے)

— (ماہنامہ) جاوید ۔ دہلی ۔ مرتب :-
عبدالوحید
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۲۰
اپریل ۱۹۳۴ء

— (ماہنامہ) جہانگیر ۔ لاہور ۔ اڈیٹر
احمد خاں
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۳
جولائی ۱۹۳۲ء

— (ماہنامہ) جوہر نسواں ۔ اڈیٹر عزیز فاطمہ
اردو ۔ اورنگ آباد ۔ دکن ص ۱۸۰
جنوری ۱۹۳۵ء

— (ماہنامہ) چاند (ہندی) الہ آباد ۔
اڈیٹر کنہیا لال
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۸۸۷
اکتوبر ۱۹۳۰ء

— (ماہنامہ) چمنستان ۔ دلی ۔ مدیر خوش
قزلباش
اردو ۔ دہلی ص ۱۶۶ ۔ ۱۶۷

جنوری ۱۹۴۱ء

— (ماہنامہ) چمنستان ۔ لاہور ۔ اڈیٹر
محمد افضل
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۸۰۳
اکتوبر ۱۹۲۹ء

— (ماہنامہ) چندن ۔ پنجاب ۔ اڈیٹر
سدرشن
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۰۲
جنوری ۱۹۳۱ء

— (ماہنامہ) حاذق دہلی ۔ اڈیٹر
محمد حسن رضوی وعطاالرحمٰن
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۹۴
اپریل ۱۹۳۳ء

— (ماہنامہ) حریم ۔ لکھنؤ ۔ اڈیٹر
آنسہ جمال
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۰۵
جنوری ۱۹۳۱ء

— (ماہنامہ) ہمایوں لاہور ۔ اڈیٹر
میاں بشیر احمد
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۲۲ ۔ ۴۲۵
اپریل ۱۹۲۲ء

— (ماہنامہ) ہمجولی ۔ حیدرآباد دکن
اڈیٹر ۔ سیدہ بیگم
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۷۳ ۔ ۵۷۴
جولائی ۱۹۳۱ء

— (ماہنامہ) ہمدرد صحت دہلی - اڈیٹر عبدالحمید
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۸۸۱-۸۸۲
اکتوبر ۱۹۳۳ء

— (ماہنامہ) عورتوں کے لئے - خاتون - لشکر گوالیار - اڈیٹر - مظفر حسین
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۷۲
جنوری ۱۹۳۰ء

— (ماہنامہ) خضر راہ - لکھنؤ — اڈیٹر حامد علی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۸۹-۵۹۰
جولائی ۱۹۲۹ء

— (ماہنامہ) خیالستان - لاہور - اڈیٹر اختر شیرانی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۸۹
اکتوبر ۱۹۳۰ء

— (ماہنامہ) دبستان - سیالکوٹ اڈیٹر - غلام سرور
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۳۲
جنوری ۱۹۳۴ء

— (ماہنامہ) رفیق - مرتبہ آغا رفیق
اردو اورنگ آباد دکن ص ۲۰۳-۲۰۴
جنوری ۱۹۳۱ء

— (ماہنامہ) رہبر نسواں - (عورتوں کے لئے) دہلی - اڈیٹر فاروقی بیگم
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۶۳۴
جولائی ۱۹۳۴ء

— رہنمائے تعلیم لاہور - زیر اہتمام جگت سنگھ
اردو - دہلی ص ۳۷۱
اپریل ۱۹۳۹ء

— (ماہنامہ) رئیس ہند - پٹیالہ
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۸۰-۴۸۱
جولائی ۱۹۲۷ء

— (ماہنامہ) سارنگ - لاہور - ایڈیٹر ایس - ایل - پرماشر
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۰۲-۲۰۳
جنوری ۱۹۳۱ء

— (ماہنامہ) ستارۂ صبح - اڈیٹر موہن سنگھ
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۷۹-۳۸۰
اپریل ۱۹۲۷ء

— (ماہنامہ) سفیر سخن - پشاور - اڈیٹر ابوالکیف سرحدی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۶۱
اکتوبر ۱۹۳۳ء

— (ماہنامہ) سبحان (رسائل علمیہ وفنون ادبیہ) گورکھپور - کیفی چریا کوٹی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۳۴۴
اکتوبر ۱۹۳۲ء

— (ماہنامہ) ستارہ - لاہور - اڈیٹر

راجیشور ناتھ
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۰
اپریل ۱۹۳۲ء

— (ماہنامہ) سوز و ساز۔ دہلی۔ اڈیٹر ملک الکلام ماہر دہلوی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۴۷
اکتوبر ۱۹۲۴ء

— (ماہنامہ) شاہکار۔ لاہور — اڈیٹر پروفیسر تاجور
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۴۳۔۱۴۴
اپریل ۱۹۳۵ء

— (ماہنامہ) شفق۔ اڈیٹر۔ مہاجر زیر سرپرستی۔ نعیم الرحمٰن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۵۸۔۱۵۹
جنوری ۱۹۲۳ء

— (ماہنامہ) شمس الحکمت لاہور — اڈیٹر محمد اکبر علی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۶۱۲
جولائی ۱۹۳۳ء

— (ماہنامہ) شمیم۔ پٹنہ۔ اڈیٹر علی اطہر
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۳۶
اکتوبر ۱۹۳۶ء

— (ماہنامہ) صبا۔ حیدرآباد دکن۔ اڈیٹر۔ سلیمان ادیب
اردو۔ کراچی ص ۱۳۸ جولائی ۱۹۵۵ء

— (ماہنامہ) صبح امید۔ لدھیانہ — اڈیٹر: مدن گوپال متن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۶۲۰
جولائی ۱۹۳۵ء

— (ماہنامہ) ضیائے شمس۔ سہارنپور مدیر۔ ظہیر احمد
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۰
اپریل ۱۹۳۲ء

— (ماہنامہ) طارق، لاہور — اڈیٹر محمد شریف
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۷۷۔۱۷۸
جنوری ۱۹۳۵ء

— (ماہانہ) طبیب۔ پٹنہ۔ انجمن خدام الطب
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۴۹۔۳۵۰
اپریل ۱۹۳۲ء

— (ماہانہ) طور۔ لاہور۔ اڈیٹر جلال الدین
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۶۔۴۸۷
جولائی ۱۹۲۸ء

— (ماہانہ) عارف۔ کانپور۔ مدیر محمد اسمٰعیل
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۷۸
جنوری ۱۹۳۵ء

— (ماہانہ) عارف۔ لاہور۔ مدیر عبدالرحمٰن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۳۲
جنوری ۱۹۳۶ء

— (ماہانہ) عروس خیال، دہلی — اڈیٹر
مظہر انصاری
اردو - اورنگ آباد دکن ۴۴۳ - ۴۴۴
اپریل ۱۹۳۵ء

— (ماہوار) عفت - (عورتوں کے لئے)
ڈاکخانہ کھگول پٹنہ - اڈیٹر صالحہ خاتون
اردو - اورنگ آباد دکن ۱۷۰
جنوری ۱۹۲۷ء

— (ماہانہ) غالب - امرتسر - اڈیٹر میرزا شجاع
اردو - اورنگ آباد (دکن) ۳۷۹
اپریل ۱۹۲۷ء

— (ماہانہ) فطرت - پٹنہ - مدیر یوسف بلخی
اردو - اورنگ آباد دکن ۲۲۲
جنوری ۱۹۳۴ء

— (ماہانہ) کابل - افغانستان
اردو اورنگ آباد دکن ۷۸۰
اکتوبر ۱۹۳۳ء

— (ماہانہ) کارنامہ - الہ آباد - ادارت
مسرور قنوجی
اردو - اورنگ آباد دکن ۷۲۱
جولائی ۱۹۳۸ء

— (ماہوار) کوآپریشن - پنجاب - ایڈیٹر
محمد بخش
اردو - اورنگ آباد دکن ۳۳۳
اپریل ۱۹۲۸ء

— (ماہانہ) کوثر - دہلی - اڈیٹر ظفر تاباں
اردو - اورنگ آباد دکن ۷۸۹
اکتوبر ۱۹۳۰ء

— (ماہانہ) کامیابی - دہلی - ایڈیٹر احمد سعید
اردو - اورنگ آباد دکن ۵۹۰
جولائی ۱۹۲۹ء

— (ماہانہ) فانوس - جھانسی — ایڈیٹر
آفتاب اکبرآبادی
اردو - اورنگ آباد دکن ۳۸۱
اپریل ۱۹۲۷ء

— (ماہنامے) قوس و قزح اور نیرنگ خیال
لاہور
اردو - اورنگ آباد دکن ۳۸۷
اپریل ۱۹۲۷ء

— (ماہوار) گرو سیوک - دہلی - مدیر
حسن نظامی
اردو - اورنگ آباد دکن ۱۴۵
اکتوبر ۱۹۲۴ء

— (ماہانہ) گلچیں - لاہور — اڈیٹر
ابو محمد ثاقب
اردو - اورنگ آباد دکن ۷۶۶ - ۷۶۷
اکتوبر ۱۹۳۲ء

— (ماہنامہ) گل خنداں - لاہور
اردو کراچی ۱۲۲
جنوری ۱۹۵۷ء

— (ماہانہ) ماہ تمام - کلکتہ - اڈیٹر محمد اسحاق
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۶۸۸
جولائی ۱۹۳۴ء

— (ماہانہ) المبصر - لکھنؤ - مدیر ابو العلا ناطق
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۸۹
جولائی ۱۹۲۹ء

— (ماہوار) مجلہ مکتبہ - حیدر آباد دکن
مدیر - عبدالقادر
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۸۰۳
اکتوبر ۱۹۲۹ء

— (ماہانہ) مرغ سحر (مرغیوں کے بارے میں) لکھنؤ اڈیٹر ترک مان
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۹۶۱
اکتوبر ۱۹۲۴ء

— (ماہانہ) مسلمہ (عورتوں کیلئے)
جالندھر - اڈیٹر - حمیرا
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۷۷
اکتوبر ۱۹۳۷ء

— (ماہانہ) مسیحائے زماں - بخارہ - الور
مدیر - محمد اکرم حسین
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۹۷
جولائی ۱۹۲۹ء

— (ماہانہ) مشاعرہ - حیدر آباد دکن
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۶۸
اپریل ۱۹۲۸ء

— (ماہانہ) مشہور - دہلی - ایڈیٹر محمد تقی
اردو دہلی ص ۱۶۷ جنوری ۱۹۴۴ء

— (ماہانہ) مشرب - تاریخ اردو نمبر
کراچی
اردو - کراچی ص ۵۳۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء

— (ماہانہ) مشیر العلاج - گجرات - اڈیٹر
محمد اکبر صادق
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۴۲-۷۴۵
جولائی ۱۹۳۷ء

— (ماہانہ) معلم العلوم - حیدر آباد (دکن)
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۵۱-۱۵۲
جنوری ۱۹۲۸ء

— (ماہانہ) معلومات - لکھنؤ — ایڈیٹر
عبدالوالی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۶۸۴-۶۸۵
جولائی ۱۹۳۴ء

— (ماہانہ) معیار - پٹنہ - مرتبہ عبدالودود
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۰۷-۲۱۰
اپریل ۱۹۳۶ء

— (ماہنامہ) معیار کلکتہ — اڈیٹر
فیض قادری
اردو اورنگ آباد دکن ص ۲۵۶-۲۵۷
اپریل ۱۹۳۳ء

— (ماہانہ) مظاہر جدید - ایڈیٹر عبدالرسول قادری ملول
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۶۹
جنوری ۱۹۲۴ء

— (ماہانہ) موج نسیم - بانکی پور - پٹنہ اڈیٹر - بہاالدین فیض
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۷۲
جولائی ۱۹۳۱ء

— (ماہانہ) "مورخ" فیض آباد - ادارت علی اظہر
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۰۳
جولائی ۱۹۳۲ء

— (ماہانہ) موی لینڈ (سینما اور فلم کے مضامین) سکندر آباد دکن
اردو - دہلی ۱۸۰ ص جنوری ۱۹۳۹ء

— (ماہنامہ) مشعل - صوبہ سرحد - اڈیٹر عزیزالرحمٰن
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۲۹-۲۳۰
جنوری ۱۹۳۸ء

— (ماہانہ) میخانہ - لکھنؤ - مدیر - اسد الصابری
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۰۴
جنوری ۱۹۳۱ء

— (ماہانہ) ندیم - مدیر - نجم
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۸۱
اکتوبر ۱۹۳۱ء

— (ماہانہ) ندیم - حیدر آباد دکن - مدیر ندیم الحسن
اردو - اورنگ آباد (دکن) ص ۱۷۵،
۱۷۶ جنوری ۱۹۳۲ء

— (ماہوار) نظارہ، کانپور — اڈیٹر ابومحمد ثاقب کانپوری
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۴۲-۳۴۳
اپریل ۱۹۲۶ء

— (ماہانہ) نظام جوبلی میگزین - دہلی اڈیٹر - خواجہ حسن نظامی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۰۶-۵۰۷
جولائی ۱۹۳۶ء

— (ماہانہ) نقاد - کلکتہ - مدیر - اسد
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۸۱-۷۸۲
اکتوبر ۱۹۳۱ء

— (ماہانہ) نقاش - میرٹھ — اڈیٹر سالک ڈبائیوی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۷۳
جولائی ۱۹۳۱ء

— (ماہانہ) نقاش بدایوں
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۷۴-۳۷۵
جولائی ۱۹۲۲ء

— (ماہنامہ) نگار - آگرہ رئیس التحریر نیاز فتحپوری
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۶۴-۷۶۹

جولائی ۱۹۲۲ء

— (ماہانہ) نگہت (بچوں کے لئے) لکھنؤ

اڈیٹر عارف علوی

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۹۱۴۲

اکتوبر ۱۹۳۷ء

— (ماہانہ) نورالتعلیم۔ پنجاب

اردو۔ دہلی ص ۳۸۳ اپریل ۱۹۴۰ء

— (ماہانہ) نور۔ جالندھر۔ مدیر اسداللہ

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۲۵

جولائی ۱۹۳۷ء

— (ماہنامہ) نیاز۔ لدھیانہ — ایڈیٹر

شبیر احمد خاں اخوندی

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۲۲

اپریل ۱۹۲۲ء

— (ماہوار) نیرنگ۔ لاہور

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۴۸

اکتوبر ۱۹۲۴ء

— (ماہانہ) ہمالیہ۔ بمبئی۔ اڈیٹر بسنال قریشی

(مختلف مضامین طبی۔ ادبی۔ فلمی وغیرہ)

اردو۔ دہلی ص ۵۷۱ جولائی ۱۹۳۹ء

— (ماہنامہ) ہمایوں۔ زیر ادارت —

بشیر احمد

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۱

اپریل ۱۹۳۳ء

— (ماہانہ) ہندوستانی۔ پٹنہ۔ اڈیٹر

سہیل عظیم آبادی

اردو۔ دہلی۔ ص ۱۷۸ - ۱۷۹

جنوری ۱۹۳۹ء

— (ماہوار) ہندستانی۔ مراد آباد

اڈیٹر۔ رشید کمال

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۲۴۲

جولائی ۱۹۳۷ء

— (ماہانہ) ہنرمند۔ لاہور۔ اڈیٹر

محبوب الہٰی

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۵۱

جنوری ۱۹۲۸ء

— (ماہانہ) ہنس۔ بمبئی۔ اڈیٹر منشی پریم

چند و کنہیالال

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۷۷-۷۷۹

اکتوبر ۱۹۳۵ء

— (ماہانہ) ہونہار (بچوں کے لئے) پستک

بھنڈار اڈیٹر

اردو دہلی ص ۱۸۰ جنوری ۱۹۳۹ء

— (ماہانہ) یادگار رضا۔ اڈیٹر

ابرار حسن صدیقی

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۸۰

اپریل ۱۹۲۷ء

— (ماہنامہ) یادگار۔ لاہور۔ اڈیٹر نیر

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۶۴

اپریل ۱۹۳۳ء

— (سہ ماہی) بہار۔ ضلع ناسک۔ زیر نگرانی
یوسف عزیز
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۶۸
جنوری ۱۹۲۴ء

— (سہ ماہی) تاریخ۔ اڈیٹر شمس اللہ قادری
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۶۵-۳۶۶
اپریل ۱۹۲۵ء

— (سہ ماہی) تجلی۔ حیدرآباد دکن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۶۸
جولائی ۱۹۲۷ء

— (سہ ماہی) تربیت اورنگ آباد دکن
اردو۔ دہلی ص ۷۰۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء

— (سہ ماہی) تعلیم و تربیت۔ علی گڑھ
اڈیٹر۔ مظفر حسین
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۲۱
اپریل ۱۹۲۸ء

— (سہ ماہی) حیاتِ نو (حالی مسلم ہائی
اسکول پانی پت کا آرگن) پانی پت —
اڈیٹر محمد بدر الاسلام فضلی
اردو اورنگ آباد دکن ص ۸۷۹-۸۸۱
اکتوبر ۱۹۳۳ء

— (سہ ماہی) حیدرآباد (ٹیچر)
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۷۸
اپریل ۱۹۲۷ء

— (سہ ماہی) حیدرآباد ٹیچر حیدرآباد دکن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۵۰-۱۵۱
جنوری ۱۹۲۵ء

— (سہ ماہی) سخن سنج۔ لکھنؤ۔ مرتب
سراج الحق
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۶۸
جنوری ۱۹۲۴ء

— (سہ ماہی) سہیل، علی گڑھ۔ مرتب
رشید احمد صدیقی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۶۰-۳۶۱
اپریل ۱۹۲۶ء

— (سہ ماہی) صبح سعادت
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۷۸-۳۷۹
اپریل ۱۹۲۷ء

— (سہ ماہی) طبیہ کالج میگزین۔ علی گڑھ
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۱-۵۰۳
جولائی ۱۹۳۲ء

— (سہ ماہی) مجلۂ طیلسانین۔ حیدرآباد
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۷۸-۴۷۹
اپریل ۱۹۳۷ء

— (سہ ماہی) مجلۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن
ایڈیٹر۔ طلبہ
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۷۶-۳۷۸
اپریل ۱۹۲۷ء

— (سہ ماہی) مجلۂ کلیہ گلبرگہ
(وسطانیہ کالج کا سہ ماہی رسالہ)

اردو - دہلی ص ۲۲۰ - ۲۲۱
جولائی ۱۹۴۵ء

— (سہ ماہی) مسلم ریویو - (انگریزی)
کلکتہ - ایڈیٹر اے - ایچ - ہاروے
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۲۵ - ۳۲۶
اپریل ۱۹۲۷ء

— (سہ ماہی) مصنّف - علی گڑھ - مرتّب
الطاف حسین
اردو - دہلی ص ۳۰۴ جولائی ۱۹۴۳ء

— (سہ ماہی) نوائے ادب بمبئی - اڈیٹر
ظہیر الدین مدنی
اردو کراچی ص ۱۶۳ - ۱۶۴
اپریل ۱۹۵۰ء

— (سہ ماہی) نیا ادب (ترقی پسند مصنفین
کی سہ ماہی کتاب ہے)
اردو - دہلی ص ۱۴۹ - ۱۵۱
جنوری ۱۹۴۳ء

— (سہ ماہی) ہندوستانی - الہ آباد
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۰۰ - ۲۰۲
جنوری ۱۹۳۱ء

— (چار ماہی) فکر و نظر - علی گڑھ
اردو - کراچی ص ۱۱۴ جولائی ۱۹۵۵ء

— (ششماہی) رفیق الطلبہ - پونا
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۹۱۴
اکتوبر ۱۹۳۷ء

— (ششماہی) رفیق طلبار - علی گڑھ
اردو - دہلی ص ۳۸۷ - اپریل ۱۹۴۷ء

— (ششماہی) نوائے ہند - علی گڑھ -
ایڈیٹر ( ) (یہ رسالہ انگلستان
کی انجمن ترقی اردو کا ہے - جو ہندوستان
کے طلبہ مقیم انگلستان نے مرتب کیا ہے)
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۵۹
جولائی ۱۹۲۳ء

— (سالنامہ) ادب لطیف
اردو - دہلی ص ۲۰۶ - اپریل ۱۹۴۶ء

— (سالنامہ) ادبی دنیا - لاہور
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۳۱
جنوری ۱۹۳۴ء

— (سالنامہ) ادبی دنیا
اردو - دہلی ص ۳۲۶ - اپریل ۱۹۴۱ء

— (سالانہ نمبر) اسلامیہ ہائی اسکول
اردو - کراچی ص ۱۵۶ - اپریل ۱۹۵۱ء

— (سالنامہ) آج کل
اردو - دہلی ص ۴۷۰ - اکتوبر ۱۹۴۵ء

— (سالانہ) برگ گل - انجمن ترقی اردو کالج
کا رسالہ
اردو - کراچی ص ۳۴۴ - جولائی ۱۹۵۶ء

— (سالانہ نمبر) پھول باغ - پٹیالہ
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۳۱
جنوری ۱۹۳۸ء

— (سالنامہ) تحریک
اردو - کراچی ص ۲۷۹ - ۲۸۰
اپریل ۱۹۵۵ء

— (سالنامہ) چنگاری
اردو - دہلی ص ۳۰۶ - اپریل ۱۹۴۶ء

— (سالنامہ) ساقی - دہلی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۳۰
جنوری ۱۹۳۴ء

— (سالنامہ) ساقی
اردو - دہلی ص ۲۲۷۲ - اپریل ۱۹۴۱ء

— (سالنامہ) ساقی - کراچی — اڈیٹر
شاہد احمد
اردو - کراچی ص ۱۶۲ - ۱۶۳
اپریل ۱۹۵۰ء

— (سالنامہ) ساقی
اردو - کراچی ص ۳۰۴ - جولائی ۱۹۵۱ء

— (سالنامہ) سائنس - عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد دکن
اردو - کراچی ص ۳۱۴ - جولائی ۱۹۵۵ء

— سرستی - سالانہ نمبر (ہندی)
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۲۵
اپریل ۱۹۲۸ء

— (سالنامہ) سفیر سخن (صوبہ سرحد)
پشاور
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۴۶
اپریل ۱۹۳۵ء

— (سالنامہ) شاعر
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۲۶
جولائی ۱۹۳۵ء

— (سالانہ نمبر) عالمگیر
اردو - دہلی ص ۴۰۴ - جولائی ۱۹۴۳ء

— (سالنامہ) عالم گیر
اردو - دہلی ص ۴۷۰ - ۴۷۱
اکتوبر ۱۹۴۵ء

— (سالنامہ) کابل
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۹۷۲
اکتوبر ۱۹۳۴ء

— (سالنامہ) کابل - افغانستان
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۰۹ - ۵۱۰
جولائی ۱۹۳۶ء

— (سالنامہ) کابل - افغانستان
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۲۴
جولائی ۱۹۳۵ء

— (سالنامہ) کارواں - مرتب - مجید ملک
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۲۶ - ۲۲۹
جنوری ۱۹۳۴ء

— (سالانمبر) کریسنٹ سورت سٹی مسلم
اسٹوڈینٹ یونین
اردو - دہلی ص ۵۵۹ - اکتوبر ۱۹۴۳ء

— (سالنامہ) مجلہ کابل - انجمن ادبی

کابل، افغانستان
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۸۸۲۔۸۸۳
اکتوبر ۱۹۳۳ء

— (سالنامہ) مشہور۔ دہلی۔ اڈیٹر محمد تقی
اردو۔ دہلی ص ۲۵۶۔ اپریل ۱۹۴۳ء

— (سالنامہ) نیرنگ خیال۔ لاہور
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۲۹۔۲۳۰
جنوری ۱۹۳۴ء

— اتالیق۔ ایڈیٹر۔ عبدالرب کوکب
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۰۰
اپریل ۱۹۳۱ء

— (ادبستان۔ اڈیٹر رشید صدیقی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۱۶
اکتوبر ۱۹۲۶ء

— ادب۔ "محمود آباد نمبر"
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۸
جولائی ۱۹۳۶ء

— ادب۔ کراچی۔ مدیر۔ رحیل آذری
اردو۔ کراچی ص ۱۵۶۔ اپریل ۱۹۵۱ء

— ادب لطیف۔ "اسم مسمیٰ نمبر"
اردو۔ دہلی ص ۱۸۱۔ جنوری ۱۹۳۹ء

— ادب لطیف۔ "افسانہ نمبر"
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۹۱۶
اکتوبر ۱۹۳۷ء

— ادراک۔ امروہہ۔ اڈیٹر منصور حسین
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۴۴
اپریل ۱۹۳۵ء

— اردو ادب ع۲۔ لاہور
اردو۔ کراچی ص ۱۵۲۔ جولائی ۱۹۵۰ء

— اردو ایسوسی ایشن میگزین۔ الہ آباد
ایڈیٹر۔ حبیب الرحمٰن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۷۶
جنوری ۱۹۳۲ء

— اردو کے جدید رسالے
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۱۹۔۵۲۰
اپریل ۱۹۳۴ء

— اردو۔ ضمیمہ (مدارس کرسچین کالج میگزین)
اردو۔ دہلی ص ۲۴۰۔ اپریل ۱۹۴۵ء

— ارمغان۔ کراچی۔ اڈیٹر۔ لیاقت حسین
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۴۴۔۴۴۵
اپریل ۱۹۳۵ء

— افکار
اردو۔ کراچی ص ۳۴۔ جولائی ۱۹۵۷ء

— افکار، منٹو نمبر۔ کراچی
اردو۔ کراچی ص ۲۸۱۔۲۸۲۔ اپریل ۱۹۵۵ء

— البرق۔ جالندھر۔ مدیر۔ محمد علی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۹۹۰
جولائی ۱۹۳۳ء

— البرق۔ جالندھر۔ مدیر۔ محمد علی

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۷۹
جنوری ۱۹۳۵ء

— الہادی - (مذہبی) ایڈیٹر - محمد حسین
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۸۰
اکتوبر ۱۹۲۹ء

— البصیرۃ - چن پٹن - ضلع بنگلور
اردو - اورنگ آباد - دکن ص ۷۴۸
اکتوبر ۱۹۳۲ء

— الکمال - دہلی - ایڈیٹر - بشیر خاں
ریاض شیروانی
اردو - اورنگ آباد ص ۳۰۴
اپریل ۱۹۲۳ء

— الموسیٰ حیدرآباد دکن - مدیر سرفراز علی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۹۱-۴۹۲
جولائی ۱۹۳۴ء

— الناظر - اڈیٹر ظفر الملک علوی (کچھ دنوں
بند رہ کر اب پھر جاری ہوا ہے)
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۲۱-۳۲۲
اپریل ۱۹۲۳ء

— الناظر - لکھنؤ - ایڈیٹر - ظفر الملک علوی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۸۷-۴۸۸
جولائی ۱۹۳۴ء

— انتخاب - لکھنؤ - ایڈیٹر - سیفی ندوی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۲۰
اپریل ۱۹۳۴ء

— انتخاب مضامین رسالہ جوہر - علی گڑھ
(جامعہ ملیہ علی گڑھ میں جوہر کے نام
سے ایک قلمی رسالہ شائع ہوتا تھا اب
"جامعہ" کے نام سے باقاعدہ طبع ہوتا ہے)
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۱۱
اپریل ۱۹۲۳ء

— انجنیئرنگ، لاہور - اڈیٹر - سیتارام
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۸۵
جولائی ۱۹۲۸ء

— ان ڈسٹری اینڈ میکانک - لاہور
اردو - دہلی ص ۱۳۰۲ - جنوری ۱۹۳۷ء

— انعام - ملتان - اڈیٹر - اسد اللہ اسد
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۵۸
جنوری ۱۹۲۳ء

— انتخاب لاہور - اڈیٹر - اختر شیرانی
الاخفائی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۶۲
اپریل ۱۹۲۶ء

— انکشاف - لکھنؤ - ایڈیٹر - محمد نسیم انہونوی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۰۱-۷۰۲
اکتوبر ۱۹۲۸ء

— ایجوکیشنل گزٹ - جالندھر
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۵۷
اپریل ۱۹۳۰ء

— انوار - بمبئی

اردو - دہلی ۴ ۱۴۸ - ۱۴۹

جنوری ۱۹۴۴ء

— ایوان - گورکھپور - مدیر - مجنوں گورکھپوری

اردو - اورنگ آباد دکن ۴ ۶۸۸ - ۶۸۹

جولائی ۱۹۳۴ء

— بانو (عورتوں کے لئے) بھوپال - ایڈیٹر

خاتون ارشد

اردو - اورنگ آباد دکن ۴ ۵۲۱

اپریل ۱۹۳۴ء

— بچوں کی دنیا - الہ آباد

اردو - اورنگ آباد دکن ۴ ۳۹۹ - ۴۰۰

اپریل ۱۹۳۱ء

— بہارستان - جالندھر - اڈیٹر -

اختر وارثی

اردو - اورنگ آباد دکن ۴ ۷۲۷

جولائی ۱۹۳۲ء

— بزم خیال شیلانگ - اڈیٹر لیاقت علی

صدیقی عاشق شوقی

اردو - اورنگ آباد دکن ۴ ۵۷۴

اپریل ۱۹۳۳ء

— بصیرت - لاہور - مدیر - عبدالحق

اردو - اورنگ آباد دکن ۴ ۵۲۸

جولائی ۱۹۳۰ء

— بیدار - جوالاپور ضلع سہارنپور

اردو - اورنگ آباد دکن ۴ ۵۶۸

جولائی ۱۹۲۷ء

— لی جرنل - لاہور - انجمن نحل پروری

(شہد کی مکھیوں کے متعلق)

اردو - دہلی ۴ ۳۸ - اپریل ۱۹۴۴ء

— پھول "جوبلی نمبر" لاہور — اڈیٹر

ممتاز علی

اردو - اورنگ آباد دکن ۴ ۹۶۲

اکتوبر ۱۹۳۴ء

— پھول - پٹیالہ - ایڈیٹر کوشاں

سنگت پوری

اردو - اورنگ آباد دکن ۴ ۵۲۱

اپریل ۱۹۳۴ء

— پیام اسلام - جالندھر

اردو - اورنگ آباد دکن ۴ ۵۲۷

جولائی ۱۹۳۰ء

— پیام حق - "اقبال نمبر" لاہور

اردو دہلی ۴ ۱۳۰ - جنوری ۱۹۴۷ء

— تبصرۃ الاطبا - خاص نمبر استاذ الاطبا

اردو - اورنگ آباد دکن ۴ ۸۸۳

اکتوبر ۱۹۳۳ء

— عورتوں کے رسالے

۱- تبلیغ نسواں مجوزہ خواجہ

۲- حرم ایڈیٹر بیگم عبدالغفور

۳- معین نسواں اڈیٹر عطیہ بیگم

اردو - اورنگ آباد دکن ۴ ۵۵۲

جولائی ۱۹۲۶ء

— تحفہ۔ مانڈلے (برہما) — ایڈیٹر
عبدالغفار خاں
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۷۶

اکتوبر ۱۹۲۷ء

— ترقی۔ حیدر آباد دکن۔ اڈیٹر
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۵۹

جنوری ۱۹۲۳ء

— تصویر۔ حیدر آباد دکن — ایڈیٹر
محمد اسحاق
اردو۔ دہلی ص ۲۵۷۔ ۲۵۸

اپریل ۱۹۴۶ء

— تعلیم و تربیت۔ لاہور۔ ایڈیٹر۔ عبدالحمید
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۰۰

اکتوبر ۱۹۲۸ء

— تنویر۔ کراچی۔ مدیر۔ فائق کرتپوری
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۷۹

جنوری ۱۹۳۵ء

— ٹیپو سلطان "شہید نمبر" میسور
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۷۔۵۰۸

جولائی ۱۹۳۶ء

— جدید اردو۔ کلکتہ۔ بنگال نمبر
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۳۴

جنوری ۱۹۴۶ء

— جمیل۔ مظفر نگر
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۲۱

اپریل ۱۹۲۸ء

— چاند۔ خاص نمبر
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۰۶۔۲۰۷

جنوری ۱۹۳۱ء

— چشمۂ حیات۔ ریاست نابھہ۔ اڈیٹر
صادق
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۷۳

جولائی ۱۹۳۱ء

— چمن۔ امرتسر
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۲۲

اپریل ۱۹۲۸ء

— حریم لکھنؤ۔ عورتوں کے لئے
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۰۔۳۵۱

اپریل ۱۹۳۲ء

— حسن ادب۔ لکھنؤ
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۴۸

جولائی ۱۹۲۷ء

— حصار اسلام۔ ایڈیٹر۔ سلطان احمد
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۲۸

جولائی ۱۹۳۰ء

— خاتون سرحد "خاص نمبر" پشاور
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۲۰۔۲۲۱

جنوری ۱۹۳۵ء

— خاتون۔ لشکر گوالیار۔ اڈیٹر۔ مظفر حسین

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۱
اپریل ۱۹۳۰ء

— خورشید۔ محلہ مشائخاں میرٹھ۔ اڈیٹر عبدالمجید زاہدی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۶۰
جنوری ۱۹۲۳ء

— خیابان۔ لکھنؤ۔ اڈیٹر۔ شہنشاہ حسین رضوی
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۱۹۹
جنوری ۱۹۲۷ء

— دستور آصفی، حیدر آباد دکن۔ مدیر عبدالرحمٰن
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۶
جولائی ۱۹۲۸ء

— دلگداز۔ اڈیٹر مولانا شرر
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۵۵-۵۵۷
جولائی ۱۹۲۷ء

— دی مسلم یونیورسٹی میگزین۔ اڈیٹر محمد نعمان
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۴۷
جولائی ۱۹۳۸ء

— دی ٹیچر۔ زیر ادارت منشی محمد اکبر خان حیدری
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۷۹-۴۸۰
جولائی ۱۹۲۲ء

— رسالہ معارف (سلیمان نمبر)
اردو کراچی ص ۵۷۶۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء

— رسالہ کیمیکل سوسائٹی۔ علی گڑھ۔ اڈیٹر محمد لطیف (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا رسالہ ہے)
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۹۷
جولائی ۱۹۲۹ء

— رہبر۔ اڈیٹر۔ محمد عمیر
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۸۰
اپریل ۱۹۲۷ء

— رہنمائے تعلیم۔ لاہور
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۵۲
اپریل ۱۹۳۰ء

— رہنمائے تعلیم۔ تعلیم جدید نمبر، لاہور
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۲-۴۸۳
اپریل ۱۹۳۶ء

— رہنمائے تعلیم۔ لاہور
اردو۔ دہلی ص ۱۵۴۔ جنوری ۱۹۴۴ء

— رہنمائے تعلیم۔ لاہور
اردو۔ دہلی ص ۲۵۹۔ اپریل ۱۹۴۶ء

— رہنمائے تعلیم۔ جوبلی نمبر۔ لاہور
اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۰۷
جنوری ۱۹۳۱ء

— رہنمائے تعلیم کا فسانہ نمبر۔ اڈیٹر جگت سنگھ

اردو- اورنگ آباد دکن ص ۲۲۵
اپریل ۱۹۲۴ء

— زبان - اڈیٹر- عبدالرحمٰن خوشتر
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۱۷۱
اکتوبر ۱۹۲۶ء

— زبان ہند کراچی - اڈیٹر ہرگوبند پرشاد
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۴۵۷-۴۵۸
اپریل ۱۹۳۳ء

— زمانہ- جوبلی نمبر- کانپور
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۳۰۲-۳۰۴
اپریل ۱۹۲۹ء

— زیب النساء (عورتوں کے لئے) لاہور
اڈیٹر- صغرا ہمایوں
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۳۰۹
جولائی ۱۹۳۴ء

— ساقی "پورانے خانہ نمبر"
اردو- دہلی ص ۱۸۱- جنوری ۱۹۳۹ء

— ساقی "افسانہ نمبر"
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۲۵۷-۲۶۰
جولائی ۱۹۳۶ء

— ستارہ علی گڑھ- اڈیٹر- مینا زبیری
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۱۴۸
اکتوبر ۱۹۲۴ء

— سب رس "اقبال نمبر"
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۷۲۲-۷۲۳
جولائی ۱۹۳۹ء

— ستلج - لودیانہ (پنجاب)
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۲۲۲-۲۲۳
اپریل ۱۹۲۳ء

— سہیل - علی گڑھ- ایڈیٹر- رشید احمد
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۲۱۰-۲۱۴
اپریل ۱۹۲۶ء

— سرگزشت - علی گڑھ - نظام نمبر
ایڈیٹر- ابراہیم بیگ
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۲۰۸
جنوری ۱۹۳۱ء

— سنیاسی- گجرات- پنجاب- اڈیٹر
حکیم عارف
اردو- اورنگ آباد دکن
اکتوبر ۱۹۳۲ء

— سویرا- ۱۸-۱۹- نمبر
اردو- کراچی ۱۴۳- جولائی ۱۹۵۵ء

— سہیلی- امرتسر (عورتوں کے لئے)
اردو- اورنگ آباد دکن ص ۵۶۸
جولائی ۱۹۲۷ء

— شان ہند (شاعر نمبر)
اردو کراچی ص ۲۸۰- اپریل ۱۹۵۵ء

— شاہ کار "آل انڈیا مشاعرہ نمبر" لاہور
اردو- دہلی- ص ۵۵۹-۵۶۱
اکتوبر ۱۹۴۳ء

— شاہ کار۔ "ترقی پسند ادب نمبر"

اردو۔ دہلی ص ۴۷۰۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء

— شباب۔ لکھنؤ۔ ایڈیٹر۔ شوکت تھانوی

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۷۰

اپریل ۱۹۳۴ء

— شہاب۔ جوناگڑھ۔ مرتب۔ سید ابوظفر

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۲۰

اپریل ۱۹۳۴ء

— شہاب۔ کلکتہ۔ اڈیٹر۔ ارشد عظیم

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۶۹۰-۶۹۱

جولائی ۱۹۳۴ء

— شفق۔ دہلی۔ ادارت۔ ظفر تاباں

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۲۱

اپریل ۱۹۳۴ء

— صحیفہ وارث۔ ضلع بارہ بنکی

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۰۳

اپریل ۱۹۲۸ء

— صنعت و حرفت۔ اڈیٹر۔ جسونت سنگھ

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۷۵

جنوری ۱۹۳۷ء

— صوفی۔ لاہور۔ اڈیٹر۔ محمد اسلم خاں

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۸۷

جولائی ۱۹۲۹ء

— ظل السلطان۔ اڈیٹر۔ محمد امین

اردو۔ اورنگ آباد ص ۳۲۲

اپریل ۱۹۲۳ء

— طالب علم۔ لکھنؤ

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۶۳

اپریل ۱۹۲۶ء

— طالب علم لکھنؤ

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۵۴

جولائی ۱۹۲۶ء

— ضیا القریش۔ گوجرانوالہ۔ اڈیٹر محبوب الٰہی

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۵۱

اپریل ۱۹۳۰ء

— عزیز۔ بمبئی۔ اڈیٹر۔ بشیر احمد

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۲۸-۵۲۹

جولائی ۱۹۳۰ء

— عصمت۔ جوبلی نمبر۔ مرتب رازق الخیری

اردو۔ کراچی ص ۲۷۴۔ جولائی۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء

— عصمت "راشد الخیری نمبر"

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۰۸-۵۰۹

جولائی ۱۹۳۶ء

— علی گڑھ میگزین، علی گڑھ

اردو۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۴۹-۴۶۰

جولائی ۱۹۲۳ء

— علی گڑھ میگزین۔ اکبر نمبر

اردو۔ کراچی ص ۱۵۵-۱۵۶

اپریل ۱۹۵۱ء

— علی گڑھ میگزین، علی گڑھ - اقبال نمبر
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۲۲
جولائی ۱۹۳۸ء

— علی گڑھ میگزین، علی گڑھ - اڈیٹر - آل احمد سرور
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۳۳
جنوری ۱۹۳۴ء

— علی گڑھ میگزین، علی گڑھ - تعطیلات نمبر
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۹۱۵-۹۱۶
اکتوبر ۱۹۳۷ء

— علی گڑھ میگزین، علی گڑھ - مرتبہ عبدالحفیظ
اردو - کراچی ص ۴۰۱ - ۴۰۲
جولائی ۱۹۵۶ء

— علی گڑھ میگزین، علی گڑھ - علی گڑھ نمبر
اردو - کراچی ص ۴۱۲ - ۴۱۳
جولائی ۱۹۵۵ء

— علی گڑھ میگزین، علی گڑھ - غالب نمبر مرتبہ مختارالدین
اردو - کراچی ص ۱۵۸ - ۱۶۰
اپریل ۱۹۵۰ء

— علی گڑھ میگزین، علی گڑھ - فانی نمبر
اردو - دہلی ص ۵۵۸ - اکتوبر ۱۹۴۳ء

— فانوس خیالی - مدراس
اردو - کراچی ص ۳۴۰ - جولائی ۱۹۵۶ء

— فانوس خیال (سالنامہ) مدراس
اردو - کراچی ص ۳۴۵ - اکتوبر ۱۹۵۶ء

— فانوس لاہور - اڈیٹر سردار علی احسن و نذیر احمد
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۳۸
جنوری ۱۹۳۳ء

— فلم لائٹ - علی گڑھ - ایڈیٹر - مزمل اللہ
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۲۱
اپریل ۱۹۳۴ء

— قرآنی دنیا - حیدرآباد دکن
اردو - دہلی ص ۲۵۶ - ۲۵۷
اپریل ۱۹۴۶ء

— کائنات - بلند شہر - زیر پرستی حسن برنی
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۸۲-۷۸۳
اکتوبر ۱۹۳۰ء

— کرلسینٹ - مسلم اسٹوڈینٹ یونین
اردو - دہلی ص ۴۴ - جولائی ۱۹۴۳ء

— کوثر - دلّی - اڈیٹر - ظفر تاباں
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۵۱
اپریل ۱۹۳۰ء

— کونین - گورکھپور - اڈیٹر - عزیز الرحمٰن
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۸۹

جولائی ۱۹۳۴ء

— کائنات - اڈیٹر - محمد اسمٰعیل

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۱۶

اکتوبر ۱۹۲۶ء

— کیف۔اجمیر

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۶۸

جولائی ۱۹۲۷ء

— قائد - امروہہ - مدیر - حبیب احمد

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۸۹

جولائی ۱۹۳۲ء

— قوم - دہلی - اڈیٹر - محمد یوسف کھتوریہ

اردو - دہلی ص ۲۳-۱۵ - جنوری ۱۹۴۴ء

— قیام الدین - لکھنؤ - اڈیٹر - حسن انصاری

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۵۲

اپریل ۱۹۳۰ء

— گہوارۂ ادب - بھوپال - مدیر - ابرار احمد

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۶۹۲

جولائی ۱۹۳۴ء

— لوح و قلم (طلبار کے لئے)

اردو - کراچی ص ۵۴۳ - اکتوبر ۱۹۵۶ء

— مبلغ لکھنؤ — اڈیٹر علی داور

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۹۴

اپریل ۱۹۳۲ء

— مجلس - دہلی - ڈون اسکول اورینٹل

سوسائٹی

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۹۵۲

اپریل ۱۹۳۶ء

— مجلہ عثمانیہ

اردو - دہلی ص ۱۶۸-۱۶۷

جنوری ۱۹۴۱ء

— مجلۂ موسیقی - طہران - مدیر - ع - بہیں

باستان

اردو - دہلی ص ۳۸۴ - اپریل ۱۹۴۰ء

— مجلہ ورنگل کالج - اورنگ آباد

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۹۸

اپریل ۱۹۳۱ء

— مجموعہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ

حیدرآباد دکن

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۴۴۴-۴۷۴

اپریل ۱۹۳۵ء

— مجموعہ مقالات علمیہ - حیدرآباد اکاڈمی

اردو - دہلی ص ۴۷۱-۴۷۲

اکتوبر ۱۹۴۵ء

— مبصر - لکھنؤ

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۶۶-۳۶۷

اپریل ۱۹۲۹ء

— محقق - بہاول پور

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۲۲-۳۴۲

جنوری ۱۹۳۶ء

— مخزن - ایڈیٹر - ابوالاثر حفیظ جالندھری

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۸۱

اپریل ۱۹۲۷ء

— مرقع ادب - مدیر - فیروز شہزاد پوری

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۱۷-۷۱۸

اکتوبر ۱۹۲۶ء

— مرقع - فسانہ نمبر

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۴۴-۳۴۵

اپریل ۱۹۲۸ء

— مرقع لکھنؤ - اڈیٹر - مقبول حسین بلگرامی

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۵۲

جولائی ۱۹۲۶ء

— مسلم ہائی اسکول فتح پور رسالہ - یوپی

اردو - دہلی ص ۱۷۱ جنوری ۱۹۴۰ء

— مسلم سوشل میگزین الہ آباد

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۹۷-۷۹۸

اپریل ۱۹۳۱ء

— مسلم یونیورسٹی اسکول میگزین - علی گڑھ

مدیر - سعید محمد

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۲۰۴-۲۰۵

جنوری ۱۹۳۱ء

— مسیحائے زماں، ریاست الور - اڈیٹر

محمد کرم حسین

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۲۳

اپریل ۱۹۲۸ء

— مشرب (سالنامہ) کراچی

اردو کراچی ص ۲۷۹ - اپریل ۱۹۵۵ء

— مشہور - دہلی "خاص نمبر" - اڈیٹر

محمد تقی دہلوی

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۱۳۲

جنوری ۱۹۲۶ء

— مشورہ - آگرہ - اڈیٹر - صبا اکبر آبادی

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۲۵

اکتوبر ۱۹۳۶ء

— مشیر باغبانی - لاہور - اڈیٹر -

جی - ایم - ملک

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۵۲

اپریل ۱۹۳۲ء

— مصلح - اڈیٹر - باباخلیل احمد

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۷۱۸

اکتوبر ۱۹۲۶ء

— معلومات - الہ آباد - ایڈیٹر - احمد الدین احمد

اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۲۷

جولائی ۱۹۳۰ء

— منزل - لکھنؤ - اڈیٹر - محمد رضا

اردو - دہلی ص ۵۵۷-۵۵۸

اکتوبر ۱۹۴۳ء

— ملینہ - عورتوں کے لئے
اردو - دہلی ص ۲۵۷ - اپریل ۱۹۴۶ء

— میخانہ "عید نمبر"
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۵۲
اپریل ۱۹۳۲ء

— میزان الافکار - کراچی - مدیر - فائق کرتپوری
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۶۹۱
جولائی ۱۹۳۴ء

— ندیم "بہار نمبر"
اردو - دہلی ص ۳۴۶ - اکتوبر ۱۹۴۴ء

— ندیم - "شاہ نمبر"
اردو - دہلی ص ۱۵۲ - جنوری ۱۹۴۴ء

— ندیم - "ظفر نمبر"
اردو - دہلی ص ۳۴۰ - جولائی ۱۹۴۳ء

— نرگس - لاہور - مرتب - فضل حسین
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۲۱ - ۵۲۲
اپریل ۱۹۳۴ء

— نسیم شمال - مظفر پور
اردو - دہلی ص ۳۸۶ - ۳۸۷
جولائی ۱۹۴۶ء

— نظام کالج اردو میگزین - اڈیٹر ظہیر احمد
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۵۳
جولائی ۱۹۲۶ء

— نظام کالج اردو میگزین - حیدر آباد دکن
(اس رسالہ کے شائع اور لکھنے والے
نظام کالج (حیدر آباد دکن) کے طلبہ ہیں)
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۲۰ - ۳۲۱
اپریل ۱۹۲۳ء

— نقاد - "عید نمبر" بنگلور
اردو - دہلی ص ۵۵۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء

— نقوش
اردو - کراچی ص ۳۰۴ - جولائی ۱۹۵۶ء

— نقوش
اردو کراچی ص ۱۷۴ - اکتوبر ۱۹۵۷ء

— نقوش (شخصیات نمبر)
اردو کراچی ص ۲۸۱ - ۲۸۲
اپریل ۱۹۵۵ء

— نقوش - منٹو نمبر
اردو کراچی ص ۳۱۴ - جولائی ۱۹۵۵ء

— نگار - لکھنؤ - اڈیٹر - نیاز فتحپوری
اردو - کراچی ص ۱۶۱ - ۱۶۲
اپریل ۱۹۵۰ء

— نوائے ہند - اڈیٹر - بشیر حسین
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۳۷۵ - ۳۷۶
اکتوبر ۱۹۲۳ء

— نورجہاں - امرتسر - (عورتوں کیلئے)
اردو - اورنگ آباد دکن ص ۵۶۸
جولائی ۱۹۲۷ء

— نوشیرواں ۔ کوئٹہ (بلوچستان)
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۳۶۶
اپریل ۱۹۲۹ء

— نونہال (بچوں کے لئے) ایڈیٹر احمد شجاع
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۳۷
اکتوبر ۱۹۲۲ء

— نوید ۔ ناگپور ۔ ایڈیٹر ۔ اے ۔ ایس رحمان
اردو ۔ اورنگ آباد (دکن) ۲۴، ۷۰، ۷۰۲
اکتوبر ۱۹۲۸ء

— نیا دور
اردو ۔ کراچی ص ۴۰۴ ۔ جولائی ۱۹۵۶ء

— نیادور ۔ آزادی نمبر ۔ اڈیٹر صمد شاہین
اردو ۔ کراچی ص ۱۴۹ ۔ ۱۵۱
جولائی ۱۹۵۰ء

— نیا دور ۔ پاکستان کلچرل سوسائٹی
اردو ۔ کراچی ص ۵۷۷ ۔ ۵۷۹
اکتوبر ۱۹۵۵ء

— نیادور ۔ طویل کہانی نمبر ۔ رسالہ
اردو کراچی ص ۴۰۹ ۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء

— نیرنگ خیال، سالنامہ اور عید نمبر
لاہور
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۴۴۲
اپریل ۱۹۲۸ء

— نیرنگ ۔ دہلی ۔ اڈیٹر ۔ محمد عزیز اللہ
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۲۷
جولائی ۱۹۳۰ء

— نئی زندگی "فرانسیس نمبر"
اردو دہلی ص ۱۲/۴ ۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء

— ہل ۔ الہ آباد
اردو دہلی ص ۴۷۲ ۔ اپریل ۱۹۳۹ء

— ہمایوں ۔ سالگرہ نمبر
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۰۷ ۔ ۲۰۸
جنوری ۱۹۳۱ء

— ہمایوں ۔ "سالگرہ نمبر"
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۹۱۶
اکتوبر ۱۹۳۷ء

— ہمایوں ۔ "سالگرہ نمبر"
اردو ۔ دہلی ۱۵۱ص ۔ جنوری ۱۹۴۴ء

— ہمدرد صحت "خاص نمبر"
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۱۰
جولائی ۱۹۳۶ء

— ہمدرد صحت "دق و سل نمبر"
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۳۳، ۲۴۴
جولائی ۱۹۳۸ء

— یادگار ۔ لاہور ۔ اڈیٹر نیّر
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۲۳۸
جنوری ۱۹۳۳ء

— یارانِ قدیم، دہلی، اڈیٹر رؤف علی
اردو ۔ اورنگ آباد دکن ص ۵۵۳
جولائی ۱۹۲۶ء

سیاحت، جغرافیہ اور تاریخ

عبدالحلیم شرر — عصر قدیم
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء ص ۸۰۰-۸۰۱

ابو ظفر وعطاء الرحمٰن — تمدن عتیق
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری سنہ ۱۹۳۷ء ص ۲۲۸-۲۲۹

ساعد بن احمد اندلسی — طبقات الامم مترجمہ احمد میاں
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء ص ۶۸۶

بشیر حسین زیدی — دنیا کے لینے والے
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۲۸ء ص ۳۱۶

محمد عسکری جعفری — سمندر کا عجائب خانہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۳۴ء ص ۶۸۳-۶۸۴

ایم اے۔ علوی — دنیا کے قدرتی خطے
اردو دہلی جنوری سنہ ۱۹۴۷ء
ص ۱۲۸

ایم اے۔ علوی — آئین جغرافیہ
اردو دہلی جنوری سنہ ۱۹۴۷ء
ص ۱۲۷-۱۲۸

سیاحت نامہ (ظہیر الدین کے حالات سفر یورپ (امریکہ)
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۷ء ص ۴۶۸

رشید احمد — سفر انگلستان
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری سنہ ۱۹۳۱ء ص ۱۹۲-۱۹۳

ابرار حسین قادری — ایشیا۔
(یہ کتاب ایشیا کے طبعی سیاسی اور
اقتصادی جغرافیہ پر ہے)
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء ص ۷۹۹-۸۰۰

ابرار حسین — ایشیا۔
اردو۔ دہلی جنوری سنہ ۱۹۴۷ء
ص ۱۲۷

طالب الہ آبادی — کروسو سیاح
(رابن سن کروسو کا خلاصہ)
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۹ء ص ۵۶۷

منظور علی — وینس کا سیاح
(مارکو پولو کے سیاحت نامے)
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۹ء ص ۵۶۷

—— نقشہ مقامات مقدسہ و عالم اسلام
اردو۔ اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء
ص ۷۱۴

غلام طیب — دلیس کہانی
اُردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۲۸ء ص ۳۱۰-۳۱۱

کیتھرین میو — مادرِ ہند مترجمہ خالد کے بیگ
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء ص ۶۸۷

نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں — مرتبہ حکیم سید مظفر حسین
مرقع دہلی
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری سنہ ۱۹۳۲ء ص ۱۷۰-۱۷۱

عرش تیموری — قلعۂ معلیٰ کی جھلکیاں
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء ص ۹۱۲

محی الدین — سیر گولکنڈہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۳۶ء ص ۶۹۱-۶۹۲

اکبر علی — سفر شاہانہ
(سفرنامے دہلی و رام پور و لکھنؤ
اور دیگر تفصیلی حالات)
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء ص ۹۵۳-۹۵۴

تارکھ ولیسٹرن ریلوے — کوہستان کانگڑہ کی دلفریب
وادی۔
(اسمیں کانگڑہ کے جغرافیائی، معاشیاتی
اور دیگر حالات ہیں۔)

اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۲۹ء ص ۳۶۴-۳۶۵

محمودہ رضویہ — دنیائے شہرزاد
(مصنفہ نے عراق کی سیر کی اس کتاب
میں اسی سفر کے حالات درج ہیں)
اردو دہلی اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء
ص ۵۲۲

سر اوریل آسٹائن — سفرنامہ مشرقی ترکستان۔
مترجمہ محمود اعظم فہمی۔
اردو اورنگ آباد
جولائی سنہ ۱۹۲۳ء ص ۴۵۳

محمود حسن شیخ الہند — سفرنامہ اسیر مالٹا۔
اردو اورنگ آباد۔
جنوری سنہ ۱۹۳۳ء ص ۱۵۳

بیگم تاج لیسین — آسٹریلیا کی جھلک
اردو کراچی جنوری سنہ ۱۹۵۷ء
ص ۱۲۳

خزینۂ تاریخ — جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)
کی بزم تاریخ کے مضامین۔
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء ص ۶۹۰-۶۹۲

خزینۂ تاریخ — (بزم تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ کا
گلدستہ مضامین)
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری سنہ ۱۹۳۱ء ص ۱۹۱

مترجمہ عبدالرزاق — انقلاب فرانس
اردو اورنگ آباد دکن
جولائی سنہ ۱۹۲۶ء ص ۵۴۳

اختر حسین — حبش و اطالیہ
اردو اورنگ آباد دکن
جنوری سنہ ۱۹۳۶ء ص ۱۵۳-۱۵۴

جوزف ہیل — عربوں کا تمدن مترجمہ نذیر نیازی
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۲۹ء ص ۳۶۱

محمد موسیٰ — اسلامی خلافت کا کارنامہ دوسرا
حصہ دوسری جلد مصطفیٰ کمال
اردو اورنگ آباد دکن
اپریل سنہ ۱۹۲۲ء ص ۲۴۲-۲۴۳

حکیم احمد نقوی — مختصر تاریخ اسلام
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۳۳ء ص ۶۷۴

محمد اسلم جیراجپوری (تاریخ الامت (حصہ اول سیرۃ الرسول)
اردو اورنگ آباد
جنوری سنہ ۱۹۳۳ء ص ۱۵۱-۱۵۲

محمد اسلم جیراجپوری تاریخ الامت حصہ ششم
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء ص ۶۸۸-۶۹۰

محمد اسلم جیراجپوری — تاریخ الامت حصہ ہفتم
اردو اورنگ آباد (دکن)

اپریل سنہ ۱۹۳۰ء ص ۳۴۹

تاریخ اسلام (حصہ دوئم) بنی امیہ
مرتبہ معین الدین
اردو دہلی جولائی سنہ ۱۹۴۱ء
ص ۴۷۸

انتظام اللہ — تاریخ ملت جلد نہم تاریخ صقلیہ
اردو کراچی جنوری سنہ ۱۹۵۵ء
ص ۱۴۰-۱۴۱

عبدالواحد — خلافت موحدین مترجم نعیم الرحمٰن
اردو اورنگ آباد اپریل سنہ ۱۹۲۳ء
ص ۳۱۵-۳۱۹

معین الدین احمد — عرب کی موجودہ حکومتیں
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری سنہ ۱۹۳۵ء ص ۱۷۳-۱۷۴

فرحت اللہ بیگ — تلخیص تاریخ بہادر شاہی
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۲۸ء ص ۳۱۱-۳۱۲

غلام محمد اے شیخ — تاریخ ہند
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۳ء ص ۴۴۷

بشیر الدین — تاریخ "ہندی قرون وسطیٰ"
اردو کراچی جنوری سنہ ۱۹۵۱ء
ص ۱۵۴-۱۵۶

سراج الحق — مسلمان تاجداران ہند
اردو اورنگ آباد جنوری سنہ ۱۹۲۴ء
ص ۱۶۶

سراج الحق — مسلمان تاجداران ہند
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء ص ۸۰۱

خان بہادر ظفر حسین — واقعاتِ عالمگیری
اردو- دہلی
اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء ص ۵۲۷

ظہیر الدین ظہیر — داستان غدر
اردو. کراچی اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء
ص ۴۱۱-۴۱۵

رندھیر سنگھ — غدر پارٹی کے انقلابی
اردو- دہلی- اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء
ص ۵۲۴

انجمن اسلام بمبئی — نوائے آزادی
اردو کراچی اکتوبر سنہ ۱۹۵۷ء
ص ۴۱۹-۴۲۰

لالہ متصدی لعل — بیداری ہند
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۷ء ص ۵۲۴
ص ۵۲۵

نور الٰہی و محمد عمر — تاریخ ریاست جموں و کشمیر
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۲ء ص ۵۴۶

سید عبدالحیٔ — یاد ایام (اعلیٰ) تاریخ گجرات
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء ص ۷۰۲

ہارون خان شروانی — تاریخ دکن
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۷ء ص ۴۶۸-۴۶۹

اختر حسین — مرقع آصفی
(تاجداران دکن کے حالات ہیں)
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۴ء ص ۵۱۳

محمد شمس الدین — حکومت آصفی و برکات عثمانی۔
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۲۷ء ص ۵۶۳-۵۶۴

شمس اللہ قادری — سلاطین مصر
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۲۹ء ص ۳۶۲

الیاس احمد — سرکار کا دربار
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء ص ۶۹۶

محمود خان محمود — تاریخ سلطنت خداداد
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۳۴ء ص ۵۱۱-۵۱۳

نبی احمد سندیلوی — مرقع بنارس
اردو- دہلی- اپریل سنہ ۱۹۴۰ء
ص ۳۷۲

مقبول احمد — تاریخ الہ آباد پہلی جلد
اردو دہلی اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء
ص ۶۵۷-۶۵۸

محمود احمد عباسی تاریخ امروہہ جلد ثانی تذکرۃ الکرام جلد چہارم تحقیق الانساب
اردو اورنگ آباد (دکن)
جولائی سنہ ۱۹۳۳ء ص ۴۰۷-۴۰۸

برج بھوکن لال تاریخ دریاباد
اردو اورنگ آباد (دکن)
اپریل سنہ ۱۹۲۶ء ص ۳۵۴

—— گذشتہ پانچ سال پر ایک نظر
اردو اورنگ آباد (دکن)
جنوری سنہ ۱۹۲۶ء ص ۱۵۹-۱۶۹

علی اشرف ایران کی بیداری
اردو دہلی اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء
ص ۵۲۴

محمد حسین انقلاب افغانستان
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۳۸۴-۳۸۷
اپریل سنہ ۱۹۳۱ء

محمد حسین خان افغان بادشاہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء ص ۷۹۸-۷۹۹

محمد زبیر تاریخ نامہ ہرات
اردو دہلی جولائی سنہ ۱۹۴۶ء
ص ۳۸۳-۳۸۴

عبداللہ بٹ نہر سویز اردو دہلی
جولائی سنہ ۱۹۴۱ء ص ۴۷۸

نور احمد تاریخ تمدن انڈونیشیا
اردو کراچی جولائی-اکتوبر سنہ 1958
ص ۴۱۱-۴۱۳

سید محمد ان ڈونے شیا کی جنگ آزادی
اردو- دہلی اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء
ص ۵۲۲

محمود احمد عباسی حقیقت قوم کیموہ
اردو کراچی اپریل سنہ 1955ء
ص ۲۷۳-۲۷۸

سوانح

راحت حسین یوم عزا
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۶۰۹
جولائی سنہ ۱۹۳۳ء

محمد اکرم، محمد سعید شہید کربلا
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۷۸۵
اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء

مسعود عالم محمد بن عبدالوہاب (ایک بدنام اور مظلوم مصلح)
اردو دہلی ص ۱۲۶-۱۲۷
جنوری سنہ ۱۹۴۷ء

محمد عزیز الدین حیات احمد بن حنبل

اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۴۴۳
اپریل ۳۲ء

ممتاز الدین رفعت پن چکی
(باباشاہ محمد سعید کے زندگی کے تفصیلی
حالات)
اردو کراچی ص ۱۲۳
جنوری ۱۹۵۷ء

زبیری۔ محمد امین پرنس آغا خاں
قومی زبان کراچی ص ۱۲
یکم جون ۱۵۵ء

خواجہ حسن نظامی غزنوی جہاد
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۱۳۴ ۱۳۵
اکتوبر ۱۹۲۴ء

ظہور الحسن محمود اور فردوسی
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۳۴۹
اپریل ۱۹۳۰ء

نواب صدر یار جنگ تذکرۂ بابر
اردو اورنگ آباد (دکن) ص ۵۶۵
جولائی ۱۹۲۷ء

ضیاء الدین احمد برنی جہاں آرا بیگم
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۷۳۰ ۔ ۷۳۱
اکتوبر ۱۹۲۲ء

بھوانی پرشاد مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی دوحاولی
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۶۹۴
اکتوبر ۱۹۳۶ء

محمد حسین حیات نادر
(نادر شاہ کے عادات وفضائل بیان
کئے ہیں)
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۵۱۰ - ۵۱۱
اپریل ۱۹۳۴ء

امیر احمد علوی بہادر شاہ ظفر
اردو ۔ اورنگ آباد (دکن)
ص ۷۳۴ ۔ ۷۳۶
اکتوبر ۱۹۳۵ء

مسیح الدین علوی سفیر اودھ
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۳۵۹ ۔ ۳۶۰
اپریل ۱۹۲۹ء

جوزف میزنی مؤلفہ مسعود بریلوی
اردو اورنگ آباد ص ۱۶۵-۱۶۴
جنوری ۱۹۲۴ء

حسن برنی — البیرونی
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۳۰۹ - ۳۱۰
اپریل ۱۹۲۸ء

محمد علی حسن خان — ماثر صدیقی موسوم بہ سیرت والاجاہی
(چار جلدوں پر مشتمل ہے)
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۳۴۷ - ۳۴۸
اپریل ۱۹۲۶ء

شیخ چاند — ملک عنبر
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۵۶۲ - ۵۶۳
جولائی ۱۹۳۱ء

محمد عباس شروانی — حیات مسعودی
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۶۱۴ - ۶۱۵
جولائی ۱۹۳۵ء

جان کیلر — میری داستان حیات - مترجمہ محی الدین
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۳۴۸ اپریل ۱۹۳۰ء

محمد امین — تذکرۂ محسن
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۶۱۵ - ۶۱۶
جولائی ۱۹۳۵ء

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
وقار حیات
اردو اورنگ آباد
ص ۳۴۳ ۳۴۶
اپریل ۱۹۲۶ء

رئیس احمد جعفری — سیرت محمد علی
اردو اورنگ آباد دکن
ص ۴۳۶ - ۴۳۹
اپریل ۱۹۳۳ء

مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ
جمال الدین افغانی
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۳۶۰ - ۳۶۱
اپریل ۱۹۲۹ء

عبدالحلیم چشتی — حیات وحید الزمان
(وحید الزماں کے جنگ کے حالات اور ان کے علمی کارناموں کا ذکر کیا ہے)
اردو کراچی ص ۴۱۸
اکتوبر ۱۹۵۷ء

محمد رفیق خاور — گاندھی نامہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۲۰۴ - ۲۰۵
جنوری ۱۹۳۴ء

تلاش حق — مترجمہ عابد حسین
(یہ مہاتما گاندھی کی آپ بیتی ہے)
اردو اورنگ آباد دکن ۴۹۲-۵۳۰
جولائی ۱۹۳۰ء

الف، اینڈ ریوز — خیالات مہاتما گاندھی مترجمہ
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۶۸۲ - ۶۸۳
جولائی ۱۹۳۴ء

راجندر پرشاد — باپوجی کے قدموں میں۔
(ہندی سے اردو میں ترجمہ)
اردو۔ کراچی ص ۳۹۹-۴۰۰
جولائی ۱۹۵۵ء

نیتا جی۔ (حالات زندگی سوباش چندر بوس)
اردو دہلی ص ۵۲۲-۵۲۴
اکتوبر ۱۹۴۶ء

اجے گھوش — بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھی۔
اردو۔ دہلی ص ۵۲۴
اکتوبر ۱۹۴۶ء

سید رضا علی — اعمال نامہ
(خود نوشت سوانح حیات)
اردو۔ دہلی ص ۱۴۲-۱۴۴
جنوری ۱۹۴۴ء

دیوان سنگھ — ناقابل فراموش
(یہ ان کی آپ بیتی ہے)
اردو کراچی ص ۴۱۸-۴۱۹
اکتوبر ۱۹۵۷ء

محمد عسکری — من کیستم
(عسکری کی خود نوشتہ سوانح حیات)
اردو دہلی ص ۲۲۳-۲۲۴
اپریل ۱۹۴۳ء

عبداللطیف — حیات عزیز
(اس کتاب میں قاضی عزیزالدین وزیر اعظم دتیا کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں)
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۵۶۳ - ۵۶۴
جولائی ۱۹۳۱ء

معین الدین — ناصر جنگ شہید
اردو دہلی ص ۴۰۲
جولائی ۱۹۴۳ء

منظفر حسین سلیمانی — چمنستان منظفر
(یہ کتاب منظفر نے ایک فاضل اور ہم وطن اولاد علی مرحوم کے حالات میں لکھی ہے)
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۵۲۳ - ۵۲۴
جولائی ۱۹۳۰ء

شیخ عبداللہ — سوانح عمری
(یعنی بیگم شیخ عبداللہ کی زندگی کے حالات)
اردو دہلی ص ۲۲۶
اپریل ۱۹۴۱ء

نواب سید محمد علی خاں — سوانح عمری نواب تفضل حسین خان
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۴۶۳ - ۴۶۷
جولائی ۱۹۲۲ء

مقبول احمد صمدانی حیات جلیل
(اس کتاب میں عبدالجلیل بلگرامی کا تذکرہ ہے)
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۵۸۵ - ۵۸۶
جولائی سنہ ۱۹۲۹ء

مظفر حسین سلیمانی گنجینۂ سلیمانی
(اس میں فرزند علی کے حالات واخلاق
اور ادبی ذوق کے نمونے ہیں)
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۱۴۸ - ۱۴۹
جنوری سنہ ۱۹۳۸ء

علی محمد شاہ حیات فریاد
(سوانح سید الفت حسین)
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۳۰۱ - ۳۰۲
اپریل سنہ ۱۹۲۸ء

عبدالحکیم دبدبۂ امیری
(یہ امیر احمد امیر کی سوانح عمری ہے)
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۴۸۱ - ۴۸۲
اپریل سنہ ۱۹۳۸ء

عبداللہ چغتائی احمد معمار لاہوری۔
(اس میں احمد معمار اور اس کے خاندان
کے حالات ہیں)
اردو - کراچی ص ۲۵۸۔
اپریل - جولائی سنہ ۱۹۵۷ء

اٹاوہ ہائی اسکول بشیر پاشا سیریز
(۱) تذکرہ سرسید احمد مرحوم بقلم نورالرحمن
(۲) " سید محمود مرحوم از محمد امین زبیری
(۳) " نواب محسن الملک از محمد امین زبیری
(۴) " مولانا الطاف حسین حالی از محمد امین زبیری
(۵) " مولانا حافظ نذیر احمد خان بقلم محمد مہدی
(۶) " نواب وقار الملک از محمد امین زبیری
(۷) " مولانا شبلی مرحوم " محمد مہدی
(۸) " مولوی سمیع اللہ مرحوم " بقلم عبدالکریم
اردو - اورنگ آباد (دکن)
ص ۳۵۳ - ۳۵۴
اپریل - سنہ ۱۹۲۶ء

محمد خان نذیر احمد کی کہانی
اردو اورنگ آباد (دکن) ص ۲۱۴ - ۲۱۵
اپریل سنہ ۱۹۳۵ء

محمد امیر - سلیم (اس میں وحید الدین سلیم کے مختصر حالات
قیام زمانہ حیدرآباد کے اور زیادہ تر
ان کی نثر و نظم پر تبصرہ کیا ہے)
اردو - اورنگ آباد - (دکن)
ص ۳۴۵ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

ممتاز علی آہ امیر مینائی (سوانح عمری امیر مینائی)
اردو - دہلی اپریل سنہ ۱۹۴۲ء
ص ۲۹۷ ۲۹۸

حیات کیفی، مرتبہ سردار علی
(یہ سولہ صفحہ کا رسالہ رضی الدین کے

حالات نہیں ہے۔
اردو اورنگ آباد ۔ (دکن)
ص ۵۶۰ جولائی سنہ ۱۹۲۷ء

شیخ چاند — ایکناتھ
(شیخ چاند نے اس مراٹھی شاعر کے حالات
اور کلام پر یہ کتاب لکھی ہے)
اردو اورنگ آباد ۔ (دکن)
ص ۵۱۴ - ۵۱۵
اپریل سنہ ۱۹۳۴ء

نعیم بیگ چغتائی — چہیتا بھائی (بچوں کے لئے)
اردو اورنگ آباد دکن
ص ۵۹۶ جولائی سنہ ۱۹۳۳ء

رشید اختر — ہمارے بزرگ ۔ پہلا حصہ
اردو دھلی ص ۶۶۱
اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء

عبداللہ چغتائی — علم پروری و ہنر شناسی
(اس میں تاریخ اسلام سے علماء فضلا
اور ہنروروں کے حالات بیان کئے ہیں)
اردو کراچی ص ۲۵۸ - ۲۵۹
اپریل جولائی سنہ ۱۹۵۷ء

I. A. ISAAC.
THE ORIENTS PIONEERS OF WESTE-
-RN SCIENCES AND CIVILIZATION
(ENGLISH)

اردو ۔ اورنگ آباد (دکن) ص ۱۵۰۳
جنوری سنہ ۱۹۲۸ء

سعید احمد — غلامانِ اسلام
اردو دہلی ص ۳۲۳ - ۳۲۴
اپریل سنہ ۱۹۴۱ء

صباح الدین عبدالرحمٰن — بزم مملوکیہ
اردو کراچی ص ۴۰۶ - ۴۰۷
جولائی سنہ ۱۹۵۵

صباح الدین عبدالرحمٰن — بزم صوفیہ
(اس کتاب میں ان مشائخ عظام کا تذکرہ
ہے جو ہندوستان میں عہد تیموری سے
پہلے گزرے ہیں)
اردو ۔ کراچی ص ۱۵۳ - ۱۵۴
اپریل سنہ ۱۹۵۰ء

سلیمان ندوی — یاد رفتگان
(یہ سلیمان ندوی کی تحریروں کا مجموعہ ہے)
اردو ۔ کراچی ص ۲۷۳
اپریل سنہ ۱۹۵۵ء

شمس اللہ — آثار الکرام ۔ حصہ اوّل
اردو اورنگ آباد (دکن)
ص ۱۸۷ - ۱۸۸
اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء

انجمن ترقی اردو کی کارگزاریوں پر بابائے اردو نے
حسبِ ذیل رپورٹیں مرتب کیں اور مضامین لکھے:-

رپورٹ — شعبۂ علمیہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل
کانفرنس یعنی انجمن ترقی اردو۔
______ سنہ ۱۹۱۳ء
______ سنہ ۱۹۱۴ء
______ سنہ ۱۹۱۵ء
سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو۔ سنہ ۱۹۱۶ء
(شعبۂ علمیہ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس
علیگڈھ ______ سنہ ۱۹۱۷ء
______ سنہ ۱۹۱۸ء
______ سنہ ۱۹۱۹ء
انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹ سنہ ۱۹۲۰ء
سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۲۱ء
انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹ ۱۹۲۲ء سنہ ۱۹۲۳ء
انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن
کی سالانہ رپورٹ ۔ سنہ ۱۹۲۴ء سنہ ۱۹۲۵ء
______ سنہ ۱۹۲۶ء
______ سنہ ۱۹۲۷ء
______ سنہ ۱۹۲۸ء
______ سنہ ۱۹۲۹ء و سنہ ۱۹۳۰ء

دو سالہ رپورٹ انجمن ترقی
اردو ______ سنہ ۱۹۳۱ء سنہ ۱۹۳۲ء
سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو۔ سنہ ۱۹۳۳ء
سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو
(ہند) دہلی ______ سنہ ۱۹۴۰ء
سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو
(ہند) دہلی ______ بابت سنہ ۱۹۴۱ء
______ بابت سنہ ۱۹۴۲ء
______ بابت سنہ ۱۹۴۳ء
______ بابت سنہ ۱۹۴۴ء
______ بابت سنہ ۱۹۴۵ء

— مختصر سالانہ رپورٹ انجمن ترقی
اردو۔ بابت سنہ ۱۹۲۰ء
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن)
۲۔ ۱۶۱۔ ۱۶۶۔
اپریل سنہ ۱۹۲۱ء

— افکار و واقعات آل انڈیا اردو کانفرنس
اردو۔ اورنگ آباد۔ (دکن) ۴۔ ۶۸۰۔
۷۰۰۔
اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء

— افکار و واقعات۔ آل انڈیا مسلم
ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ

سالہ جوبلی -
اردو - اورنگ آباد - (دکن) - ص -
۴۲۲ - ۴۴۲ - ۴
اپریل سنہ ۱۹۳۷ء

— چند محسنوں کا شکریہ -
ہماری زبان - دہلی - ص - ۷ -
۱۶ر مئی سنہ ۱۹۳۹ء

— انجمن کا عمارت فنڈ
ہماری زبان - دہلی - ص - ۱۰
۱۶ر اگست سنہ ۱۹۳۹ء

— انجمن ترقی اردو (ہند) کی عمارت
ہماری زبان دہلی - ص - ۹
یکم اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء

— رپورٹ انجمن ترقی اردو جو کل ہند
اردو کانفرنس دہلی میں پڑھی گئی
ہماری زبان - دہلی - ص - ۱۱ - ۱۲
جاری - ص - ۱۰ - ۱۱
۱۶ر جنوری سنہ ۱۹۴۰ء
یکم فروری سنہ ۱۹۴۰ء

— گزارش برائے امداد عمارت انجمن
ترقی اردو (ہند) دہلی
ہماری زبان - دہلی - ص - ۲
یکم اپریل سنہ ۱۹۴۱ء

— وعدے بڑے لوگوں کے وعدے یعنی وعدے کرنا آسان
اردو کا مشکل ہے - دسمبر ۱۶ر سنہ ۱۹۴۲ء
ہماری زبان دہلی - ص - ۳ -

— انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی (حامیان
اردو کو دعوت نامہ ناگپور تیسری آل انڈیا اردو
کانفرنس میں شرکت کے لئے) ہماری زبان
دہلی - ص - ۹ - یکم جنوری سنہ ۱۹۴۴ء

— رپورٹ انجمن ترقی اردو
اردو - دہلی - ص - ۹۴ - ۱۰۲
جنوری سنہ ۱۹۴۴ء

— انجمن ترقی اردو کالج
قومی زبان - کراچی - ص - ۵ - ۶ -
یکم جولائی سنہ ۱۹۴۹ء

— رپورٹ سیکریٹری صاحب انجمن
ترقی اردو (ہند) دہلی - ص - ۴۲ -
۴۵ - از - کیفیت و روداد کل ہند
اردو کانفرنس دہلی منعقدہ دسمبر
سنہ ۱۹۳۹ء دہلی - انجمن ترقی
اردو، سنہ ۱۹۴۰ء

— روداد انجمن ترقی اردو
قومی زبان کراچی - ص - ۱۶ - ۲۱

یکم جون ۱۹۵۱ء

رپورٹ
سالانہ روئداد انجمن ترقی اردو
پاکستان بابت ۱۹۵۰ء
قومی زبان کراچی - ص - ۱۲ - ۱۵
یکم فروری ۵۲ء
جشن پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو
قومی زبان کراچی - ص - ۲ - ۳
۱۶ جنوری ۵۳ء
روئداد، پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو
قومی زبان کراچی - ص - ۱۸ - ۲۲
۱۶ نومبر ۵۳ء
پولیس اور ڈاک کی چہرہ دستی
(انجمن کے کاموں میں) پولیس اور ڈاک
خانے کی لاپرواہی)
قومی زبان کراچی - ص - ۴
یکم اگست ۵۶ء

رپورٹ
Anjuman Taraqqi-e-Urdu (India) Eight years work in outline 1939-1946 Delhi, Anjuman Taraqqi-e-Urdu, 1943 pp. 10

رپورٹ
Anjuman Taraqqi-e-Urdu (India) Thirty years record of Service 1913-46. Delhi Anjuman Taraqqi-e-Urdu 1947
Page: 27.

بابائے اردو کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں نذرانۂ عقیدت

۱- تصانیف

۲- مضامین اور خبریں

آمنہ صدیقی (مرتب) افکارِ عبدالحق
کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۲۶ء
ص - ۳۴۴

عبداللطیف اعظمی - بابائے اردو مولوی عبدالحق
لکھنؤ، ادارہ فروغِ اردو، ۱۹۶۲ء
ص - ۲۲۰ -

آفاق صدیقی بابائے اردو وادیٔ مہران میں
سکھر، ادارہ مصنفین پاکستان ۱۹۶۲ء
ص - ۱۱۲

ارشد کاکوی بابائے اردو کی شخصیت کے دو اہم پہلو
قومی زبان کراچی - ص - ۲۰ - ۲۵ -

یکم اپریل تا ۱۶ اپریل ۱۹۶۲ء

اسرار احمد — بقول عبدالحق
برگ گل ایوب نمبر کراچی۔ ص ۔ ۴۲۲
۴۲۵ - ۴۲۲
۱۹۶۰ء

اسرار احمد کریوی — بابائے اردو مری میں۔
قومی زبان۔ کراچی ۔ ص ۔ ۴ ۔ ۷
یکم تا ۱۶ جولائی ۱۹۶۱ء

بیدار، عابد رضا — بابائے اردو کا رسالہ اخبر
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۹ ۔ ۱۵
یکم اپریل تا ۱۶ اپریل ۱۹۶۲ء

ثمینہ شوکت — مولوی عبدالحق کا اسلوب بیان
لیل و نہار لاہور۔ ص۔ ۱۵ ۔ ۱۶
۲۶ اگست ۱۹۶۲ء

بیگم مصباح الدین۔ دکھنی ادب کو اجاگر کرنے والی ہستیاں
قومی زبان کراچی ۔ ص۔ ۵۲ ۔ ۵۳
یکم تا ۱۶ اپریل ۱۹۶۲ء

جدکپتان — بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب
قومی زبان کراچی ۔ ص ۔ ۱۰
۱۶ مئی ۵۳ء

— چودھری خلیق الزماں کا خط بابائے
اردو کے نام ۔ انڈونیشیا کے سفر کے حالات
قومی زبان کراچی ۔ ص ۔ ۱۳ ۔ ۱۴
۱۶ اگست یکم ستمبر ۵۵ء

خالد علیگ — وہ ساٹھ برس قبل کی بے کیف سی اک شام
اس قوم پہ اک تازہ بلا ٹوٹ پڑی تھی۔
قومی زبان کراچی ۔ ص ۔ ۲۱
۱۶ جنوری ۶۰ء

دور ہاشمی — اردو یونیورسٹی (بابائے اردو کی
"معراج فکر و نظر" کی روشنی میں)
پرچم عظمت و رفعت کا نشان ہے اردو
دولت قوم ہے۔ کہ جنس گراں ہے اردو
قومی زبان کراچی ۔ ص ۔ ۱۰
۱۶ مئی ۶۰ء

رشیدہ رضویہ — فی ذکری العلامت عبدالحق
(بزبان عربی) (جریدہ یومیہ) الایام
بغداد۔
۹ ذی العقدہ ۱۳۸۲ھ

رفیق الدین۔ — کیفیت دورہ جناب سیکریٹری صاحب
انجمن ترقی اردو (ہند) (دہلی/بمبئی کے سفر کے حالات)
ہماری زبان دہلی ۔ ص ۔ ۱۱
یکم مارچ ۱۹۴۱ء

زیبا شجاع احمد — بابائے اردو مشرقی پاکستان میں

	قومی زبان کراچی - ص - ۸ - ۱۴ ص - ۱۱ - ۱۴ یکم دسمبر ۱۹۵۰ء ۱۶ دسمبر ۱۹۵۰ء
سلطانہ فاطمہ	بابائے اردو ہمارے سر سید گرلز کالج میں قومی زبان کراچی - ص - ۱۳ - ۱۴ ۱۶ دسمبر ۵۶ء
شاہد حسین بخاری	بابائے اردو کے ساتھ چند لمحے قومی زبان کراچی - ص - ۲۶ - ۲۹ یکم اپریل تا ۱۶ اپریل ۱۹۶۳ء
شورش کاشمیری	آئی ۔ سی ۔ ایس ۔ بابائے اردو کے اسی عنوان کے مضمون کے ضمن میں قومی زبان کراچی ص - ۱۲ - ۱۴ یکم فروری ۱۹۶۱ء
عبدالستار صدیقی -	خط بنام جناب سیکریٹری صاحب انجمن ترقی اردو ورسم الخط سے متعلق ہماری زبان ص - ۸ ۱۶ جولائی ۱۹۴۴ء
حنیف انصاری -	بابائے اردو کے آنسو قومی زبان کراچی - ص - ۱۶ - ۲۰ یکم اکتوبر تا ۱۶ دسمبر ۱۹۶۲ء
کمالی، رحیم الدین	اردو تہذیب اور بابائے اردو لیل و نہار لاہور -- ص - ۱۳ - ۱۴ ۲۶ اگست ۱۹۶۲ء
کیفی دہلوی	ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا دورہ (بغرض سندھ اردو کانفرنس علیہ شرکت) ہماری زبان - ص - ۳ - ۴ ۱۶ مئی ۱۹۴۴ء
کیفی دہلوی	ملیبار اردو کانفرنس اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ، معتمد انجمن ترقی اردو (ہند) کا دورہ ہماری زبان - ص - ۶ - ۸ پہلی دسمبر ۱۹۴۳ء
لطیف احساس	بابائے اردو سے گذارش و ملک کی زبان سے متعلق مشورہ رائے - قومی زبان کراچی - ص - ۱۰ - ۱۲ یکم اکتوبر ۱۹۵۵ء
مجیبی حافظ محمد الیاس	- اردو و بابائے عبدالحق، حافظ کی ذاتی یادداشتوں میں عبدالحق پر مسلسل ۳ قسطوں میں مضمون - قومی زبان کراچی - ص - ۴ - ۷ - ۱۲ - ۱۴ - ۵ - ۸ - ۱۲ - یکم مئی ۱۹۵۶ء

۱۶ر مئی سنہ ۵۶ء

محمد اعظم میمن — ایک درد مند کمی کا خط بابائے اردو کے نام
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۱۳
یکم جون سنہ ۱۹۵۰ء

محمد نسیم قدوائی۔ ایک خط مولوی عبدالحق کے نام
ہماری زبان۔ ص۔ ۸ ۔ ۹
پہلی نومبر سنہ ۱۹۴۳ء

مسعود احمد محمد — بابائے اردو سے چند ملاقاتیں
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۲۵۔ ۳۰
یکم مئی تا یکم جون

نثار سیمابی۔ عدنی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خدمت میں عقیدت کے چند پھول غزل
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۱۲۔
یکم اپریل سنہ ۵۴ء

نظر حیدرآبادی — اردو اور بابائے اردو سے
ہم پہ ہی نہیں بھاری ہیں ہجرت کے یہ دن
دور وحشت کی یہ راتیں عہد غربت کے یہ دن۔
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۱۷
۱۶ر مئی سنہ ۱۹۵۹ء

نور الحسن ہاشمی — بابائے اردو سے
لے کے تیرے فیض سے شاداب اردو کا چمن
لے کے تیری شمع سے روشن ترقی کی لگن
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۲
یکم اکتوبر سنہ ۵۶ء

نور الحسن ہاشمی — عاشق اردو
یکم اگست تا ۱۶ دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء
ص۔ ۹۔ ۱۱

وقار خلیل — یوم عبدالحق (حیدرآباد دکن) آنکھوں دیکھا حال
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۵۔ ۹
۱۶ر جون سنہ ۶۰ء

وقار عظیم — اردو یتیم ہو گئی
لیل و نہار لاہور۔ ص۔ ۵
۲۰ر اگست سنہ ۱۹۶۱ء

دانش دھر — سچا ہیرا
لیل و نہار لاہور۔ ص۔ ۱۱۔ ۱۲
۲۶ر اگست سنہ ۱۹۶۲ء

ہاشمی فریدآبادی۔ بابائے اردو کی خدمات جلیلہ کا اعتراف
زیبا، شجاع الدین احمد۔ قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۵
حسان۔ ۱۶ر اپریل سنہ ۱۹۵۹ء
یعقوب تمیز اکبرآبادی۔ معمار اعظم
(یہ مولوی صاحب کی صحت یابی پر ۲۰ر اگست

سنہ ۱۹۴۳ء کو انجمن ترقی اردو کے عملے
نے شکرانے اور تہنیت کی ایک تقریب
منعقد کی۔ جس میں یعقوب نے یہ نظم
پڑھی۔ وہ ہے کون؟ جو ہے نگہباں
اردو۔ پھیلا، پھولا جس سے گلستانِ اردو
ہماری زبان۔ دہلی۔ ص۔ ۷
یکم اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء

— انجمن ترقی اردو بنگلور۔
بابائے اردو کی خدمت میں سپاس نامہ
ہماری زبان۔ ص۔ ۱۱۔ ۱۲
۱۶ جولائی سنہ ۱۹۴۷ء

— انعام ڈاکٹر عبدالحق بابائے اردو
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۱۴۔ ۱۵
۱۶ فروری سنہ ۵۵ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی
منانے کے لئے کمیٹی مقرر کر دی گئی۔
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۱۳۔ ۱۲
۱۶ نومبر سنہ ۵۹ء

بابائے اردو وادیٔ مہران میں، کل
سندھ ادبی کنونشن کا افتتاح — ادارہ
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۹۔ ۱۴
۱۶ جنوری سنہ ۶۰ء

سپاسنامہ بعالی خدمت جناب بابائے — ادارہ
اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب
مدظلہ العالی صدر انجمن ترقی اردو
منجانب
اہالیان نواب شاہ و کارکنان مرکز
علم و ادب و پاکستان رائٹرز گلڈ نواب
شاہ و طلبا اسلامیہ ہائی اسکول۔
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۱۶
۱۶ جنوری سنہ ۶۰ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے پاکستان
میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی اسکیم
کا اعلان کر دیا۔ خبر منقولہ روزنامہ
جنگ ۸ جنوری سنہ ۱۹۶۰ء
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۱
۱۶ فروری سنہ ۶۰ء

روس میں بابائے اردو کی سالگرہ
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۲۲۔
۱۶ مارچ سنہ ۶۰ء

— روس میں بابائے اردو کا جشن
سالگرہ اور بابائے اردو کا پیغام۔
قومی زبان کراچی۔ ص۔ ۱۴
۱۶ جون سنہ ۶۰ء

بابائے اردو
لیل و نہار۔ ص۔ ۱
۲۰ اگست سنہ ۱۹۶۱ء

بابائے اردو (بابا پر مضمون)
لیل و نہار لاہور۔ ص۔ ۱
۲۶ اگست سنہ ۱۹۶۲ء

اردو رسائل اور ان کے مندرجات
جو
بابائے اردو کی خدمات جلیلہ کے اعتراف میں شائع ہوئے

نورس (اورنگ آباد کالج کا دوماہی رسالہ) عبدالحق نمبر
جلد ۴ شمارہ نمبر ۱ آذر و دے ۱۳۴۷ ف

مندرجات:-

پیغامات:- نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر (انگریزی متن اور اس کا اردو ترجمہ) ص ۱ - ۷

اسپٹ، ای۔ ای۔ تحیتہ طیب۔ مولوی صاحب کی سیرت کا سچا خاکہ (انگریزی متن اور اس کا اردو ترجمہ) ص ۸ - ۲۶

عابد حسین۔ رسالہ اردو ص ۲۷ - ۵۷

ہاشمی فرید آبادی۔ مولوی عبدالحق کی انشاپردازی کا ایک نمونہ۔ ص ۵۹ - ۶۳

عبدالحق۔ گودڑی کا لال - نور خاں ص ۶۴ - ۸۰

غلام ربانی مولوی عبدالحق صاحب بحیثیت معتمد انجمن ترقی اردو ص ۸۱ - ۱۱۲

ساجد علی مولوی عبدالحق صاحب اور انتظام ص ۱۱۳ - ۱۲۵

شیخ چاند مولوی عبدالحق صاحب کا مقصد زندگی ص ۱۲۶ - ۱۵۰

ہاشمی فرید آبادی۔ ترجیع بند، مژدہ اہل عزلت وزد امانۂ ہنگامہ فرد زبزم آیا۔ ص ۱۵۱ - ۱۵۴

دانش دھر بدائی میں چپ ہوں اس سے یہ نہ سمجھنا کہ مجھ کو ہے بولنا نہ آتا۔ ص ۱۵۵ - ۱۵۶

شمیم ہی الحسن۔ مولوی عبدالحق صاحب اور اورنگ آباد۔
اس جہانِ رنگ و بو میں ایک طائر خوشنوا
پھر رہا تھا ہر طرف اڑتا ہوا گاتا ہوا
ص ۱۵۷ - ۱۵۸

ناقص، فیاض الحسن۔ اظہار مسرت۔
ایک بلبل ہو گیا تھا جا کے صحرا میں مکیں
گو وہ جنگل ہو گیا تھا اس سے فردوسِ بریں
ص ۱۵۹ - ۱۶۰

سید احمد ندوی۔ نظم بتقریب جلسہ الوداعی
اے کہ تیری ذات کا انساں نوازی امتیاز
تیری میزانِ نظر میں ایک محمود و ایاز
ص ۱۶۸ - ۱۷۱

اساتذہ اور طلبۂ عثمانیہ کالج (اورنگ آباد) وشاخ دسطانیہ سپاسنامہ الوداعی ص ۱۷۲ - ۱۷۷

گرامی عبدالخالق۔ نظم۔
آج ہیں جتنے یہاں خورد و کلاں
سب کے چہروں سے ہے رنج و غم عیاں
ص ۱۷۸ - ۱۸۴

غلام طیب۔ عبدالحق
اے دلِ درد آشنا مشکل ہے تیرا کاروبار
دیکھنا جلنے نہ پائے سوزِ فرقت کا وقار
ص ۱۸۵ - ۱۸۷

رسالہ جوہر (انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی) عبدالحق نمبر۔

جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی سترویں سالگرہ کی یادگار میں۔ ادارہ تحریر حسن سبحانی صدیقی اور دیگر حضرات

مندرجات:۔

ذاکر حسین خاں تقریب ص ۱ - ۲

پیامات مہاتما گاندھی اور دیگر حضرات ص ۳ - ۱۵

عطا حسین مولوی عبدالحق صاحب۔ معتمد انجمن ترقی اردو ص ۱۷ - ۳۳

اسپٹ، ای ای۔ طینہ طیب۔ ص ۳۴ - ۴۰

شیخ چاند مولوی عبدالحق صاحب کا مقصد زندگی ص ۴۱ - ۵۴

ہاشمی فریدآبادی۔ مولوی عبدالحق صاحب کے چند خطوط ص ۵۵ - ۶۵

غلام ربانی۔ مولانا عبدالحق صاحب اور انجمن ترقی اردو ص ۶۶ - ۱۰۱

نواب منظور احمد صاحب جنگ بہادر۔ مولانا عبدالحق صاحب کی تنقیدات اور مقدمات پر ایک نظر ص ۱۰۲ - ۱۱۴

عابد حسین حدیث دیگراں (چند ہم عصر مولوی صاحب کی سیرت کے کچھ اندرونی شہادت) ص ۱۱۵ - ۱۱۳

(ماہ نامہ) **الشجاع کراچی**۔ عبدالحق نمبر۔ اگست ۱۹۵۹ء جلد ۷ شمارہ ۸

مندرجات:۔

پیغامات الف۔ ایم خاں اور دیگر حضرات۔ زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے۔

ایس۔ اے۔ رحمن اور دیگر حضرات (پیغامات و تاثرات) ص ۹ - ۲۹

شاہد عشقی اردو کے دوسرے دیس کی کہانی ص ۳۰ - ۳۵

شوکت سبزواری۔ بقیہ السلف عبدالحق ص ۳۶ - ۳۷

ہاشمی فریدآبادی۔ جناب مولوی صاحب کے ادبی عطیات و طیبات ص ۳۸ - ۴۰

میر تقی اردو۔ تاریخ کے نئے موڑ پر ص ۴۱ - ۴۵

رفیق حسین ڈاکٹر عبدالحق کی عظمت ص ۴۶ - ۵۰

نصیرالدین ہاشمی۔ حیدرآباد میں مولانا ڈاکٹر عبدالحق کی خدمات پر ایک طائرانہ نظر ص ۵۱ - ۵۴

ادیب، مرزا جواں ہمت بڈھا ص ۵۵ - ۵۷

ارشد تھانوی عظیم انسان ص ۵۸ - ۶۰

فرمان فتحپوری خطبات عبدالحق ص ۶۱ - ۶۹

زبیر، محمد داؤد بابائے اردو سے ایک حقیر کی ارادت ص ۷۰ - ۷۴

رئیس امروہوی۔ مولوی عبدالحق۔ اردو۔ پاکستان ص ۷۵ - ۷۸

محمد احمد سبزواری مولوی صاحب ص ۷۹ - ۸۴

انور عنایت اللہ۔ بابائے اردو کی ریڈیائی تقریریں ص ۸۵ - ۸۹

منور حسین چند ہم عصر اور عبدالحق ص ۸۹ - ۹۶

یونس احمد ترجمے کی اہمیت۔ مولوی صاحب کی نظر میں ص ۹۷ - ۹۹

قطب النساء ہاشمی بابائے اردو ص ۱۰۰ - ۱۰۲

محمود علی خاں بابائے اردو کی بذلہ سنجی ص ۱۰۳ - ۱۰۵

حکیم امامی — مجاہد اردو — ص ۱۰۶-۱۱۰

شاعر لکھنوی — بابائے اردو (نظم)
یہ تیری جہد مسلسل کا فیض ہے کہ زبان
دلوں کا حسن خیالوں کا اعتبار سجا
ص ۱۱۲-۱۱۳

شاعر، حمایت علی — اردو اور بابائے اردو (نظم)
جیسے آغوش محبت میں ہمکتی ہوئی ننھی بچی
اپنے بابا کو کسی فکر میں ڈوبا ہوا پاکر خود بھی
ص ۱۱۳

محشر بدایونی — بابائے اردو زندہ باد (نظم)
اے دیارِ پاک اے آماجگاہ علم و فن
زندہ افکار اور پائندہ زبانوں کے وطن
ص ۱۱۴-۱۱۵

عدم، عبدالقیوم — مردانِ کار۔ بابائے اردو کی خدمت میں ایک پرخلوص پیغام (نظم)
جنوری کا منجمد تالاب بھی سیال ہے
کتنی وجدانی ترے ذوق عمل کی چال ہے
ص ۱۱۶

محسن بھوپالی — شب چراغ (نظم)
ایک حق کے عزائم ہی کا انعام تو ہے
ص ۱۱۷

ادیب واثقی — عظیم فن کار (نظم)
تری نوا سے طلوع سحر کے سازوں میں
فسون نغمۂ ہستی کی جاوداں جھنکار
ص ۱۱۸

بابائے اردو مشاہیر کی نظر میں۔ گاندھی جی آنجہانی اور دیگر مشاہیر — ص ۱۲۰-۱۲۲

عبدالحق — مکاتیب عبدالحق۔ دو غیر مطبوعہ خط گاندھی جی اور سر سکندر حیات خاں کے نام — ص ۱۲۳-۱۲۴

عبدالحق — ایک نئے دور کا آغاز ہوا — ص ۱۳۶-۱۳۸

عبدالحق — ایک تاریخی تقریر (بزم فروغ اردو اسلامیہ کالج لاہور کے سپاسنامے کے جواب میں) — ص ۱۳۹-۱۴۰

عبدالحق — ادیب اور حکومت (خطبۂ صدارت جو رائٹرس کنونشن کے اختتامی اجلاس میں پڑھا گیا) — ص ۱۴۱-۱۴۴

عبدالحق — ایک تاریخی خطبہ (اردو کانفرنس بنگلور منعقدہ ۴ جون ۱۹۴۷ء میں پڑھا گیا) — ص ۱۴۵-۱۴۹

(ماہنامہ) نگارش کراچی — عبدالحق نمبر۔ ستمبر ۱۹۶۱ء
جلد ۳، شمارہ ۴

مندرجات:-

ادارہ — ڈاکٹر مولوی عبدالحق — ص ۷-۱۰
وقار عظیم — اردو یتیم ہو گئی — ص ۱۱-۱۲
ظہر بابر — اردو کا جنازہ — ص ۱۳-۱۴
جمیل الدین عالی — بوڑھا سپاہی — ص ۱۵-۱۶
ابن انشا — مولوی صاحب کے آخری ایام — ص ۱۷-۲۰
ابوالخیر کشفی — بابائے اردو — ص ۲۱-۲۴

(پندرہ روزہ) قومی زبان کراچی (کل پاکستان
انجمن ترقی اُردو کا ترجمان ——
اشاعت خصوصی بیادگار بابائے اُردو۔
۱۵ اگست ۱۹۶۱ء تا ۱۶ دسمبر ۱۹۶۱ء جلد ۱۹ شمارہ ۴ — ۱۲
مندرجات :۔
بابائے اردو کی وفات پر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان
صدر پاکستان کا تعزیتی پیغام ص ۷
بابائے اُردو کی وفات پر قدرت اللہ شہاب
سکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ کا تعزیتی
پیغام۔ ص ۸
انجمن ترقی اُردو کی قرار داد تعزیت
ص ۹ — ۱۰
عبدالماجد دریابادی بابائے اُردو ص ۱۱ - ۱۲
رشید احمد صدیقی بابائے اُردو (منقول از فکر و نظر علی گڑھ
اکتوبر ۱۹۶۱ء) ص ۱۷-۳۵
صلاح الدین احمد بابا کے بعد (منقول از ادبی دنیا لاہور۔
دور پنجم شمارہ پنجم) ص ۳۶ - ۳۷
بنارسی داس چترویدی مولوی عبدالحق مرحوم (منقول از سہ ماہی
صبح، انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ جلد اوّل
۱۹۶۱ء) ص ۳۸ - ۴۲
عندلیب شادانی چراغ راہ (تقریر ریڈیو پاکستان ڈھاکہ)
ص ۴۳ - ۴۶
وقار عظیم اردو یتیم ہوگئی ص ۴۷ - ۴۸
سلام مچھلی شہری اہلِ خرد صاحب نظر، روشن دماغ (مدیر
کے نام ایک طویل مکتوب کی تلخیص ص ۴۹ — ۵۰
عاؔلی۔ جمیل الدین بوڑھا سپاہی (منقول از روزنامہ جنگ کراچی)
ص ۵۱ — ۵۳
ابن انشاء مولوی صاحب کے آخری ایام ص ۵۴-۵۹
آزاد۔ جگن ناتھ عظیم الشان۔ منقول از چٹان لاہور۔
۱۸/۹/۱۹۶۱ء ص ۶۰ - ۶۴
ادیب۔ لطیف حسین عظمت کا نوحہ (۳۰ ستمبر کو بریلی میں یوم
عبدالحق کے جلسے میں پڑھا گیا)
ص ۶۵ — ۷۱
محمود حسین تایا ابا (منقول از ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور
نومبر ۱۹۶۱ء ص ۷۲ — ۸۲
عبادت بریلوی بابائے اردو کی ادبی خدمات ص ۸۳ — ۸۵
عبداللطیف اعظمی مولانا عبدالحق (منقول از جامعہ دہلی
ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۸۶ — ۸۹
نصر اللہ خاں چراغ انجمن افروز (منقول از ماہنامہ ہم قلم
کراچی۔ ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۹۰ — ۹۸
ظہیر بابر ایک محترم شخصیت (منقول از لیل و نہار
۲۰ اگست ۱۹۶۱ء) ص ۹۹ — ۱۰۰
جانکی پرشاد دِوانہ مرگیا (منقول از سب رس حیدرآباد
دکن ستمبر اکتوبر ۱۹۶۱ء) ص ۱۰۱ — ۱۰۳
ادارہ ماہنامہ سات رنگ کراچی۔ آخری مسافر (منقول از
سات رنگ کراچی ستمبر اکتوبر ۱۹۶۱ء)
ص ۱۰۴ — ۱۰۷
محی الدین احمد مولوی عبدالحق کی چند کمزوریاں (منقول
از سب رس حیدرآباد دکن ستمبر اکتوبر ۱۹۶۱ء)
ص ۱۰۸ — ۱۱۰

رئیس امروہوی مولوی عبدالحق جی گئے (منقول از روزنامہ جنگ کراچی ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء) ص ۱۱۱ - ۱۱۵

افضل صدیقی بزمِ سید کی آخری شمع بجھ گئی (منقول از روزنامہ جنگ کراچی ۱۴ نومبر ۱۹۶۱ء) ص ۱۱۶ - ۱۲۷

شہلا عاصمہ ایک فرد - ایک تحریک ص ۱۲۸ - ۱۳۰

ربیعہ فخری پاک دل پاک ذات پاک صفات - (منقول از روزنامہ تعمیر راولپنڈی - ۲۰ اگست ۱۹۶۱ء ص ۱۳۱ - ۱۳۴

سروری عرفان اللہ بیگم - محسنِ قوم کی یادیں (منقول از روزنامہ جنگ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۱ء) ص ۱۳۵ - ۱۳۸

آمنہ صدیقی باباۓ اردو کی شخصیت نگاری ص ۱۳۹ - ۱۴۲

ادارہ ہفت روزہ لیل و نہار - ایک عالی دماغ تھا نہ رہا - (منقول از اشاعت ۲۰ اگست ۱۹۶۱ء) ص ۱۷۶ - ۱۷۷

ادارہ مہر نیمروز کراچی (باباۓ اردو) منقول از اشاعت اکتوبر ۱۹۶۱ء ص ۱۷۷ - ۱۸۰

ادارہ ماہنامہ افکار کراچی (باباۓ اردو) (منقول از اشاعت ستمبر ۱۹۶۱ء) ص ۱۸۰ - ۱۸۱

ادارہ ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور - (باباۓ اردو) (منقول از اشاعت ستمبر ۱۹۶۱ء) ص ۱۸۱ - ۱۸۲

ادارہ، ماہنامہ ہم قلم کراچی (باباۓ اردو) (منقول از ماہنامہ ہم قلم کراچی، ستمبر ۱۹۶۱ء) ص ۱۸۲ - ۱۸۴

ماہنامہ ادب لطیف لاہور (باباۓ اردو) (منقول از ادب لطیف لاہور ستمبر ۱۹۶۱ء) ص ۱۸۵

ادارہ ماہنامہ الشجاع کراچی - (باباۓ اردو) منقول از الشجاع کراچی ستمبر ۱۹۶۱ء) ص ۱۸۶ - ۱۸۷

ادارہ روزنامہ امروز لاہور - باباۓ اردو (منقول از امروز لاہور ۱۷ اگست ۱۹۶۱ء) ص ۱۸۷ - ۱۸۸

ادارہ روزنامہ جنگ کراچی باباۓ اردو (منقول از جنگ کراچی ۱۸ اگست ۱۹۶۱ء) ص ۱۸۸ - ۱۹۰

ادارہ روزنامہ انجام کراچی باباۓ اُردو (منقول از انجام کراچی ۱۸ اگست ۱۹۶۱ء) ص ۱۹۰ - ۱۹۳

ادارہ روزنامہ نئی روشنی کراچی باباۓ اُردو (منقول از نئی روشنی کراچی ۱۸ اگست ۱۹۶۱ء) ص ۱۹۳ - ۱۹۶

ادارہ ماہنامہ شمع کراچی باباۓ اردو (منقول از ماہنامہ شمع کراچی اکتوبر ۱۹۶۱ء) ص ۱۹۶ - ۱۹۷

ادارہ ماہنامہ ہومیو ڈاکٹر حیدرآباد باباۓ اُردو (منقول از ماہنامہ ہومیو ڈاکٹر حیدرآباد اگست ۱۹۶۱ء) ص ۱۹۷

ادارہ ماہنامہ عصمت کراچی (باباۓ اردو) (منقول از ماہنامہ عصمت کراچی ستمبر ۱۹۶۱ء) ص ۱۹۷ - ۱۹۸

ادارہ ہفتہ وار لاہور لاہور (باباۓ اُردو)

(منقول از ہفتہ وار لاہور لاہور
اگست ۱۹۶۱ء) ص ۱۹۸ - ۱۹۹

ادارہ ہفت روزہ ایشیا لاہور (بابائے اردو)
(منقول از ہفت روزہ ایشیا لاہور
۲۲ اگست ۱۹۶۱ء) ص ۱۹۹ - ۲۰۰

ادارہ ہفت روزہ اقدام لاہور (بابائے اردو)
(منقول از ہفت روزہ اقدام لاہور)
ص ۲۰۰ - ۲۰۱

ادارہ رسالہ خیال کامٹی ۔
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
منقول از رسالہ خیال کامٹی اگست
ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۲۰۱ - ۲۰۲

ادارہ میرا رسالہ کراچی (بابائے اردو)
(منقول از رسالہ میرا رسالہ کراچی ستمبر ۱۹۶۱ء)
ص ۲۰۲

ادارہ ماہنامہ نقش کراچی (بابائے اردو)
(منقول از نقش کراچی ستمبر ۱۹۶۱ء) ص ۲۰۲-۲۰۳

ادارہ رسالہ معارف اعظم گڑھ (بابائے اردو مولوی عبدالحق)
(منقول از رسالہ معارف اعظم گڑھ
ستمبر ۱۹۶۱ء) ص ۲۰۳ - ۲۰۴

ادارہ سہ ماہی العلم کراچی (بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق)
(منقول از رسالہ العلم کراچی ۔
جولائی ۔ ستمبر ۱۹۶۱ء) ص ۲۰۵ - ۲۰۶

ادارہ ماہنامہ جامعہ دہلی (ڈاکٹر عبدالحق)
(منقول از رسالہ جامعہ دہلی ۱۹۶۱ء
ص ۲۰۶ - ۲۰۷

ادارہ کتابی دنیا کراچی (بابائے اردو مولوی عبدالحق)
(منقول از کتابی دنیا کراچی اگست ۱۹۶۱ء
ص ۲۰۷

ادارہ ماہنامہ کتاب نما دہلی ۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
(منقول از کتاب نما دہلی ستمبر ۱۹۶۱ء)
ص ۲۰۷ - ۲۰۸

ادارہ ماہنامہ حرم لاہور ۔ (اردو زبان کے محسن ڈاکٹر مولوی
عبدالحق (منقول از حرم لاہور ستمبر ۱۹۶۱ء)
ص ۲۰۸

ادارہ ماہنامہ سفینہ کراچی (لیلائے اردو کا عاشق)
(منقول از ماہنامہ سفینہ کراچی ستمبر ۱۹۶۱ء)
ص ۲۰۹

ادارہ ماہنامہ حور لاہور بابائے اردو
(منقول از ماہنامہ حور لاہور ستمبر ۱۹۶۱ء)
ص ۲۱۰

ادارہ ماہنامہ برہان دہلی ۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق
(منقول از برہان دہلی ستمبر ۱۹۶۱ء)
ص ۲۱۰ - ۲۱۲

ادارہ ماہنامہ سب رس حیدرآباد (دکن) ڈاکٹر مولوی
عبدالحق ۔ (منقول از ماہنامہ سب رس
حیدرآباد ستمبر اکتوبر ۱۹۶۱ء ص ۲۱۲ - ۲۱۳

ادارہ ماہنامہ سات رنگ کراچی بابائے اردو
(منقول از ماہنامہ سات رنگ کراچی
ستمبر اکتوبر ۱۹۶۱ء) ص ۲۱۳ - ۲۱۴

ادارہ ماہنامہ تحریک دہلی بابائے اردو

(منقول از ماہنامہ تحریک دہلی -
ستمبر ۱۹۶۱ء) ص ۲۱۴-۲۱۵
ادارہ سہ ماہی نوائے ادب بمبئی (ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم)
(منقول از نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۶۱ء)
ص ۲۱۵ — ۲۱۶
ادارہ پندرہ روزہ ترجمان علی گڑھ - بابائے اردو ڈاکٹر
مولوی عبدالحق (منقول از ترجمان علی گڑھ
۲۰ اگست ۶۱ء ص ۲۱۶ - ۲۱۷
ادارہ ہفت روزہ جھنکار کراچی بابائے اردو
(منقول از جھنکار کراچی ۲۲ اگست ۶۱ء)
ص ۲۱۷ — ۲۱۸
ادارہ ہفتہ وار نئی جمہوریت کراچی - (بابائے اردو مولوی
عبدالحق)۔ (منقول از نئی جمہوریت
کراچی ۲۲ اگست ۶۱ء) ص ۲۱۸-۲۱۹
ادارہ ہفت روزہ الہام بھاولپور (آہ بابائے اردو ڈاکٹر
عبدالحق)۔ (منقول ہفت روزہ الہام
بھاولپور ۲۱ اگست ۶۱ء) ص ۲۲۰-۲۲۱
ادارہ ترجمانِ سرحد پشاور (بابائے اردو مولانا عبدالحق)
(منقول از ترجمان سرحد پشاور
ستمبر ۱۹۶۱ء) ص ۲۲۱
ادارہ روزنامہ کلیم سکھر (بابائے اردو)
(منقول از کلیم سکھر ۱۸ اگست ۱۹۶۱ء
ص ۲۲۱ - ۲۲۲
ادارہ روزنامہ آفاق لاہور/لایل پور (بابائے اردو
ڈاکٹر مولوی عبدالحق) (منقول از
آفاق لاہور ۱۷ اگست ۱۹۶۱ء) ص ۲۲۳
ادارہ روزنامہ سیاست حیدرآباد (دکن) (بابائے اردو
مولوی عبدالحق) (منقول از سیاست۔
حیدرآباد دکن ۱۸ اگست ۱۹۶۱ء ص ۲۲۴
ادارہ رہنمائے تعلیم دہلی (مولوی عبدالحق صاحب)
(منقول از رہنمائے تعلیم دہلی ص ۲۲۴-۲۲۵
قدرت اللہ شہاب مولوی عبدالحق کی یادیں ص ۲۲۶
جلیل قدوائی ہے مکرر لب ساقی پہ صدا ص ۲۲۷

منظومات

اظہر، اے۔ ڈی اگلے وقتوں کا تھا اک بابا سو وہ بھی چل بسا
اپنے ہاں پہلے ہی پہلی سی وہ باتیں تھیں کہاں
ص ۱۳
سیفی فرید آبادی سینکڑوں دشمن تھے اردو کے لئے
خشم چشمی طارم ارزق کی تھی
ص ۱۳
بشیر فاروق گئے خلد بریں بابائے اردو
برہنہ سر ہوئی اب ہائے اردو
ص ۱۴
محمد یونس قریشی وابستگان اردو آنسو بہا رہے ہیں
اک حشر فرطِ غم سے ہر سو اٹھا رہے ہیں
ص ۱۴
نیرنگ نیازی گلستاں کو نئے پھولوں سے سنوارا تو نے
راہ دشوار کو آسان بنایا تو نے
ص ۱۵

آرزو اکبرآبادی — تیرا دم تھا یادگارِ غالب و میر و نظیر
فخرِ اردوئے معلّیٰ خوش بیاں زرّیں رقم
ص ۱۵

نیّر سعیدی، لیاقت علی
رو رہے ہیں فدایانِ اردو
یاد میں تیری اے جانِ اردو
ص ۱۶

غضنفر امروہوی — اے غضنفر وصف کیا بابائے اردو کے لکھوں
ذاتِ والا فخرِ پاکستان و صد عظمت نشاں
ص ۱۶

ارشاد دہلوی — بخشی چراغِ علم سے جس نے کہ روشنی
خورشید چھپ گیا وہ اجالا چلا گیا
ص ۱۶

سلام مچھلی شہری — بابائے اردو کی یاد میں ؎
روشنی جب بھی جہاں بھی ختم ہوتی ہے سلام
سوچتا ہوں بجھ گیا میری ہی محفل کا چراغ
ص ۵۰

ساجد سنبھلی — بابائے اردو ؎
کُل رہگذرِ غم سے ہے جہانِ اردو
رخصت ہوئے بابائے زبانِ اردو
ص ۱۰۷

اشک، محمد بہاء الحق — تاریخِ وفات بابائے اردو ؎
مولوی عبد الحق کہ شناور
بود ہمہ دم در یم اردو
ص ۱۱۰

اشک، محمد بہاء الحق — قطعہ تاریخِ وفات ؎
فریاد ازیں گنبدِ گرداں فریاد
از دست اداشک بیاراں بیداد
ص ۱۱۵

آرزو ڈبائیوی — غم بابا میں چند شعر ؎
زندگی خدمتِ تکمیلِ زباں میں کاٹی
عمر بھر خون سے سینچا کئے باغِ اردو
ص ۱۳۰

صدق جائسی — قطعہ تاریخِ وفات ؎
گئے سوئے عدم بابائے اردو
یہ غم اے صدق ہے صبر آزما غم
ص ۱۴۳

فطرت عبدالعزیز — نذرِ بابائے اردو ؎
زندہ باد اے رہِ محبوب میں مرنے والے
صورتِ زلف بکھرنے میں نکھرنے والے
ص ۱۴۴ — ۱۴۵

جمیل نقوی — مولوی عبداللہ ؎
وحیدِ عصر و یکتائے زمن تھا
نشانِ عظمتِ اہلِ وطن تھا
ص ۱۴۶ — ۱۵۰

یوسف جمال انصاری۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی رحلت پر
سید احمد خاں کی رحلت آج تازہ ہو گئی
آج عبدالحق بھی دنیا سے روانہ ہو گیا
ص ۱۵۱

شہاب رفعت — انجمن تنہا ؎

مرگ و حیاتِ انسانی کا وہی قدیم افسانہ تو ہے
تاخت و تاراجِ ہستی کا مشغلۂ روزانہ تو ہے
منقول از ماہ نو کراچی ستمبر ۱۹۶۱ء
ص ۱۵۲ — ۱۵۳

عاصم حسین — سارا چمن ماتم میں ہے ؎
اب آنسوؤں کا سیلاب بہنے اور آہوں کے طوفان چھائیں
اب کالے کالے بادلوں کی گھنگھور گھٹائیں لہرائیں
منقول از ماہ نو کراچی ستمبر ۱۹۶۱ء
ص ۱۵۴ — ۱۵۸

فرشوری، ایم۔ ایم — دردِ پیری ...... ؎
ہاتھ سے جاتا رہا کیوں دامنِ صبر و قرار
اشک آنکھوں سے رواں ہیں کس لئے دیوانہ وار
ص ۱۵۹ — ۱۶۰

ارشد کاکوی — بابائے اردو ؎
موت برحق ہے زندگی کی طرح
تیرگی سچ ہے روشنی کی طرح
(منقول از پاسباں ڈھاکہ)
ص ۱۶۱ — ۱۶۲

انوار احسن صدیقی — بابائے اردو کے نام ؎
شمع فسردہ گل ہو گئی ہے
بادیدۂ تر با چشم پُر نم
ص ۱۶۳ — ۱۶۴

رازؔ یوسفی — آہ! بابائے اردو ؎
کس کی خاطر ہو رہے ہیں دیدہ و دل اشکبار
کیوں شکیبِ صبر کا دامن ہوا ہے تار تار

منقول از امروز لاہور ۔ ۲۷ اگست ۱۹۶۱ء)
ص ۱۶۵ — ۱۶۶

جذب عالم پوری، راگھو بندر — آہ بابا ؎
اردو کو بہت خوب سنوارا تو نے
اس کے لئے کتنوں کو ابھارا تو نے
منقول از روزنامہ ملاپ حیدرآباد دکن
۲۳ اگست ۱۹۶۱ء) ص ۱۶۷

تابؔ حنیف — بابائے اردو ؎
ایک دھن، ایک طلب، ایک لگن رکھتا تھا
عین پیری میں جوانوں سا چلن رکھتا تھا
ص ۱۶۸

وقار خلیل — سلکِ غم ؎
اک مردِ حق شناس کا رہبر کا ذکر ہے
بحرِ ادب کے ایک شناور کا ذکر ہے
ص ۱۶۹ — ۱۷۰

جوہر صدیقی — بابائے اردو۔ قطعہ تاریخ اور نظم ؎
رفت چوں بابائے اردو زیں سرا
فکر تاریخ دو حالش شد مرا
اے کہ سرتاجِ ہمالہ تھا ترا عزمِ صمیم
اے کہ تیرے نام سے لرزاں دلِ ابلیسِ رجیم
ص ۱۷۱ — ۱۷۲

جمیل نقوی — بعد از مرگ زاد ؎
ادب کے نام پہ قائم ہیں حلقہ ہائے نہنگ
زباں کے پردۂ زرکار میں چھپے ہیں پلنگ
منقول از ماہ نو اکتوبر ۱۹۶۱ء ص ۱۷۴

قطعات تاریخ:۔

کاشف الہاشمی ادیبی ؎ اپنے غم میں ایک عالم کو تڑپتا چھوڑ کر
ڈاکٹر صاحب روانہ ہوگئے سوئے ارم
ص ۱۷۳

نامی، غلام دستگیر ؎ دریغا حسرتا بابائے اردو
ہوئے اصعب مرض میں مبتلا اہ
ص ۱۷۳

شمیم صہبائی متھراوی مختلف مادہ ہائے تاریخ
ص ۸۲

(ماہنامہ) ادب لطیف لاہور۔ شمارہ خصوصی۔ نومبر ۱۹۶۱ء

مندرجات:۔

جمیل نقوی مولوی عبدالحق غفر اللہ
وحیدِ عصر و یکتائے زمن تھا ۱۳۸۱
نشانِ عظمتِ اہلِ وطن تھا
ص ۲ - ۹

تاب، حفیظ بابائے اردو
ایک دھن ایک طلب، ایک لگن رکھتا تھا
عین پیری میں جوانوں سا چلن رکھتا تھا
ص ۱۰

محمود حسین تایا ابا ص ۱۱ — ۱۸
خان رشید مولوی عبدالحق ص ۱۹ — ۲۶
ظہیر الدین مدنی ڈاکٹر عبدالحق ص ۲۷ - ۳۱
دلشی دھر سچا ہیرو ص ۳۲ - ۳۷

محی الدین احمد مولوی عبدالحق کی چند کمزوریاں
ص ۳۸ - ۳۹

عبدالحق مکاتیب عبدالحق۔
مولانا غلام رسول مہر کے نام (۲۷ خطوط)
ص ۴۰ - ۵۷

اختر اورینوی تاج کبھی۔ قطب مینار کبھی
ص ۵۸ - ۶۰

آمنہ صدیقی عبدالحق — محقق، نقاد
ص ۶۱ - ۶۸

سلیم اختر چند ہم عصر ص ۶۹ - ۷۳

(سہ ماہی) مجلس۔ حیدرآباد دکن۔ مولوی عبدالحق نمبر

جلد ۳، شمارہ ۱ — ۲
اکتوبر ۱۹۶۰ء اور جنوری ۱۹۶۱ء

مندرجات:۔

سجاد مرزا اردو کا زخمی سپاہی ص ۱ — ۳
اسلوب احمد انصاری مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری
ص ۴ - ۱۳
غلام یزدانی مولانا عبدالحق ص ۱۴ - ۱۵
غلام ربانی عظیم الشان ص ۱۶ - ۲۵
سید محمد بیسویں صدی کا سرسید ص ۲۶ - ۳۲
رفعت، مبارز الدین بابائے اردو ص ۳۳ - ۳۶
ہارون خاں شروانی ڈاکٹر مولوی عبدالحق ص ۳۷ - ۴۱
کمال، رحیم الدین اردو تہذیب کی تعمیر و ترقی میں مولوی
عبدالحق صاحب کا حصہ ص ۴۲ - ۵۲

سروری، عبدالقادر — مولوی عبدالحق — میرے تاثرات
ص ۵۳ – ۵۷

اسرار احمد — اردو کا معمار اعظم — ص ۵۸ – ۶۴

قطب النسا ہاشمی — بابائے اردو ایک تاثر — ص ۶۵ – ۶۸

دلشی دھر — سچا ہیرا — ص ۶۹ – ۷۶

شاہد، حمید الدین — اردوئے قدیم اور بابائے اردو
ص ۷۷ – ۸۷

ابوظفر عبدالواحد — مسائلی شخصیت — مولوی عبدالحق
ص ۸۸ – ۹۰

عبدالحق — اردو زبان — ص ۹۱ – ۹۶

خلیق انجم — مولوی عبدالحق بحیثیت خاکہ نگار
ص ۹۷ – ۱۰۳

نثار احمد فاروقی — مولوی عبدالحق کا اسلوب
ص ۱۰۴ – ۱۱۹

رفیعہ سلطانہ — ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے
ص ۱۲۰ – ۱۲۴

سہیل عظیم آبادی — بابائے اُردو — ص ۱۲۵ – ۱۳۳

نصیر الدین ہاشمی — ڈاکٹر مولانا عبدالحق اور دکنیات
ص ۱۳۴ – ۱۳۸

ندر، محی الدین قادری — مولوی عبدالحق صاحب
ص ۱۳۹ – ۱۴۲

ساجد علی — مولوی عبدالحق صاحب اور تعلیمات
ص ۱۴۳ – ۱۵۰

سیدہ جعفر — عبدالحق کے تنقیدی تصورات
ص ۱۵۱ – ۱۵۶

نظر حیدرآبادی — مولوی عبدالحق ایک تحریک ایک ادارہ
ص ۱۵۷ – ۱۵۹

ثمینہ شوکت — مولوی عبدالحق کا اسلوبِ بیان
ص ۱۶۰ – ۱۶۴

آزاد، جگن ناتھ — مولوی عبدالحق، چند تاثرات
ص ۱۶۵ – ۱۶۹

وزیر حسن دہلوی — اردو کے بڑے میاں
ص ۱۷۰ – ۱۷۴

اکبر علی، محمد — ڈاکٹر عبدالحق اور ان کی خدمات
ص ۱۷۵ – ۱۸۱

منظومات

جذب عالم پوری، راگھوبندر راؤ — خراج تحسین ؎
یوں کہنے کو کہتے ہیں کلام شیریں
الفاظ بھی ملتے ہیں بہت کچھ رنگیں
ص ۱۸۵

آزاد، جگن ناتھ — قطعہ ؎
صفحات ہر اک دور میں تاریخ ادب کے
تیرے ابدی کام سے تابندہ رہیں گے
ص ۱۸۶

سعادت نظر — چراغ منزل ؎
یہ جبر گردش دوراں! یہ تلخیٔ حالات
کہاں طلوع سحر؟ ہے ابھی اندھیری رات
ص ۱۸۷

حاذی، غلام علی
ہدیۂ تبریک ؎

سرور و کیفِ اردو کچھ نہ پوچھو
غضب ہے نشۂ صہبائے اردو
ص ۱۸۸

رہی، علی اصغر   بابائے اردو سے
فکر کو اہمیت بیان سے ہے
آدمی کو شرف زبان سے ہے
ص ۱۸۹

بانو طاہرہ سعید   بابائے اردو کی خدمت میں سے
کشمکش ہی تو رازِ راحت ہے
عزم بالجزم میں کرامت ہے
ص ۱۹۰

محشر عابدی   نذرِ عقیدت سے
خدا نے بزمِ اردو کی صدارت آپ کو دی ہے
بساطِ باغِ اردو کی حمایت آپ کو دی ہے
ص ۱۹۱

خیال، فیض الحسن   نذرِ عقیدت سے
اے فدائے علم و دانش عاشقِ اردو زبان
تیری ہستی پہ ہے نازاں مادرِ ہندوستان
ص ۱۹۲

نیر، صلاح الدین   شمعِ اردو سے
جشن بابائے اردو مناتے ہیں ہم
شمعِ الفت کو دل میں جلاتے ہیں ہم
ص ۱۹۳

یسین علی خاں   بابائے اردو مولوی عبدالحق سے
حالی تمھارے دور کا باقی ہے اک چراغ
روشن ہیں جس کے نور سے اردو کے باغ و راغ
ص ۱۹۴

وحید مرزا   بابائے اردو سے
اے امیرِ گیسوئے لیلائے اردو السلام
جانبِ منزل رواں ہے کاروانِ تیز گام
ص ۱۹۵

وتشی دھر   اصلی موتی سے
جو پھول کھلا کرتے ہیں، وہ ہلکے رنگوں کے ہوتے ہیں
جو بڑے آدمی ہوتے ہیں، وہ سیدھے سادے ہوتے ہیں
ص ۱۹۶

پیامات و تاثرات

بابائے اردو۔ سندر لال، احتشام حسین اور دیگر حضرات
ص ۱۹۹ - ۲۱۴

عبدالحق   مکتوبات   ص ۲۱۷ — ۲۲۷

(پندرہ روزہ) قومی زبان کراچی - بابائے اردو نمبر

یکم اگست تا ۱۶ ستمبر ۱۹۶۲ء
جلد نمبر ۲۱   شمارہ نمبر ۳ — ۶

مندرجات :-

ادارہ   بابائے اردو کی پہلی برسی   ص ۴ — ۸
نور الحسن ہاشمی   عاشقِ اردو   ص ۹ — ۱۱
شوکت سبزواری   دل کو باتیں جوان کی یاد آئیں   ص ۱۲ — ۱۴
اکبر الدین صدیقی، محمد   بابائے اردو اور رسالہ افسر   ص ۱۵ — ۱۸

صدق جائسی مولوی عبدالحق ص ۱۹ – ۲۲

سید احمد ندوی روئداد حق ص ۲۳ – ۲۹

خان عارف برنی بابائے اردو سے ارادت۔

ص ۳۰ – ۳۳

محمد حسین رضوی بابائے اردو سے میری خط و کتابت

ص ۳۴ – ۳۹

محی الدین احمد مولوی عبدالحق کی چند کمزوریاں

ص ۴۰ – ۴۶

رشید اعظم فاروقی بابائے اردو اور اردوئے بابا

ص ۴۷ – ۵۱

وحید قیصر ندوی کچھ یادیں ـــــ کچھ آنسو

ص ۵۲ – ۵۴

ابو تمیم مولوی صاحب کا عشق انہ

ص ۵۵ – ۶۰

سخاوت مرزا مرد راہ داں ص ۶۱ – ۶۴

متین الرحمن مرتضیٰ عظیم تہذیبی قائد ص ۶۵ – ۶۷

بابائے اردو مقدمہ قاموس الکتب ص ۶۸ – ۷۱

برگِ گل (آرگن انجمن ترقی اردو کالج کراچی۔)

بابائے اردو نمبر۔ اگست سنہ ۱۹۶۳ء

مندرجات:۔

تاثرات:۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، نیاز فتح پوری اور دیگر حضرات ص ۹ – ۲۰

آمنہ صدیقی روشنی کا مینار ص ۲۳ – ۶۱

درشہوار مولوی عبدالحق ص ۶۲ – ۶۹

نغمہ کیفی بابائے اردو ص ۷۰ – ۷۸

ممتاز حسن مولوی عبدالحق ص ۸۱ – ۸۴

ابوسعید نورالدین حیات عبدالحق کے چند اہم پہلو

ص ۸۵ – ۱۰۴

رفیق خاور بابائے اردو ـــــ ایک تجریدی خاکہ

ص ۱۰۵ – ۱۱۷

قطب النساء ہاشمی مجاہد اردو ص ۱۱۸ – ۱۲۶

خان رشید مولوی عبدالحق ص ۱۲۷ – ۱۳۷

سجاد مرزا اردو کا زخمی سپاہی ص ۱۳۸ – ۱۴۰

تابش دہلوی عبدالحق ـــــ ایک تاثر

ص ۱۴۱ – ۱۴۳

عباس احمد عباسی سنجیدگی، مقصدیت اور محنت

ص ۱۴۴ – ۱۴۶

برنی، ضیاء الدین افکار عالیہ ص ۱۴۷ – ۱۵۳

نظر، حیدرآبادی مولوی عبدالحق..... ایک ادارہ ـــــ ایک تحریک ص ۱۵۴ – ۱۵۸

منظر ایوبی لفظوں کا جوہری ص ۱۵۹ – ۱۶۳

وحید چغتائی بابائے اردو ص ۱۶۴ – ۱۷۰

شریف رزمی محسنِ اردو ص ۱۷۱ – ۱۷۴

اولیا، محمد ایوب بابائے اردو مولوی عبدالحق

ص ۱۷۵ – ۱۸۴

نسیم ریاض اردو زبان کی نشوونما میں مولوی عبدالحق کا مرتبہ ص ۱۸۵ – ۱۸۹

ظفر نیازی اردو جو مٹ نہ سکی

ص ۱۹۰ – ۱۹۲

قیصر نظامی   ایک صاحب طرز نثار ص ۱۹۳-۱۹۷
نیرنگ نیازی   اک شمع رہ گئی ہے ص ۱۹۸-۲۰۵
مسعود جعفری   مولوی عبدالحق اور ترقی پسند ادب
ص ۲۰۶-۲۱۴
محمد طہٰ خاں   دیوانۂ محسن   ص ۲۱۵-۲۲۳
متین الرحمٰن مرتضیٰ - اردو تنقید اور عبدالحق
ص ۲۲۴-۲۳۹
معین الرحمٰن   مولوی عبدالحق کا مرتبہ ص ۲۴۰-۲۵۰
زخمی، محمود الٰہی   ڈاکٹر عبدالحق بحیثیت شخصیت نگار
(چند ہم عصر) کی روشنی میں
ص ۲۵۱-۲۵۶
اختر ادرینوی   عبدالحق — بابائے اردو
ص ۲۵۷-۲۶۰
احمد اسحاق نعمانی   مولوی عبدالحق کی نثر — ایک جائزہ
ص ۲۶۱-۲۶۶
اسدی، حفیظہ خاتون   مولوی عبدالحق کا مشن
ص ۲۶۷-۲۷۴
شمسہ کلثوم   عبدالحق اور ادب ص ۲۷۵-۲۸۲
فردوس خاتون   مولوی عبدالحق کی شخصیت چند ہمعصر
کے آئینہ میں   ص ۲۸۳-۲۸۷
غوثیہ زریں لکھنوی عبدالحق بحیثیت ایک نقاد
ص ۲۸۸-۲۹۳
افروز شوکت   ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی سیاسی بصیرت
اردو کے روپ میں
ص ۲۹۴-۲۹۸

(انسہ) خورشید حسن صدیقی - مولوی عبدالحق - ایک مطالعہ
ص ۲۹۹-۳۰۲
اشرف، کنیز فاطمہ   بابائے اردو کے خطبات میں لطیفے اور چٹکلے
ص ۳۰۳-۳۰۸
عذرا کیفی   زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
ص ۳۰۹-۳۲۰
خان اقبال یوسفی   اردو کے معمار اعظم - بابائے اردو
ڈاکٹر مولوی عبدالحق ص ۳۲۱-۳۲۵
عزیز الرحمٰن   ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں
ص ۳۲۶-۳۳۱
شرلادیوی   اردو کا باپ   ص ۳۳۲
ادارہ   افکار عالیہ - خطبات الحق -
(مقدمات عبدالحق سے چند اقتباسات
ص ۳۳۵-۳۹۹

منظومات

اثر، نواب جعفر علی خاں   نذر عقیدت سے
وہ عبدالحق کہ ہیں بابائے اردو
نہ کیوں شعر و ادب ہوں ان پہ نازاں
صفحہ ۴۰۳
نور الحسن ہاشمی   تو نے جوش عشق میں ..... سے
اے کہ تیرے فیض سے شاداب اردو کا چمن
اے کہ تیری شمع سے روشن ترقی کی لگن
ص ۴۰۴
آزاد، جگن ناتھ -
بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے

صفحات ہر اک دور میں تاریخ ادب کے
تیرے ابدی کام سے تابندہ رہیں گے
ص ۴۰۵

شاد عارفی — دخت کشی۔ نذر بابائے اردو سے
دخترِ مادرِ ہندی ہے زبان اردو...
دخت کش، اس کی تباہی کے اُٹھاتی ہیں اصول
ص ۴۰۶

سلام مچھلی شہری — خلوصِ کار و درافتادہ سے
ہر تازہ شمع جلتی ہے شمع قدیم سے
میں یہ سمجھ سکا ہوں بہ ایں عمر فن سلام
ص ۴۰۷-۴۰۹

رئیس امروہوی — اُردو نامہ بابائے اردو کی خدمت میں سے
ہے بزرگانِ قوم سے فریاد
کہ سنیں اس غریب کی روداد
ص ۴۱۰ — ۴۱۴

محشر بدایونی — خالق و تخلیق سے
وہی چمن میں بڑائی کا حق بھی پلتے ہیں
جو پھول دیتے ہیں اور آپ زخم کھاتے ہیں
ص ۴۱۵

بلراج کومل — ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی نذر سے
صحنِ گلشن کے ایک گوشے میں
باوقار و بلند و سنجیدہ
ص ۴۱۶

جمیل نقوی — بابائے اُردو سے
ادب کے نام پہ قائم ہیں حلقہ ہائے نہنگ
زبان کے پردۂ زنگار میں چھپے ہیں پلنگ
ص ۴۱۷ — ۴۱۹

بہار کوٹی — بابائے اردو سے
تو نے تو تیز کی مشعلِ علم کی تیرگی چھٹ گئی کارواں چل پڑے
تیری للکار سے رہروانِ ادب چونک اُٹھے اور بعزمِ جواں چل پڑے
ص ۴۱۹ - ۴۲۰

صہبا اختر — مشورہ سے
سیلِ غم ہے تو اسے آپ ہی برداشت کریں
آپ کے غم میں پریشاں کوئی گیسو کیوں ہو
ص ۴۲۱ - ۴۲۲

شاعر حمایت علی — بابائے اُردو سے
وہ اک چراغ کہ روشن ہے انجمن کے لئے
وہ اک دماغ کہ مشعل ہے اہلِ فن کے لئے
ص ۴۲۳

شاہد عشقی — اک شکن آلودہ ہاتھ سے
اب ہے اس برگد کا سایہ کس قدر جہاں نواز
کارواں کتنے ٹھہرتے ہیں اس کی چھاؤں میں
ص ۴۲۴

فضا ابن فیضی — شاہدِ اردو سے
تھے جہاں سورج پشیماں اور صبحیں سرگراں
تو وہاں سوزِ عمل کی روشنی بن کر اُٹھا
ص ۴۲۵ - ۴۲۷

یوسف جمال انصاری — بابائے اردو کی خدمت میں سے
جو کم نظر ہیں وہی جاہ و قدر کو دیکھتے ہیں
ہنر کے دیکھنے والے ہنر کو دیکھتے ہیں
ص ۴۲۸ - ۴۲۹

رضا ابنِ حامد رضوی — فخرِ مشاہیر سے

تو کہ اک فخرِ مشاہیر زبانِ اردو
کلکِ معنی ترا ہمراز فغانِ اردو

ص ۴۳۰ - ۴۳۲

نصیر کوٹی — بابائے اردو سے

صد آفریں تجھے اردو کے مونس و غم خوار
ہر اک نفس ہے تری زندگی کا بیش بہا

ص ۴۳۳-۴۳۴

جامؔ بنارسی — بابائے اردو سے

سلمائے زماں ہو کہ وہ لیلائے ادب ہو
رنگینیٔ عارض ہے ترے خونِ جگر سے

ص ۴۳۵ - ۴۳۵

سہیل اقبال — معراج سے

تیرے بارے میں اٹھایا جو قلم ہاتھوں نے
قریۂ دل، افقِ ذہن غزل خواں ہی ملے

ص ۴۳۷ - ۴۳۸

محسن بھوپالی — پیکرِ عمل سے

یورشِ بادِ مخالف کے مقابل رہ کر
طنزِ اغیار کے احباب کے طعنے سہہ کر

ص ۴۳۹

نظر جعفری — بابائے اردو سے

نام سے تیرے فروزاں ہے چراغِ علم و فن
تیرے ہاتھوں نے سنواری زلفِ اردو کی شکن

ص ۴۴۰

ناصر کاسگنجوی — بابائے اردو سے

کم نگاہی گمرہی کی آندھیاں
بے سر و پا رنج و کاوش بجلیوں پر بجلیاں

ص ۴۴۱ — ۴۴۲

خورشید حیدر صدیقی — بابائے اردو کے حضور ہدیۂ تبریک و تہنیت سے

اے کہ تو بابائے اردو ہے نہیں اس میں کلام
اے کہ حاصل ہے ادب میں تجھ کو اک اعلیٰ مقام

ص ۴۴۳

نیرنگ نیازی — جس کا ایمان ہے اردو وہ مسلمان ہے تو سے

گلستاں کو نئے پھولوں سے سنوارا تو نے
راہ دشوار کو آسان بنایا تو نے

ص ۴۴۴

شریف کمال عثمانی — بابائے اردو سے

وجہ فروغِ حسنِ بہاراں ہیں آپ ہی
یعنی کہ روحِ جانِ گلستاں ہیں آپ ہی

ص ۴۴۵ - ۴۴۶

انجمؔ اعظمی — اردو سے

زندگی بھیس بدل کر جہاں فن بنتی ہے
میر و غالب کا وہ اندازِ سخن بنتی ہے

ص ۴۴۷

(سہ ماہی) اردو کراچی۔ بابائے اردو نمبر

جلد ۴۰-۴۱، شمارہ ۱-۴، سنہ ۱۹۶۲ء

منظومات:۔

مفتوں، دیوان سنگھ — اردو زبان کا عاشق

ص ۹ - ۱۴

افسر میرٹھی، حامد اللہ ۔ بابائے اردو یا بابائے ملت
ص ۱۵ - ۱۸
احمد حسین، شیخ ابدی بھائی ص ۱۹ - ۲۶
رفعت، مبارز الدین بابائے اردو ص ۲۷ - ۳۰
حمید احمد خاں بابائے اردو اسلامیہ کالج لاہور میں
ص ۳۱ - ۳۸
غلام ربانی عظیم انسان ص ۳۹ - ۴۷
محمد اعظم یاد ایام عشرت فانی ص ۴۸ - ۵۵
... ، عبداللطیف خاں عبدالحق ۱۹۲۱ء ص ۵۶ - ۶۰
ظہیر الدین مدنی ڈاکٹر مولوی عبدالحق ص ۶۱ - ۶۷
شرف الحق مولوی صاحب قبلہ ص ۶۸ - ۷۹
محمد حسن ایک تاثر ص ۸۰ - ۸۳
طاہر فاروقی مولوی صاحب ص ۸۴ - ۸۹
سید محمد بیسویں صدی کا سرسید
ص ۹۰ - ۹۶
وفا راشدی بابائے اردو اور بنگال
ص ۱۰۱ - ۱۰۸
فرقت کاکوروی، غلام احمد ۔ سب سے بڑا مقدمہ باز
ص ۱۰۹ - ۱۱۱
دیوانہ، موہن سنگھ مولوی صاحب ص ۱۱۲
غلام مصطفےٰ خاں بابائے اردو کی اردو
ص ۱۱۳ - ۱۵۵
ابن فرید شخصیت کے پردہ نگاری میں
ص ۱۵۶ - ۱۶۲
عبادت بریلوی مقدمات عبدالحق ص ۱۶۳ - ۱۸۳

اسلوب احمد انصاری مولوی عبدالحق کی مرقع نگاری
ص ۱۸۴ - ۱۹۵
ساجد علی مولوی عبدالحق اور تعلیمات اردو
ص ۱۹۶ - ۲۰۷
حمیدہ نسیم (زبان میں عورت کا حصہ۔
بابائے اردو کے خطبات کی روشنی میں
ص ۲۰۸ - ۲۳۲
سلام سندیلوی مولوی عبدالحق پر حالی کا اثر
ص ۲۳۳ - ۲۴۹
تہور حسین تصانیف عبدالحق ۔ ایک جائزہ
ص ۲۵۰ - ۲۷۰
وقار عظیم مولوی صاحب کی سیرت نگاری
ص ۲۷۱ - ۲۹۱
انور عنایت اللہ بابائے اردو کی ریڈیائی تقریریں
ص ۲۹۲ - ۲۹۷
کمال رحیم الدین بابائے اردو کی بامقصد زندگی
ص ۲۹۸ - ۳۲۸
اعجاز حسین مولانا حالی کا اثر ڈاکٹر عبدالحق پر
ص ۳۲۹ - ۳۳۸
ریاض الحسن بابائے اردو
جدید تنقید کے بانی
ص ۳۳۹ - ۳۴۴
ایوب قادری بابائے اردو کے غیر مطبوعہ خطوط
ص ۳۴۵ - ۳۶۸

نظم

ایک نظم   دریا کا آغاز وانجام سے

اے دلفریب دریا آتا ہے تو کہاں سے؟
اٹھکھیلیاں سی کرتا جاتا ہے تو کدھر کو؟

معارف علی گڑھ جولائی سنہ ۱۹۰۰ء   ص ۳

(نوٹ) اس نظم کے مصنف کا نام ع - ح دیا گیا ہے۔ (اغلب گمان یہ ہے کہ یہ نظم بابائے اردو کی تصنیف ہے)

مدیر مشفق خواجہ

انجمن پریس لائنس روڈ میں چھپ کر کل پاکستان انجمن ترقی اردو - اردو روڈ کراچی سے شائع ہوا

Regd. S. No. 1138 Phone: 32784

Fortnightly **QUOMI ZUBAN** Karachi

وہ زبان جسے ہمارے اسلاف نے اور ہمارے شاعروں ادیبوں اور علما نے
اپنی پیہم کوششوں اور اپنی دماغی ذہنی اخلاقی اور روحانی کاوشوں سے
ایسا پُرمایہ بنا لیا اور وسیع بنا دیا کہ وہ دنیا کی شائستہ زبانوں کی صف میں کھڑی
ہو سکتی ہے - وہ زبان جو برعظیم پاک و بھارت میں سب سے مقبول رہ چکی ہے اور
اس برعظیم سے باہر دور دور تک جا پہنچی ہے - وہ زبان جس کی حمایت میں سر سید احمد خاں
مرتے دم تک اس کے دشمنوں سے لڑتے رہے - وہ زبان جس کے لیے نواب محسن الملک نے
یوپی کے گورنر سے ٹکر لی - وہ زبان جس کا نام لے کر مسلم لیگ نے پاکستان کا
مطالبہ کیا اور اسے اس برعظیم کی عام زبان بنانے کی قرارداد منظور کی - وہ
زبان جس کے تحفظ کے لیے انجمن ترقی اردو نے کانگرس حکومتوں اور ان کے
ناخدا گاندھی جی سے معرکہ آرائیاں کیں اور مخالفوں کو نیچا دکھایا - وہ
زبان جس کی خاطر قائد اعظم علیہ الرحمہ نے جان جوکھوں میں ڈال کر ڈھاکے
کا پُرخطر سفر اختیار کیا اور نہایت غیر مبہم الفاظ میں علی الاعلان یہ
فرمایا کہ پاکستان کی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی اور جو لوگ اس کو
مخالف غلط فہمی پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ پاکستان کے دشمن ہیں - آج وہی
زبان اپنی قلمی مملکت پاکستان میں ذلیل و خوار ہے - انتہا یہ کہ پولیس کا
معمولی سپاہی اُس کے حروف اور ہندسوں کو حقارت سے دیکھتا ہے اور
قابل مواخذہ سمجھتا ہے - حیرت کا مقام ہے کہ ہماری قومی غیرت اور حمیت اسے
گوارا کرتی ہے - کیا اس کے بعد بھی ہم اس مملکت کو پاکستان کا مقدس
نام دے سکتے ہیں؟

عاقل